مقالاتِ شامِ ہمدرد

۱۹۷۲ء

موضوع : احترام

مرتّبہ

حکیم محمد سعید

مقالاتِ شامِ ہمدرد

۱۹۷۲ء

موضوع : احترام

مرتّبہ

حکیم محمد سعید

ہمدرد اکیڈمی ، کراچی

نام کتاب : مقالاتِ شامِ ہمدرد، ۱۹۷۲ء

مرتّب : حکیم محمد سعید

ناشر : ہمدرد اکیڈمی
ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ناظم آباد
کراچی ۳

طابع : ابرار پرنٹنگ پریس، کراچی

سالِ اشاعت : ۱۹۸۰ء

تعداد اشاعت : گیارہ سو

قیمت : چالیس رُپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احترام

انتہائے تعظیم اور منتہائے احترام یہ ہے کہ انسان —— اشرف المخلوقات —— اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے مقرّر کردہ شعائر اور محترم احکام یعنی حرمات اللہ کی تعظیم کرے اور احترام و تکریم، کہ یہی فکرِ صحیح ہے اور یہی عملِ صالح ہے اور یہی دلوں کے تقوے کا اظہار ہے اور یہی پرہیز گاری کی نمود ہے۔

ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب۔ (الحج: ۳۲)

بلندیِ دَرَجات، عفوِ سیّات، سرفرازیِ حیات اور حصولِ خیر و برکات کا کوئی راستہ نہیں ہے بجز اس کے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو شعائر و اعلام طے کر دیے ہیں یعنی وہ چیزیں جن کے ادب و احترام کے تحفّظ کے لیے اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ نے احکام مقرّر کر دیے ہیں، ان کا پاس و لحاظ کیا جائے اور ان کو عنوانِ حیات بنایا جائے اور منتہائے زندگی۔

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تحلوا شعائر اللہ (المائدہ: ۲)

اس کتاب میں جو عنوانات ہیں اور موضوعاتِ فکر وہ بتمامہٖ حرمات اللہ کی تعبیریں ہیں اور شعائر اللہ کی تفسیریں۔ علمائے خیر اور فضلائے ملّت نے میری دعوت پر فکر و نظر کی تمام بلندیوں پر پہنچ کر شعائر و حرمات کی ایسی دل نشین اور ایمان افروز تشریحات و توضیحات کی ہیں کہ بے اختیار میرا دستِ دعا دراز ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کے مراتب بلند تر فرمائیں۔ میں ان سب اہلِ فکر و نظر کی خدمت میں ہدیۂ تشکّر و امتنان پیش کرتا ہوں اور فخر و انبساط کے ساتھ یہ مقالاتِ شامِ ہمدرد آپ کے لیے پیش کرتا ہوں۔

حکیم محمد سعید

جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن کے نام

ابوالعُلا معرّی نے وسعتِ حیات کو تین دنوں میں سمیٹا تھا:

ثلاثة ایام هی الدهر کله   وما هن الا الامس والیوم والغد

وما القمر الا واحد غیر انه   یغیب ویأتی بالضیاء المجدد

کل جو گزر چکا ہے، آج جو گزر رہا ہے، کل جو آنے والا ہے، مگر اس تقسیم زمانہ میں وجودِ حال محلِ نظر ہے۔ کیا یہ بڑی دل چسپ حقیقت نہیں ہے کہ گردشِ وقت کی رفتار اس درجہ تیز و تُند ہے کہ جس "وقت" کا ہم نے تعاقب کیا وہ ضرور حال تھا مگر جو ہماری گرفت میں آیا وہ ماضی ہے!

ابوطالب کلیم کا مشاہدہ مبنی بر حقیقت ہے کہ مدّتِ حیاتِ انسانی دو دن سے زیادہ نہیں۔

بدنامیِ حیات دو روزے نہ بود بیش   آں ہم کلیم با تو چہ گویم چساں گذشت

یک روز صرفِ بستنِ دل شد بایں و آں   روزِ دگر بہ کندنِ دل زیں و زاں گذشت

مگر حقیقتِ حال کو اگر زیادہ قریب ہو کر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ دیکھیے تو مدّتِ حیاتِ انسانی ایک صبح و شام سے زیادہ نہیں ہے۔ صبح آنکھیں کھلیں، دوپہر بیم و رجا میں گزری، رات آئی تو آنکھیں پھر بند! لم یلبثوا الا عشیة او ضحاها (۷۹: ۴۶)۔

حبیب محترم مکرم جناب جسٹس ڈاکٹر ایس۔ اے۔ رحمٰن مرحوم بس ایک صبح شام ہی جیے، مگر اس عرصۂ حیات میں بھی انھوں نے انسانی عظمتوں کو چھُو لیا، احترامِ حیات کو جالیا، عدل و انصاف کا بول بالا کر دیا، شرفِ آدم کی رفعتوں کو پالیا اور شامِ ہمدرد کو انھوں نے اپنا لیا۔

اِس مجموعۂ مقالاتِ شامِ ہمدرد کو اُن کے نامِ نامی سے معنون کرنا اُن کی خدمت میں ہدیۂ احترام پیش کرنے کے مترادف ہے۔

حکیم محمد سعید

مقالہ نما



حکیم محمد سعید، ڈاکٹر محمد سلیم جیلانی (مقرر)



ڈاکٹر جیلانی، حکیم محمد سعید، جسٹس شیخ عبدالحمید (صدرِ مجلس)



احترام ورثۂ ملّی کے سامعین

احترامِ ورثۂ ملّی

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمد سعید

مقالہ : ڈاکٹر محمود سلیم جیلانی

شامِ ہمدرد، راولپنڈی

۴ جنوری ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

محترم خواتین و حضرات!

جب کسی شخص کو اپنے باپ دادا سے دولت، عزت، نیک نامی، جائیداد، جاگیر وغیرہ ملتی ہے تو ہم اس کو خوش قسمت کہتے ہیں۔ ایک فرد اپنے آبا و اجداد سے دو طرح کا ورثہ پاتا ہے۔ ایک مادّی ورثہ، دوسرا معنوی ورثہ۔ مادّی ورثے میں روپیہ پیسہ، سازوسامان، جائداد اور جاگیر قسم کی چیزیں شامل ہوتی ہیں اور معنوی ورثے میں علم، اخلاق، مزاج، عادات و خصائل کو شامل کیا جاتا ہے۔ حقیقی معنی میں خوش قسمت وہ شخص ہوتا ہے جس کو معنوی ورثہ ملا ہو، جس کو اپنے خاندان سے علم کا شوق، محنت کی عادت، مزاج کی شائستگی اور شگفتگی، دیانت، خلوص، انکسار، حلم، صبر، قناعت اور ہمدردی جیسی خصوصیات ورثے میں ملی ہوں۔ وہ اُس شخص سے کہیں زیادہ فائدے میں ہے جس کو مال و دولت تو کثرت سے ملا ہو، لیکن اُن صفاتِ حسنہ کا ورثہ قطعاً نہ ملا ہو اور اُس کی دولت اُس کو مسرّت و شادمانی اور سکون و عافیت دینے کے بجائے اُس کی پریشانی کا سبب بن جائے۔

یہی حال قوموں کا ہے۔ قوموں کا ورثہ ایک تو اُن کے شہر، مکانات، عمارات، کارخانے، صنعتیں، نہریں، پُل، بند، شاداب زمینیں، کانیں اور اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ دوسری قسم کا ورثہ اخلاق، کردار اور روایات ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عالمِ اسباب میں مادّی ورثے کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ زندہ رہنے کے لیے یہ سب چیزیں بھی ضروری ہیں اور ان کا وجود قومی ترقی و خوش حالی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اچھی حکومتیں اُن کے لیے سعی و تدبیر سے کام لیتی ہیں، لیکن معنوی ورثے کی اہمیّت کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کی اہمیّت مادی ورثے سے بھی زیادہ ہے اور میرے خیال میں ورثۂ ملّی یہی ہے، کیونکہ اس کے بغیر مادی اسباب و ذرائع سے استفادہ بھی مشکل ہے جس طرح ایک خاندان کے افراد مال و دولت کی تقسیم پر لڑنے جھگڑنے لگیں تو وہ خوش نہیں رہ سکتے، اسی طرح کسی قوم کے مختلف گروہ اور افراد باہم مطمئن اور معاون نہ ہوں تو مادّی ذرائع اُن کی خوش حالی کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔

ملّتِ اسلامیہ کی حیثیت سے ہمارا اصلی ورثہ ہمارا مذہب، ہماری تہذیب، ہماری تاریخ اور روایات، ہمارا ادب، ہمارا فنِ تعمیر ہے۔ اس ورثے کا تحفّظ اور اُس کی ترقی ہمارے قومی وجود کے لیے ضروری ہے

یہی ہمارا قومی تشخص ہے۔ اسی سے ہماری انفرادیت قائم ہے۔ ہماری ترقی کے لیے بھی اس ورثے کا تحفظ ضروری ہے۔ ہمارا ورثہ ہی ہمیں ماضی سے مربوط، حال سے وابستہ اور مستقبل کا اہل بنا سکتا ہے۔ ورثۂ ملی کا احترام ہی خود آگہی کا دوسرا نام ہے۔ خود آگہی کے بغیر قومیں بے مقصدی کی دلدل میں پھنسی رہتی ہیں۔ اُن کا مستقبل غیر یقینی ہوتا ہے اور اُن کی منزل غیر متعین۔ جس قافلے کو یہی معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں سے آیا ہے، تو وہ یہ کیسے طے کر سکتا ہے کہ اس کو جانا کہاں ہے۔ خود آگہی کے بغیر قومیں بے مقصدی کی دلدل میں پھنسی رہتی ہیں۔

ایک اتفاقی حادثہ بھی اس قافلے کو گمراہ اور تتر بتر کر سکتا ہے۔ ایسی قوم کے لیے اجتماع اور اتحاد کی بنیادیں تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اپنے ورثے کا احترام کسی ملت کے لیے وہ عظیم دولت ہے جس کی موجودگی میں اُس کا حال خوش حال اور اُس کا مستقبل خوش آیند ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمود سلیم جیلانی

خواتین و حضرات!

میں آپ کے سامنے مسئلے کا صرف وہ پہلو پیش کرنا چاہتا ہوں جو کہ ملک کی تعمیر کے لئے سود مند ثابت ہو سکے۔ ورثہ ماضی سے آتا ہے۔ ماضی کو دہراتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ جو تکلیف مجھے ہوگی، وہی آپ خواتین و حضرات کو بھی ہوگی۔ اور اگر ہم کافی پہلے کے واقعات کی طرف جائیں، تاریخ پر نظر دوڑائیں تو بہت سی چیزیں بے اثر لگیں گی۔ اور سارے مسئلے کو ایک نئے پہلو سے دیکھنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ اس وقت قوم کو تعمیر کے لئے کئی چیزوں کی ضرورت ہے اور ہمارا ورثہ اس سلسلے میں ہماری کیا امداد کر سکتا ہے۔ میں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے مایوس ہونا نہیں جانتا۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس وقت ساڑھے تیرہ کروڑ لوگوں کا یہ ملک، جس کے ایک حصے پر ہمارے قدیم دشمن کا قبضہ ہے، اس میں اب بھی اتنی قوت موجود ہے کہ اگر ہم صحیح طریقے سے اپنی تعمیر کریں تو اب بھی ہمیں کسی دشمن سے خطرے کی ضرورت نہیں ہے اور ہم نئے سرے سے ایک اتنی مضبوط قوم کی تعمیر کر سکتے ہیں کہ کوئی ہماری طرف نہ دیکھ سکے گا، لیکن بات صرف اس مرحلے پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ہمیں وہ کچھ، وہ اسباق اپنے سامنے رکھنے ہوں گے اور اپنے ماضی کو اپنے سامنے رکھنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا چیزیں قابلِ احترام ہیں اور کیا نہیں۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں یہ بھی عرض کروں گا کہ ہم اپنے سارے ماضی کا اور سارے ورثے کا احترام نہیں کر سکتے یا کم از کم ان حالات میں ہمیں اپنے ماضی میں صحیح اور غلط میں تمیز کا مادّہ پیدا ہونا چاہیئے تاکہ آئندہ ہم سے وہ غلطیاں نہ ہوں جو کہ ماضی میں ہوتی رہی ہیں۔ پہلی چیز جو میں عرض کرنا چاہ رہا تھا اور حکیم صاحب نے اس پر بہت مناسب طریقے سے روشنی ڈالی، یہ ہے کہ انسان کا ورثہ دراصل صرف بچے ہوتے ہیں، گوشت پوست کے، لیکن ملّت کا ورثہ دراصل ایک کلچرل یا معاشرتی ورثہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے معاشرے سے کیا اقدار حاصل کی ہیں۔ ہم نے کیسے انہیں آگے چلایا ہے اور اس وقت حال میں جو معاشرہ ہمارے سامنے ہے، وہ ماضی کے ورثے میں کس طرح بنا ہے، کیونکہ کوئی معاشرہ یا سوسائٹی ایسے ہی معرضِ وجود میں نہیں آجاتی بلکہ جس طرح عمارت ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھنے سے آہستہ آہستہ بنتی چلی جاتی ہے، اسی طرح سے نسلوں میں ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھتے رکھتے معاشرے کی اقدار بنتی ہیں اور ایک ورثہ بنتا ہے جس سے پکڑا گئے کی تو میں

یا آگے کی نسلیں فائدہ اُٹھاتی ہیں اور اُس سے مزید ترقی ہوتی ہے اور نئے راستے کھلتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارا ورثہ کیا ہے؟ بلکہ یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ہمارے ورثے کے دو حصے ہیں۔ میں معاشرے کے ورثے کی بات کر رہا ہوں، جس میں مادّی اور غیر مادّی دونوں قسم کا ورثہ شامل ہے۔ انسان کی جو بنیادی یا جبلّی قدریں ہوتی ہیں، وہ ساری دنیا میں ایک ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہمارے ملک کے کسی شخص کو تکلیف پہنچتی ہے یا اُسے بخار آ رہا ہے تو وہ ایک خاص قسم کی آوازیں نکالے گا۔ پھر کسی دوسرے ملک میں اگر کوئی شخص اُسی تکلیف میں مبتلا ہے تو اُس پر بھی وہی کیفیت طاری ہوگی۔ یہ وہ ورثہ ہے جسے ہم آفاقی کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے اور یونگ (Jung) سے منسوب ہے، لیکن اس سے ہمیں یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ تمام دنیا کے ورثے میں کچھ اقدار اور کچھ طریقے ایسے ہیں جو کامن ہیں یا ایک سے ہیں۔ اُس کے بعد ہر قوم کا کچھ اُس کا اپنا ورثہ اُس میں شامل ہوتا ہے کہ اُس کے سوچنے کا ڈھب اور اُس کی تاریخ کا تعلق اُس کے ورثے کے ساتھ ہے۔ اُس سے اُس کی اقدار میں ایسی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں کہ ایک قوم یا ایک ملّت کی اقدار دوسری قوم یا ملّت کی اقدار سے مختلف ہو جاتی ہیں۔ اور اس قوم کے افراد نہ صرف اس قوم کی اقدار کا ایک حصّہ ہوتے ہیں بلکہ وہ اس اقدار کے نام لیوا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک قوم دوسری قوم سے مختلف ہو جاتی ہے لیکن بنیادی طور پر جو آفاقی اقدار ہیں، یا ورثہ ہے، وہ اپنی جگہ پہ موجود رہتا ہے۔ اس کلچرل انہیرٹینس کو یا معاشرتی ورثے کو جب کوئی قوم یا اس قوم کے افراد قریب سے دیکھتے ہیں تو اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُسے بچانے کی کوشش کی جائے۔ اُن کا نام بلند کیا جائے، اُسے دوسری قوموں کے سامنے ایک مثالی اقدار کے طور پر پیش کیا جائے۔ پھر نفسیاتی تجزیہ یہ ہے کہ چونکہ یہ اقدار دراصل باپ کی شکل سے منسوب ہوتی ہیں، یعنی ہر قوم جو ہے وہ ان اقدار کو اپنے باپ یا اپنی ماں کے طور پر سمجھتا ہے لہٰذا جس طرح وہ اُن کی عزّت اور ناموس کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح اپنے اس ورثے یا اپنی ان اقدار کو بھی بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب ہم اپنی پرانی اقدار کو یا جب ہم اپنے ورثے کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اُس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہماری آگے بڑھنے کی جو توتیں ہیں اُن میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ معاشرہ کسی لمحے ٹھہرتا نہیں، بلکہ متحرک رہتا ہے، اور اس حرکت کی وجہ سے عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی ورثہ ہمارے پاس موجود ہے، اُس کے بعض حصّوں کو ہم اپنا لیتے ہیں، اُن کے اوپر عمل کرتے ہیں اور اس کے بعض حصّے اندھیرے میں چلے جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ایسی قوتیں یا ایسی اقدار انسانوں کو عزیز ہو جائیں جن میں آگے بڑھنے کی قوت نہیں ہوتی تو وہ ماضی کے

اندھیروں میں گم ہو کے رہ جاتا ہے۔ اگر وہ اقدار کبھی اُس کے ساتھ چلا پا جائیں یا اُنھیں روشنی مل جائے جن سے آگے بڑھنے کی قوتیں مضبوط ہوتی ہیں تو وہ قوم ترقی کرنے لگتی ہے۔ میں نے یہ فلسفیانہ بات، سارا مسئلہ اس لئے آپ کے سامنے پیش کیا کہ اس مرحلے پہ جہاں یہ قوم اس وقت کھڑی ہے اور ملّت کو جو مرحلہ درپیش ہے، اُس کے پیشِ نظر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کون سی اقدار اور ورثے کا کون سا حصّہ ہمیں آگے بڑھا سکتا ہے اور ورثے کا کون سا حصّہ ہمیں پیچھے کی طرف کھینچ سکتا ہے اور ہم کیا سبق اپنے ورثے سے اور اپنے ماضی سے حاصل کرتے ہیں، جن سے ہم قوم کی تعمیرِ نو کر سکیں۔

خواتین و حضرات!

تاج محل اور لال قلعہ ہمارے ورثے ہیں، لیکن اگر اُس میں اور آپ کی قوم کے ناموس، اُس کی بقا اور اُس کی عزت کے درمیان کوئی سلسلۂ امتیاز ہو تو آپ دونوں چیزوں میں سے کیا چیز پسند کریں گے؟ یہ فیصلہ آپ پر ہے۔ مسلمانوں کو ورثے میں علم، تحقیق، فن ایجاد، نئے علاقے فتح کرنا، نئی چیزیں دریافت کرنا۔ مسلمانوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ اس میں سے اس ورثے میں سے ہمارے پاس کیا ہے؟ گزشتہ چھے سو سال میں ہم نے کیا دریافت کیا؟ ہم نے کتنی تحقیق کی؟ کتنے نئے فنون میں ہم نے نئے معرکے مارے؟ کیا یہ سارے کا سارا ورثہ ہم نے گنوا نہیں دیا۔ ہم نے اپنے ماضی میں جو کچھ کیا تھا، بجائے اس کے کہ ہم اُس سے آگے بڑھتے، بجائے اس کے کہ ہم اس پتھر کے اوپر اور پتھر رکھتے اور عمارت تعمیر کرتے، ہم نے ان پتھروں کو بھی مٹا دیا۔ اب ان کے نشان یورپ اور امریکہ میں ملتے ہیں۔ ہمارے یہاں نہیں ملتے۔ ہمارے یہاں اُن کا علم بھی صرف اُن چند لوگوں کو رہ گیا ہے جو فارسی اور عربی کے عالم ہیں۔ اور لگتا تو عجیب سا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ میں حکیم صاحب کو مبارکباد دوں کہ ان کی کوششوں سے اس کا کچھ حصّہ اُردو میں منتقل ہوا ہے اور ادھر اُدھر کچھ کام شروع ہوا ہے، لوگوں میں دلچسپی پیدا ہوئی ہے، لیکن اس سے ہٹ کر ہم نے کیا کیا؟ چنانچہ آپ نے اپنی قوم کو مضبوط کرنے کے بجائے اُسے کمزور کیا۔ اُس کے آگے بڑھنے کی صلاحیتیں سلب کیں اور یہ تھا ہمارا احترام اپنے ورثے کے لیے۔ چنانچہ یہ سوچنے کا موقع ہے کہ کیا اسی قسم کا احترام ہم آئندہ بھی اپنے ورثے سے روا رکھ سکتے ہیں؟ کیا ہمارا ورثہ صرف یہی تھا کہ ہم ان چیزوں کو کتابوں میں دفن کر دیں اور ہم اُن سے کوئی سبق نہ سیکھیں؟ اگر ہم صحیح معنوں میں اپنے ورثے سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں، ہمیں اس سے پیار ہے اور ہم اس کا احترام کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں آگے بڑھنے کے لئے نئے سرے سے اپنے اس ورثے کا جائزہ لینا ہوگا، اور ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہم نے کہاں یہ ڈوری چھوڑی تھی جہاں سے ہم دوبارہ شروع کر سکتے ہیں اور ہم سے آگے جو دنیا نکل چکی ہے جو خلا پیدا ہو گیا ہے، اُس کو کس طرح سے پُر کیا جا سکتا ہے۔

اُس کے بعد دوسری بات میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کسی قوم کے ورثے کی قوت اس کا ایمان

ہوتا ہے، اُس کے اعمال ہوتے ہیں اور جہاں تک اس سلسلے میں ہمارا تعلق ہے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم دنیا کے مختلف حصوں میں بیرونی دباؤ کا شکار رہے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ جب مسلمانوں نے اپنے آپ سے سبق نہیں سیکھا جب انھوں نے اپنے ماضی کو بُھلا دیا تو اُس کے بعد کسی کو بھی اُن پہ فوقیت حاصل ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس چیز کو ہم ثقافتی حملے کا نام دیتے ہیں۔ دنیا کے تمام مسلمانوں پہ باہر کے کلچر کی ثقافت کی یلغار شروع ہو گئی تھی، اور مسلمانوں کا معاشرہ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ جس وقت ہندستان میں مسلمان آئے تو مسلمانوں کا معاشرہ اتنا مضبوط تھا اور اُن کی اقدار اتنی صالح تھیں کہ جس ہندستانی تہذیب نے اُن کے سامنے کھڑے ہونے کی کوشش کی، اُسے شکست ہوئی لیکن جس وقت یہاں پہ مقامی ثقافت نے اسلام کی ثقافت پہ حملہ کیا تو مسلمان عیاشی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں جو معاشرہ آپ کو ملا اور جو اقدار آپ کو ملیں وہ دراصل ہندوؤں کے کلچر اور اُن کی ثقافت کا شکار ہوتی ہوئی اقدار تھیں۔

آپ کے یہاں کاسٹ سسٹم شروع ہو چکا تھا، جس کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ آپ کے یہاں اکثر وہ رسومات شروع ہو چکی تھیں جو بنیادی طور پر مسلمانوں کی نہیں اور وہ چیزیں پچھلے چوبیس برسوں میں گھٹنے کے بجائے بڑھیں۔ کیا اب وقت نہیں ہے کہ ہم اپنا جائزہ لیں اور اپنا اصلی ورثہ تلاش کریں؟ اگر ہم اسی طرح سے اپنی سوسائٹی کو چلانا چاہتے ہیں جس طرح کہ چل رہی ہے تو بسم اللہ۔ ایک نتیجہ دیکھ لیا آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ تاہم اب وقت ہے کہ ہم اپنے اس بنیادی ورثے کو بھی دیکھیں کہ کیا ہمارا ہے اور کیا ہم نے دوسروں سے لیا ہے۔ میں نام لینا نہیں چاہتا۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب کا اپنے ماضی سے یا ماضی کے مختلف اَدوار سے کچھ جذباتی رشتہ بھی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو ہمارا کون سا بادشاہ پسند ہو۔ آپ کو کس سے کیا دلچسپی ہو، لیکن جن مختلف اَدوار میں سے ہندُستان کے مسلمان گزرے ہیں اُن کا جائزہ لیجیے اور دیکھیے کہ کس طرح مسلمانوں کا زوال ہندُستان میں ہوا اور اُن کی کیا وجوہات تھیں۔ اُن کا مقابلہ پاکستان بننے کے بعد کے حالات سے کر کے دیکھ لیجیے۔ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا، اور آئندہ کے لیے آپ کو لائحۂ عمل بھی اس میں ملے گا۔ اس کے بعد میں ایک چیز اور عرض کرنا چاہتا تھا کہ کلچرل اِن ویژن یا بیرونی ثقافت کے جو حملے ہم پر ہوئے ہیں اُن کا ہم پر کیا اثر پڑا۔ جہاں ہم نے بہت کچھ اور گنوایا، وہاں ساتھ ہی ہم نے ایک اور چیز بھی کھو دی۔ مسلمانوں میں دوسروں سے سبق سیکھنے کا اور اُن کی اچھی باتیں اپنانے کا جذبہ بھی تھا، وہ بھی غائب ہو گیا۔ چنانچہ ہم نے باہر کی ثقافت کی بُری باتیں اپنائیں، اُن کی اچھی باتوں کو نہیں اپنایا۔ اپنی اچھی باتیں چھوڑ دیں، اور اپنی بُری باتوں کو ہم نے اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بجائے

آگے بڑھنے کے پیچھے ہٹے اور بجائے سبق سیکھنے کے ہم نے اور غلطیاں کیں۔ ہمارا بنیادی ورثہ سادگی، کفایت، سپاہیانہ زندگی اور ایک خاص سوچنے سمجھنے کا انداز اور ایک خاص ڈھب کا نتیجہ تھا۔ ہم نے سادگی کو نہ صرف چھوڑ دیا بلکہ ہم اسی پر فخر محسوس کرنے لگے کہ باہر کا کپڑا پہنیں اور باہر کی اشیا استعمال کریں۔ ہندستان کے ساتھ ہماری زندگی اور موت کی جنگ جاری تھی اور راولپنڈی کی پان کی دکانوں پر ہندستان سے اسمگل شدہ پان بک رہے تھے۔ یہ میں سُنی سُنائی بات نہیں کہہ رہا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ ہماری غیرت کا حال اور یہ ہمارا ورثہ تھا جو ہم نے پایا تھا اور اُسے کس طرح ہم نے انحطاط میں مبتلا کیا۔ میں اپنے آپ کو اس سے مبرا نہیں سمجھتا۔ مجھ سے بھی کچھ غلطیاں ہوتی ہوں گی لیکن مجھے تکلیف ہوتی ہے کہ ہم اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ہم نے اپنی قوم کو بچانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی ہیں؟ اپنی قوم کو مضبوط بنانے کے لئے کیا قربانی دی ہے اور کس طرح ہم نے مختلف اوقات میں برتاؤ کیا ہے؟ کس طرح سے ہم نے اپنی قوم کو مختلف راہیں دکھائی ہیں؟ یہ ہمارے لئے سوچنے کا مقام ہے۔

خواتین وحضرات!

بظاہر آپ کو معلوم ہوگا کہ میں اصل موضوع سے ہٹ کر باتیں کر رہا ہوں لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ موقع ایسا تھا کہ میں کوئی مبسوط تقریر کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ یہ موقع ایسا ہے کہ ہم ایک نئے دور کا آغاز کر رہے ہیں اور ہمیں قوم کی تعمیر کرنی ہے۔ چنانچہ ہم نے ماضی میں جو غلطیاں کی تھیں، اُن پر ایک نظر ڈالنی مناسب تھی، تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ ہمارا صحیح ورثہ کیا ہے اور ہم پھر اُس کا اعتراف کر سکیں۔ ایک خاص بات اس سلسلے میں جو میں عرض کرنا چاہ رہا تھا، وہ ہمارے سوچنے اور سمجھنے کا ڈھب ہے۔ ایک لحاظ سے اُس کا تعلق تحقیقِ فن کے ساتھ نئی باتیں سیکھنے اور نئی باتیں کرنے سے بھی ہے، لیکن ہمارے سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں جو مشکل آن پڑی ہے وہ یہ ہے کہ ہم بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ حالات کے بدلتے ہوئے دھارے کا ساتھ دے سکیں۔ کچھ تو یہ انسانی کمزوری ہوتی ہے لیکن انسانی کمزوری کے علاوہ جب سالہا سال تک کوئی قوم آمرانہ حالات میں زندگی گزارتی ہے تو اُس کی سوچنے کی قوتیں کُند ہو جاتی ہیں۔ اُس کی ایک وجہ ہے، یہ بات گزشتہ دنوں بہت کہی گئی ہے کہ کیوں احتساب نہیں ہوتا اور یہ بات متعیّن نہیں کی جا سکتی کہ کون شخص کس طرف ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کو عادت پڑ جاتی ہے حالات کے دھارے کے ساتھ بہنے کی۔ مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم یہ محسوس کریں کہ اِس قوم کو آگے بڑھنا ہے اور اس قوم کو نئے سرے سے تعمیر کرنا ہے اور کس طرح سے ہم اس سلسلے میں اپنا

رول یا اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں ۔ اُس کے لئے ایک خاص قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہے ۔ ایک خاص طریقے سے سوچنے سمجھنے کے انداز کی ضرورت ہے کہ ہم قوم کی ضروریات کو اپنے سامنے رکھیں اور اُن کے مطابق اپنے فیصلے کر سکیں ۔

خواتین و حضرات !

قوم جب بنتی ہے تو وہ صرف ایک فرد کی محنت کا نتیجہ نہیں ہو سکتی ۔ بظاہر ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص تاریخ کا دھارا بدل دے لیکن اس کے پیچھے عوام کی قوت اور آواز ہوتی ہے کہ ان سب کے سوچنے کا طریقہ اور ان سب کی کوششیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں ۔

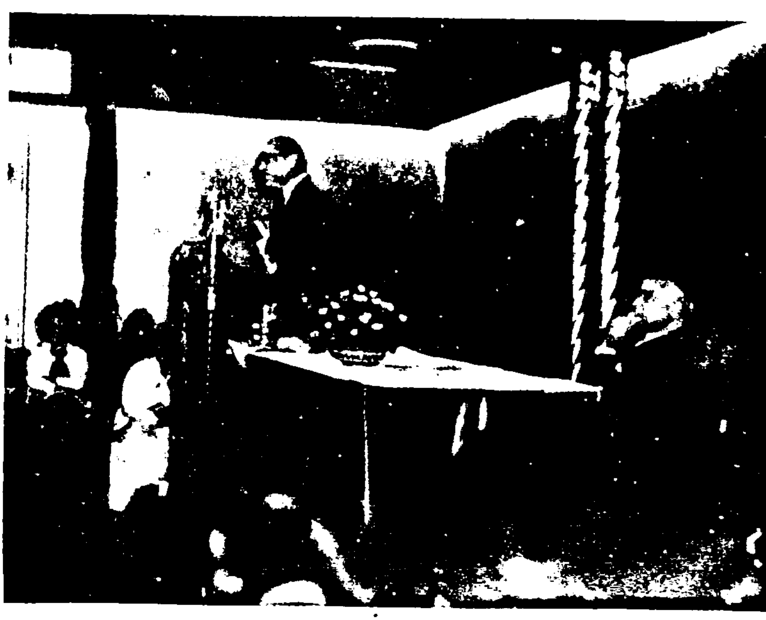
۱۹۴۷ء میں جب ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا اور میں ایک مہاجر کی حیثیت سے پاکستان میں داخل ہوا تھا تو مجھے یاد ہے کہ لاہور کی کیا حالت تھی ۔ مجھے سڑکوں کی حالت یاد ہے ۔ مجھے یاد ہے کہ کتنی بسیں سڑکوں پر تھیں ۔ میں اُس وقت فرسٹ ایر میں پڑھتا تھا ۔ چنانچہ مجھے اپنے کالج کی حالت یاد ہے اور مجھے مہاجروں کی عام طور پر وہ حالت بھی یاد ہے جس سے وہ گزر کر آئے تھے اور اُن کے جو اثرات اُن پر مرتب ہوئے تھے مجھے وہ بھی سب یاد ہیں اور اس کے بعد یہ پاکستان ہمارے سامنے یہاں پہنچا جہاں یہ اب ہے ۔ چنانچہ جہاں تک انسان کی اور ہماری قوم کی قوتِ تعمیر کا تعلق ہے مجھے اس میں کوئی شک نہیں ۔ ۱۹۴۷ء میں حالات یہ تھے کہ آپ کی ساری فوج ملک سے باہر پڑی ہوئی تھی ۔ اُس کے انتظامی ڈھانچے پر بڑی ضربات پڑ چکی تھیں، آپ کا بنکنگ سسٹم نہ ہونے کے برابر تھا ۔ اس وقت آپ نے پاکستان کو بنانا شروع کیا اور تقریباً ایک کروڑ مہاجر آپ کے کیمپوں میں اور گلیوں یا سڑکوں پر پڑے تھے ۔ آپ نے آہستہ آہستہ اس پاکستان کو بنایا تو اب بھی پاکستان کو تعمیر کیا جا سکتا ہے ۔ اور ہمیں اپنے ورثے میں سے ان چیزوں کو دوبارہ لانا ہوگا ۔ استقامت، قوتِ ارادی اور ایمان کی قوت نیز ایک خاص جذبے اور ایک لگن کے ساتھ ہمیں یہ کام کرنا ہے ۔ اور جو کچھ ہمیں تاریخ نے یعنی اپنی تاریخ نے سکھایا ہے اور اس کے ساتھ ہی جو کچھ ہمیں دوسرے ملکوں کی تاریخوں نے سکھایا ہے، ان سب سے ہمیں فائدہ اُٹھانا چاہیئے تاکہ ہم صحیح معنوں میں ایک ایسے معاشرے کی تکمیل کر سکیں جو کہ ہر رکاوٹ اور ہر مشکل کا سامنا کر سکے ۔ ایک بات جو میرا خیال ہے صدر بھٹو نے غالباً اپنی تقریر میں کہی تھی، وہ قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی معاشرے کی قوت دراصل اسی معاشرے کے اندر سے پیدا ہوتی ہے ۔ یہ ایک فلسفیانہ نقطہ ہے جس پر ہم نے کبھی ایک قوم کی حیثیت سے غور نہیں کیا ۔ ہم نے ہمیشہ چھوٹے بھائی والا رول ادا کیا ہے کہ جب کوئی مارنے کو بڑھے تو بڑے بھائی کو بلاؤ ۔ اگر ہم اپنے معاشرے کو صحیح معنوں میں مضبوط اور قوت والا بناتے تو ہمیں کوئی دشواری نہ ہوتی ۔ چنانچہ یہ ایک موقع ہے کہ نئے سرے

سے معاشرے کی تشکیل کی جائے، نئے سرے سے اُسے بنایا جائے تاہم ہر شخص کا اپنا کردار اِس معاشرے کے اندر صاف ہونا چاہیئے۔ اُسے اپنی جگہ پہچاننی چاہیئے اور اُسے یہ دیکھنا چاہیئے کہ مجھے دیکھ کر کتنے اور لوگ خرابی میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور یہ مثال ہر فرد کو قائم کرنی پڑے گی اور اسی سے معاشرہ صحیح معنوں میں مضبوط ہو سکے گا۔ میں حکیم صاحب کچھ اور عرض کرتا لیکن اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی ہمّت نہیں رکھتا۔ شکریہ۔ پاکستان زندہ باد۔

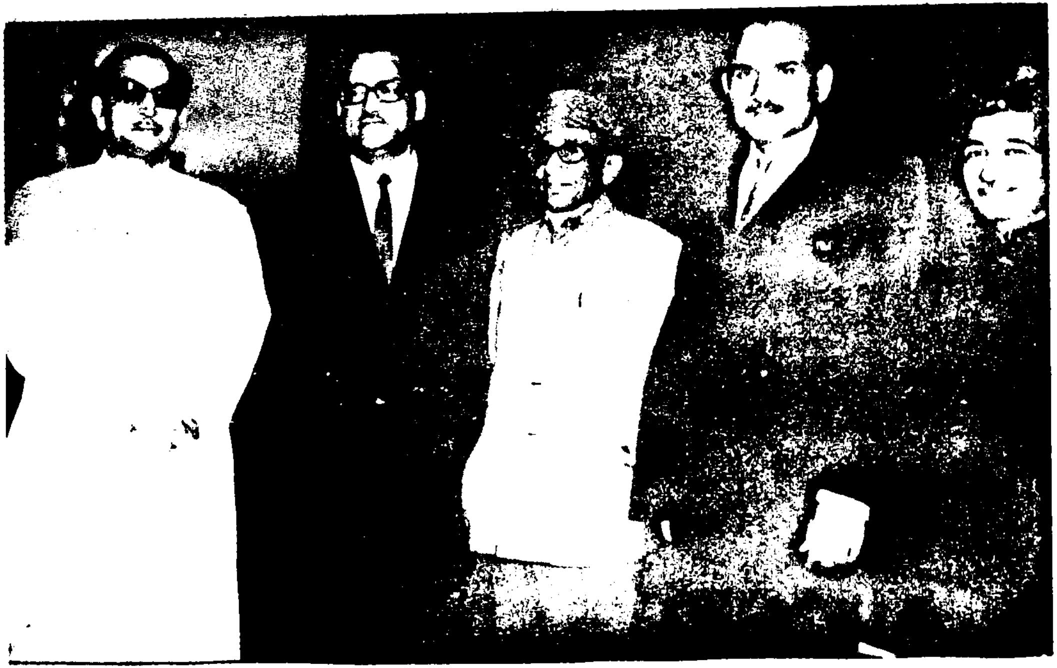
(یہ تقریر ٹیپ سے تیار کی گئی ہے)



حکیم محمد سعید، جسٹس انوارالحق (صدرِ مجلس)، جناب مختار مسعود



جسٹس انوارالحق ، جناب مختار مسعود (مقرر)



چند سامعین: (دائیں سے) جناب خلیق قریشی، میجر جنرل فضل مقیم خاں، حضرت حفیظ جالندھری، جناب مختار مسعود، حکیم محمد سعید۔

قحط الرّجال

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمّد سعید

مقالہ : جناب محترم مختار مسعود

شامِ ہمدرد، لاہور

۲۰ جنوری ۱۹۷۶ء

حکیم محمدؐ سعید

اس کرۂ ارض نے سورج کے گرد کتنے چکر لگائے ہیں اور کتنے طواف کیے ہیں اس کے شمار کا کسی نے کوئی دعوا نہیں کیا ہے۔ اگر ایک شام و سحر تاریخِ عالم کا ایک ورق بنتے ہیں اور روشن و منوّر اور تاریک و سیاہ صفحات وجود میں آتے ہیں تو اس کتابِ حیاتِ ارضی کی ضخامت اس قدر زیادہ ہے کہ انسان کے فہم و ادراک اِس کا احاطہ نہیں کر سکتے، اور اقوام و ملل نے اس کتاب کے اتنے ابواب رقم کیے ہیں کہ اُن کا علم و شمار ممکن نہیں۔ اس عنوان پر انسانی علم — اگر اسے علم کا نام دیا جا سکے — صرف مبنی بر قیاس ہے اور قیاس کے گھوڑے بھی اتنے سبک رفتار اور منہ زور نہیں کہ انسان کو منزل آشنا کر سکیں۔

لیکن انسان اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہے کہ بالکل ماضیٔ قریب یعنی چار پانچ ہزار سال کی تاریخِ اقوام و ملل اور اُن کے عروج و زوال کی داستانیں جاننے کا دعوا نہ کر سکے! اس کا اپنا حال بھی اس کے سامنے موجود ہے اور وہ ضرور یہ الزام لگانے کی پوزیشن میں ہے کہ ملتوں کے عروج و زوال کی ہر داستان بلندیٔ اخلاق اور پستیٔ اخلاق سے اور احترام و عدم احترام سے عبارت ہے۔ زوال، پستیِ اخلاق اور عدم احترام لازمی نتیجہ ہوتا ہے قحط الرجال کا۔ قحط الرجال کی جب بھی گفتگو کی جاتی ہے وہ ضروری طور پر ایک مخصوص تہذیب و تمدّن اور ایک مخصوص معاشرے کو محیط ہوتی ہے۔

صاحبو! قحط الرّجال کی بہت سی صورتیں ہیں:

مثلاً ایک صورت یہ بھی جا سکتی ہے کہ ایک قوم سیلِ آب و مرض کا شکار ہو گئی اور اس کی بستی کی بستیاں اس طور فنا ہوئیں کہ قحط الرجال کی صورت پیدا ہو گئی۔ ایسے واقعات سے تاریخ خالی نہیں ہے، بھری پڑی ہے۔

اور اگر آپ گزشتہ کل کی مثال مجھ سے سننا چاہیں تو پاکستان میں قحط الرّجال کی ایک صورت یوں پیدا ہوئی کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح جب افقِ مشرق سے سُورج طلوع ہوا، لوگوں نے آنکھیں کھولیں تو اچانک انھیں معلوم ہوا کہ اس روز پاکستان کی آدھی آبادی غروب ہو چکی ہے، مگر اس کا رونے والا کوئی نہیں ہے۔

مزید ایسی لاتعداد مثالوں سے گریز کرتے ہوئے میں کہوں گا کہ قحط الرجال کی یہ دونوں صورتیں

اس وقت ہمارا موضوعِ فکر نہیں ہیں۔ ہمارا موضوعِ فکر متعین اور قطعی طور پر یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں جو حالات پیش آئے ان میں فکر و تدبر کا فقدان تھا۔ اگر صاحبانِ عقل و فہم اور اکابر رجال ان دونوں مثالوں میں موجود ہوتے تو سیلِ آب پر بھی بندھ باندھا جاسکتا تھا اور اس مرض کی وبا کو بھی روکا جاسکتا تھا اور مشرق و مغرب کی ہم آہنگی اور طلوع و غروب کے نظمِ فطرت کو برقرار رکھا جاسکتا تھا۔

قحط الرجال کی ایک طبعی اور غیر شرعی صورت یہ ہے کہ فیملی پلاننگ (خاندانی منصوبہ بندی) پر عمل کیا جائے جس کے نتائج پر اس حد تک کبھی غور نہ ہو سکے کہ محمد علی جوہر اور حسرت موہانی اور اقبال و جناح پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں۔ اور نتائج سے بے تعلقی اس حد تک ہو کہ آدھی آبادی قربان گاہِ بے تدبیری و بے تعلقی کی نذر ہو جانے کے بعد بھی نامعقولیت پر مبنی یہ فعل باقی رکھا جائے۔

قحط الرجال کی ایک صورت یہ ہے کہ دانایانِ ملت کے دونوں ہاتھ اُن کی پشت پر باندھ دیے جائیں اور اُن کے جسم اور اُن کے دل و جگر کو سنگینوں سے چھید دیا جائے۔ اس جامِ شہادت پر اور اس رقصِ بسمل پر "قصرِ اسلام" میں جامِ شرابِ نوشِ جان کیا جائے اور ہمالہ پر رقصِ ابلیس دائم و قائم رہے۔

قحط الرجال کی ایک صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ قوم اپنے دانشوروں کو نشانہ ملامت بنائے، جہلا علما و فقہا کو ہدفِ ستم بنائیں اور خود علم جامۂ جہل زیبِ تن کرلے، اہلِ علم و فضیلت ظلم و ستم کی وجہ سے گوشہ نشین کر دیے جائیں اور طالب علم اپنے استاد کو قصاب اور گاڑی بان کا درجہ دے، شرفا کی پگڑیاں اچھالی جائیں، اکابر رجال کی تضحیک کی جائے تو رجال کا قحط پڑ جاتا ہے۔ ان رجال کی بستیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ اُن کے کھیت جل جاتے ہیں، اُن کے چمنستان تباہ ہو جاتے ہیں۔

ایک متفق علیہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ من العباد، ولکن یقبض العلم بقبض العلماء، حتی اذا لم یبق عالما، اتخذ الناس رؤسًا جہالًا، فسئلوا فافتوا بغیر علم، فضلوا واضلوا۔

یعنی: خدا علم کو لوگوں سے چھین نہیں لے گا بلکہ علما اُٹھتے جائیں گے حتیٰ کہ کوئی عالم نہ رہ جائے گا۔ تو لوگ جاہلوں کو اپنا مقتدا و امام بنالیں گے اور اُن سے معلومات حاصل کریں گے اور یہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

میں اس موضوع پر فی الحال اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ مگر آپ سے کہتا ہوں کہ آپ غور کیجیے، آپ فکر سے کام لیجیے اور پناہ مانگیے اس وقت سے کہ جب یہ قولِ رسول صلعم صحیح ہو جائے کہ —— "ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ کہا کریں گے کہ فلاں قبیلے اور فلاں خاندان میں ایک دیانتدار ہے۔"

حتّٰی یقال انّ فی بنی فلان رجالاً امینًا

محترم دوست صاحب فضل و عظمت، اہلِ علم و قلم جناب مختار مسعود صاحب نے آج شامِ ہمدرد سے خطاب کے لیے درحقیقت بہت ہی نازک موضوع منتخب فرمایا ہے۔ شاید ہم دیکھیں کہ وہ پل صراط پر سے گزر رہے ہیں۔ اگر اُن کے لیے دعائے خیر کرنے والے اس اجتماع میں موجود ہیں تو جاننا چاہیے کہ ملّتِ پاکستانیہ قحط الرّجال کے خطرے سے بشارت دوچار نہیں ہے۔ صحیح صورتِ حال کا مبنی بر حق و انصاف فیصلہ اس مجلس کے صدر عالی جناب محترم و معظم جسٹس انوارالحق صاحب فرمائیں گے۔

جناب مختار مسعود صاحب اس ماہ شامِ ہمدرد سے خطاب میں تامل فرما رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ شامِ ہمدرد کے مدعوئین وہ افرادِ ملّت ہیں کہ جو پاکستان کے مقدس نصب العین کی روشنیاں منوّر کرنے کے لیے بے چین ہیں اور جو پاکستان کی تعمیرِ نو میں تاریخ کا ایک یادگار رہ جانے والا کردار ادا کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونا چاہتے ہیں اور جو ہمالہ کو دُور نہیں گردانتے۔ شامِ ہمدرد کے شرکا اہلِ فکر و نظر ہیں اور وہ ہیں جو مسائل پیش آمدہ کے حل کے لیے آپ کی اور میری طرح بے چین ہیں۔

ہمارے مخاطب وہ صاحبانِ ذوق نہیں ہیں کہ جو سقوطِ مشرقی پاکستان کے غم سے نڈھال ہو کر ان نگارخانوں اور اُن رقص گاہوں میں توانائیاں حاصل کر رہے ہیں کہ جو چھے کروڑ مسلمانوں کے غلام بن جانے، قومی شکست و ذلّت اور ناقابلِ فہم پُراز سازش ترکِ جنگ کے بعد ہی اس قلعۂ اسلام میں غیرتِ اسلام اور حمیّتِ ملّی کا مذاق اڑانے کے لیے کھل گئے تھے۔

ہمارے مخاطب وہ بے حس و عمل لوگ بھی نہیں ہیں کہ جو قوم کے سانحۂ عظیم و شدید اور اُس کے نفسیاتی و جذباتی مضمرات کے احساس سے عاری نظر آ رہے ہیں، اور جن کے کان مشرقی پاکستان میں پاکستان کا دم بھرنے والوں کی چیخوں اور کراہوں کی گونج نہیں سن سکتے، اور جو مغربی پاکستان کے لاکھوں دلوں کے کرب و تڑپ کے ادراک سے محروم ہیں۔

زورِ بیان یا حدّتِ کلام کی وجہ سے نہیں، فرطِ غم و الم سے ایک لغزش آج یہ ہوئی ہے کہ میں نے آج آپ کا استقبال کیا اور نہ مہمان مقرّر و صاحب صدر کا خیر مقدم، اور نہ اظہارِ تشکّر و امتنان! میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

جنابِ محترم مختار مسعود صاحب! جناب صدر کی اجازت سے اس پل صراط پر تشریف لے آئیے۔

جناب محترم مختار مسعود

قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرجال میں زندگی۔ مرگ انبوہ کا جشن ہو تو قحط، حیات بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرجال۔ ایک عالم موت کی ناحق زحمت کا دوسرا زندگی کی ناحق تہمت کا۔ ایک سماں حشر کا دوسرا محض حشرات الارض کا۔ زندگی کے تعاقب میں رہنے والے قحط سے زیادہ قحط الرجال کا غم کھاتے ہیں۔

بستی، گھر اور زباں خاموش۔ درخت، جھاڑ اور چہرے مرجھائے۔ مٹی، موسم اور لب خشک۔ ندی، نہر اور حلق سوکھے۔ جہاں پانی موجیں مارتا تھا وہاں خاک اڑنے لگی، جہاں سے مینھ برستا تھا وہاں سے آگ برسنے لگی۔ لوگ پہلے نڈھال ہوئے پھر بے حال، آبادیاں اجڑ گئیں اور ویرانے بس گئے۔ زندگی نے یہ منظر دیکھا تو کہیں دور نکل گئی، نہ کسی کو اس کا یارا تھا نہ کسی کو اس کا سراغ، یہ قحط میں زمین کا حال تھا۔

ابر دل کھول کر برسا، چھوٹے چھوٹے دریاؤں میں بھی پانی چڑھ آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا جل تھل ہوا کہ سبھی تر دامن ہو گئے۔ دولت کا سیلاب آیا اور قناعت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ علم و دانش دریا برد ہوئے اور ہوش و خرد مئے ناب میں غرق۔ دن ہوا و ہوس میں کٹنے لگا اور رات ناؤ نوش میں۔ دن کی روشنی اتنی تیز تھی کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں، رات کا شور اتنا بلند تھا کہ ہر آواز اس میں ڈوب گئی۔ کارواں نے راہ میں ہی رختِ سفر کھول دیا، لوگ شادباد کے ترانے گانے لگے گرچہ منزلِ مراد ابھی بہت دور تھی۔ زندگی نے یہ منظر دیکھا تو زور نکل گئی۔ نہ کسی کو اس کا یارا تھا نہ کسی کو اس کا سراغ۔ یہ قحط الرجال میں اہل زمین کا حال تھا۔ شاعر نے جو یہ حال دیکھا تو نوحہ لکھا ؎

بے دلی اے تماشہ کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی اے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

دل گرفتگی نے کہا: ایسی شادابی اس ویرانی پر قربان جہاں مادرِ ایام کی ساری دخترانِ آلام موجود ہوں، مگر وبائے قحط الرجال نہ ہو۔ اس وبا میں آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ مردم شماری ہو تو بے شمار، مردم شناسی ہو تو نایاب۔ دل کی خاطر مجھے منظور تھی کہ اس کو آزردہ رکھنا کفر ہے۔ اس کی کشادگی کے بہت سے طریق ہیں جو موقع کی مناسبت سے اختیار

کرتا ہوں۔ مجھے یاد آیا کہ دل جوئی کے لیے ایک بادشاہ چھپ کر اپنی پرانی پوستین سر آنکھوں سے لگاتا تھا۔ ہر شخص کے پاس اُس کی پوستین ہوتی ہے مگر اکثر اس سے منکر ہو جاتے ہیں کیونکہ اسے قبول کرنے کے لیے جس جرات کی ضرورت ہوتی ہے اس کی کم یابی قحط الرجال کی پہلی نشانی ہے۔ خود فراموشی کے فریب سے بچنے کے لیے پوستین ہمیشہ سنبھال کر رکھنی چاہیئے اور جب دل تنگ ہو جائے یا سنگ بن جائے تو اس سے کشادگی اور گداختگی مستعار لینی چاہیئے۔ میرے پاس سر و چشم پر رکھنے کے لیے جو چند چیزیں ہیں وہ میں نے ایک بے رنگ آہنی صندوقچی میں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ پرائمری اسکول میں میرا بستہ ہوا کرتا، اب اس سے بہت سے کام لیتا ہوں۔ یہ کبھی سبکتگیں کی پوستین بن جاتی ہے اور کبھی جمشید کا جام جہاں نما۔ اس میں تصویروں، تحریروں اور تمغوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی البم بھی رکھی ہوئی ہے۔

۱۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے، میں مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ والد محترم نے فرمایا کہ آج ایک چینی مسلمان عالم ہمارے گھر آئے گا، مجھے چاہیے کہ اس سے ملوں اور اُس کے آٹوگراف حاصل کر لوں۔ میں نے اسی وقت بازار سے ایک آٹوگراف البم خریدی اُس کی قیمت صرف چھے آنے تھی۔ اس وقت مجھے وہ البم قیمتی لگی اور آج اُسے بیش قیمت سمجھتا ہوں۔ البتہ اُن دنوں وجہ کچھ اور تھی اور اِن دنوں کچھ اور۔ سہ پہر جب میں نے نامانوس خال و خط کے مہمان کے سامنے اُسے پیش کیا اور اس نے چینی زبان میں لکھنا شروع کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ اُس کی سطریں اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہیں۔ حیرت اس وقت دور ہوئی کہ جب یہ سمجھ میں آیا کہ ہر اچھی بات الہامی ہوتی ہے اور الہام نازل ہوا کرتا ہے۔ مسٹر کیہ چن تو دستخط کرنے اور چائے پینے کے بعد رخصت ہو گئے، وہ ایک طویل سفر پر نکلے ہوئے تھے، لیکن ان کے دستخط کی بدولت میں ایک ایسے طویل سفر پر نکل کھڑا ہوا جو آج بھی جاری ہے۔ شروع میں بات آسان لگی کہ کسی بڑے آدمی کے دستخط حاصل کیے جائیں، مگر جوں ہی میں نے دوسرا ورق اُلٹا اور سوچنے لگا کہ اب کس کے آٹوگراف لیے جائیں تو بات ہاتھ سے نکل گئی۔ میں نے والدِ محترم سے رہنمائی چاہی تو ہدایت ملی کہ آٹوگراف البم کے صفحات ہوں کہ زندگی کا ورق سادہ انھیں یونہی نہیں بھرنا چاہیئے۔ جاؤ، نگاہِ انتخاب کو کام میں لاؤ۔ بڑے آدمی زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔ اُن کے تجربے کے لیے کارلائل پڑھو، ان سے ملاقات کے لیے پلوٹارک کے پاس جاؤ، ان کو سمجھنے کے لیے سعدی سے لے کر سیموئل سمائل تک سب کے دروازے پر دستک دو۔ راہ کا نشان اتنا واضح ملا تو سفر شروع ہو گیا۔ پہلی منزل نہ عظیم مصنف تھے نہ ضخیم کتابیں۔ یہ سفر تو بچّوں کی کہانیوں کی چھوٹی سی پگڈنڈی پر شروع ہوا۔ اسکول میں

انعام تقسیم ہوئے تو ایک کتاب جس کا عنوان "بہادر لڑکا" تھا میرے حصے میں آئی۔ یہ ایک ولندیزی بچے کی کہانی تھی جو موسم سرما کی ایک شام سمندری پشتے پر جا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک چھوٹے سے سوراخ پر پڑی۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ گاؤں جا کر اس کی خبر کرے تو اتنی دیر میں پانی کے زور سے شگاف ہو جائے گا اور وہ ساری بستیاں اور سارے کھیت جو سطح سمندر سے نیچے ہیں غرق ہو جائیں گے۔ وہ اس سوراخ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ رات آئی تو اسی حالت میں سو گیا۔ پہلے سردی اور پھر موت سے اس کا جسم اکڑ گیا مگر ننھا سا ہاتھ جوں کا توں پشتے کے سوراخ پر دھرا رہا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ اُن کا محسن ایک بہادر لڑکا ہے۔

میرے سفر کی یہ پہلی منزل تھی، اس کا نقش دوسری منزلوں سے گہرا اور روشن ہے۔ یہ منزل جرات اور قربانی کی منزل تھی۔ نام اس کے بہت سے ہیں مگر وہ نام جس سے اس کی ساری عظمتیں عیاں ہوتی ہیں شہادت کہلاتا ہے۔ بہادر لڑکے کی کہانی بچوں کے لیے تھی اور ایک بچے نے اسے پڑھا تھا۔ وہ بچہ پہلے تو یہ سمجھا کہ جرات کے اظہار کے لیے جو مقامات درکار ہیں وہ صرف دور دراز کے ملکوں میں ہوا کرتے ہیں جیسے ہالینڈ میں سمندر کو روکنے والے پشتے۔ وقت گزرا تو یہ عقدہ کھلا کہ دنیا کا ہر ملک سطح سمندر سے نیچے آباد ہے۔ آبادی اور سمندر کے درمیان پشتے بنے ہوتے ہیں، نئے اور پرانے، پائدار اور ناپائدار۔ ان میں جو پشتے دین اور سیاست کے ریختے اور بدن کے لہو اور قلم کی سیاہی کے آمیختے سے بنے ہوں اور جن کی حفاظت بصیرت اور فکر فردا کے سپرد ہو صرف وہی پشتے مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں۔

بچوں کی کہانیوں سے بات آگے بڑھی تو ان کتابوں تک جا پہنچی جن میں بڑے آدمیوں کا مختصر حال درج ہوتا ہے۔ ان کتابوں میں زیادہ تر اُن لوگوں کا ذکر تھا جن کی ایجاد و دریافت یا تحریر و افکار کو صدقۂ جاریہ کا درجہ حاصل ہو۔ یہ ایک طویل قطار ہے ازل سے ابد کی طرف رواں، جس میں ہر مکان و زماں کے لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو اس بات سے ہرگز کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ یاد رکھے جائیں گے یا بھلا دیے جائیں گے، غرض ہے تو صرف یہ کہ بے ڈھب دنیا کو کیوں کر ڈھب پر لا سکتے ہیں۔ اُن میں سے ہر شخص نے دنیا کو جس حال میں پایا اس سے بہتر حال میں چھوڑا۔ اس گروہ کے افراد مختلف زبانیں بولتے ہیں، مگر کام کے دوران زیر لب یہ سارے ایک ہی مصرعہ گنگناتے ہیں ؎

کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون!

جو لوگ اس گروہ میں شامل ہیں اُنھیں محسنین کہا جاتا ہے۔ اہلِ شہادت اور —— اہلِ احسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ شہید دوسروں کے لیے جان دیتا ہے اور محسن دوسروں

کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ایک سے ممکن وجود میں آتا ہے اور دوسرے سے وجود کو توانائی ملتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہوتا ہے جو اُس توانا وجود کو تابندگی اور حسن بخشتا ہے۔ جو لوگ اس آخری گروہ میں شامل ہوتے ہیں انھیں اہلِ جمال کہتے ہیں۔ اہلِ جمال کی پہچان یہ ہے کہ یہ لوگ مسجد قرطبہ تعمیر بھی کرتے ہیں اور تحریر بھی۔

جہاں یہ تینوں گروہ موجود ہوں وہاں زندگی موت کی دسترس سے محفوظ ہو جاتی ہے اور جس ملک یا عہد کو یہ گروہ میسّر نہ آئیں اُسے موت سے پہلے بھی کئی بار مرنا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ میری تلاش مجھے اہل شہادت، اہلِ احسان اور اہل جمال تک تو لے آئی مگر اس کے لیے سند بھی ہونی چاہیے۔ سند کی دُور دُور تلاش کی مگر وہ شہ رگ سے بھی قریب نکلی " وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جس کو حکمت ملی بے شک اُس کو بڑی نعمت ملی "۔ (۲ : ۲۶۹) اہلِ شہادت کو حکمت ملی تو نقدِ حیات لٹا دیا، اہلِ احسان کو ملی تو خیرِ کثیر بن گئی، اہلِ جمال کو ملی تو وہ دانائے راز ہو گئے!

احسان کی تلاش میں خالق کا ذکر لازم ہو جاتا ہے۔ بحث کا رُخ خدا سے انسان کی جانب ہو یا انسان سے معراج کی طرف اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ خالق نقطۂ آغاز بھی ہے اور نقطۂ انجام بھی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ انسان نے پہلے صفاتِ خداوندی کی فہرست بنائی پھر وہ صفات مستعار لے کر جو متشبہات میں شامل ہیں ایک ایسی مخلوق عالم خیال میں تخلیق کی جو دیومالائی قرار دی گئی۔ بڑے آدمی کو دیومالائی کسوٹی پر پرکھا گیا اور اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا کہ وہ بھی مافوق الفطرت معلوم ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ شعور بیدار ہوا اور لوگوں کا اعتبار ناقابلِ اعتبار قصّے کہانیوں سے بالکل اُٹھ گیا۔ یہ عیاں ہوا کہ انسان احسنِ تقویم بھی ہے اور اشرف المخلوقات بھی، اور اپنی ذات وصفات کے سہارے اس درجے پر بھی فائز ہو جاتا ہے جس کے بارے میں مولانا رومؒ نے کہا ہے ؎

بزیر کنگرہ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

سرِ راہے ایک اہل حق سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مدت سے مفلوج تھے مگر بیماری کے نہ آثار نہ اثرات، دمکتا چہرہ، کھنکتی آواز، طنطنہ ایسا کہ جب ایک ملک کی صدارت کا ذکر آیا اور میں نے پوچھا کہ شکایت کرنے والے اس کے اُمیدوار کیوں نہیں بن جاتے تو اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ بڑی مشکل سے مفلوج پاؤں کے پنجے کو خفیف حرکت دی اور کہنے لگے میں صدارت کو اس پاؤں تلے آنے والی خاک سے کمتر جانتا ہوں اور تم چاہتے ہو کہ اہلِ حق اپنی توجّہ اور توانائی اس راہ میں زائل اور ضائع کر دیں۔ مجھے احساس

ہوا کہ اُن کے پاؤں کی مٹی کحل بصر ہے۔ میں نے اُٹھا کر آنکھوں میں لگائی تو اہل اتقا اور اہلِ اقتدار کا فرق نظر آنے لگا۔ آج اُن کے جلال و ارشاد کی یاد آتی ہے تو بیدل کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے ؎

آخر نہ فقر بر سرِ دنیا زدیم پا
خلقے بجاہ تکیہ زد و ما زدیم پا

بہادر لڑکے کی کہانی سے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کی منزل تک سفر بڑا دلچسپ نکلا۔ یہ سفر بیشتر کتابی تھا اور موضوع کے تنوع اور وسعت کی وجہ سے یہ داستان بہ ہر عنوان پھیلی ہوئی ملی۔ تاریخ، ادب، نفسیات، عمرانیات، سوانح، خاکے، مضمون، شہر آشوب، قصیدے اور ہجو۔ خود نوشت سوانح ہی کا سرمایہ اتنا بڑا ہے کہ اسے پڑھنے کے لیے عمر نوح درکار ہے۔ یہ میسّر بھی ہو تو انتخاب ضروری ہوگا، کیونکہ یہ بات مضر ہے کہ ہر بڑے آدمی کی خود نوشت سرگزشت کو پڑھا جائے۔ رزق ہی نہیں کتابیں بھی ایسی ہوتی ہیں جن کے پڑھنے سے پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے۔

ایتھنز میں ایکروپولس (ACROPOLIS) کی پہاڑی پر سیاحوں کا ایک گروہ کھڑا تھا۔ سب کی نگاہیں منروا کے خوبصورت مندر پر جمی ہوئی تھیں، مگر میں سر جھکائے مندر میں داخلے کے ٹکٹ کی پشت پر لکھی ہوئی عبارت کو بار بار پڑھ رہا تھا۔ یہ پلوٹارک کا قول تھا کہ پیری کلیس اتنا پُر نظر تھا کہ اُس کے عہدِ حکومت میں ملک مالا مال اور لوگ نہال ہو گئے مگر اُس کی ذاتی ملکیت میں پھوٹی کوڑی کا بھی اضافہ نہ ہوا۔ میں نے اس عبارت پر غور کرنے کے بعد جب پارتھے نون (PARTHENON) پر نظر ڈالی تو مجھے عمارت میں اُس کے حسنِ صورت کے ساتھ اس کو بنانے والے کی حسنِ سیرت کی جھلک بھی نظر آئی۔ عمارت کی چھت گر چکی ہے، مگر اُس کے ستون دو ہزار سال سے استادہ ہیں، لغزش سے پیری کلیس خود بھی محفوظ رہا اور اُس کے بنائے ہوئے ستون بھی۔ میں نے وہ ٹکٹ سنبھال لیا اور وطن واپس لے آیا۔ اس بات کو کئی برس گزر چکے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو بھیجوں۔ یک انار و صد بیمار۔

پلوٹارک کے یہاں کتنے ہی بڑے آدمیوں سے ملاقات ہوجاتی ہے: پیری کلیس، جولیس سیزر، ڈیماستھینز، سسرو، کیٹیلائن، کیٹو، پومپئی اور ان سب سے بڑھ کر سکندر جیسے میں نے اس وقت تک سکندرِ اعظم مانا ہی نہ تھا جب تک اس کا حال پلوٹارک کی کتاب میں نہ پڑھا تھا۔ پلوٹارک کے بہت سے ہیرو جنگجو فاتح ہیں، مگر سکندر کی بات بالکل نرالی ہے۔ بچپن میں اُس نے کہا کہ افسوس میرا باپ یوں فتوحات حاصل کرتا رہا تو میرے لئے کوئی بڑا کام باقی نہ رہے گا۔

لڑکپن میں اس نے کہا کہ ڈیماسنھیز نے پہلے مجھے نادان کہا پھر نابالغ، میں ایتھنز کی فصیل پر دستک دوں گا تاکہ اسے میری مردانگی کا اعتبار آجائے۔ اس کی مردانگی کے بارے میں پلوٹارک کہتا ہے کہ سکندر کی عظمت اس کی شجاعت سے کہیں زیادہ اس کی شرافت میں تھی، شجاعت اس نے ایرانی سپاہ کے مقابلے میں دکھائی اور شرافت ایرانی قیدی خواتین کے معاملے میں۔

جولیس سیزر نے جب سکندر کا حال پڑھا تو رونے لگا کہ میری عمر تک سکندر کتنے ہی ملک فتح کر چکا تھا، مگر میرے پاس اس کے مقابل ایک کارنامہ بھی نہیں ہے۔ افراد اور اقوام واقعات سے اپنے ضمیر کے مطابق سبق حاصل کرتے ہیں۔ سکندر اعظم کی سوانح کا ایک استعمال سیزر نے کیا تھا اور دوسرا ہمارے فقیروں نے جو خیرات پر سکندر کی سندیں لاتے ہیں کہ ؎

سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

پلوٹارک کے ساتھ کچھ وقت گزارا تو محرومیوں نے گھیر لیا۔ پہلے آدمی اپنے کردار سے بڑا آدمی بنتا تھا اور ہومر، پلوٹارک اور فردوسی اس کی عظمت کے محافظ بن جاتے تھے۔ اب آدمی عظمت کا گاہک بن کر تعلقات عامہ کے تجارتی اداروں سے شہرت خریدنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مشاہیر تھے اور یہ صرف مشہور، اُن کی شہرت میں قوتِ بازو کو دخل تھا اور اِن کی شہرت میں صرف قوتِ خرید کو!

اہلِ اقتدار کا ذکر ہو تو مجھے بے اختیار "کوبے بیف" یاد آجاتا ہے۔ کوبے جاپان کا مشہور شہر ہے جہاں سے بڑا گوشت سوغات کے طور پر پردساور بھیجا جاتا ہے۔ یہ گوشت اس بیل کا ہوتا ہے جسے پیدا ہونے سے لے کر ذبح کیے جانے تک پینے کے لیے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں دیا جاتا۔ اس کی پرورش بڑے اہتمام سے ہوتی ہے، دودھ چھڑاتے ہیں تو شراب پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ تمام عمر پانی کے بجائے شراب پر پالا جاتا ہے۔ پینے والے اسے رشک سے دیکھتے ہیں اور کھانے والے اسے دیکھ کر منہ میں پانی بھر لاتے ہیں۔ یہ بیل کب تک خیر مناتا، بالآخر ذبح کیا جاتا ہے اور اس کے پارچے لوگوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اہلِ اقتدار کی قسمت بسا اوقات اس بیل کی طرح ہوتی ہے۔ اقتدار کی سرمستی، اختیار کا نشہ، قوت کا غرور اور امتیازات کا سرور اُن کی رگ و پے میں سما جاتا ہے، یہاں تک کہ وقت مقررہ آن لگتا، ان کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور لوگ بوٹیاں نوچ لیتے ہیں۔ اس انجام کی مثال مسولینی کے انجام میں ملتی ہے۔

مسولینی کی یاد یوں آگئی کہ جس سال میں نے آٹوگراف البم خریدی اس سے اگلے برس دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ جنگ میں کشتوں کے پشتے لگ گئے، تاریخ کے صفحات تیزی سے

بکھرنے لگے، آٹو گراف البم کے صفحات یونہی خالی رہ گئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد آزادی آگئی اور اُس کے استقبال سے ذرا فرصت ملی تو میں نے البم کی گرد جھاڑی۔ اب منظر اتنا بدل چکا تھا کہ کوئی نگاہوں میں نہ جچتا تھا۔

جب آزادی ملی تو نقلِ مکانی کا مرحلہ بھی آیا۔ میرا اثاثہ ایک جناح کیپ، سیاہ شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامہ اور یہ آٹو گراف البم تھی۔ جناح کیپ ایک تحریک سے وابستگی کی علامت تھی، سیاہ شیروانی سے میں نے بچپن میں مساوات کا پہلا سبق سیکھا تھا۔ جامے کی تراش میں علی گڑھ کا سارا فیض شامل تھا اور میری البم اس جذبے کی مظہر تھی جو مجھے کشاں کشاں مادرِ درس گاہ سے مادرِ وطن کی طرف لے جا رہا تھا۔ پاکستان سے چھوٹی بڑی کتنی ہی اُمیدیں وابستہ کی تھیں۔ آٹو گراف البم کی رعایت سے میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ کیسا کیسا یکتا و یگانہ سمٹ کر اس ملک میں آگیا ہے اور کیسا کیسا سخنور۔ برصغیر کی وسعتوں میں پھیلا ہوا فیض یہاں قریہ قریہ میں عام ہوگا۔ مجھے یہ اندازہ ہی نہ تھا کہ ان لوگوں کے دن پھر جائیں گے اور دل بدل جائیں گے۔

میں آٹو گراف البم لئے ۲۵ برس سے ایک شخص کا تعاقب کرتا رہا۔ پہلی بار اس لئے ملاقات نہ ہوسکی کہ وہ گھر الاٹ کرانے کے لیے متروکہ جائداد کے دفتر کے باہر قطار میں کھڑے تھے۔ میں نے پانچ سال ان کی آبادکاری کا انتظار کیا اور پھر اُن کے گھر گیا۔ اس بار بھی ملاقات نہ ہوسکی۔ وہ کاروبار میں مصروف تھے۔ پانچ برس اور گزرے میں پھر اُن کے یہاں پہنچا، وہ گھر بدل کر کسی نئی بستی میں جا چکے تھے۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے پنج سالہ منصوبے کے مطابق چوتھی بار ان کے یہاں پہنچا۔ معلوم ہوا وہ دنیا کے دورے پر نکلے ہوئے ہیں۔ میں نہ معاش کی مصروفیتوں کا مخالف ہوں نہ انھیں بڑائی کی راہ کی رکاوٹ سمجھتا ہوں مگر پھر بھی دل میں وسوسے اٹھنے لگے، میں نے انھیں دبادیا اور معاشیات کا سبق پڑھانے بیٹھ گیا۔ حضرت آدم سے ایڈم اسمتھ تک اور اُس وقت سے تا ایں دم دولتِ اقوام اسی طرح چند لوگوں کی سوجھ بوجھ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوگ تو محسنین کی صف میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں۔ ان کی لیاقت کی قدر کرو کہ تمہیں معاشی پستی سے نکال کر کارخانے کی چمنی کی طرح بلند کر دیا ہے۔ دل ایسی باتوں سے کہاں بہلتا تھا مگر میں نے اُسے مزید پانچ سال باتوں میں لگائے رکھا۔ آخر کار پانچویں کوشش بار آور ہوئی۔ وہ شخص مجھے مل گیا، مگر جوئندہ یابندہ کی کہاوت غلط نکلی، وہ ایک نیا شخص تھا۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں حاضری کے لیے وہ تیسرے درجے میں ریل گاڑی سے ایک ہزار میل کا سفر کرنے والا مجھے اپنی کامیابیوں کی فہرست سنا رہا تھا۔ فہرست بڑی طویل تھی، تیسری بیوی، چوتھا کارخانہ، دسواں مقدمہ، بیسویں کمپنی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا، مگر جب اُس نے دوسرے پاسپورٹ کا ذکر کیا تو مجھے سکتہ ہوگیا۔ تاہم میں

نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور آٹوگراف البم کو مضبوطی سے تھام لیا تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خود بخود جیب سے باہر آجائے اور وہ اس پر دستخط کر دیں۔
ایک بار کسی نے اعتراض کیا کہ مسلمان یونہی قحط الرجال کا رونا روتے رہتے ہیں۔ سقوطِ بغداد کے بعد یہ ان کی عادت بن چکی ہے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مہدی آخرالزماں کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر کوئی رہنمائی کرنا چاہے تو غالب کی طرح اُس کے بھی پُرزے اُڑا دیے جاتے ہیں۔ یہ لیڈر کے پیچھے چلنے کے بجائے اُس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ہندوؤں کو دیکھو وہ کتنے فرزانے ہیں، اپنے ہر رہنما کو اوتار اور مہاتما بنا لیتے ہیں۔ ایک مسلمان رہنما نے اس اعتراض کا جواب یوں دیا کہ ہندو کا دیوتا بے حس وحرکت، اُن کی دھرتی ماتا پاتال، اُن کی گاؤ ماتا بے زبان۔ وہ ہر حال میں اپنے لیڈر کو جو انسان ہوتا ہے اُن سے بہتر پاتے ہیں اس لیے بے پایاں عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ مسلمان اپنے رہنما کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار قرنِ اوّل کی یاد آجاتی ہے۔ وہ اسے سنّت کی کسوٹی پر گھستے ہیں تو ملمع اُتر جاتا ہے۔ یہ کوئی نفسیاتی عارضہ یا اجتماعی نقص نہیں بلکہ معیار اور مزاج کا فرق ہے۔ یہ جواب نواب بہادر یار جنگ نے دیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میری آٹوگراف البم میں اُن کے دستخط موجود ہیں۔ میں نے البم اٹھائی اور ورق الٹنے لگا۔

میر عثمان علی خاں کو میں نے بچپن میں پہلی بار اُس وقت دیکھا جب وہ وائسرائے کے ہمراہ علی گڑھ آئے تھے۔ لارڈ ولنگڈن اس سلطنت کا نمائندہ تھا جہاں سُورج غروب نہیں ہوتا تھا اور اس سلطنت کے ساتھ نظام کی ریاست کا ذکر سُورج کو چراغ دکھانے کے مثل ہوگا۔ کسی سے سُنا کہ نظام دنیا کے سب سے متموّل انسان ہیں تو اُن کے ساتھ ہمدردی ہوگئی جو زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ ایک بار جب یہ سنا کہ اُن کی ترکی ٹوپی کے کناروں پر میل جمی رہتی ہے تو دل میں اُن کی طرف سے میل آگیا جو آج تک نہیں گیا، بلکہ جب اُن کے سلوک کو یاد کرتا ہوں جو انھوں نے نواب بہادر یار جنگ سے روا رکھا تو کچھ اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ نظام نہ عظمت رفتہ کا آخری چراغ تھے نہ روشن مستقبل کی پہلی کرن۔ وہ تاریخ کا ایک جگمگاتا ہوا عنوان نہیں بلکہ بُجھا بُجھا نوشتۂ دیوار تھے۔ بہادر یار جنگ کے حرفِ راز کو سُن کر ٹال دیا اور خود حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ اگر وہ اُن کی باتوں پر کان دھرتے تو ممکن ہے ریاست چلی جاتی مگر نام رہ جاتا۔
محمد بہادر خاں کو بہادر یار جنگ کا خطاب جس فرمان شاہی سے ملا تھا وہ رات کے ایک بجے جاری ہوا تھا، اُس کے چند سال بعد جب بہادر یار جنگ کی شہرت کا سورج اوج پر اور خطابت کا سمندر موج پر تھا تو انھیں دو فرمان ملے جن کے عنوان عطا اور سزا تھے۔ بہادر یار جنگ نے سزا والا فرمان وصول کرلیا۔ خطاب اور جاگیر ضبط ہوئی، عزّت اور توقیر اور بڑھی، درجات

کا حال دینے والے کو معلوم ہو گا۔ تعجب اس بات پر ہے کہ سزا کا فرمان بھیجنے والے کو وہ تقریر کیوں یاد نہ آئی جس سے خوش اور متاثر ہو کر خطاب عطا کیا تھا۔ وکٹری پلے گراؤنڈ حیدرآباد دکن میں سیرت کا جلسہ تھا، نظام اچانک آ پہنچے، اُن کی آمد سے ہلچل مچ گئی اور مقرر نے پکارا "اے محمدؐ عربی کے تاج پوش اور تخت نشین غلام آ میں تجھے بتاؤں کہ اس شہنشہ کونین کی نظر میں انداز ملوکیت کیا تھے"۔ بہادر یار جنگ کو ایک بار عہدے کی پیشکش ہوئی تو کہنے لگے "مجھے کرسی وزارت پر بیٹھ کر امور مملکت پر غور کرنے کے لیے نہیں بلکہ کوچہ و بازار میں کر قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے"! میں اس طوفان کی موجوں کو آج بھی اپنے دل میں اٹھتا ہوا محسوس کرتا ہوں جو بہادر یار جنگ کی تقریر سُن کر میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ ایک روز اُن کی تقریر ختم ہوئی تو میں نے اپنی آٹوگراف البم اُن کے سامنے رکھ دی۔ بہادر خاں نے بڑی تیزی سے دستخط کیے اور ۳۰ اگست ۱۹۳۹ء لکھ دیا۔ اس وقت اُن کی عمر ۴۳ برس کی تھی اور مسلم ہند کی تاریخ میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے اُن کے پاس صرف ۵ برس باقی رہ گئے تھے۔ شاید انھیں اس کا احساس تھا اس لیے ہر کام تیزی اور تن دہی سے کیا کرتے تھے۔ تیزی سے لکھا ہوا خط خوش خطی کے زمرے میں نہیں آتا، مگر تن دہی سے کیے ہوئے کام جاوداں اور ہمیشہ جواں ہوتے ہیں۔

میری البم میں ایک دستخط ایسا بھی ہے کہ جو آہستہ آہستہ کیا گیا، مگر اس کے باوجود خوش خط نہیں ہے۔ یہ ایک انگریز ناولسٹ کے دستخط ہیں۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے فوراً بعد علی گڑھ آیا تھا۔ میں اس طویل جنگ کے اثرات اُس کے چہرے پر تلاش کر رہا تھا مگر وہاں نہ ملال تھا نہ اضمحلال، تھوڑی سی مسکراہٹ تھی اور بہت سی فراست۔ اُس کے انداز میں ایک ایسا ٹھہراؤ تھا جیسے غم، غربت اور جہالت کا سایہ کبھی اس کی زندگی پر نہ پڑا ہو۔ ای، ایم، فاسٹر کی عمر اس وقت ۶۶ برس کی تھی، اس کے بائیس برس بعد ۸۸ برس کی عمر میں وہ سخت بیمار ہوا تو "سنڈے آبزرور" نے اس کے ایک بے تکلف اور کم عمر دوست سے تعزیتی مضمون لکھوایا۔ فاسٹر صحت یاب ہو گئے اور تعزیت نامہ لکھنے والا چل بسا۔ یہ مضمون بالآخر ۱۹۷۰ میں شائع ہوا جب فاسٹر نے ۹۱ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ فاسٹر تیس برس کا تھا تو اس کے چار ناول شائع ہو چکے تھے۔ پھر ۴۵ برس کی عمر میں اس کا پانچواں اور اس کی زندگی میں چھپنے والا آخری ناول شائع ہوا۔ اس کے بعد اگلے ۴۵ برس فاسٹر نے ان پانچ ناولوں سے حاصل کی ہوئی دولت اور شہرت کے سہارے بسر کر دیے۔ یہ سوال کئی بار اٹھا کہ اس نے ناول لکھنے کیوں بند کر دیے کوئی اس کا صحیح جواب نہ دے سکا۔ یہ سوال تو ڈرامہ انارکلی کے مصنف کے بارے میں بھی

اٹھتا رہا۔ انار کلی ایک گمنام طالب علم نے لکھی اور اردو کے مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج اس کے بعد ۵۰ برس تک اس پایے کی تحریر پیش نہ کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ لکھنے کی ایک اُمنگ ہوتی ہے، کہیں قطرہ اور کہیں قلزم۔ اس امنگ کی عمر بھی ہوتی ہے، کبھی لمحہ اور کبھی عصر۔ فاسٹر کے ایک مشہور ناول میں برصغیر اپنے سارے مسائل کے ساتھ بکھرا ہوا ہے۔ دفتر میں سیاہی کے چھینٹے، گھر میں پان کے داغ اور سڑک پر گنڈیری کے چھلکے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس ناول میں انگریز افسر کا پرچہ ترکیب بھی درج ہے۔ نسخے میں پبلک اسکول، ایک مشہور یونیورسٹی، مقابلے کا امتحان، صوبے میں تعیناتی، درجہ بدرجہ ترقی، ایک گھوڑے سے گرنا اور ایک بار میعادی بخار میں مبتلا ہونا شامل ہے۔ جو اس بخار سے شفا پا گیا وہ ہمیشہ کے لیے اس بیماری میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ ہم چو ما دیگرے نیست۔ مسلمانوں کی جو تصویر کھینچی ہے، اس میں فاسٹر نے دکھایا ہے کہ ان کا صرف ایک محبوب موضوع ہے اور صرف ایک محبوب مشغلہ! موضوع ہے زوالِ اسلام اور مشغلہ ہے وصالِ یار۔

آخری دنوں میں فاسٹر کی ملازمت بڑی دلچسپ تھی۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ان کو اس بات کی تنخواہ ملتی تھی کہ جب کوئی چاہے اُن کا دروازہ کھٹ کھٹائے اور اُن سے گفتگو کر لے۔ کچھ حیثیت چڑیا گھر کے شیر کی کہ بچے جب چاہیں آکر دیکھ لیں اور کچھ حیثیت سبیل کی تھی کہ پیاسے جب چاہیں آکر پیاس بجھالیں۔ اس ملازمت میں فاسٹر نے ایک بار یہ شکایت کی کہ آج خوش گفتار انسان کم یاب ہیں۔ میں اور ابن حسن برنی ایک دن گل افشانی گفتار کی تلاش میں کراچی کی سڑکوں پر پھرتے رہے اور کئی بار راستہ بھول کر اورنگی ہلز کے پاس اس گھر پر جا پہنچے جس کے باہر ایک تختی پر لکھا تھا "مُلّا واحدی"۔

واحدی صاحب کے یہاں بات سے بات نکلتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اُن کی عمر ۸۰ برس کی ہوگی، بچپن میں بزرگوں کی آنکھیں دیکھیں اور اُن کی باتوں پر کان دھرا اس لیے مُلّا صاحب کی گفتگو سے پوری ایک صدی روشن ہو جاتی ہے۔ گفتگو میں کتنے ہی پیچ کیوں نہ پڑ جائیں اور موضوع کہیں سے کہیں کیوں نہ نکل جائے واحدی صاحب کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوتی۔ مشاہدہ اور مطالعہ ایک طرف حافظہ اور بیان دوسری طرف، سننے والا کبھی اس پر حیران ہوتا ہے کبھی اس پر، نہ حیرت ختم ہوتی ہے اور نہ بات ختم ہونے میں آتی ہے۔ بیان کا انداز یہ ہے کہ بات کا ایک سرا لے کر دائرہ بناتے ہیں پھر دوسرا اس دائرے سے گزار کر گرہ لگاتے ہیں۔ سننے والا بھی بات گرہ میں باندھ لیتا ہے۔

واحدی صاحب سے گفتگو کے دوران میری اور ابن حسن برنی کی کیفیت یکساں تھی مگر نشست کا

انداز مختلف تھا۔ میں باتوں میں محو اور کھویا ہوا تھا اس لیے کرسی پر ڈھیر تھا۔ وہ متوجہ اور چوکس تھے اس لیے مودبانہ بیٹھے رہے۔ انھیں اس طرح بیٹھے دیکھ کر واحدی صاحب کا شجرہ یاد آنے لگا۔ شاہ جہاں کو ہاتھی پر چڑھنے میں یوں تامل ہوا کہ شاہ کی طرف فیل بان کی پشت ہوتی ہے۔ آدابِ شاہی کا یہ حل ڈھونڈا گیا کہ بخارا سے ایک صحیح النسب سید طلب کیے گئے جو سواری کے دوران فیل بان کی پشت سے پشت ملا کر بادشاہ سلامت کے روبرو باادب بالاحظ ہوشیار بیٹھے رہتے تھے۔ یہ عہدہ پیش نشین کہلایا اور عہدے دار کو فوجدار خاں کا خطاب ملا۔ واحدی صاحب آخری فوجدار خاں کی لڑکی کے پڑپوتے ہیں۔ ہاتھی چلتا تو بادشاہ کی نظر آگے پڑتی اور پیش نشین کی نظریں پیچھے لگی رہتیں۔ واحدی صاحب کو ماضی کی طرف منہ کرکے دیکھنے اور لکھنے کی عادت شاید ورثے میں ملی ہے۔

واحدی صاحب کو جب میں نے آٹوگراف البم دی تو انھوں نے پلٹ کر چند دستخط دیکھے، ایک کو شناخت نہ کرسکے تو مجھ سے پوچھا کس کے دستخط ہیں۔ میں نے کہا میں اس شخص کے دستخط شناخت کرسکتا ہوں مگر اس کے ارادے اور نیت کی پرکھ نہیں رکھتا۔ یہ دستخط روس کے وزیر اعظم کوسیگن کے تھے۔ واحدی صاحب نے اپنے دستخط کیے اور یوں نصیحت لکھی "بولنے، لکھنے اور ہر کام کرنے میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس سے دین یا دنیا کا کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں" دنیا سے مراد اپنی دنیا نہیں دوسروں کی دنیا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ کیا میری البم میں کسی ایسے شخص کے دستخط بھی ہیں جس کی زندگی اس نصیحت کا عملی نمونہ ہو۔

میں نے ورق الٹے اور ایک شاعر کے دستخطوں پر پہنچ کر ٹھہر گیا۔ یہ شخص بھی عجیب ہے، چار بار جیل ہوئی، گیارہ حج کیے اور تیرہ دیوان شاعری کے مرتب کیے، نہ سیاسی ہنگاموں کا حساب ہے نہ ادبی جلسوں کا شمار۔ ملک کے لیے آزادی مانگی تو کالج سے نکالے اور حوالات میں داخل کیے گئے۔ کتب خانہ اردوئے معلیٰ ضبط ہوا۔ نایاب قلمی نسخے پولیس ٹھیلوں پر لاد کر لے گئی، مسودات ان کے سامنے جلا دیے گئے۔

ایک بار گرفتاری کا یہ منظر تھا کہ یہ جلسہ گاہ میں زمین پر منہ کے بل گرے ہوئے تھے۔ پولیس کے کچھ سپاہی مار رہے تھے اور کچھ اٹھا رہے تھے۔ کچھ بن نہ پڑا تو زمین پر اگی ہوئی گھاس کو پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر میں پولیس کی لاری پر یوں لادے گئے جیسے سامان لادا جاتا ہے۔ زبان پر انقلاب زندہ باد کا نعرہ تھا اور دونوں مٹھیوں میں گھاس۔ وہ فرنگ کے دبدبے کو پرِ کاہ کے برابر بھی نہ سمجھتے تھے جیل میں قید تنہائی ملی، سال بھر ہر روز ایک من آٹا پیسا، ہتھیلیاں زخمی ہوگئیں مگر نازک خیالی اور مضمون آفرینی نہ گئی۔ کہتے ہیں ؎

مایۂ عشرت بے حد ہے غمِ قیدِ وفا
میں شناسا ہی کبھی نہیں رنجِ گرفتاری کا
کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرتؔ
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

ایک دن میں کسی سلسلے میں علی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں مولانا حسرت موہانی تشریف رکھتے تھے۔ ٹین کا سوٹ کیس، میلی دری میں لپٹا ہوا تکیہ دونوں چیزیں رسّی سے بندھی ہوئی تھیں اور ایک گرہ لوٹے کو لگی ہوئی تھی۔ جی چاہا یہ سامان اٹھانے کی سعادت حاصل کروں مگر میں سوچتا ہی رہ گیا اور وہ ہاتھ جو جیل میں چکّی پیستے تھے انہی ہاتھوں نے وہ سامان اٹھالیا۔ بھرے بھرے بھدّے ہاتھ جن میں کل رات ایک باریک نب والا قلم پکڑ کر اس باغی صفت، صوفی منش رئیس المتغزلین نے میری آٹوگراف البم میں لکھا تھا، فقیر حسرت موہانی ۲ دسمبر ۱۹۴۳ء۔ فقیر کے نقطے نہیں اور موہانی تو حسرت شوشے دار نصف دائرہ اور ایک ٹیڑھی لکیر ہے۔ نقطے نہ سہی وہ شخص نکتہ سنج تو تھا، لکیر سیدھی نہ سہی وہ خود ساری عمر صراطِ مستقیم پر چلتا رہا، دستخط بدخط سہی، وہ شاعر تو خوش نوا تھا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ فقیر لکھا اور یہ بات برحق ہے ؎

اک طرفہ تماشا تھی حسرتؔ کی طبیعت بھی

وہ طرفہ تماشا جس کی بدولت چکّی کی مصیبت کے ساتھ مشقِ سخن جاری تھی حسرت کے ایک ہم مشرب اور ہم عصر کے حصّے بھی آئی۔ دونوں کے مشغلے اور مصائب یکساں تھے۔ انگریز سے نفرت اور اس کی پاداش میں نظربندی، آزادی کا مطالبہ اور اس کے جواب میں جیل، دین کا بار بار ذکر لہٰذا جائداد قرق، اور جب اس احوال کو نظم کیا تو شعر بھی ضبط ہو گیا، جائداد، پریس اور اخبار جب قرق ہوئے تو مولانا ظفر علی خاں نے کہا ؎

میری روزی نہ کی قرق اس نے میری سرکشی پر بھی
خداوندانِ لندن سے مرا پروردگار اچھا

ظفر علی خاں کا زمیندار اخبار میں نے بہت کم پڑھا ہے۔ جب اس اخبار کا شہرہ تھا میں اس وقت اتنی مسافت پر رہتا تھا کہ یہ اخبار دوسرے یا تیسرے دن پہنچتا تھا۔ روزے آپ قضا کر سکتے ہیں، مگر روزنامے کے قضا کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اور یوں بھی ترکیوں کر ہو جب روزنامہ محض پہلے دن اخبار کہلاتا ہے اور دوسرے دن سے ردّی شمار ہوتا ہے۔ ہمارا واسطہ البتہ برسوں ایسے اخبارات سے بھی رہا ہے جو روزِ اشاعت ہی سے دوسرے تیسرے دن کے اخبار

معلوم ہوتے ہیں۔ زمیندار اخبار جب بند ہوا تو اس کا بورڈ اتار کر عمارت پر زمیندار ہوٹل کا بورڈ لگا دیا گیا۔ میں نے پہلی بار نیا بورڈ دیکھا تو مجھے زمیندار کے ادارتی عملے کے بہت سے نام یاد آنے لگے، علامہ نیاز فتح پوری، وحیدالدین سلیم پانی پتی، عبداللہ العمادی، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت۔ ان لوگوں کی جگہ ہوٹل کے بیروں اور خانساموں نے لے لی۔ مولانا ظفر علی خاں کے لیے کبھی کوئی بہتر انتظام نہ ہو سکا اور وہ مولانا اختر علی خاں کے حصے آئی۔ بعض نسلیں اپنے اسلاف کے ساتھ بڑا سنگین مذاق کرتی ہیں۔

میں نے ۲۸ اگست ۱۹۴۰ء کو مولانا ظفر علی خاں کے آٹوگراف حاصل کیے تو اس کی وجوہات بڑی سادہ سی تھیں۔ مجھے یاد تھا کہ ایک بار اُن کی دور طالب علمی کی تقریر سُن کر سرسید نے انھیں گلے لگایا تھا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے پیرانہ سالی میں اس نوجوان کا قصیدہ لکھا تھا۔ ۱۹۰۶ میں ظفر علی خاں نے اس اجلاس سے خطاب کیا جس میں مسلم لیگ قائم ہوئی اور ۱۹۴۰ میں اس جلسے سے خطاب کیا جس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔ ظفر علی خاں نے البم کو جوڑے رُخ پر موڑا اور لکھا: "بجز اللہ اور کسی قوت سے نہ ڈرو"۔ میں نے البم لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر مولانا نے اُسے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔ مجھے اُن کے دستخط مطلوب نہ تھے مگر انھوں نے انگریزی میں دستخط کیے۔ اور لکھا

Hope, Endeavour Truth

مجھے آج تک اس مشہور آدمی کا کوئی پتہ نہیں اور نہ ہی میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ قدرت جو دانے دانے پر مہر لگاتی ہے صفحے صفحے پر دستخط بھی تو ثبت کرتی ہو گی۔

مولانا ظفر علی خاں کی تقریر سے متاثر ہو کر کسی سے تعریف کی تو رائے ملی کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو بھی سنو۔ میں نے بہت کوشش کی، مگر قسمت نے یاوری نہ کی۔ اوائل ملازمت میں ایک بار کراچی کے جہانگیر پارک بھی گیا مگر جلسہ منسوخ ہو گیا اور شاہ جی پکڑے گئے۔ مجھے محرومی کا احساس ہونے لگا۔ اب شاہ جی کے بولنے اور ہمارے سننے کے دن ختم ہو رہے تھے۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور اُن کی تقریریں کچھ قانونِ وقت نے روک دیں کچھ قانونِ قدرت نے۔ یہاں کبھی پیشہ ورانہ آداب اور ضابطے اشتیاق کی راہ میں حائل ہونے لگے تھے۔ آج تقریر نہ سُنی تو کل کیسے سُن سکیں گے۔ جب آپ اس نظام کا حصہ ہوں گے جس کا تقاضا یہ ہو گا کہ کسی کی تقریر نہ ہو سکے۔ تقریر کا جواب تقریر سے دینے میں محنت صرف ہوتی ہے اور یہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ گول باغ اور موچی گیٹ میں پانی چھوڑ دیں۔

شاہ جی کی تقریر سے محروم رہا تو تقریب بہر ملاقات نکال لی۔ جب ملاقات ہوئی تو گھنٹوں جاری رہی۔ میں نے اُن سے تیکھے سوال بھی کیے۔ دو سوالوں کا جواب تفصیل سے ملا۔ مگر تیسرے سوال پر وہ خاموش ہو گئے۔ میرا تیسرا سوال یہ تھا کہ اگر قیامت کے دن پوچھا گیا کہ اے وہ شخص جسے چالیس کروڑ افراد پر بیان و کلام کی فوقیت حاصل رہی اس خطابت کا حساب پیش کرو تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟ شاہ جی کی خاموشی میں افسردگی شامل تھی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور آٹوگراف سامنے رکھ دی۔ شاہ جی نے اسے پہلو پر رکھا اور لکھا ؎

وہ اٹھتا ہوا اک دھواں اوّل اوّل
وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر
قیامت کا طوفان، صحرا میں اوّل
غبارِ رہِ کارواں آخر آخر۔

دو تین برس بعد میں اور منشی عبدالرحمان خاں اُن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ شاہ جی زندہ تھے تو سامعین کو کبھی بنجر زمین کبھی صحرا اور کبھی قبریں کہہ کر پکارتے۔ آج ہم اُن کے سرہانے کھڑے تھے، قبر سے آواز آئی اس روز تمہارے تیسرے سوال کا جواب نہ دے سکا تھا تو آج سنو الفاظ اقبال کے ہیں اور داستان میری ؎

گرمی آوازِ من کارے نہ کرد

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کی عمر فرنگی سے لڑتے گزر گئی۔ ہمارے ایک رہنما نے جن کی خدمات مسلّم ہیں ان سے تمام عمر دوستی رکھی اور اس بات پر ہمیشہ ناز کیا کہ اپنی طویل پبلک لائف میں انھیں بکنگھم پیلس میں چار شاہی پشتوں کے ساتھ ڈنر کھانے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کا ذکر بڑے مزے لے لے کر انھوں نے اپنی سوانح عمری میں کیا ہے۔ یہ چار پشتیں جارج پنجم، ایڈورڈ ہشتم، جارج ششم اور ایلزبتھ دوم پر مشتمل ہیں۔ اگر خاندانِ شاہی کو چند مسز سمپسن اور میسّر آجاتیں تو ممکن ہے ہمارے رہنما کا سابقہ سات پشتوں سے پڑ جاتا۔ ایلزبتھ دوم سے ایک بار تنہا ملاقات ہوئی، آٹوگراف کے لیے یہ بڑا موزوں موقع تھا، مگر برصغیر کی ساری تاریخ آنکھوں کے سامنے پھر گئی اور میں نے آٹوگراف البم کو جیب ہی میں رہنے دیا۔ مجھے تاجِ برطانیہ کے وارث کے دستخط درکار نہ تھے لیکن حالات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ جب میں چلنے لگا تو ملکہ نے مجھے اپنی ایک تصویر تحفے میں دی جس پر اُن کے دستخط ثبت تھے!

تاجِ برطانیہ کے زیرِ سایہ برصغیر میں تقریباً چھ سو ریاستیں تھیں۔ میں نے کئی والیانِ ریاست

کو دیکھا ہے مگر دستخط صرف ایک نواب اور ایک راجہ کے لیے ہیں۔ نواب بھوپال کے تھے اور راجہ محمود آباد کے۔ نواب بھوپال علیگ تھے' ایک دن یونین ہال میں طالب علمی کے دور کی یاد آ گئی۔ جب تقریر کے آخری حصے پڑھنے تو کہنے لگے: صاحب صدر! آپ کا ہاتھ میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کی طرف بڑھ رہا ہے' اس کے بجتے ہی مقرر کو تقریر ختم کرنی پڑتی ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ اسے بجا نہ دیں، کیونکہ بعد میں گھنٹی کی آواز نہیں محض اشارے سے سمجھ جاتا ہوں کہ میرا وقت ختم ہو گیا ہے۔ نواب صاحب نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اس بات کا اشارہ سمجھا کہ بساط اُلٹ گئی ہے، اُن کی تقریر کا وقت ختم ہو چکا ہے اور گھنٹی بجنے والی ہے۔ وہ خود ہی خاموشی سے سیاسی اسٹیج سے اُتر آئے۔ واحسرتا وہ لوگ جن کے اقتدار کی رونق ہمیشہ ایک ہنگامے پہ موقوف ہوتی ہے، حصولِ اقتدار کی کشمکش، وصلِ اقتدار کا جشن، شکست اقتدار کا ہنگامہ۔ ایسے لوگ تاریخ سے ناواقف ہوتے ہیں اور شاید انہی کی وجہ سے تاریخ کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ تاریخ انسان کے جرائم، حماقتوں اور بدقسمتی کی فہرست کا نام ہے۔ ایک مشہور مورخ ایسا بھی ہے جو تاریخ میں اس شاعری کو تلاش کرتا ہے جو خدا کو پہچاننے میں مدد دیتی ہے۔ اس مورخ کے مطالعۂ تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ کی اکائی بادشاہ، سلطنت یا ملک نہیں بلکہ تہذیب اور معاشرہ ہوتا ہے۔ انسان کی ساری تاریخ اٹھائیس تہذیبوں پر مشتمل ہے جن میں سے اٹھارہ فنا ہو چکی ہیں، نو زوال پذیر ہیں اور تنہا تہذیب مغرب ترقی پذیر ہے، مگر اس کا مستقبل بھی دوسری تہذیبوں سے مختلف نہ ہوگا۔ بس اتنی سی بات تھی جسے آرنلڈ جے۔ ٹائن بی نے افسانہ بنا کر ہزارہا صفحات، تیرہ ابواب، دس جلدوں اور زندگی کے تینتیس سالوں پر پھیلا دیا۔

جب میں ٹائن بی سے ملتان میں ملا تو اُس کی علمیت کے ساتھ اس کی فروتنی اور انکساری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں دیر تک ان سے گفتگو کرتا رہا، چلنے سے پہلے میں نے انھیں آٹوگراف البم پیش کی۔ ٹائن بی نے قلم کھولا، دستخط کیے، عیسوی سن اور تاریخ لکھی، سر اُٹھایا اور مسکرا کر کہا: آپ ابھی اسلام کے مستقبل پر گفتگو کر رہے تھے، بتایئے آج ہجری سن اور تاریخ کیا ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ ٹائن بی نے ۲۹ فروری ۱۹۶۰ عیسوی کے مطابق ہجری تاریخ درج کر دی۔ اس کا اشارہ واضح تھا، اسلام کی تاریخ ایسے لوگ کہاں بنا سکتے ہیں جنھیں تاریخ تک یاد نہ ہو۔ چلتے ہوئے ٹائن بی نے کہا: جب آپ لندن آئیں تو مجھ سے ملنا نہ بھولیے گا۔ میں نے انھیں دوسری بار واشنگٹن میں تقریر کرتے سنا۔ میرے اور ان کے درمیان ایک ہزار کا اجتماع حائل تھا۔ میں نے اُن تک پہنچنے کی کوشش ہی نہ کی۔ جب بھی جی چاہتا ہے کہ ان سے ملاقات

کہ دوں تو میں "مطالعۂ تاریخ" کی جلدیں اٹھا لیتا ہوں یا اپنی آٹوگراف البم۔

ٹائن بی تو ایک تاریخ داں ہے میری البم میں تو ایک عہد ساز ہستی کے دستخط بھی ہیں۔ میں نے اس دستخط کی تلاش میں چند ورق اُلٹے، دو بادشاہ، ایک ملکہ، دو شاعر، دو قانون داں، ایک اچھوت، اور ایک دیوی کے نام گزرنے کے بعد وہ دستخط مل گئے جو میری آٹوگراف البم ہی میں نہیں بلکہ جریدۂ عالم پر بھی ثبت ہیں۔ یہ دستخط قائداعظم کے ہیں۔

قائداعظم اس دہائی میں پیدا ہوئے جو ۱۸۷۰ء سے شروع ہوئی۔ وہ دس برس بھی کیا منتخب سال تھے کہ اگر دوسرے ملکوں میں چرچل، لینن اور اسٹالن پیدا ہوئے تو برصغیر میں قائداعظم، علامہ اقبال، محمدؐ علی جوہر اور ظفر علی خاں بھی انہی سالوں میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد برصغیر میں نہ جانے مسلمانوں پر کیا اُفتاد پڑی کہ نہ دیوانے پیدا ہوئے اور نہ فرزانے، ہمارے حصّے تو بس ایک ہجوم آیا، سرگشتہ اور برگشتہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے بڑے آدمیوں کی پیدائش کا ایک اصول بنا رکھا ہے۔ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیئے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔ عطا تو اسی کے حق میں ہوتی ہے جو حق دار ہو۔ آخر قدرت ایک سپاس ناآشنا قوم کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے، اُسے اپنے عطیے کی بے قدری اور رسوائی ناگوار گزرتی ہوگی۔ عطا کا پہلا حق یہ ہے کہ انسان اُس کا شکر ادا کرے۔ دل شکر سے لبریز ہو تو روشن ہو جاتا ہے شکوہ کرے تو بجھ جاتا ہے، ناشکر گزار ہو تو پتھر ہو جاتا ہے۔ ناشکر گزاری کا نتیجہ بے ہنری کی صورت میں سامنے آتا ہے اور جہاں ناشکر گزار اور بے ہنر جمع ہو جائیں وہاں صرف منافقت ہی پھلتی پھولتی ہے۔ اگر دل شکر کی طرف نہیں آتا، دماغ ہنر کی طرف نہیں جاتا اور زبان حق کی طرف مائل نہیں ہوتی تو انسان انسان نہیں رہتا بلکہ دشت و صحرا میں بدل جاتا ہے۔ جب چاروں طرف بے کراں دشت آدم زاد کی شکل میں پھیلے ہوں تو اس صورت کو قحط الرجال کہتے ہیں۔ میں اس بے کراں دشت میں ایک ہاتھ پر چراغ اور دوسرے پر اپنی آٹوگراف البم رکھے ہوئے یہ شعر پڑھ رہا ہوں ؎

گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

احترام ادب و ادیب ——— کراچی ——— ۲۰ جنوری ۱۹۷۲ء



حکیم محمد سعید، جناب حاتم اے علوی ۔ جناب سیّد ہاشم رضا



جناب سید ہاشم رضا (مقرر) حکیم محمد سعید



جناب حاتم اے علوی
صدرِ مجلس



(دائیں سے) جناب حاتم اے علوی، حکیم محمد سعید اور جناب سید ہاشم رضا

احترامِ اَدب و اَدیب

مقالہ : جناب محترم سیّد ہاشم رضا
کلماتِ صدارت : حکیم محمّد سعید

شامِ ہمدرد، کراچی
۲۰-جنوری ۱۹۷۲ء

جناب محترم سیّد ہاشم رضا

عجیب دَور ہے یہ دورِ ارتقا اے دوست
ہر ایک کی قدر بڑھی، قدرِ آدمی نہ رہی

میرے دوست حکیم محمّد سعید صاحب نے سالِ رواں کے شامِ ہمدرد کے مقرّروں کے لیے جو ۲۴ موضوع تجویز کیے ہیں اُن کے انتخاب کی قدرِ مشترک قدرِ آدمی معلوم ہوتی ہے۔ انقلابِ زمانہ اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ جسے پیدا کرنے والا اشرف المخلوقات کہے، جسے تسخیرِ کائنات کا حکم دیا جائے، جس کے کاندھوں پر وہ بار ڈالا جائے جس کے قابل فرشتے نہ سمجھے گئے، وہ اس دور میں جسے سب 'اٹامک ایج' کہتے ہیں ایک ذرّے کے مقابلے میں ہیچ سمجھا جائے۔ جس وقت گزشتہ جنگِ عظیم اپنے عروج پر پہنچی اُس وقت ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایسے دھماکے ہوئے جن سے ذہنِ انسانی لرز اٹھا۔ وہ مرد، عورتیں اور بچّے خوش نصیب سمجھے گئے جو ایٹم بم کی وجہ سے موت کی آغوش میں پہنچ گئے، وہ لوگ جو موت سے بچے آج تک زندہ درگور ہیں۔

ادب اور سائنس کی چشمک صدیوں سے چلی آتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ادب کی قدر برائے ادب ہوتی تھی، پھر نظریے بدلے اور ادب برائے زندگی کی مانگ بڑھنے لگی اور اب مادی ترقی کے حامی ادب سے رشتہ توڑ کر سائنس اور ٹیکنالوجی سے زندگی کے تمام رشتے جوڑنا چاہتے ہیں۔ اس کشمکش میں ہم اہلِ پاکستان بھی مبتلا ہیں۔ بیس برس سے اہلِ وطن کا یہ حال ہے کہ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہ رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہم منزل کے راستے سے ہٹ کر دوراہے پر پہنچ گئے ہیں۔ جس زمانے میں ہم اپنے راہبر قائدِ اعظم محمّد علی جناح کے سایۂ عاطفت میں بڑھ رہے تھے اس وقت ہمیں اپنی منزل کا پتہ تھا اور ہم شانہ بشانہ اُس کی جانب بڑھتے گئے۔ اس عزم اور یقین کے راستے میں ہمیں بے مثال سیاسی قائد ملے جنھوں نے ہمارے ذہنوں کی رہبری کی اور یکتائے روزگار ادیب اور شاعر ملے جنھوں نے ہمارے لہو کو گرمایا۔

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کا دن ہمارے لیے فخر و مباہات کا دن تھا۔ اُس دن ہمیں اپنی

جد وجہد کا صلہ ملا، اس جد وجہد میں ہماری تنظیم، یکجہتی اور یقینِ کامل نے تلوار کا کام کیا۔ ہم نے بیک وقت انگریزی سامراج اور ہندو رام راج سے ٹکرلی اور فتح مبین کے قابل ٹھہرائے گئے۔ چار برس کے قلیل عرصے میں ہمیں اقوامِ عالم میں ایک مقتدر جگہ ملی، ہم دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کی پانچویں مملکت ٹھہرائے گئے۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے قتلِ ناگہانی نے ہماری ترقی کا رُخ بدل دیا اور بامِ عروج کے بجائے ہم قعرِ مذلت کی جانب بڑھتے گئے۔ آخر کار ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وہ سانحۂ عظیم رونما ہوا جس نے ہماری مملکت، ہماری استقامت اور ہماری ساکھ کو پارہ پارہ کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر کے مسلمانوں نے بے تیغ لڑ کر جو ملک حاصل کیا تھا ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے مسلمانوں نے فوج اور ہتھیار سمیت اسی ملک کا بیشتر حصہ کھو دیا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان میں ہمیں اپنی شکست کا اعتراف کیوں کرنا پڑا، ہتھیار کیوں ڈالنے پڑے اور ۱۷ دسمبر کی شام کو ہمیں مغربی پاکستان کے محاذ پر ہندستان کی سیز فائر کی تجویز کیوں ماننا پڑی؟ ان معاملات کی چھان بین کے لیے حکومت نے حمود الرحمٰن کمیشن مقرر کیا ہے؛ یہ کمیشن اپنی رپورٹ مارچ میں پیش کرے گا۔ ہمارے ذہنوں کے انتشار کو دیکھتے ہوئے تین مہینے کا عرصہ بہت طویل اور صبر آزما ہے۔ ہمارے لیے تو الانتظار اشدّ من الموت والا معاملہ ہے۔

لیکن اس انقلاب کا پس منظر صرف ایک برس کے واقعات نہیں بلکہ بیس برس کی سیاسی اور اخلاقی پستی ہے جس میں ہم سب وقتاً فوقتاً گرتے گئے۔ ہم نے ان قدروں کو فراموش کر دیا جن کے لیے ہم نے برصغیر میں مشرق اور مغرب کو ملا کر ایک ملک قائم کیا تھا۔ ہم صوبہ پرستی، زرپرستی، جاہ طلبی، جلبِ منفعت اور خوشامد کی دلدل میں پھنس گئے جس سے نکلنے کے لیے ہمیں ایک مرتبہ پھر سیاسی اور اخلاقی جد وجہد کرنی پڑے گی۔ اس جد وجہد میں ہمیں احترامِ احکامِ الٰہی، احترامِ رسولِ مقبولؐ، احترامِ کتاب وقلم، احترامِ علم وعمل، احترامِ قانون وعدل، احترامِ تعلیم، احترامِ کسان اور احترامِ مزدور کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں احترامِ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ احترامِ ادب وادیب کی بھی ضرورت ہے، اس تلخ نوائی کے بعد میں آج کے موضوع کی طرف آتا ہوں۔

(احترامِ ادب وادیب)

ادب میں نظم ونثر کا وہ سرمایہ شامل ہے جس کا امتیاز حُسنِ بیان ہو۔ ادیب کے لغوی معنی ہیں علم اور تہذیب سکھانے والا، نظم اور نثر کا ماہر، انشا پرداز اور معلم۔

مہذّب قوموں میں ادیب کا مقام بہت بلند ہوتا ہے اور ایک ادیب ایک فرمانروا کو مشورہ دے سکتا ہے۔ یونان کے ایک امیر MAECENAS کا خیال تھا کہ شاعر معاشرے کی سب سے بڑی خدمت کرتا ہے لیکن اسی یونان کے ایک مقتدر مفکر پلاٹو نے اپنی ریپبلک سے شاعروں کو یک قلم ملک بدر کردیا۔ یورپ اور انگلستان میں جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کا طوطی بولتا ہے وہاں اب بھی ادیب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ میتھو آرنلڈ کا قول ہے کہ جمادات اور نباتات، پانی اور ہوا کی ماہیت سائنس دانوں نے معلوم کی، لیکن ان چیزوں سے انسانی زندگی کا تعلق شاعر نے بتایا۔ پروفیسر جی۔ ایچ۔ ہارڈی نے، جو کیمبرج یونیورسٹی میں ریاضی کے ایک مشہور اُستاد تھے اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر شاعر ہاسمان (HOUSMAN) سے پوچھا جاتا کہ وہ لارڈ سائمن، مشہور وزیر اور قانون داں، یا لارڈ بروک، مشہور وزیر اور صحافی ہونا چاہیں گے تو وہ انکار کرتے، کیوں کہ اُن کی تمنا یہ تھی کہ وہ تاریخ کے صفحات پر اپنی شاعری کے ذریعہ سے ایک دائمی نقش چھوڑیں اور لارڈ سائمن یا لارڈ بیور بروک کی طرح بیس برس کے بعد بھلا نہ دیے جائیں۔ آپ نے اگر ویسٹ منسٹرابے کی گائڈ بک دیکھی ہوگی جس میں انگلستان کے مشہور ترین آدمیوں کے نام شامل ہیں تو یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اس فہرست میں انگلستان کے وزرائے اعظم سے پہلے انگلستان کے شعراء کے نام دیے گئے ہیں۔ ہمارے قائدِ اعظم نے، جن کا شمار ہندستان کے چوٹی کے بیرسٹروں میں ہوتا تھا اور جن کی تقریر اور تحریر کا لوہا دشمن بھی مانتے تھے، ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کے دن پنجاب یونیورسٹی ہال میں یومِ اقبال کے ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا، "اگر میں ہندستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتے ہوئے دیکھنے کے لیے زندہ رہا اور مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ تم اسلامی حکومت کے رئیسِ اعلا بننا چاہتے ہو یا علامہ اقبال جیسے مفکر و مصنّف تو میں اقبال کی تصنیفات کو مملکت کی صدارت پر ترجیح دوں گا۔" اہلِ سیف اور اہلِ قلم کی چشمک ہر دور میں نمایاں ہوتی ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اہلِ سیف کے کارنامے بھی اہلِ قلم ہی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچتے ہیں۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کو اپنے پیشۂ آبا سپہ گری پر فخر تھا اور وہ اپنی شاعری کو ذریعۂ عزّت نہیں سمجھتے تھے، لیکن آج مرزا غالب کا شہرہ تمام تر اُن کی شاعری کی وجہ سے ہے۔ ۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی سوسالہ برسی دنیا کے بڑے بڑے ملکوں میں منائی گئی۔ جتنی عُسرت میں اُن کی زندگی بسر ہوئی اُتنی ہی دریادلی سے حکومتوں اور اداروں نے اُن کی یاد میں پبلک ہال اور لائبریریاں قائم کیں۔ اپنی زندگی میں مرزا غالب اپنی ناقدری کا شکوہ کرتے رہے لیکن اس اعتماد کے ساتھ کہ ایک دن

گفتۂ غالب کی شہرت عام ہوگی اور اُن کے سر پر بقائے دوام کا تاج رکھا جائے گا ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

علامہ اقبال نے اسرارِ خودی میں بالکل یہی بات کہی،

ع من نوائے شاعرِ فردا ستم

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست یوسفِ من بہر ایں بازار نیست
نغمۂ من از جہانِ دیگر است
این جرس را کاروانِ دیگر است

انگریزی کی ایک مثل ہے۔

Poetry and poverty are close neighbours

یعنی تنگ دستی اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے؛
جو لوگ اقتدار کے خواہاں ہیں جاہ و جلال کے متلاشی ہیں، دولت و ثروت کے دل دادہ ہیں انھیں ادب کے کوچے میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیئے۔ ہمارے بیشتر ادیبوں کی زندگی پر فانی بدایونی کا یہ تبصرہ صادق آتا ہے: ؎

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

داغ دہلوی جیسے خوش نصیب شاعر بہت کم گزرے ہیں جنھیں عزت بھی ملی اور دولت بھی، جب دلی اور لکھنؤ میں دیارِ غیر کے تاجر حاکم بن گئے اور ان مرکزوں سے جہاں اُردو پروان چڑھی تھی انگریزی اور ہندی کا چرچا ہونے لگا تو اُردو کے کچھ ادیبوں نے رام پور اور حیدرآباد کے فرماں رواؤں کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی۔ نواب رام پور نے جن کا نظام تخلص تھا ایک رسالے میں ایک شاعر کی نظم پڑھی جس نے شکوۂ روزگار کیا تھا۔ نظم کا آخری مصرع یہ تھا:

(ع اے موت جلد آ کہ کوئی قدرداں نہیں)

نواب رام پور نے یہ نظم پڑھ کر اس شاعر کو رام پور آنے کی دعوت دی اور اُن کے خط کا آخری جُملہ یہ تھا:

ع (اے دوست جلد آ کہ ترے قدرداں ہیں ہم)

میر ببر علی انیس اس معاملے میں بڑے ہی خوش نصیب تھے۔ اُن کی زندگی ہی میں اُن کے کمال

شہرہ برصغیر کے گوشے گوشے میں جہاں جہاں اُردو کا راج تھا پھیلا۔ وہ ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۷ ہجری میں فیض آباد میں پیدا ہوئے، اُن کے والد میر خلیق نے ترکِ وطن کر کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی اور اس طرح انیسؔ کا عہدِ جوانی لکھنؤ میں گزرا۔ فنِ شعر کے علاوہ انھوں نے فنونِ سپہ گری آلاتِ حرب کے استعمال اور اسپ رانی میں مہارت حاصل کی۔ عظیم آباد، حیدر آباد دکن، بنارس اور الہ آباد کے سخن دانوں نے انھیں بہ اصرار اپنے شہروں میں بُلایا اور جب وہ وہاں پہنچے تو انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دکن میں نواب تہوّر جنگ جیسے امیر اُن کی کفش برداری کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اُن کی مجالس میں اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ شرکت سے محروم رہ جاتے تھے۔ اُن کی زندگی میں مرزا دبیر مرثیہ گوئی میں اُن کے مدِّمقابل تھے، لیکن مرثیہ پڑھنے میں اُن کا کوئی حریف نہ تھا۔ جب وہ اشاروں اور کنایوں سے، ہاتھ اور ابرو کی جنبش سے، اپنی بلند جبین اور اپنی عقابی آنکھوں سے اپنے مطالب کو ادا کرتے تھے تو اہلِ مجلس کے سامنے وہ مناظر گھومنے لگتے تھے جنھیں میر انیسؔ کا قلم صفحۂ قرطاس پر پھیلاتا تھا۔ اُن کا انتقال ۲۹ شوال ۱۲۹۱ ھجری کے دن ہوا۔ اودھ اخبار میں اُن کے انتقال اور تجہیز و تکفین کی خبر اسی طرح چھپی جیسے کہ بادشاہوں کے مرنے کا ذکر ہوتا ہے۔ بے شمار شعرا نے وفات کی تاریخیں کہیں۔ مولوی علی میاں کاملؔ کا مصرعِ تاریخ تھا:

انیسِ عالمِ وحدت ولائے آلِ عبا است

۱۲۹۱ ھجری

سیّد حسین میرزا عشقؔ نے یہ تاریخ نکالی:

"بادا انیسِ عشق حسین اندریں مزار"

۱۲۹۱ ھجری

مرزا دبیر نے اس موقع پر جو اشعار کہے اُن سے انیسؔ اور دبیر دونوں کی عظمت کا پتہ چلتا ہے:

یادگارِ رفتگاں، ہستیم در مہمانِ جہاں ‏— چند روزہ، چند ہفتہ، بے برادر، بے انیسؔ

اشک را ربطے بہ دامن بود، لیکن اشکِ ما ‏— رفتہ رفتہ رفت تا دامانِ محشر بے انیسؔ

آسماں بے ماہِ کامل، سدرہ بے روح الامیں ‏— طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیسؔ

سال گزشتہ میر انیسؔ کی صد سالہ برسی منانے کی تحریک ہوئی۔ انجمن یادگارِ انیس کراچی اور دبستانِ انیس راولپنڈی نے پروگرام مرتب کیے لیکن افسوس ہے کہ ہندستان کی جارحانہ پالیسی

کی وجہ سے اہلِ پاکستان بجا طور پر اپنے ملک کے دفاع میں مشغول ہو گئے اور میر انیس کی یاد نہ منا سکے۔ میں شامِ ہمدرد کے اراکین کا ممنون ہوں کہ ان کے وسیلے سے کراچی کے سخن دانوں کے سامنے مجھے میر انیس کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا موقع ملا۔

دبستانِ انیس راولپنڈی نے ۱۰ر مارچ ۱۹۶۲ء کو مجھے میر انیس پر تقریر کرنے کی دعوت دی، یہ وہ نازک زمانہ تھا کہ جب روسی ہواباز گیگرین، اور امریکی ہواباز گلین کے خلائی سفر کے چرچے ہو رہے تھے اور اہلِ زمین چاند کے سفر کے لیے پر تول رہے تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگر میری زندگی میں چاند کا سفر ممکن ہو گیا اور مجھ پر اس سفر میں کلام مجید کے علاوہ صرف تین شاعروں کی کلیات لے جانے کی پابندی کی گئی تو میں غالب کا دیوان، اقبال کی نظمیں اور انیس کے مرثیے لے کر جاؤں گا۔ مرزا غالب نے فرمایا تھا:

"ہندستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔"

ہماری شاعری کے اوّلین دور سے غزل، قصیدے، مثنویاں، مسدس، واسوخت، قطعات اور رباعیات ہمارے شعرا کے احساسات اور جذبات کا ذریعہ بنیں۔ پہلے سلام اور مرثیے بہت کم کہے گئے۔ ان میں عقیدت تو تھی لیکن اردو شاعری میں ان کا شمار نہ تھا۔ انیس اور دبیر کے دور سے مرثیہ اردو ادب کا وہ خزانہ بن گیا جس میں غزل کی اشرفیاں، قصیدوں کے گوہر اور مثنویوں کے جواہرات ایک ہی وقت میں ملنے لگے اور "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" والا معاملہ ہو گیا۔ ایک کامیاب شاعر کے لیے اصلیت کی پابندی، خیال کی بلندی الفاظ کی مناسبت اور جذبات کی تڑپ ضروری ہے

انسانی جذبات میں سب سے زیادہ قوی تاثرات غم اور حسرت کے ہوتے ہیں اور اسی لیے ہماری غزلوں میں عشق و محبت اور غم و حسرت کے مضامین کی کثرت ہے، مرثیوں میں ان مضامین کے ساتھ واقعات اور مناظر کی مرقع نگاری شامل ہو گئے۔ مشرق اور مغرب دونوں کے اہلِ فکر نے خوشی کے مقابلے میں غم کو زیادہ تر اپنے خیالات کا موضوع بنایا۔ شیلے نے کہا تھا:

Our sweetest songs are those
That tell of saddest thoughts

یعنی ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جن میں غم ناک خیالوں کا ذکر ہوتا ہے۔

علامہ اقبال نے کہا تھا: ؎ ...

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینہ دل کے لیے گردِ ملال

غزل کے عشق اور مرثیے کے عشق میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ غزل کا محور انسان کی ذات ہوتی ہے اور اس میں نفسانی خواہشات شامل ہوتی ہیں۔ مرثیے کے عشق کا سرچشمہ معرفتِ الٰہی اور اسلام کی تعلیم ہے۔ یہ اس قسم کا عشق ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا:

ے عشق دمِ جبریل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

مرثیوں میں غم اور عشق کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ اعلانِ کلمۂ حق، راہِ رضا میں سب کچھ نثار کرنے کا جذبہ، ظالم کے سامنے سینہ سپر ہونے کی جرات، اسلام کی روحانی قدروں کو بچانے کی جدوجہد اور تلواروں کے سایے میں نماز نہ قضا کرنے کی ہمت، صبر اور شکر، زہد اور قناعت، ان سارے مضامین کو انیس اور دبیر نے مرثیوں کی لڑیوں میں پرو دیا۔

مرثیے کے علاوہ جو دوسرے اصنافِ شاعری ہیں ان پر قدرت حاصل کرنے کے لیے کسی کا مسلمان ہونا ضروری نہیں، لیکن مرثیے کہنے کے لیے اسلام سے رشتۂ قلبی، قرآنِ مجید کی حکمت سے آگہی، رسول کریمؐ کی سیرت سے اُنسیت اور اسلامی تاریخ سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کا دور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے دورِ ابتلا تھا، اُن کی سات سو سالہ حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ہار چکے تھے، مرشد آباد، عظیم آباد، لکھنؤ اور دلّی میں اُن کی اُمیدوں کے چراغ بجھ چکے تھے۔ اس پُرآشوب زمانے میں انیس اور دبیر نے مرثیے کے ذریعہ سے برّصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں وہ تڑپ قائم رکھی جس کے ذریعہ سے ہمارے سیاسی رہبروں نے پاکستان کی منزل سر کی۔ میرا اعتقاد ہے کہ میر انیس ۱۹۴۷ء میں زندہ ہوتے تو میری طرح وہ بھی لکھنو چھوڑ کر اسلامی ریاست کی سمت ہجرت کرتے۔ اس دعوے کی دلیل میں اُن کا شعر پیش کرتا ہوں:

ے نکلو کہیں جلد عمر آخر ہے انیس
اس ہند بسیہ بخت میں رکھا کیا ہے

۱۸۵۷ء میں برصغیر کے مسلمانوں کی شکست اور ۱۹۴۷ء میں اُن کی فتح کا نقشہ میر انیسؔ کے اس مطلع میں ہے :

خود نویدِ زندگی لائی قضا میرے لیے
شمعِ کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

میر انیسؔ نے پچاس برس مسلسل ریاضت کرکے سلام، رباعیوں اور مرثیوں کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا کہ چھ ضخیم جلدیں شائع ہونے کے بعد بھی اُن کا ایسا کلام باقی ہے جس کی اشاعت کی نوبت ابھی تک نہیں آئی۔ جس طرح کربلا کا سانحہ آفاقی ہے، اسی طرح میر انیسؔ کا کلام بھی جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے۔

اُن کے کلام کے چند نمونوں سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ اگر وہ غزل کہتے تو کتنے غزل گو شعرا کے چراغ گل ہو جاتے:

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

دہانِ کیسۂ زر بند رکھ برائے منعم
خدا کے واسطے وا کر جبیں کی چینوں کو

حسین عشق میں اکبر کے کیوں نہ ہوں سرشار
کہ دوست رکھتا ہے اللہ بھی حسینوں کو

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

شباب کھو کے بھی غفلت وہی ہے پیروں کو
سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھے ہیں

انیسؔ دم کا ٹھکانا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

شباب تھا کہ دمِ واپسیں کی آمد و شد
یہ مضطرب اِدھر آیا، اُدھر روانہ ہوا

ہاتھ خالی آئی لاشوں پر شہیدوں کے نسیم
پھول بھی اس فصل میں ایسے گراں پیدا ہوئے

بند

شہرہ بہت تھا حُسن میں کنعاں کے ماہ کا
قصہ سُنا ہوا ہے زلیخا کی چاہ کا
یاں آفتاب کو نہیں یارا نگاہ کا
یوسف ہے ایک ایک جواں اس سپاہ کا
سنتے تھے ہم کہ عالمِ ایجاد زشت ہے
ایسے چمن کھلے ہیں کہ دنیا بہشت ہے

بسمل کے لوٹنے کی کسی دل کو کیا خبر
غربت میں کون لٹ گیا منزل کو کیا خبر
کشتی کے ڈوب جانے کی ساحل کو کیا خبر
کس پر چھری یہ چل گئی قاتل کو کیا خبر

خاروں سے پوچھیے نہ کسی دل سے پوچھیے
صدمہ چمن کے لٹنے کا بلبل سے پوچھیے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے | سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے | زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گل رو کے لیے

داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

فردوسی نے اپنے شاہنامے میں رستم وسہراب کی جنگ کا نقشہ بڑی چابک دستی سے کھینچا ہے، لیکن رستم کے زورِ بازو کی داستانیں بیان کرنے کے بعد خود اپنے زورِ قلم پر یوں تبصرہ کیا:

منش کردہ ام رستمِ پہلواں
وگرنہ یلے بود در سیستاں

میرانیس کو ایسا ممدوح ملا جس کے جنگ و جدال اور صبرو استقلال کی حدیں انسانی احاطے سے بھی بالاتر تھیں۔ فرماتے ہیں:

غل تھا الٹ چکے ہیں حسین آستین کو | یا بو تراب آ کے بچالو زمین کو

بند

وہ پڑھ کے چند شعر رجز شاہِ دیں بڑھے | گیتی کے تھام لینے کو روح الامیں بڑھے
مانند شیرِ نر کہیں ٹھہرے کہیں بڑھے | گویا علی الٹتے ہوئے آستیں بڑھے

گرمی میں برقِ تیغ جو چمکی شرر اڑے
جھونکا چلا ہوا کا جو سن سے تو سر اڑے

اختر خجل ہیں زینِ جواہر نگار سے | ذروں نے چن لیے ہیں ستارے غبار سے
جلوے دکھا رہی تھی ضیا ہاتھ پاؤں کی | اک چاندنی بچھی ہوئی تھی دھوپ چھاؤں کی
بر میں نبی کا جامہ عنبر شمامہ ہے | رنگت تو پھول سی ہے گلابی عمامہ ہے
چوتھا فلک ضیا سے جلو خانہ بن گیا | خورشید شمعِ حسن کا پروانہ بن گیا

بند

آمد فرس کی تھی دلہن آتی ہے جس طرح | تھم تھم کے نکہتِ چمن آتی ہے جس طرح
تصویرِ آہوئے ختن آتی ہے جس طرح | یا شمع سوئے انجمن آتی ہے جس طرح

باہم طیور کہتے تھے کبکِ دری ہے یہ
گھوڑے چراغ پا تھے کہ بیشک پری ہے یہ

بند

پھرتا تھا کیا صفوں میں فرس جھوم جھوم کے
سرعت بلائیں لیتی تھی منھ چوم چوم کے
پامال تھے پرے سپہِ شام دردم کے
غل تھا یہ غول میں پسرِ سعدِ شوم کے
رخش ایسا روم ورے میں نہیں شام میں نہیں
یہ شوخیاں تو ابلقِ ایام میں نہیں

پنجہ ادھر چمکتا تھا اور آفتاب اِدھر
اس کی ضیا تھی خاک پہ ضو اُس کی عرش پر
زرریزیٔ علم پہ ٹھہرتی نہ تھی نظر
دولھا کا رُخ تھا سونے کے سہرے میں جلوہ گر
تھے دو طرف جو دو علم اس ارتفاع کے
اُلجھے ہوئے تھے تار خطوطِ شعاع کے

بجلی گری پروں پہ شمال وجنوب کے
کیا کیا لڑے ہیں شام کے بادل میں ڈوب کے

میرانیس کی قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی ایک مصرع سے وہ کام لیتے تھے جس کے لیے پورا بند ضروری ہوتا ہے۔ ہم نے ٹیلے وژن کی ایجاد کے بعد یہ مشاہدہ کیا کہ تصویریں ہوا کے دوش پر چل سکتی ہیں، لیکن اس ایجاد کے سو برس پہلے میرانیس نے کہا تھا، ع۔
تصویر تھی ہوا پہ شہِ ذوالفقار کی' اور ع سایہ کہیں تھا تیغ کہیں تھی چمک کہیں
جب امام عالی مقام نے جہاد کی منزل سر کرلی اس وقت اُن کے مطمئن قلب کا نقشہ میرانیس نے یوں کھینچا، ؎

ہر دُکھ میں خوش ہیں وہ جنھیں الفت خدا کی ہے
میرا نہیں یہ سر تو امانت خدا کی ہے

بند

بھاگو نہ' لو نیام میں رکھتا ہوں میں حسام
مشتاقِ قربِ حق ہے یہ مظلوم و تشنہ کام
دنیا سے کچھ غرض ہے نہ اب زندگی سے کام
حاضر ہے سر فقیر کا کیا کوچ کیا مقام
بیٹھے نہیں زمیں پہ خزانے کو گاڑ کے
موت آئی اُٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

انیس اور دبیر کے مرثیوں میں معرفتِ الٰہی اور اصول دین کے دفتر کھلے ہوئے ہیں، کچھ نمونے پیش کرتا ہوں۔

ترجیع

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں خوشبو تیری ہے

عزت رہے یارو آشنا کے آگے　　محجوب نہ ہوں شاہ وگدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہِ مولا میں انیس　　یہ ہاتھ جب اُٹھیں تو خدا کے آگے

نبوّت

رسول عربیؐ کے وقتِ آخر کی تصویر میر انیسؔ نے یوں کھینچی :

نزدیکِ محمدؐ ملک الموت جب آیا
فرمانِ خدا فوجِ ملائک کو یہ پہنچا
نزدیک سواری ہے رسول عربیؐ کی
صف باندھ کے تعظیم کرو روحِ نبیؐ کی

وہ آتا ہے جو عاشقِ صادق ہے ہمارا　　وہ آتا ہے جس کے لیے عالم کو سنوارا
وہ آتا ہے جو عرش معلّی کا ہے تارا　　وہ آتا ہے جو سب سے بہت ہے ہمیں پیارا

عدل

بھیج دے دوزخ میں یا جنّت میں ہاں مجرم تو ہوں
تو ہے عادل جو مناسب ہو سزا میرے لیے

پرسشِ اعمال

کیا کیا دنیا سے صاحبِ مال گئے　　دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ　　کچھ ساتھ اگر گئے تو اعمال گئے

عزّتِ نفس

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے　　سر جہاں رکھتے ہیں سب، ہم واں قدم رکھتے نہیں

محلِ عبرت

دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے اُن کے سر
آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

فلسفۂ جہاد

کیا فخر جو پیاروں کو رہِ حق میں دیا ہے
تیری ہی امانت کو فدا تجھ پہ کیا ہے

جس نے میر انیسؔ کا تھوڑا سا بھی کلام پڑھا ہے وہ ان شعروں کی بہت داد دے گا۔

سُبک ہو چلی تھی ترازوئے سخن　　مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمینِ سخن　　تجھے بات میں آسماں کر دیا

گھٹا زورِ مشقِ سخن بڑھ گئی   ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا
کہاں ایک ذرّہ کہاں آفتاب   خدا نے کسے مہرباں کر دیا

دبستانِ انیس راولپنڈی نے انیس کی صد سالہ برسی کی تقریبات کے سلسلے میں ایک محفلِ مسالمہ کے لیے شعرا کو دعوتِ سخن دی تھی۔ میں نے میر انیس کے اس مصرع پر طبع آزمائی کی۔

ع عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

"عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا"   انیس جب تجھے دیکھا بلند تر دیکھا
انیس تیرا دبستاں کھلا ہے چار طرف   ریاضِ مدحتِ شبیر کا ثمر دیکھا
انیس زندگیٔ جاوداں مبارک ہو   شہیدِ حق کی عنایات کا اثر دیکھا
یہ معجزہ ہے تری مرثیہ نگاری کا   جو کربلا میں ہوا وہ بچشمِ تر دیکھا
سند ہیں شعر ترے مستند زباں تیری   ترے ہنر کا ہے پرتو جدھر جدھر دیکھا
وہ طرزِ خاص ترا سادگی میں پُرکاری   کہ جس کا خواب ادیبوں نے عمر بھر دیکھا
وہ تیری شانِ تکلم کہ سامعہ حیراں   سبھوں کی تو نے نظر موڑ دی جدھر دیکھا
ہر ایک بحر میں تو نے گہر فشانی کی   ہر ایک بیت میں ہیروں کو منتشر دیکھا
خزاں کبھی ہے چمنِ نظم میں بہار کے ساتھ   تری روش کو مسلسل بہار پر دیکھا

مطلع ثانی

جہاں میں سطوتِ شاہی کو مختصر دیکھا   سخن میں تیری خدائی کو معتبر دیکھا
خزانہ تو نے لٹایا ہے شعر و معنی کا   جسے بھی فکر ہوئی اُس نے تیرا در دیکھا
دکھائی تو نے فضا گلشنِ محمدؐ کی   کہ دیدہ ور نے سدا جس کو تازہ تر دیکھا
حدودِ شعر ملائے درِ عبادت سے   خدا پرستوں کو مجلس میں جلوہ گر دیکھا
محل سراؤں میں دیکھا نہ خانقاہوں میں   وہ سیلِ نور جو تیرے مزار پر دیکھا

میر انیس کے ایک مرثیے کے چند بند نمونتًا پیش کرتا ہوں، اُن کے کلام کے انتخاب کرنے میں یہ دشواری ہے کہ ہر مرثیے کا ہر گوشہ ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا ست

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے   جلوہ کیا سحر کے رُخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے   مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا   یاں آج خوں بہے گا محمدؐ کی آل کا

چہرہ خوشی سے لال ہے زہرہ کے لال کا گزری شبِ فراق دن آیا وصال کا
ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہے جس کی شام یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام لکھے خدا نماز گزاروں میں سب کے نام
سب ہیں وحیدِ عصر یہ غل چار سو اُٹھے
دنیا سے جو شہید اُٹھے سُرخ رو اُٹھے

سو کھے لبوں پہ حمدِ الٰہی رُخوں پہ نور خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دُور
فیاض، حق شناس اولوالعزم ذی شعور خوش فکر و بذلہ سنج و ہنرپرور و غیور
سب کے رخوں کا نور سپہر بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا جُھرمٹ زمیں پہ تھا

ساونت بُردبار فلک مرتبت دلیر عالی منش سبا میں سلیمان وغا میں شیر
گردانِ دہر ان کی زبردستیوں سے زیر فاقے سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر
دنیا کو ہیچ پوچ سراپا سمجھتے تھے
دریا دلی سے بحر کو قطرہ سمجھتے تھے

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور دیکھے تو غش کرے اَرِنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور وہ جا بہ جا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار پھولوں پہ جا بہ جا وہ گہرہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخلِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حیّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیلِ کردگار
طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں　　تشریف جا نماز پہ لائے شہِ زماں
سجادے بچھ گئے عقبِ شاہِ انس وجاں　　صوتِ حسن سے اکبر مہرو نے دی اذاں
ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسول کی کانوں میں آ گئی

فارغ ہوئے نماز سے جب قبلۂ انام　　آئے مصافحے کو جوانانِ تشنہ کام
چومے کسی نے دستِ شہنشاہِ خاص و عام　　آنکھیں ملیں کسی نے قدم پر بہ احترام
کیا دل تھے کیا سپاہِ رشید و سعید تھی
باہم معانقے تھے کہ مرنے کی عید تھی

سجدے میں شکر کے تھا کوئی مردِ باخدا　　پڑھتا تھا کوئی حزن سے قرآں کوئی دُعا
نعتِ نبی کہیں تھی کہیں حمدِ کبریا　　مولا اُٹھا کے ہاتھ یہ کرتے تھے التجا
فاقوں پہ تشنہ کامی و غربت پہ رحم کر
یا رب مسافروں کی جماعت پہ رحم کر

گرمی کا روزِ جنگ کی کیونکر کروں بیاں　　ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لُو کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں　　رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لُو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب　　کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب　　خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آبِ رواں سے منھ نہ اُٹھاتے تھے جانور　　جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر　　خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے　　آہو نہ منھ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے　　گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر
آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب   چھپنے کو برق چاہتی تھی دامن سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب   کافور صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اسیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں
اس آب پر یہ شعلہ فشانی خدا کی شان   پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان
خاموش اور تیز زبانی خدا کی شان   استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان
لہرائی جب اُتر گیا دریا چڑھا ہوا
تیزوں تھا ذوالفقار کا پانی بڑھا ہوا
پھر تو یہ غل ہوا کہ دہائی حسین کی   اللہ کا غضب ہے دہائی حسین کی
دریا حسین کا ہے ترائی حسین کی   دنیا حسین کی ہے خدائی حسین کی
بیڑا بچایا آپ نے طوفاں سے نوح کا
اب رحم، واسطہ علی اکبر کی روح کا
آئی ندائے غیب کہ شبیر مرحبا   اس ہاتھ کے لیے تھی یہ شمشیر مرحبا
یہ آبرو یہ جنگ کی توقیر مرحبا   دکھلادی ماں کے دودھ کی تاثیر مرحبا
غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر

حکیم محمد سعید

" احترامِ ادب و ادیب " جیسے اہم موضوع پر آپ نے جناب محترم سید ہاشم رضا صاحب کا پُرمغز و موثر مقالہ سماعت فرمایا۔ اگر یہ حقیقت ہے ، اور ضرور حقیقت ہے کہ اس کرۂ ارض کی ہر شئے میں ایک قوت پنہاں ہے اور پوشیدہ تو انسان بھی اس کرۂ ارض کی ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت میں قوت کا ایک خزانہ پنہاں ہے ۔آپ جانتے ہیں کہ خاک کے ہر ذرّے میں بجلی کی رو موجود ہے ۔ زمین کا ہر حبّہ نمو کی قوت سے عبارت ہے اور موجوں کا تلاطم ہر دریا کے اندر چھپا ہوا ہے، لیکن کوئی بھی قوت خود بخود نمایاں نہیں ہوتی، خود بخود حرکت میں نہیں آتی بلکہ اپنے وجود کے ظہور کے لیے ایک سخت کشمکش، ایک شدید مقاومت اور ایک زبردست تصادم کی منتظر رہتی ہے ۔ لہذا جب کوئی طاقت ان کو مہمیز لگا دیتی ہے تو اُن کے چہرۂ تاب ناک سے نقاب اُٹھ جاتی ہے ۔ حرکت بجلی کے خزانے میں آگ لگا دیتی ہے ۔ سیلاب کی رَو زمین کی قوتِ نمو کو اُبال دیتی ہے، ہوا کے جھونکے سطحِ دریا پر موجوں کا جال پھیلا دیتے ہیں ۔ اگر جناب سیّد ہاشم رضا صاحب کے خطاب کی قوت نے آپ کے جذباتِ احترام کو جھنجوڑ کر بیدار کر دیا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ شامِ ہمدرد کا بھی حاصل ہے ۔

اس دنیا میں طاقت اور قوت کے بڑے بڑے مظاہر ہمیں نظر آتے ہیں لیکن حقائق پر جن کی عمیق نظر ہے اور جو لوگ حقائق و معارف کے ادراکِ صحیح کے وصف سے متصف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اخلاق سب سے بڑی طاقت ہے اور طاقتِ اخلاق کی نمائش کرنے ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کو اخلاقِ حسنہ کا مظہر بنایا ہے ۔ اور اسی بنا پر انبیائے کرام علیہم السّلام نے اپنی بعثت کا مقصد تکمیلِ اخلاق قرار دیا ۔

محاسنِ اخلاق میں احترام کو نہایت اہم مقام حاصل ہے ۔ اگر ہم غور کریں تو اقوام و ملل کی ترقی و تنزل، ان کے مد و جزر اور عروج و زوال کی ہر داستان اخلاق اور عدم اخلاق اور احترام اور عدم احترام کے تابع ہے ۔ ادب اور ادیب بھی اس دائرے سے باہر نہیں اور احترام ادب و ادیب بھی اس ذیل میں آتا ہے ۔ جن اقوام و ملل نے اس حقیقت کا ادراک نہیں کیا کہ احساسِ ملّی کے بغیر اچھے ادب کا ظہور نہیں ہو سکتا، اور جب تک خود داری کا وصف اس میں نہ ہو احساسِ ملّی بیدار نہیں ہو سکتا اور خود داری فقط حریتِ فکر اور آزادی کا ثمر ہے ایسی اقوام کا انجام اُڑتی ہوئی خاک ہوا ہے

اور اس کی ہر داستان مبہم ہو کر رہ گئی ہے۔

آج جو لوگ عظیم المرتبت اور رفیع الشان اقوام و ملل کی موت پر ماتم کناں ہیں اُن کو صرف مادی طاقتوں ہی کو پیشِ نظر نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ اُن کے ان اخلاقی تغیّرات پر بھی نظر رکھنی چاہیئے جو سطوتِ عامّہ کا جزوِ لاینفک ہیں۔ اس انداز کی حکیمانہ نگاہ سے صرف یہی ثابت ہو گا کہ ترقی و تنزل صرف اخلاقی انقلابات کا نتیجہ ہیں۔ اخلاق کی زبردست طاقت کے سامنے ہر مادّی قوت نے ہمیشہ سرِتسلیم خم کیا ہے۔ عربوں کو اسی اخلاقی طاقت نے اُبھارا تھا اور اسی کے تنزل نے اُن کو موجودہ گم نامی تک پہنچا دیا ہے۔ پاکستان کو اسی طاقتِ اخلاق نے وجود بخشا اور اسی کے زوال نے آج پاکستان کو ذلّت و گمراہی کی بے رحم طوفانی موجوں کے حوالے کر دیا ہے۔

ولعل اللہ یحدث بعد ذٰلك امرا (الطلاق آیۃ: ۱



پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی، ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ ہاشمی (صدر مجلس) حکیم محمد سعید



پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی (مقرر)



صدرِ مجلس ڈاکٹر زیڈ۔اے۔ ہاشمی خطاب کر رہے ہیں

احترامِ سائنس

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمدّ سعید
مقالہ : پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی

شامِ ہمدرد، راولپنڈی

یکم فروری ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

محترم خواتین و حضرات!

زندگی کے ہر شعبے میں سائنس کی وجہ سے ہزاروں سہولتیں حاصل ہو رہی ہیں ان قوموں کے لیے، جو سائنس کو فروغ دیتی ہیں، جو ادارے سائنس کو ترقی دیتے ہیں اور جو اس کو اپنی روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ میں اپنی گزارشات میں صرف چند منٹ آپ سے لوں گا صرف یہ عرض کرنے کے لیے کہ ہمارا ادب اس چیز کو اچھا سمجھتا ہے اور ہماری قوم نے کسی زمانۂ قدیم میں اس شعبے کو بہت ترقی دی تھی اور اس ضمن میں بڑا نام پیدا کیا تھا، لیکن ماضی کے ان کارناموں پر خوش ہونا محض "پدرم سلطان بود" والی بات ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر صحافتی دَور میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کی تشہیر ان ثقافتوں کے علمبردار کرتے ہیں اور بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم حقدار ہیں اُن قدروں کے جن کے ہم نام لیوا ہیں۔ لیکن در اصل ہر تمدّن کو اس اعتبار سے نہیں پرکھا جاتا کہ لوگ کس چیز کے دعویدار ہیں، بلکہ اس لحاظ سے جانچا جاتا ہے کہ جس ثقافت کو وہ پیش کر رہے ہیں، اس کے عملی پہلو کس حد تک اُن کے عہد میں اپنائے گئے ہیں اور اُن سے بنی نوع انسان کو یا کم سے کم اُن کی جمعیت کو، اُن کے ہم عصروں کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے اور آئندہ زمانے میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ آنے والی نسلوں کو اُن سے کیا فائدہ پہنچے گا۔

ہم کو آزادی حاصل کیے پچیس سال گزر چکے ہیں۔ چین نے ہم سے دو سال بعد آزادی حاصل کی تھی اور اُس وقت وہ ہم سے بھی زیادہ پس ماندہ تھا، لیکن مقابلہ کیا جائے تو وہ زندگی کے ہر شعبے میں، خاص طور پر سائنس کے میدانِ عمل میں ہم سے کہیں زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ بلکہ بہت سے ترقی یافتہ ملکوں کے ہم پلہ ہوگیا ہے اور بعض سے بازی بھی لے گیا ہے۔ اس کا سبب معلوم کرنا نہایت ضروری ہے۔ ہم کو اس پہلو پر غور کرتے وقت یہ ملحوظ رکھنا ہوگا کہ ۱۹۴۹ء سے اب تک وہ کم و بیش بیس لاکھ انجینیروں کو تربیت دے چکے ہیں اور اُن کی تازہ ترین منصوبہ بندی میں پچیس لاکھ مزید انجینیروں کو تربیت دینا شامل ہے۔ اس کے برعکس ہم نے مشکل سے تین چار ہزار انجینیروں کو تربیت دی ہوگی اور اُن کو روزگار دلانے یا اُن کی صلاحیتوں سے صحیح طرح فائدہ اٹھانے کا مسئلہ بھی حل طلب ہے۔ انھی کی کھپت مشکل ہے تو آئندہ کا لائحۂ عمل بے مقصد و بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں

ان تربیت یافتہ افراد کے لیے ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ کسی بیرونی ملک میں چلے جائیں اور اپنے لیے نئی دنیا آباد کریں۔ یہ صورت اُن کے لیے سودمند ضرور ہے لیکن ہمارے لیے قومی اعتبار سے افسوسناک ہے۔ یہ قومی سرمائے کا ضیاع ہے۔

اوپر دی ہوئی مثال کے بموجب صرف انجینئر ہی اس زمرے میں نہیں آتے۔ ہمارے سینکڑوں ہزاروں ڈاکٹر بھی باہر چلے جا رہے ہیں، حالانکہ خود ہمارے مسائلِ صحت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر اسی ملک میں رہ کر اپنے علم طب سے اپنے ہم وطنوں کے کام آئیں۔ اُن کو صحت مند بنائیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم میں سائنس کو بڑی اہمیت دیں اور سائنسی علوم حاصل کرنے والوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ یہ سمجھائیں کہ اُن کا مقصد حصولِ علم کیا ہونا چاہیئے اور وہ اپنے میدانِ عمل میں صرف حکومت کے کسی شعبے پر تکیہ نہ کیے بیٹھے رہیں بلکہ اس میدان کی وسعتوں میں اپنے ہی وطن میں رہتے ہوئے اپنا مقام پیدا کریں، اپنی قابلیت کا لوہا منوائیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت میرے علم میں ہے کہ ۱۹۵۲ء میں حکومت نے اپنے دستور العمل میں معاشرتی منصوبہ بندی کی شق شامل کی تھی لیکن ۱۹۶۲ء کے دستور العمل میں اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ جب ہم ایک نئے معاشرے کو ترتیب دے رہے تھے تو اس موضوع کی اہمیت کو کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔ جب تک کوئی چیز دستور العمل میں نہ ہو، اگلے قوانین مرتب نہیں ہوتے۔ چنانچہ سائنسی علوم سے بے اعتنائی و بے رغبتی واضح ہو جاتی ہے اور اُس کے حصول سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

خواتین و حضرات!

آج شام ہمدرد کا موضوع "احترام" کی ایک کڑی یعنی "احترامِ سائنس" ہے اور اس پر سیر حاصل بحث جناب پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی کر سکتے ہیں کیونکہ "عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں" کے مصداق یہ اُن کا اپنا موضوعِ خاص ہے۔ لہٰذا اُن کے سامنے مزید لب کشائی کرنا "دشت کی سیاحی" سے بھی پرے کی بات ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں اُن کے لیے میدان خالی چھوڑ دوں تاکہ وہ اپنے علم کے گھوڑے اپنے اندازِ فکر کے مطابق دوڑا سکیں۔ میں اُن سے درخواست کروں گا کہ وہ تشریف لا کر اپنے منتظر سامعین کو مستفید ہونے کا موقع دیں۔ جناب پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی۔

پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی

خواتین و حضرات!

انسان کا رابطہ اللہ کی ذات سے ہو یا مخلوق کے ساتھ، اس کے دینی مراسم ہوں یا دنیاوی، سب کا تعلق باہمی ربط و ضبط کے اس اتصالی نقطے سے ہے جسے ہم احترام یا اکرام کہتے ہیں۔ دراصل یہی حقوق و فرائض اخلاق و معاملات کے دوائر کا نقطۂ پرکار ہے۔ احترام جس طرح بندہ اور خدا اور بندوں کے آپس کے تعلّقات کا مرکزی نقطہ ہے۔ اسی طرح کائنات اور جملہ اشیا سے انسانی روابط بھی احترام ہی کے رشتے سے پروئے ہوئے ہیں۔

کسی چیز سے فائدہ اُس کی عظمت اور قدردانی کے بعد ہی اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر کسی چیز کی عظمت یا اہمیت دل میں نہیں ہوتی تو اُس چیز کو معمولی سمجھ کر اولاً انسان اس کی طرف مائل نہیں ہوتا اور جب میلان ہی نہ ہو تو فائدہ اُٹھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس بنا پر اسلام بھی جن چیزوں سے استفادے کا طالب ہے وہ اُن کی قدر و منزلت یا احترام دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً اسلام نے شعائر اللہ کی قدردانی کو تقویٰ اور دین کا نشان بتلایا ہے ارشاد ہے:

ومن یعظّم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب۔

(اور جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی تعظیم اور بڑائی کرتے ہیں تو یہ اُن کے دلوں کے تقویٰ کا نشان ہے) (الحج: ۳۲)

جس طرح دینی شعائر انسان کی اُخروی زندگی بنا دیتے ہیں، اس طرح اللہ تعالیٰ کی کائنات میں غور و فکر ان میں تجسّس اور حدود الٰہیہ میں رہ کر اُن سے استفادہ انسان کے دین اور دنیا دونوں کو سنوار دیتا ہے۔ اسی مشاہدے، غور و فکر اور استفادے کا نام سائنس ہے۔

خواتین و حضرات!

اصطلاحاً سائنس سے مراد وہ علم ہے جو مختلف وقوعات یا تبدیلیوں وغیرہ کے دیکھنے پھر تجربہ کرنے اور تجربوں سے نتیجہ اخذ کرنے پر حاصل ہوتا ہے۔ یا یہ وہ علم ہے، جس کی بنیاد مقدار، وزن یا ناپ تول اور شمار کیمیاوی وطبعی آلات کی مدد سے تجزیے کی بعد کی معلومات سے ڈالی جاتی ہے اور واقعات سے پیدا شدہ نتیجوں اور نظریوں کی جانچ اور پرکھ سے مضبوط کی جاتی ہے۔ سائنس حقیقت میں مشاہداتی

علم یا معلومات کی منظم اور معتبر شکل کا نام ہے، جس کے بغیر تحقیق اور صحت کا کوئی اچھا اور قابلِ اطمینان نتیجہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

سائنس کا دائرۂ عمل علم اور آلات کی ترقی کے ساتھ ساتھ بہت پھیل گیا ہے۔ اب سائنس کا خاص طریقہ اور تحقیق کے نتیجے اور نظریے معیشت، معاشرت، سیاست بلکہ ہر فن اور ہنر پر استعمال کیے جاتے ہیں حقیقت میں سائنس کا صحیح مقام اب کائنات کی پیدائش یا تخلیق اور تسخیر سے لے کر انسان کی حقیقت اور اس کے تمام رازوں تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ سائنس انسان کی پیدائشی خاصیت ہے۔ قرآنِ پاک میں جب تخلیقِ آدم کا ذکر آتا ہے تو جہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ "علم الأدم الاسماء کلّھا"[۹] یعنی حضرت آدم کو سارے نام یعنی علم الاشیاء ودیعت کیا گیا تو اس سے مراد یہی بات ہے کہ آدم کے وجود میں سائنس کو استعمال کرنے کی اور سائنس کے ذریعے سے اشیا کی حقیقت، ان کی شناخت اور ان کا تعلق معلوم کرنے کی صلاحیت عطا کر دی گئی ہے۔ چنانچہ جتنا انسان کا تجربہ، عقل اور شعور بڑھتا جائے گا سائنس کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا۔ اور انسان حقیقت، قوت اور کمال کی طرف ترقی کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ علمی اعتبار سے سائنس کا مقصد یہ ہے کہ کائنات کے ہر جزو کی تخلیق اور ترکیب کا پتہ چلایا جائے۔ ہر چیز کا تجزیہ اس کا اثر اور ربط معلوم کیا جائے۔ پھر ان معلومات کی بنا پر ایسے قوانین یا کلیے دریافت کیے جائیں جن سے آگے کی راہیں کھل سکیں اور نئی معلومات حاصل ہوتی رہیں۔

عملی طور پر سائنس کا کام کائنات کی ساری قوتوں کو فتح کرنا اور زمین و آسمان کے خزانوں سے بھرپور فائدہ اٹھانا ہے۔ اسی لیے سائنس انسان کی جملہ ضروریات سے تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ سارے انسانی پیشے حرفتیں اور دستکاریاں، صنعت و زراعت، تعمیرات، رہنا سہنا سب کچھ سائنس کے عمل کا محتاج ہے۔

سائنس کے علم کو اسلام میں ایک خاص مرتبہ اور مقام دیا گیا ہے۔ قرآن پاک بار بار اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ انسان دنیا کی مختلف چیزوں اور کیفیات کو دیکھے اور ان پر غور کرے۔ وہ لوگ، جو اپنے حواس مشاہدہ کے لیے اور اپنا ذہن غور و فکر کے لیے استعمال نہیں کرتے، انھیں قرآن نے چوپایوں سے تشبیہ دی ہے، بلکہ ان سے بھی بدتر بتایا ہے۔ انسان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی تخلیق یعنی پیدائش اور بناوٹ پر بھی نظر ڈالے اور زمین و آسمان کی پیدائش پر بھی۔

(۱) اِنّ فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الّیل والنّھار
والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع النّاس وما انزل اللہ
من السماء من ماءٍ فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبثّ

فیھا من کُلّ دآبّۃ و تصریف الرّیاح والسحاب المسخّر
بین السّماء والارض لاٰیٰت لقوم یعقلون ہ (بقرہ۔۱۶۴)
ارض و سما کی تخلیق اختلاف لیل و نہار، سمندر میں تیرنے والی کشتیوں،
بارش ہواؤں کے چلنے اور ان بادلوں میں جو زمین اور آسمان کے
درمیان خیمہ آرا ہیں۔ ارباب عقل کے لیے نشانیاں موجود ہیں۔

(۲) و فی خلقکم و ما یبث من دآبّۃ اٰیات لقوم یوقنون ہ
(جاثیہ ۴)
تمہاری پیدائش اور چوپایوں کی افزائش نسل میں اہلِ یقین کے لیے نشانیاں
موجود ہیں۔

(۳) اولم ینظروا فی ملکوت السّماوات والارض وما خلق اللّٰہ
من شیٔ ہ (اعراف ۱۸۵)
کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت پر اور جو چیزیں اللہ نے
پیدا کی ہیں۔ نظر نہیں ڈالی۔

(۴) الم تریٰ انّ اللّٰہ انزل من السّماء ماء فاخرجنا بہ ثمرات
مختلفًا الوانھا و من الجبال جدد بیض و حُمرٌ مختلف الوانھا
و غرابیب سود ہ و من النّاس والدواب والانعام
مختلف الوانہ کذٰلک انّما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلمٰؤا ہ
اور غور کرو کہ پہاڑوں میں سفید سُرخ و سیاہ رنگ کے پتھروں کی تہیں
موجود ہیں نیز انسانوں چوپایوں اور مویشیوں کے مختلف رنگوں کا مطالعہ
کرو اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ سے اُس کے بندوں میں صرف جاننے والے
ہی ڈرتے ہیں۔ (فاطر آیات ۲۷،۲۸)

اسی لیے تو ہادیٔ برحق فرماتے ہیں کہ صحیفۂ کائنات میں گھڑی بھر کے لئے تفکر سال بھر کی عبادت
سے بہتر ہے۔

معلوم ہوا اسلام نے تسخیر کائنات کے بارے میں وہ نظریہ اختیار نہیں کیا جو رہبانی ذہن کے دیگر
مذاہب کا طریقہ رہا ہے۔ بلکہ اُس نے اللہ کی کائنات میں غور و فکر، اُن سے استفادہ اللہ کی
صنعت کاری کے پہچان کا اور بالواسطہ اللہ کی معرفت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ قرآن میں آیا ہے:

صنع اللہ الّذی اتقن کلّ شئ ٥ (النمل آیہ ۸۸

(کاریگری ہے اُس پروردگار کی جس نے ہر چیز کو انتہائی حسن و کمال کے ساتھ بنایا)

اسی وجہ سے قرآن کریم کائنات کی ایک ایک چیز کی قدر و منزلت کو اس قدر بڑھاتا ہے کہ اُسے اپنی دلیل اور نشانی اور قرآن کی اصطلاح میں "آیت" یا "آیات" بتلاتا ہے۔ گویا کائنات کی عظمت اس کے مخلوق بننے کی بنا پر نہیں بلکہ اُسے اپنی خدائی نسبت کی بنا پر انتہائی غور و فکر اور اہمیت کا مستحق گردانا ہے۔ قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہے:

وسنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق و فی انفسھم حتّٰی یتبیّن لھم انہ الحق ٥

(ہم انھیں اپنی نشانیاں آفاق یعنی کائنات اور اُن کے اپنے نفسوں میں بتائیں گے۔
یہاں تک کہ اُن پر کھل جائے گا کہ قرآن کی یہ دعوت سچ ہے) (حٰم السجدہ: آیہ ۵۳)

غرض ان آیاتِ آفاقی کے ذریعے اسلام مظاہرِ قدرت کا مطالعہ اور تحقیق ہر مسلمان پر لازم کر دیتا ہے، کیونکہ یہ علم جس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہے نہ صرف کائنات کے رموز کا انکشاف ایک معلّم متعلّم پر کر دیتا ہے بلکہ اُسے حکیم و علیم و خبیر ربّ العالمین خالقِ کائنات کی ذاتِ پاک پر ایمان اور یقین بھی نصیب کروا دیتا ہے۔

خالقِ کائنات نے کوئی چیز بے کار و باطل یا حقیر و بے وقعت نہیں پیدا فرمائی۔ اُس کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ ہر چیز بامقصد مفید اور قابلِ قدر ہو۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زمین و آسمان کے بارے میں فکر کرنے والوں کے اس سچّے قول کو نقل کیا:

ربّنا ما خلقت ھذا باطلاً

(اے ہمارے پروردگار تو نے کائنات کی کوئی چیز باطل اور بے کار پیدا نہیں فرمائی) (آل عمران آیہ ۱۹۱)

ایک دوسری جگہ قرآن اس حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے:

وما خلقنا السّماء والارض وما بینھما لاعبین ٥

(ہم نے زمین اور آسمان اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے کھیل تماشے کے طور پر (یعنی بے کار) پیدا نہیں کیا) (الانبیاء آیہ: ۱۶)

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے چیونٹی اور مکھی جیسی بادی النظر میں معمولی چیزوں کا تذکرہ کیا ہے اور مختلف کائناتی چیزوں سے اپنی قدرت پر استدلال فرمایا ہے۔ مچھر کے بارے میں فرمایا:

انّ اللہ لا یستحیی ان یضرب مثلاً ما بعوضۃ فما فوقھا ۵

(اللہ تعالیٰ نہیں شرماتے کہ مچھر یا اس سے اوپر کسی چیز کی مثال دیں) (البقرہ آیہ: ۲۶)

شہد کی مکھی کے نظام کا تذکرہ اپنی قدرت کے عجائبات میں فرمایا ہے ۔ ان تمام باتوں کا ایک مفاد یہ بھی ہے کہ انسانوں کے ذہنوں میں قدرت کی پیداکردہ ہر چیز کی عظمت و احترام پیدا ہو اور وہ کسی چیز کو حقیر نہ جانے ۔ اُسے اللہ تعالیٰ کی عنایت اور عطا سمجھ کر اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اگر ایک اور زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو مصنوعات کو حقیر سمجھنا حقیقت میں اُن کے صانع کی حق تلفی ہے۔ "بنی ہوئی چیز" بنانے والے ہی کی کاریگری ہوتی ہے ۔ اس حکیم مطلق صانع نے ہر چیز کو کمال و جمال صوری و معنوی کے ساتھ پیدا فرمایا ہے ۔ اس لیے اشیائے مصنوعات یعنی کائنات کی قدرافزائی اللہ تعالیٰ کے یقین اور ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی کی قدر و منزلت کا سبب اور ذریعہ ہے ۔ اس لئے وہ سائنسی علوم جو معرفت اور اکتشافات اشیا سے متعلق ہیں اُن کی قدردانی و احترام عزت و اکرام کا اہتمام اسلامی تعلیمات کا اصولی نقطہ ہے۔

خواتین و حضرات!

جب ایک مسلمان طالب علم سائنس کے مختلف شعبوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کا علم محض کتابوں تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ خود مشاہدے اور تجربے کی بنا پر انسانی زندگی کے لیے سازگار معاونات و ممدات کو کرۂ ارض پر کارفرما دیکھتا ہے ۔ مثلاً فضائے بسیط میں تناسب اور موزوں مقداروں میں گیسوں کے آمیزے کا گھنا اور گنجان غلاف جو ہمیں زندگی بخشتا ہے، ہمیں لاتعداد شہابِ ثاقب کے ٹکراؤ اور سورج کے ضرر رساں اور مہلک اشعاع کے اثرات سے بچاتا ہے' وہ خود مشاہدہ کرتا ہے تو وہ صانعِ حقیقی کی بلندی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اگر ہم مادّے اور توانائی کے تعلق ارضی مقناطیس کی کارفرمائی، زمین کے محوری جھکاؤ اور گردش کے خوشگوار اثرات اور بارشوں اور ہواؤں کے نظام پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کرۂ ارض کا حجم اور وزن بالکل متناسب اور موزوں ہے ۔ نہیں تو کشش زمین کی کمی یا زیادتی سے کرۂ ہوائی لطیف تر یا کثیف تر ہوکر ہماری زندگی محال کر دیتا نیز کرۂ ارض کا سورج سے فاصلہ بھی موزوں ترین ہے ۔ بصورتِ دیگر زمین یا تو جم کر یخ بستہ ہو جاتی اور یا چلچلاتی دھوپ میں جل کر راکھ ہو جاتی اور اس پر کسی ذی روح کا رہنا ممکن نہ ہوتا۔ اور اگر چاند کا زمین سے فاصلہ کم ہوتا تو مدّوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوتیں کہ کرۂ ارض لہروں کی لپیٹ میں آجاتا اور اگر یہ فاصلہ زیادہ ہوتا تو ساحلی علاقے مدّوجزر کے فوائد سے محروم رہ جاتے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمین میں دھاتوں کو سطح کے قریب ہی دفن کیا ہے ۔ اس طرح موجود

تہذیب کا رونما ہونا ممکن ہوا۔ اگر یہ زیادہ گہرائی پر ہوتیں تو ان کا نکالنا مشکل ہو جاتا اور انسان اُن سے مستفید نہ ہو سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمین ہلتی جلتی نہیں بلکہ اسے ثبات اور قرار حاصل ہے۔ اس طرح ہم تجربے اور مشاہدے کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کائنات میں اٹل ابدی اور صحیح قوانین جاری و ساری ہیں۔ یہاں تک کہ بے شعور مادّہ اور رواں دواں توانائی بھی متعین اور صحیح قوانین کے ماننے پر مجبور ہے۔ قرآن اس موقع پر چیلنج دیتا ہے:

ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت فارجع البصر هل تریٰ من فطور ہ

(نہ دیکھے گا تو پیدائش رحمٰن میں کچھ فرق۔ پھر پلٹ کر دیکھو۔ کیا ہے کوئی فتور؟) (الملک آیہ: ۳)

غرض کہ جب ایک مسلم طالب علم تمام قوانین قدرت کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ لازماً تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کائناتی ترتیب ہم آہنگی، نظم و ضبط، افادیت اور مقصدیت محض اتفاق کا نتیجہ نہیں۔ جوں جوں اس کی سائنسی معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور وہ جدید ترین سائنسی حقائق پر غور و فکر اور تدبر کرتا ہے تو وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنا سر اس ابدی اور ازلی قادرِ مطلق کے سامنے جھکا دے جس نے اُسے اور تمام کائنات کو تخلیق کیا ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اسلام کے عملی نظام میں تحقیق یا ریسرچ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیرًا کثیرا

اسے "خیرًا کثیرًا" کہا ہے۔ رسول پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ تم علم کے راوی یا بیان کرنے والے نہ بنو بلکہ اُس کے تحقیق کرنے والے بنو۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ سُنی سُنائی بات اس وقت تک قابلِ قبول نہ سمجھی جائے جب تک اُس کی صحت اور صداقت کا یقین نہ ہو جائے۔ یہ بات ایک دوسری حدیث کے ذریعے اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یہ حدیث علم کے بارے میں یہ بتاتی ہے کہ علم کا ہر جانب سے احاطہ کرنا چاہیئے۔ یعنی علم کے سارے رشتے اور تعلق اور اس کے حدود اور پھیلاؤ کا علم ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی بھی دینی یا دنیوی علم ایسا نہیں جس کا تعلق سائنس کی کسی نہ کسی شاخ سے نہ ہو۔ اس صورت میں ہر علم کا سائنس سے تعلق اور اس کا سائنس سے ملتا جلتا پہلو معلوم ہونا چاہیے ورنہ اس علم کا پورا احاطہ یا حدبندی مکمل نہیں ہو سکتی۔

سائنس بحیثیتِ علم بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ سائنس نہ صرف انسان اور کائنات کی پیدائش اور بناوٹ کا علم ہے، بلکہ اس سے انسان کے ان مقاصد کی، جن کا تعلق دنیا کے ہر پہلو سے ہو، پورا

ہونے میں مدد ملتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ۵۰ صفحات میں علم کا بیان کیا ہے۔ کائنات کی بناوٹ کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ کل شئی عندہ بمقدار یعنی (ہر چیز کا اللہ تعالیٰ کے پاس ایک اندازہ یا مقدار موجود ہے) یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ اللہ نے میزان، وزن یا تول پیدا کی۔ میزان یا پیمانہ وہ قوت ہے جس کی مدد سے انسان ایک چیز کی حیثیت اور قوت کا مناسب اندازہ کرسکتا ہے۔ میزان یا تول سائنس کا بنیادی عمل ہے۔ اور سائنس کا مقصد مقدار، بناوٹ، تعلق اور خاصیت معلوم کرنا ہے۔

سائنس کے علم کا عملی پہلو بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام میں عملی علم کے دو فائدے بتائے گئے ہیں۔ پہلا فائدہ یہ کہ وہ علم نفع دینے والا ہو اور دوسرا یہ کہ مخلوق کی ضرورت اور انتظام میں کام آسکے۔ عملی سائنس کو نفع دینے والا علم کیونکر کہا جائے گا۔ اس بات کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ وہ علم جس سے انسان کی ذات اور معاشرے کی بھلائی اور ترقی ہوسکتی ہو، اُس کو نفع دینے والا علم کہنا چاہیے۔ عملی سائنس میں عملی ریاضی، عملی شماریات، عملی نفسیات وغیرہ ایسے علوم شامل ہیں جن کی مدد کے بغیر کسی بات کی پکی تحقیق اور صحیح کیفیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ پھر سائنس کے آلات تعلیم دینے کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی مدد سے علم کی اشاعت اور سمجھ بوجھ میں اضافہ اور آسانی پیدا ہوجاتی ہے۔ اسلام انسانوں کی ضرورت پُورا کرنے والی چیزوں پر بالخصوص اصرار کرتا ہے۔ اس لیے ان کا حصول حکومت یا معاشرے پر لازم ہوجاتا ہے لہٰذا معاشرے میں کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو ان ضروریات کو پورا کرتے رہیں۔ ان ضروری کاموں میں جہاد اور سائنس کا علم بھی شامل ہے اور دوسری ضروریات بھی مثلاً طب، دوا سازی، زراعت، یا کھیتی باڑی، تعمیر یا انجنیرنگ یا کپڑا بننا وغیرہ۔ آج کل کی دنیا میں اس طرح کی صنعتوں کے لیے مشین سازی بھی ایک لازمی بات ہے۔ اور ان امور میں ترقی اور افادیت بڑھانے کے لیے سائنس کے اوزار اور آلات کا بنانا بھی شامل ہونا چاہیے۔ چنانچہ اطلاقی سائنس بالخصوص مشین سازی، انجنیرنگ، صحت، زراعت یا دواسازی کا سیکھنا اسلامی معاشرے کے لئے فرضِ کفایہ کا درجہ رکھتا ہے۔ نئے آلات اور تجربات نے ہم پر بہت سے ایسے بھید کھول دیے ہیں کہ زندگی کا اب سائنس کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہوگیا ہے۔ انسان اب کائنات اور اپنی ذات کے ہر پہلو کو جاننے اور سمجھنے کے لیے سائنس کا محتاج ہے۔

سائنس روز بروز نئی نئی باتیں بتاکر انسان کے دل و دماغ میں ایک بے چینی اور تڑپ پیدا کرچکی ہے۔ آج انسان علم اور سمجھ کی اس منزل پر ہے جو ابھی ناتمام اور نامکمل ہے۔ اس صورت میں انسانی رُوح بے تابی کے ساتھ سائنس کے میدان میں آگے بڑھنا چاہتی ہے لہٰذا سائنسداں کوشاں ہیں

کہ وہ علم کو ترقی دینے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں۔
یہ نہ صرف علمی جہاد ہے، بلکہ انسانی زندگی کی بقا اور انسانی روح کی تسکین کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ پھر اس کے علاوہ دنیا کے موجودہ حالات اور انسانی نسل کی بڑھتی ہوئی آبادی نے یہ بات اب صاف اور واضح کر دی ہے کہ سائنسداں اپنے علم ہی کے ذریعے خلقِ خدا کی خدمت کی کوئی نہ کوئی صورت نکال سکتا ہے۔ انسانی معاشرے کی خیریت اس کی حفاظت، انسان کے جسموں کی صحت، خوراک کے مسائل اب ہر ملک کے لیے زندگی کے اہم ترین مسئلوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان مسئلوں کے حل کرنے والے انسانیت کے بہترین فرزند اور محسن شمار کئے جاتے ہیں۔ اب سائنسدانوں کے لئے یہ امر فخر اور سربلندی کا ایک اعلیٰ کارنامہ قرار دیا جاتا ہے کہ وہ بیماری، افلاس، بھوک، سماجی روگ اور انتشار، امن کی حفاظت یا دفاعی آلات میں کوئی بھی نئی بات معلوم کر لیں۔ چنانچہ اسلامی معاشرے میں سائنس کو آئیڈیل کا مقام دینا چاہیے۔ اور مسلمان سائنسدانوں کو سائنس کے بنیادی اور عملی یا اطلاقی پہلو پر اس طرح کام کرنا چاہیے جیسے کوئی مسلمان جہاد کر رہا ہو۔ علاوہ ازیں سائنس کے سارے نقطۂ نظر کو انسان کی بھلائی اور خدمت کی طرف اس جذبے اور شوق سے پھیلانا چاہیے، جیسے انسان کسی دینی، روحانی یا جذباتی کام میں لگا ہوا ہو۔ سائنس کو مسلمانوں کی نئی معاشرتی تنظیم میں ایک واضح اور خاص اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ سائنس، علمی اور عملی دونوں لحاظ سے، زندگی کے عمل، قیام اور ترقی کے لیے ضروری اور لازمی امر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب جبکہ معاشرے کی بنیاد علم اور سوجھ بوجھ پر قائم ہے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اسلام نے ہر مرد و عورت پر علم حاصل کرنا کیوں فرض کیا ہے۔ اس طرح انسان یہ جان لیتا ہے کہ اس کو کونسے کام کرنے چاہئیں اور کونسے کاموں سے بچنا چاہیے۔ جیسے جیسے معاشرہ اور تمدن ترقی کرتا رہا ہے یہ باتیں، جن کا جاننا ضروری ہے، اور بھی زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔ ان کے لیے اب ایک ایسے شعور اور سمجھ کی ضرورت ہوتی ہے جن کی بنیاد صرف علم ہی پر قائم رہ سکتی ہے، جن میں سے بہت سی چیزیں سائنس کی بنیادی معلومات کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ اس وجہ سے یہ کہنا لازم ہے کہ آج کل مسلمانوں کے معاشرے کے لیے علم سیکھنا پہلے سے زیادہ ضروری ہے۔ اسے قومی زندگی اور موت کا مسئلہ بھی اگر بنایا جائے تو بھی بے جا نہ ہوگا۔ اور جو باتیں علم کے نصاب میں شامل کی جائیں ان میں سائنس کی عام اور صحیح معلومات ضرور موجود ہوں۔
معاشرے کا ایک دوسرا پہلو انسان کے پیشے یا کمائی کے طریقوں سے تعلق رکھتا ہے۔ آج کل کی دنیا میں انسان کی معاشی یا مالی ضروریات بہت بڑھ گئی ہیں۔ رہنا سہنا، غذا، خوراک، لباس، آمد و رفت کے ذرائع، تعلیم اور صحت کے لیے انسان کو اب پہلے سے زیادہ رقم کی ضرورت ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ

معاشرے کا معیارِ زندگی اونچا ہو رہا ہے۔ اس بات کے لیے ایسے پیشوں اور حرفتوں کی ضرورت ہے جن کی مدد سے قوم کی پیداواری قوت میں اضافہ ہو تاکہ لوگوں کی آمدنی بھی زیادہ ہو سکے۔ لہذا ضروری ہو جاتا ہے کہ مشینوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جائے۔ نیز ہمارے نظامِ تعلیم میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ہمارے تمام روزی کمانے والے افراد عملی سائنس اور ٹیکنیکل تربیت کے کسی نہ کسی پہلو سے واقف ہو جائیں۔ بالفاظ دیگر ہماری ساری قوم کی معیشت کا میکنیکل اور ٹیکنیکل تعلیم اور تربیت سے زیادہ گہرا میل جول یا رابطہ پیدا کیا جائے۔

مسلمانوں کے معاشرے میں آجکل سائنس کی تعلیم ایک نمایاں ولولے یا نصب العین کی کیفیت سے خالی ہے۔ ایک زمانہ تھا جبکہ اسلام کے شیدائی سائنس کے بھی شیدائی تھے اور اپنی ساری زندگیاں سائنس کی تعلیم اور تحقیق میں گزارتے تھے۔ اس وقت سائنس یونان کے زوال کے بعد ایک ہزار سال تک مُردہ اور لاپتہ ہو گئی تھی۔ مسلمانوں نے اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر زندہ اور طاقتور علم بنایا۔ اگر ہم ان مسلمانوں کی زندگی پر نظر ڈالیں اور اُن کے زمانے کے خیالات کا کھوج لگائیں تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اگر اُس دور میں سائنس کو ایک علمی آئیڈیل یا نصب العین سمجھا جاتا تھا اور لوگ اُسے انتہائی شوق اور دلچسپی سے حاصل کرتے تھے تو اُس کا سبب یہ تھا کہ حکومت، عوام اور خواص سب یہ سمجھتے تھے کہ کائنات کی معلومات حاصل کرنا بڑی ضروری اور اہم بات ہے۔ سورج، چاند، ستارے، زمین کی گردش اور کائناتی واقعات اور حالات کے علاوہ زمین کا جغرافیہ، سیر و سیاحت، انسان، حیوان، نباتات، اور معدنیات کا علم ریاضی اور پیمائش اور میکانکی علم ساری قوم کے لئے دل کش ترقی اور عزت کا سبب سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ جہاں رُوحانی پیشوا کو امام کہا جاتا تھا، وہاں سائنسداں کو شیخ الرئیس کہا جاتا تھا۔

خود سائنس دانوں کے لیے سائنس کی حیثیت صرف ایک معاشی پیشے یا ہُنر کی نہ تھی بلکہ وہ اسے ایک عظیم الشّان با مقصد نصب العین سمجھتے تھے۔ چنانچہ لوگ ہزاروں میل سائنس کی طلب میں سفر کرتے تھے۔ سینکڑوں راتیں جاگ کر ستاروں کی گردش دیکھتے رہتے تھے۔ نباتات، حیوانات، دریا اور پہاڑوں کی معلومات میں برسوں گزار دیتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے یہ مال و دولت کا ذریعہ نہ تھا بلکہ یہ اُن کے لئے ایک جذباتی ولولہ یا شوق بنا ہوا تھا اور بہت سے لوگ " ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرًا کثیرا " کی عملی تفسیر پیش کرتے ہوئے اُسے خلقِ خدا کی خدمت سمجھ کر حاصل کرتے اور پڑھاتے تھے۔

اس سلسلے میں پروفیسر محی الدین خلوت لکھتے ہیں کہ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ اسلام کے نام لیوا تہذیب کے عَلَم بردار اور عصرِ جدید کی سائنس کے بانی تھے۔ ان لوگوں کو یہ بات یقیناً اچنبہ معلوم ہوگی جو

یہ سننے کے عادی ہو چکے ہیں کہ اسلام ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے اور وہ سائنسی علوم کا مخالف ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور حق بات تو یہ ہے کہ اگر اسلام معرضِ وجود میں نہ آتا تو سائنس کی تعلیم بھی پردۂ اخفا میں رہتی۔

مغرب کا ایک ممتاز مصنف رابرٹ بریفالٹ اپنی کتاب تشکیلِ انسانیت میں یوں رقمطراز ہے: "اسلامی تہذیب کے گوں ناگوں اثرات نے سب سے پہلے یورپین زندگی کو جلا بخشی۔ سائنس ایک بڑی حد تک عربوں کی ثقافت کی مرہونِ منت ہے۔ یونانیوں کے علمِ فلکیات اور ریاضیات اُن کے اپنے نہ تھے۔ تحقیق کے صبر آزما طریقے، مثبت معلومات کی تدوین، طویل مشاہدات اور تجرباتی تحقیق سے یونانی دل و دماغ بالکل ناآشنا تھے۔ عربوں نے ہی دنیائے یورپ کو سائنسی اسپرٹ اور تحقیقی طریقوں سے متعارف کیا۔" لہٰذا اگر مسلمان اپنی جستجو اور کاوش آب دیدا و خونِ جگر سے سائنس کی آبیاری نہ کرتے تو وہ موجودہ ترقی کے منازل طے نہ کر سکتی۔ ارتقار کے متفقہ اصولوں کے مطابق یہ میراثِ اعلا مسلمانوں ہی سے یورپ کو منتقل ہوئی۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

حکمتِ اشیار فرنگی زاد نیست اصلِ او جز لذّتِ ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلمان زادہ است این گہر از دستِ ما افتادہ است
چون عرب اندر اروپا پر کشاد علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند حاصلش افرنگیاں برداشتند
این پری از شیشۂ اسلافِ ماست باز میدش کن کہ او از قلبِ ماست

خواتین و حضرات!

جدید سائنسی اسپرٹ اور اسلامی اسپرٹ میں جو اہم نقطۂ اختلاف ہے، وہ تشریح طلب ہے۔ جہاں جدید مغرب نے قوت اور عیش و عشرت کی ناجائز خواہش کو پورا کرنے کے لیے سائنس کو آلۂ کار بنایا، وہاں اسلامی تحقیقات کی مدد سے ان وسائل اور ذرائع کی جستجو کرتا ہے، جس سے انسانیت کی خدمت کا فرض ادا ہو اور وہ رُوحانی طور پر بلند مقام حاصل کر سکے۔ بقول سید محمد قطب المصری:

"تیز رفتار طیاروں، ایٹم بموں، ریڈیو اور ٹیلی وژن کو ترقی نہیں کہہ سکتے۔ ان کو ترقی کے مترادف قرار دینا غلط بینی ہے کیونکہ یہ چیزیں ترقی ناپنے کا کوئی انسانی پیمانہ ہمیں دینے سے یکسر قاصر ہیں۔ اگر حقیقی ترقی معلوم کرنا ہے تو یہ دیکھیے کہ انسان کو اپنی حیوانی خواہشات اور جذبات پر کامل قابو حاصل ہے۔ یا وہ ان کے ہاتھوں میں اب تک کھلونا بنا ہوا ہے۔ اگر انسان اب بھی اپنی خواہشاتِ نفس کے سامنے بے بس اور عاجز ہے اور وہ ان سے اوپر اُٹھ کر کوئی بات سوچ ہی نہیں سکتا تو سمجھ لیجیے کہ انسان حقیقی

ترقی سے ابھی کوسوں دُور ہے اور بہ حیثیت انسان اُس کی حالت علم وفضل اور سائنس کے میدانوں میں ان تمام خیرہ کن کامیابیوں کے باوجود قابلِ رحم ہے۔ بجائے کہ اسے ترقی یافتہ اور کامیاب قرار دیا جائے۔"

بے جانہ ہوگا اگر یہاں میں ایچ، جی، ویلز کے مقالے "سائنس اور دنیا" سے اقتباس پیش کروں۔ وہ لکھتے ہیں: "میں نے ایک ایسی قدآور دوربین دیکھی ہے جو ابھی زیرِ تعمیر ہی ہے۔ وہ مجھے نہایت کامیاب نظر آئی۔ وہ میرے اعصاب پر مسلّط ہوگئی۔ میں مہینوں اس کے متعلق سوچتا رہا۔ میں عزائم اور ادراک کے اس دیو قد شاہکار کی موجودگی میں کوتاہ قد نظر آیا۔ اس کے باوجود میں کہوں گا کہ دوربین بنانا اتنا ضروری نہیں، جتنا فلاحِ انسانیت کا خیال۔"

میرے خیال میں خلائی پروگراموں پر سالانہ اربوں ڈالر خرچ کرنے والوں کے لیے ایچ، جی، ویلز کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے۔

اسلامی اسپرٹ کی بات ہو رہی تھی۔ ذیل کی آیات میں یہ مفہوم بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا گیا ہے:

اِنّ فی خلق السّمٰوات والارض واختلاف الّیل والنّھار لاٰیات لاولی الالباب الّذین یذکرون اللہ قیامًا وّ قعودًا وّ علیٰ جنوبھم ویتفکّرون فی خلق السّمٰوات والارض ربّنا ما خلقت ھذا باطلا سُبحٰنک فقنا عذاب النّار (اٰل عمران ۱۹۲-۱۹۱)

(بلاشبہ آسمان اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات دن کے آنے جانے میں ان اہلِ عقل کے لیے دلائل ہے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے بھی، بیٹھے بھی، لیٹے بھی، اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے پروردگار تو نے انھیں لایعنی پیدا نہیں کیا۔ ہم آپ کو منارہ سمجھتے ہیں۔ ہمیں دوزخ کی آگ سے بچائیے)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ ایمان اور یقین کے ساتھ کائنات کے بارے میں تحقیقات کرتے ہیں وہ حقیقتِ کائنات اور خدا کی ذات و صفات کے بارے میں صحیح نتائج پر پہنچتے ہیں۔ بغیر ایمان اور یقین کے یہ تو ممکن ہے کہ سائنسی تحقیقات کر کے کسی قانونِ طبیعی کا علم حاصل کیا جائے اور اس کی بنا پر کوئی ایجاد یا اختراع بھی عمل میں آجائے، لیکن اس کائنات کی اصل حیثیت اور

حقیقت کا پتہ لگانا ایسے لوگوں کے لیے ممکن نہیں جو ایمان نہ رکھتے ہوں ۔

وماتغنی الآیات والنذر عن قوم لا یومنون (یونس ۱۰۱)

(اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کو دلائل اور دھمکیاں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے)

قرآنِ حکیم کی ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مناظر قدرت پر تفکر اور تدبر علم کے حصول کا ایک بہت بڑا ماخذ ہے کیونکہ اس تفکر اور تدبر سے ہی ذہنِ انسانی بیدار ہوتا ہے اس میں تخلیقی قوت پیدا ہوتی ہے اور اپنی ضروریات اور سہولت کے لیے کائنات کی مختلف اشیا سے کام لے کر مختلف چیزیں بناتا ہے ۔ اسی طرح صنعتوں کی بنیاد پڑتی ہے ۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآنِ حکیم ہمیں سائنسی علوم کے حصول کی تلقین کرتا ہے ۔

ادھر کچھ عرصہ سے یہ عقیدہ زور پکڑتا جارہا ہے کہ سائنس مذہب کا مخالف ہے، مگر واقعات اس نظریے کی تائید نہیں کرتے کیونکہ سائنس داں تو شب و روز یتفکرون فی خلق السموات والارض کے مصداق آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں ۔ حقیقتاً سائنس تمام مادّی علوم کا سرچشمہ، معلومات کا خزینہ اور معرفتِ الٰہی کا زینہ ہے ۔ اس کا کام مادیات کے پُرپیچ راستوں کے ذریعے انسان کو حق و صداقت تک پہنچانا اور علم کیمیا طبیعیات، حیاتیات، نباتیات، حیوانیات، ریاضیات، مرکبات، شماریات، ارضیات اور فلکیات وغیرہ کے ذریعے اسرارِ فطرت کا سُراغ لگانا ہے ۔ اس لیے مذہب اور سائنس دو متضاد قوتیں ہیں بلکہ بقول علامہ اقبال:

"سائنس اور مذہب کی حقیقت تک پہنچنے کے دو مختلف راستے ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مذہب کی بنیاد الٰہیات پر ہے جو قطعی اور حتمی ہے جن میں غلطی اور تنسیخ کا کوئی امکان نہیں اور سائنس کی بنیاد عقلیات پر ہے جس میں ہر وقت غلطی اور تبدیلی کا امکان رہتا ہے ۔"

ہمارے بعض نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سائنس داں خدا کا منکر ہے ۔ اُن کے لیے میں ماہر عضویات انڈریو کان وے کا قول پیش کرتا ہوں، اس بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ "یہ سائنس داں پر ایک تہمت ہے ۔ سائنس کی دنیا میں جتنے بھی نامور لوگ گزرے ہیں اُن کی عظیم اکثریت خداوند تعالیٰ کے وجود کی قائل ہے ۔ اُن کا خدا تو اس اندازِ فکر ہی کے منافی ہے جس کے مطابق ایک سائنس داں سوچتا اور تحقیقات کے میدان میں آگے بڑھتا ہے ۔ وہ اپنے کام کا آغاز اس بنیادی تصور سے کرتا ہے کہ کوئی مشین بھی مشین ساز کی قوتِ فکر و عمل کے بغیر معرض وجود میں نہیں آسکتی ۔"

اس قسم کے شکوک دراصل ہم تک انگریزی کتابوں کے ذریعے پہنچے ہیں جن کے پس منظر میں سائنس اور

عیسائیت کا طویل ٹکراؤ ہے۔ ہوا یوں کہ جب سائنسی علوم سائنسی اسپرٹ اور ایجادات یورپ میں براستۂ اسپین اور سسلی پہنچے اور اس تحریک کا آغاز ہوا جسے یورپ کی تاریخ میں "تحریک احیائے علوم" کہتے ہیں، تو بقول ایچ۔ جی ویلز، "اس وقت پادریوں نے اس فطری فلسفے کو دبانے کی سعیٔ بلیغ کی۔ سادہ لوح اور جاہل عوام سے کہا گیا کہ یہ نئی تہذیب، یعنی سائنس، مذہب اور تقدس کا انجام بن کر آئی ہے۔ اس لیے اسے اختیار نہ کرو اس کے خلاف جہاد کرو۔"

اس طرح کلیسا کی تحقیقاتی عدالتوں نے سائنس دانوں کو کوڑے لگوائے، انھیں قید میں رکھا، اُن پر انواع و اقسام کے مظالم روا رکھے اور بعض صورتوں میں زندہ جلا دینے کا حکم دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس کے علمبردار مذہب سے مکمل طور پر دل برداشتہ، متنفر اور بیزار ہو گئے۔ مذہب اور ہر قسم کی رُوحانیت کی تعلیم کو خیر باد کہہ کر تذبذب، شک اور دہریت کے خیموں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ جب ان کے دماغوں سے مذہب کا وجود ہی نکل گیا تو ایک خلا پیدا ہو گیا، مگر انسان ایک خلا میں نہیں رہ سکتا۔ اُس کو زندہ رہنے کے لیے ایک عقیدے اور نظریے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ ان عیسائیت بیزار سائنس دانوں کو مشینی مادّیت اور دہریت کی شکل میں مل گیا۔ اس نئے عقیدے کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس عقیدے میں خدا، رُوح اور آخرت کا کہیں نام و نشان تک بھی نہ آتا تھا اور زندگی محض بے کار اور بے مقصد تصوّر کی جاتی تھی۔ انصاف، سچائی، حق پسندی، ایمانداری، قربانی، بے لوث اور بے غرض خدمت اور پاکبازی وغیرہ کا اس عقیدے میں کہیں نام و نشان تک بھی نہ تھا اور ان اخلاقِ عالیہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی اور نہ ہی انسانی زندگی میں ان اقدارِ حیات کے لیے کوئی جگہ تھی۔ یہ عقیدہ کسی مذہب اور کسی اخلاقی ضابطۂ حیات پر یقین کا حامل نہیں تھا، نہ ہی اس عقیدے میں ضمیر کے وجود پر ایمان تھا۔ نہ ہی اس عقیدے کے اپنانے والے آخرت اور حساب کتاب پر ایمان رکھتے تھے۔ اس عقیدے کی رُو سے انسان کو حیوانات سے ترقی یافتہ جانور سمجھا جاتا تھا اور اُسے بنیادی طور پر محض ایک اعلیٰ حیوان یا حیوانِ ناطق کا درجہ دیا جاتا تھا۔ مغربی سائنس دانوں کا یہ عقیدہ اور یہ مادّیت لامذہبیت اور دہریت پر استوار سائنس یورپی اقوام نے ایشیا اور افریقہ کی نو آبادیوں میں رائج کی۔

برِّصغیر پاک و ہند میں انگریزی نے بھی یہی کچھ کیا۔ اس طرح طلبا کے ذہنوں میں اپنے مذہب اور علمائے مذہب کے حق میں حقارت اور نفرت کا بیج بو یا گیا۔ علمائے اسلام اس پر برانگیختہ ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ ان تعلیمی اداروں سے قطع تعلق کریں جن کا مقصد مسلم طلبا کو اپنے مذہب سے بیگانہ کرنا تھا۔ اسی لیے تو علامہ اقبالؒ شاکی ہیں ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

علمائے اسلام کے اس اقدام کو دشمنوں نے غلط رنگ میں پیش کیا۔ کہا گیا کہ اسلام ایک تنگ نظر مذہب ہے۔ اسلام اور سائنس میں تضاد ہے۔ حالانکہ جیسے میں عرض کر چکا ہوں اسلام اور سائنس میں تضاد کیسا۔ وہ تو صحیح سائنس کو معرفتِ حق کا آئینہ سمجھتا ہے۔ اور اُسے کائنات کے پیالے میں شاہدِ ازل کا پرتو نظر آتا ہے۔ بقول حافظ شیرازی ؎

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذّتِ شربِ دوامِ ما

غرض اسلام نے' جو ادب اور احترام کا پیامبر ہے' اسے دیگر اشیا کی طرح علوم سائنس کا نہ صرف ذہنی و فکری پاس و ادب سکھایا بلکہ اُس نے واشگاف الفاظ میں پُکار کر کہا کہ انسانیت کی فلاح احترام ہی کے جذبات پر مبنی ہے جس میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی تعلیمات کی عظمت اور احترام سے لے کر کائنات کے ذرّے ذرّے کا احترام شامل ہے۔ ہر مفید چیز کا احترام' ہر صحیح فکر و نظر کا احترام' ہر مفید دن کا احترام' نہ صرف جذباتی اور لسانی احترام' بلکہ حقیقی اور عملی احترام' جس میں مفید سائنسی علوم کا احترام دینی علوم کے بعد سب سے اونچا مقام رکھتا ہے۔ پس ہماری گفتگو کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ حدودِ الٰہیّہ کے اندر سائنس کا وہ احترام دلوں میں سمو لیں جو ہمیں ہر لمحے اکتشافات و معلومات ایجادات و مصنوعات کی نئی دنیا سے ہمکنار کرتا رہے اور ہم اقوامِ عالم کی دینی قیادت کے ساتھ علمی اور سائنسی سیادت بھی سنبھال سکیں۔

اسلام زندہ باد۔ پاکستان پائندہ باد



ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر محمد اجمل (صدرِ مجلس)، حکیم محمد سعید



مہمان مقرر
محترم ڈاکٹر محمد باقر
خطاب کر رہے ہیں۔



(دائیں سے) حکیم محمد سعید، ڈاکٹر محمد اجمل، جناب عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر محمد باقر اور پروفیسر ڈاکٹر محمد اجمل

احترامِ اُستاد

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمّد سعید

مقالہ : جناب محترم ڈاکٹر محمّد باقر

شامِ ہمدرد، لاہور

۳ر فروری ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

اس دنیا میں طاقت اور قوت کے بڑے بڑے مظاہر نظر آتے ہیں، لیکن حقائق پر جن کی عمیق نظر ہے اور جو لوگ حقائق و معارف کے ادراکِ صحیح کے وصف سے متصف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اخلاق سب سے بڑی طاقت ہے اور طاقتِ اخلاق کی نمائش کرنے ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کو اخلاقِ حسنہ کا مظہر بنایا ہے، اور اسی بنا پر انبیائے کرام علیہم السّلام نے اپنی بعثت کا مقصد تکمیلِ اخلاق قرار دیا ہے۔

اخلاق و احترام کو نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ اگر ہم غور کریں تو اقوام و ملل کی ترقی و تنزل، اُن کے مد و جزر اور عروج و زوال کی ہر داستان اخلاق اور عدمِ اخلاق اور احترام اور عدمِ احترام کے تابع ہے۔ اُستاد بھی اس دائرے سے باہر نہیں اور احترامِ اُستاد بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ جن اقوام و ملل نے اس حقیقت کا ادراک نہیں کیا کہ احساسِ ملّی اور احترامِ علم کے بغیر اچھا علم و عالم وجود میں نہیں آسکتا، اور جب تک خودداری کا وصف اس میں نہ ہو احساسِ ملی بیدار نہیں ہو سکتا اور خودداری فقط حریّتِ فکر اور آزادی کا ثمر ہے۔ ایسی غیر متوازن اقوام کا انجام اُڑتی ہوئی خاک ہوا ہے اور اُن کی ہر داستان مبہم ہو کر رہ گئی ہے۔

آج ساری دنیا ایک شدید قسم کے تصادم سے دوچار ہے۔ یہ تصادم اُستاد اور شاگرد کا تصادم ہے۔ بنیادی طور پر یہ اخلاقی اور غیر اخلاقی قوتوں کا تصادم ہے۔ میرے لیے یہ حکم لگانا مشکل ہے کہ اس تصادم کے نتائج کہاں کہاں کیا کیا ظہور میں آئے ہیں۔ مگر پاکستان کے بارے میں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہاں تمام اخلاقی اقدار کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے اور استاد کے مقام کو قطعی طور پر غیر متعیّن بنا دیا گیا ہے۔ یہ صورتِ حال کسی طرح بھی اور کسی بھی دَور میں مضرتوں سے خالی نہیں رہی ہے۔ ہم پاکستان میں استاد اور طالب علم کے رشتۂ احترام کے منقطع ہو جانے کے نتائج کا مشاہدہ کر سکتے ہیں اور اس کے ہولناک اور سنگین نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ اگر یہ غیر اخلاقی قوتوں کی فتح ہے تو اس فتح و نصرت کے ہاتھوں ہم نے پاکستان میں اب تک کیا کھویا ہے اس پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان اور انتشارِ مغربی پاکستان محض ہماری دنیاوی طاقت میں کمزوری آجانے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا بلکہ ان اخلاقی اقدار کے مجروح ہو جانے کا نتیجہ ہے جو ہر طاقت کی اساس اور بنیاد مبنی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں ہماری فوجی

طاقت ۱۹۶۵ء کے مقابلے میں قطعی طور پر زیادہ تھی۔ ۱۹۶۵ء کے مقابلے اور ۱۹۷۲ء میں ہماری اخلاقی طاقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان دونوں کا فرق بڑا واضح ہو کر ہمارے سامنے آچکا ہے۔ آج جو لوگ عظیم المرتبت اور رفیع الشان اقوام و ملل کی موت پر ماتم کناں ہیں ان کو صرف مادی طاقتوں ہی کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ اُن کے اخلاقی تغیرات پر بھی نظر رکھنی چاہیئے جو سطوتِ عامّہ کا جزو لاینفک ہیں۔ اس انداز کی حکیمانہ نگاہ سے صرف یہی ثابت ہوگا کہ ترقی و تنزل صرف اخلاقی انقلابات کا نتیجہ ہیں۔ اخلاق کی زبردست طاقت کے سامنے ہر مادی قوت نے ہمیشہ سر تسلیم خم کیا ہے۔ عربوں کو اسی اخلاقی طاقت نے اُبھارا تھا اور اسی کے تنزل نے اُن کو موجودہ گمنامی تک پہنچا دیا ہے۔ پاکستان کو اسی طاقتِ اخلاق نے وجود بخشا ہے اور اُس کے زوال نے آج پاکستان کو ذلّت و گمراہی کی بے رحم طوفانی موجوں کے حوالے کر دیا ہے

[ولعل الله یحدث بعد ذالك امرا]

اور شاید خدا اس کے بعد بہتری کی کوئی صورت پیدا کر دے (الطلاق آیہ: ۱)

جناب ڈاکٹر محمد باقر صاحب اور جناب ڈاکٹر محمد اجمل صاحب ہماری جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ دونوں اُستاد کے مرتبے پر فائز ہیں اور دونوں کا شمار دنیائے تعلیم و تعلّم کے فضلا میں ہے۔ احترام اُستاد کے موضوع پر یہ دونوں جو کچھ ارشاد فرمائیں گے وجۂ فکر و عمل ہوگا۔

جناب محترم ڈاکٹر محمد باقر

ماضیٔ قریب سے ذرا پیچھے ہٹ کر اپنی تاریخ پر ایک نظر ڈالیے۔ اساتذہ اور علما کے لیے معاشرے میں بالعموم اور ہیئتِ اقتدار کے ہاں بالخصوص جو احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا اُس کی بے شمار مثالیں صفحاتِ تاریخ پر جگمگا رہی ہیں۔ راقم صرف چند ایک کی طرف آپ کی توجّہ مبذول کرانا چاہتا ہے۔ علم پروری بیشتر مسلمان حکمرانوں کا شیوہ رہا ہے۔ شانی تکلو شاعر فصیح البیان اور معلم شاہ عباس صفوی (۱۵۵۷-۱۶۲۹) کا مدح گستر بھی تھا۔ ساری عمر عنایات شاہی سے صلات و وظائف کی شکل میں مستفیض ہوتا رہا لیکن جب اُس نے بادشاہ کی تعریف میں یہ شعر لکھا

اگر دشمن کشد ساغر وگر دوست
بطاق ابروی مستانۂ اوست

(دشمن اور دوست دونوں کو اسی کی طاق ابروئے مستانہ کی بدولت ساغر عیش ونشاط میسّر ہے)

تو حکم ہوا کہ شانی کو رُپوں میں تول کر یہ رقم اسے ادا کر دی جائے۔

اپنے گھر یعنی سابقہ ہندستان کے سابقہ حکمراں سلطان شہید قطب الدّنیا والدّین ایبک سلطان (۱۲۰۶-۱۲۱۰) نے کئی علما کو ہاتھی کے ہم نزاد روپے بخش کر "لکھ داتا" کا لقب پایا۔ جہانگیر نے حیاتی کاشی کو اپنے وزن کے ہم سنگ رُپے تلوا کر دیے۔ اور شاہ جہاں نے تو متعدد آدمیوں کو اُن کا ہم وزن رُپیہ بخشا۔ مثلاً اس کی عنایاتِ خسروانہ سے کلیم، قدسی، باقیا اور سعیدا جیسے عالم اور شاعر فیض یاب ہوئے۔ اور مورخوں کے بیان کے مطابق اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم اور اُستاد مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی دو بار صیغۂ فضیلت کے اعتبار سے میزانِ عنایت میں تولے گئے اور ہر بار چھے ہزار رُپے انعام پایا (اس لحاظ سے مولوی صاحب کا وزن تقریباً ڈیڑھ من تھا) شاہ جہاں نے مشہور معاصر عالم قاضی محمد اسلم پدر مصنّف رسالہ میر زاہد و صاحب حواشی کو ۱۰۵۲ ہجری میں رُپوں میں تلوایا جو وزن میں ساڑھے چھے ہزار تھے۔ ایک بار گھوڑے سے گر گئے تو چار مہینے صاحبِ فراش رہے۔ شفا پائی تو کابل گئے۔ جہاں شاہ جہاں نے اُنھیں دس ہزار رُپے انعام میں دیے۔ اُنھوں نے ۱۰۶۱ ہجری میں وفات پائی۔ مزار لاہور میں واقع ہے۔ شاہ جہاں نے اپنے زمانے کے مشہور ترین مورّخ ملا عبدالحمید لاہوری کو بھی چاندی میں تول کر رقم

اُن کو عنایت کی۔
زیب النسا کے معلّموں میں صرف ملا محمد سعید اشرف مازندرانی کا نام تاریخوں میں محفوظ رہ گیا ہے۔ جو اُس کی عمر کے اکیسویں سال میں درسی کتب کے علاوہ فقہ، اصول فقہ اور علم حدیث کی تدریس کے لیے مقرر ہوئے۔ غلام علی آزاد بلگرامی کے ایک بیان سے پتہ چلتا ہے کہ زیب النسا نے اپنے اُستاد کی خدمت کے لیے ایک کنیز معین کی ہوئی تھی۔ اتفاق سے ملا سعید اس سے خوش نہ رہ سکے اور ایک قطعہ کے ساتھ شہزادی کو یہ کنیز لوٹا دی۔
اپنے وقت کے مشہور عالم اور اُستاد نعمت خاں عالی نے اس شہزادی زیب النسا کے پاس ایک مرصع کلغی فروخت کے لیے بھیجی۔ اتفاق سے زیب النسا کلغی وصول کر کے قیمت بھیجنا بھول گئی۔ نعمت خاں عالی نے یہ رباعی لکھ بھیجی۔

ای بندگیت سعادت اخترِ من — درخدمتِ تو عیاں شدہ جوہرِ من
گر جیغہ خریدنی است پس کو زرِ من — ور نیست خریدنی بزن بر سرِ من

(آپ کی خدمت میری قسمت کے ستارے لیے باعثِ سعادت ہے اور آپ کی خدمت کرتے کرتے ہی میری قابلیت کا جوہر اُبھرا ہے۔ اگر کلغی آپ نے خریدلی ہے تو قیمت دلوایئے، اور اگر آپ خریدنا نہیں چاہتیں تو میرے سر پہ دے ماریئے)
یہ گلہ سنتے ہی زیب النسا نے اظہارِ ندامت کے ساتھ کلغی کی قیمت پانچ ہزار رُپلے اسی وقت بھجوادی اور عالم کی قدر افزائی کے لیے کلغی بھی لوٹا دی۔
یہ تو کچھ پُرانی باتوں کا ذکر تھا۔ راقم نے حالیہ تاریخ جو اپنی آنکھوں سے بنتے دیکھی ہے اُس کی ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں:
صدر جمہوریہ امریکا کا سب سے بڑا مشیر ہمیشہ کسی نہ کسی یونیورسٹی کا اُستاد ہوتا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی نکسن کے مشیر پروفیسر کسینجر ہیں جنھیں اس وقت ساری دنیا نکسن سے اُن کے رابطے کی وجہ سے پہچانتی ہے۔
ایران میں متعدد اساتذہ وزارت میں شامل رہتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال، جو پیشے کے لحاظ سے طبیب ہیں، پہلے تہران یونیورسٹی میں پروفیسر ہوئے۔ پھر پرنسپل اور وائس چانسلر بنائے گئے۔ پھر وزیر دربار بنے اور بعد میں وزیر اعظم ہو گئے۔ اس وقت آئل کمپنی کے سرپرست ہیں۔ راقم اُن کے متعدد ہم پیشہ اساتذہ کو ذاتی طور پر جانتا ہے جو مختلف وزارتوں میں وزیر بنائے گئے۔
دوسرے ہمسایہ مسلمان ملک افغانستان میں ظاہر شاہ کے اتالیق خلیل اللہ خاں خلیلی، جو ایک معروف شاعر بھی ہیں، پہلے وزیر بنائے گئے اور اب سفارت کے عہدے پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر

انس خاں کابل یونیورسٹی کے پروفیسر تھے اور سائنس اور ریاضی کے اُستاد تھے۔ انھیں چند سال پہلے قندھار کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

مسلمانوں کے ہاں قدرافزائی کی اس رسم کا اصطلاحی نام "بہ زر کشیدن" (سونے میں تولنا) بھی کچھ دیر پہلے تک معروف رہا، لیکن اپنے ہاں بدقسمتی سے حالات کی رَو اس طرح چلی کہ ہیئتِ اقتدار کے متوسلین میں اساتذہ اور پروفیسروں کے لیے کوئی جگہ یا مقام نہ نکل سکا۔ یہاں ان حکمرانوں کا سلسلہ چلا جو کسی ہنر، فن، علمی فضیلت، جوہرِ قابل، سماجی خدمت، دین کے فروغ اور تبلیغ کی مساعی کی اہمیت کے قائل ہی نہ تھے۔ انھوں نے زمینیں، جاگیریں، رُوٹ پرمٹ، ٹھیکے، امپورٹ لائسنس، عوام کے بنکوں سے قرضے صرف اُس مخلوق کو دیے جو زراندوزی، سودخوری اور استحصال میں ماہر تھی۔

یہاں تک تاریخ کی بات تھی اور اساتذہ کی قدیم قدرشناسی اور حالیہ ناقدری کا ذکر تھا۔ قدرشناسی احترام کا ایک مظہر ہے۔ جب ہم اُستاد کے احترام اور بے احترامی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ ان دونوں مظاہر کا سبب کیا ہے۔ ایک بات تو بالکل صاف اور سیدھی نظر آتی ہے کہ اُستاد کا حقیقی احترام صرف اسی صورت میں معاشرے میں جنم لیتا ہے جب وہ اپنے فرائض سے صحیح معنی میں عہدہ برآ ہوتا ہے۔ اُستاد کے ذمّے بنیادی طور پر دو فرائض لگائے گئے ہیں: ایک یہ کہ وہ مطالعہ اور تحقیق سے ہر لحظہ اپنا علم بڑھاتا رہے اور دوسرے یہ کہ اس علم سے متعلّمین کو فیض یاب کرتا رہے۔ بدقسمتی سے اس ملک میں انگریز کے استعمار اور طریقۂ تعلیم نے اُستاد کے احترام کے ضامن عوامل کو بُری طرح مجروح کیا۔

لارڈ کرزن نے اب سے تقریباً ستّر سال پہلے ۲ ستمبر ۱۹۰۱ء کو شملہ میں منعقد ہونے والی تعلیمی کانفرنس میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا:

> "ہم گزشتہ ستّر سال سے ایک ایشیائی قوم کو انگریزی تعلیم دینے میں مصروف ہیں میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ اس دور سے قبل اس ملک میں تعلیم کا انتظام نہیں تھا، تعلیم بے شبہ موجود تھی لیکن یہ تعلیم دائرۂ اثر میں محدود، عمل درآمد میں مخصوص اور اور غیر مسلسل، غیر مذہبی ہونے کے بجائے مذہبی اور نوعیّت کے اعتبار سے عملاً افادیت پسند ہونے کی جگہ نظریاتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں سائنسی تنظیم کا فقدان تھا اور صرف مردوں تک محدود تھی۔"
>
> (اخبار پانیر ۶/۷ ستمبر ۱۹۰۱ء)

لارڈ کرزن غالباً کافی معلومات بہم نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے اس قسم کا غیر محتاط انتقاد کر گئے کہ ہمارا پُرانا نظامِ تعلیم:

- علمی تنظیم سے یکسر عاری تھا۔ اور
- اس سے استفادہ صرف مرد ہی کر سکتے تھے۔

کیونکہ ہمارے پاس فارسی کے ایسے منابع موجود ہیں (اور اس زمانے میں ہماری تاریخ فارسی ہی میں ضبط ہو رہی تھی) جن سے یہ واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ اس نظامِ تعلیم کی تنظیم علمی اور عملی حیثیت سے نہایت عمدہ تھی اور تعلیم کے دروازے عورتوں پر بھی وا تھے۔ انگریزوں کے فاتحانہ قبضے کے فوراً بعد ابتری کے دور کو معیاری یا نمونے کے طور پر رکھنے کے لیے پیش نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس دور سے ملحق ماضی میں ہمارے ہاں مکتب، کتاب خانے، قرائت خانے، اساتذہ، رصدگاہیں، آلات و معمل، غرض تعلیم کے تمام وسائل مجہز اور مہیا تھے، اور اسی نظامِ تعلیم نے ہر دور میں بڑے بڑے مفکر، عالم، شاعر، مہندس، طبیب، سیاست مدار، فوجی جرنیل، منتظمین، مذہبی رہنما یہاں تک کہ ایسے نامور اساتذہ پیدا کیے جن کے کارناموں کو دیکھ کر آج کئی سو سال کے بعد بھی متمدن ترین اور ترقی یافتہ دنیا کے لوگ انگشت بدنداں ہیں۔ یہ موقع ان کارناموں کی تفصیل پیش کرنے کا نہیں کیونکہ پھر موضوعِ سخن بدل جائے گا، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ اپنے مغتنم وجود سے اپنا احترام کرانے والے اساتذہ ماضی کے ان قدیم ادوار میں پیدا ہوتے رہے۔ وہ خود مطالعہ اور تحقیق میں مصروف رہتے اور معاشرے اور تلامذہ کو مستفید فرما کر اپنے احترام کا سکّہ منواتے، لیکن تعلیم کی بات جوں ہی اِس دور سے آگے بڑھی صورتِ حال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اس تقریر میں کرزن نے یہ تسلیم کیا:

> "ہم نے یہاں (یعنی ہندستان میں) انگریزی ماڈلوں کی انتہائی غلامانہ نقالی سے ابتدا کی تھی اور آج بھی ہم اپنے آپ کو اس بدنما دھبّے سے چھٹکارا نہیں دلا سکے مثال کے طور پر ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ہندستان کو یونیورسٹی کے معیار کی جس تعلیم کی ضرورت ہے اس کا مقصد محض لندن یونیورسٹی کی نقالی سے پورا ہو جائے گا۔
> بعد کے ادوار میں ہم نے یورپ کے تعلیمی باغات سے ضمنی اصلاحات کے پھول چُن چُن کر برِصغیر میں اُن کی باقاعدہ پیوندکاری کرنے کی سعی کی۔ پھر ہم نے اپنے تئیں یہ تصوّر کر لیا کہ ہندستانی بچّوں کو انگریزی سکھانے پڑھانے کے لیے یہ اقدام کافی ہے۔ حالاں کہ انھوں نے ابھی اپنی دیسی زبانوں پر بھی عبور حاصل نہیں کیا تھا۔
> تعلیم دراصل زندگی کی ایک [illegible] ارتقائی صورت ہے جو زندہ لوگوں کے ذریعے زندہ افراد کے لیے زندہ لوگوں کی طرف سے بہم پہنچائی جاتی ہے مجھے خدشہ ہے کہ ہم اس ارفع مقصد سے ہٹ گئے ہیں"۔

یہ ایک ضمیر دار انسان کی آواز تھی جو بے شک ہمارا خارجی حاکم تھا لیکن اس کا ضمیر جاگ رہا تھا، وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ غلام قوم کے لوگوں کو بھی اس تعلیم اور اس نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے جس سے وہ ذی ہوش تر اور بہتر انسان بن سکیں۔

کرزن نے رائج نظام تعلیم (اور بدقسمتی سے یہ ابھی تک اسی حال میں رائج چلا آتا ہے) میں تعلیم کی تکمیل اور اس کے خطرناک نتائج پر بھی بڑا حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا۔ اُس نے کہا:

"جب میں اپنے ہندستانی اسکولوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم ہزاروں نوجوانوں کی حالت حالت دکیفیت پر غور کرتا ہوں جو محض امتحانات کے لاانتہا ہی سلسلے میں کامیابی کے لیے مطاوبہ نمبر حاصل کرنے کی خاطر مسلسل مشقت کرتے چلے جاتے ہیں تو مجھے یہ صورتِ حال تبت کے اُن سادھوؤں سے کم قابلِ رحم نظر نہیں آتی جو قربان گاہ کے ساتھ لگے اشلوک اور فہم وادراک سے بالاتر منتروں کے کبھی نہ ختم ہونے والے جاپ میں مصروف انسانی نجات کے لیے سرگرداں نظر آتے ہیں"

آپ نے سُنا انگریز جس بے مقصد تعلیم کو ملک میں رائج کر گیا ہے خالی سانچے کتنے بھی چمکدار اور شکل وصورت کے اعتبار سے کتنے بھی خوبصورت ہوں جب تک اُن میں کچھ ڈالا نہ جائے اُن سے کوئی چیز نہیں بن سکتی۔ گر بجویٹ سازی چمک دار سانچے بنانا ہے جو اندر سے خالی ہوتے ہیں جب تک ان میں کوئی مفید مطلب چیز نہیں ڈالی جائے گی اُن سے کارآمد شئے برآمد نہ ہوگی۔ بورڈ اور یونیورسٹیاں ڈگری پر ٹھپّے لگانے والے کارخانے بن گئے ہیں۔ ملّت کی جانوں اور قومی سرمایے سے صرف وہی آدمی خالی سانچے تیار کرتا ہے جو خدا سے نہیں ڈرتا۔ پھر کیا عجب کہ تعلیم اور یونیورسٹیوں کے یہ سب ناخدا ناخدا ترس ہیں اور صرف اپنی بھاری بھاری تنخواہیں اور دوسری آسائشیں وصول کرنے کی ہوس سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ کوئی کہے کہ ایسے تنخواہ کھاؤ اساتذہ کی شاگرد کیسے عزت کریں! احترام احسان، عادلانہ لین دین اور منصفانہ مدد سے پیدا ہوتا ہے اور یہ یک طرفہ نہیں ہوتا اس کے لیے جانبین کے روابط بکار آتے ہیں۔ اگر اُستاد شاگردوں کی ہر طرح کی فلاح وبہبود کا خیال نہیں رکھتا تو اُن سے یہ توقع کرنا عبث ہے کہ وہ اُستاد کا احترام کریں گے۔

یہاں تک بات مادّی دنیا کی زیادہ اور رُوحانی دائرے کی کم ہو رہی تھی۔ راقم یہ عرض کر رہا تھا کہ احترامِ آدمیت یا احترامِ اُستاد خوش معاملگی کا رہینِ منّت ہے اور یہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر اُستاد اپنے آپ کو صحیح طور پر محترم نہیں بناتا تو شاگرد یا معاشرے سے زبردستی خراجِ احترام وصول نہیں کر سکتا، لیکن ان باہمی روابط کی ایک ذہنی یا روحانی لَم بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نفسیاتی طور پر وہ شاگرد تقریباً گھاٹے میں رہتا ہے جو اُستاد کی عزّت نہیں کرتا۔ تحصیل و

تعلم کا سلسلہ کچھ ایسا ہے کہ اگر آپ اُستاد کو ایک بہتر انسان سمجھ کر اُس کے سامنے زانوئے ادب نہ نہیں کرتے اور اُس کی تدریس اور تبلیغ پر ایمان نہیں لاتے تو واضح طور پر آپ کے لیے ایسے انسان سے کچھ سیکھنا یا حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ آج تک ایسی کوئی گولی ایجاد نہیں ہوئی جسے آپ کھالیں تو وہ آپ کے نہاں خانۂ دماغ میں پہنچ جائے جس کو آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ علم اور ہنر کی تحصیل بہر صورت بالاستیعاب کی جاتی ہے اور صرف اسی جذبے سے کی جاسکتی ہے جب اُستاد آپ کی نظر میں قابلِ احترام، قابلِ تقلید اور اعلا و ارفع شخصیت ہو۔ میں کسی احساسِ کمتری کو اپنانے کی تلقین نہیں کر رہا، لیکن میں نے ان سفید بالوں کے آجانے کی حد تک یہی تجربہ حاصل کیا ہے کہ جب کسی آدمی سے مجھے کچھ سیکھنے کی حاجت اب بھی محسوس ہوئی ہے تو میں ادب و احترام سے اس کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور خلوصِ نیت سے شکرگزاری کے جذبات کے ساتھ واپس لوٹا ہوں۔ اس جذبے کے بغیر تحصیل کا رشتہ کبھی پروان نہیں چڑھا۔ اُستاد صرف سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ہی نہیں ہوتے، تحصیل و تلمذ کی دنیا بڑی وسیع ہے، اور یہ صرف کتابوں، ...ڈیوں اور ڈگریوں تک ہی محدود نہیں، آپ کو ہر روز ان لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جن سے آپ لیبارٹری... ...سے جن سے کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں، کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کچھ سیکھنا چاہتے ہیں اپنی حاجت کی د... صنائع... اگر اس تحصیل کے عرصے میں آپ با... ادب نہ رہیں اور سکھانے والے کا احترام نہ کریں تو آپ کے راستے میں متعدد دشواریاں حایل ہو جائیں جن ذیل... لہٰذا احترامِ اُستاد اس لیے بھی ضروری ہے کہ آپ اپنی حاجت برآری آسانی اور شگفتگی سے کر سکیں۔

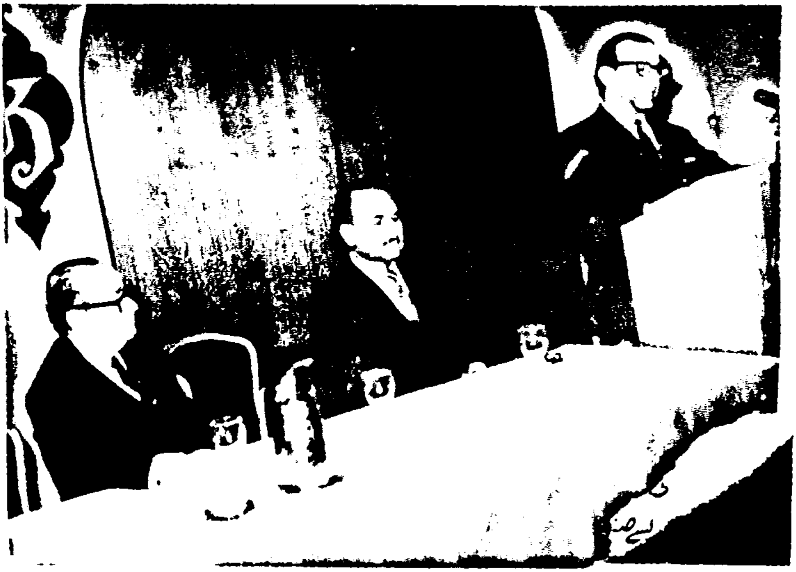
مادی دنیا سے پرے ہٹ کر اخلاقی دنیا میں اُستاد کے مرتبے کی پہچان اور احترام... گزاری اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہر اُستاد کو شاگرد پر یہ تفوق حاصل ہوتا ہے کہ ایک تو شاگرد کے مقابلے میں اس کے پاس وہ علم، ہنر اور فن زیادہ مقدار میں ہوتا ہے جس سے شاگرد استفادہ کرنا چاہتا ہے۔ اور چونکہ ہر علم کو سیکھنے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے لہٰذا عموماً اُستاد کی عمر بھی شاگرد سے زیادہ ہوتی ہے اور ہمارے معاشرے کی قدیم روایت یہی ہے کہ زیادہ عمر والے آدمی کا احترام کرتے ہیں۔ احترام لینے دینے کی روایت یوں ہی امورِ انسانی میں ایک عمدہ روایت ہے جس سے ہم معاشرے میں خوشگوار ماحول اور آسودگی پیدا کر سکتے ہیں، لیکن اگر اس روایت کی افادیت کا قایل ہو کر اسے جاری و ساری کیا جائے تو اس عمل میں خلوص کو بڑا دخل ہوگا۔ خصوصاً اُستاد اور شاگرد، معلّم اور متعلّم، سکھانے والے اور سیکھنے والے کے باہمی روابط بہت خوش گوار اور نفع بخش ثابت ہو سکتے ہیں اگر ہم ان روابط میں ایک دوسرے کے احترام کو ملحوظ رکھیں۔

نہ صرف اُستاد کے لیے بلکہ انسانی معاشرے میں ادب و احترام کی اہمیت میں حکیم زماں مولوی روم

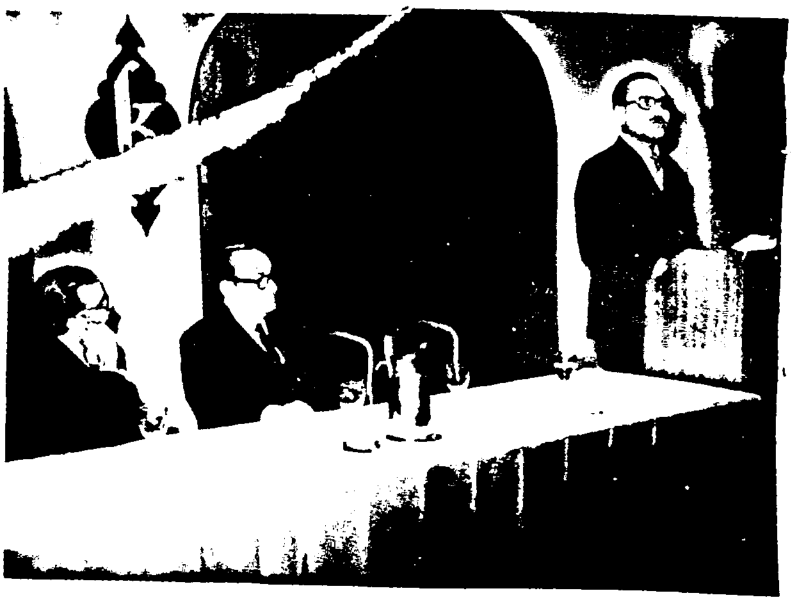
کی اس بات پر ختم کرتا ہوں۔

از خدا جوئیم توفیقِ ادب　　　بے ادب محروم ماند از لطفِ رب
بی ادب تنہا نہ خود را داشت بد　　　بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد
از ادب پر نور گشتست ایں فلک　　　واز ادب معصوم و پاک آمد ملک
بد ز گستاخی کسوف آفتاب　　　شد عزازیل ز جرأت ردباب
ہر کہ گستاخی کند اندر طریق　　　گردد اندر وادیٔ حیرت غریق

(ہم خدا سے ادب کی توفیق کے طالب ہیں کیونکہ بے ادب لطفِ رب سے محروم ہو جاتا ہے۔ دوسروں کا احترام نہ کرنے والا صرف اپنے لیے ہی مصیبت کا باعث نہیں بنتا بلکہ اپنے عمل سے وہ ساری دُنیا کو برباد کر ڈالتا ہے۔ ادب اور احترام کی وجہ سے یہ آسمان پر نور ہے اور فرشتے اس کے باعث معصوم اور پاک ہیں۔ لوگوں کی بے احترامی اور معصیت کی وجہ سے تو آفتاب بھی گہنا جاتا ہے اور عزازیل بھی بے ادبی اور بے احترامی کی وجہ سے دھتکارا جاتا ہے۔
الغرض جو آدمی بھی بے ادبی اور گستاخی اپنا شعار بناتا ہے وہ پریشانی سے ہم کنار ہوتا ہے)



ڈاکٹر حافظ محمد الیاس، میجر جنرل فضل مقیم خاں، جسٹس قدیر الدین احمد



میجر جنرل فضل مقیم خاں (مقرر) جسٹس قدیر الدین احمد، ڈاکٹر محمد الیاس



جسٹس قدیرالدین احمد (صدرِ مجلس) میجر جنرل فضل مقیم خاں، ڈاکٹر محمد الیاس



سامعین

احترامِ عسکریت اور عوامی فوج

کلماتِ ابتدائیہ	:	حکیم محمد سعید
مقالہ	:	جنابِ محترم میجر جنرل فضل مقیم خاں
کلماتِ صدارت	:	جنابِ محترم جسٹس (ریٹائرڈ) قدیر الدین احمد

شامِ ہمدرد، کراچی

۱۷- فروری ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

سلسلۂ تقاریر یا احترام (احترام لیکچرز) میں آج آپ ایک نہایت اہم موضوع پر پاکستان کی دو نہایت اہم شخصیتوں کے خیالات و افکار سماعت فرمائیں گے۔ موضوع ہے: احترام عسکریت و احترام عوامی فوج ۔ ملّتِ پاکستانیہ کے ایک فرد کی حیثیت سے اور ایک محب وطن کی حیثیت سے مَیں اسے اپنا حق اور اپنا فرض سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں کہ مجھے اور پاکستان کے ہر فرد کو تنظیم اور خالصتہً دفاع کے اعلائے مقاصد کے لیے اور جہاد کے ارفع فرائض کی بجا آوری کے لیے ایک مخصوص اور لازمی فوجی تربیت کا اہل قرار دیا جاتا۔ مگر پاکستان میں کوئی وقت بھی ایسا نہ آسکا کہ مستقل فوج اور عوامی فوج کے تصور و تشکیل کے درمیان ایک حدِّ فاصل قائم کی جاسکتی۔ اس لیے پاکستان کو بڑے مخصوص حالات سے سابقہ رہا جس میں دنیا کی بہترین افواج میں سے ایک فوج کی تشکیل و تعمیر ہوئی مگر عوامی فوج کی اعانت اسے حاصل نہ ہوسکی۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آج کے خطاب کا یہ ایک اہم نکتہ ہے اور یہی نکتہ اس کا متقاضی ہے کہ ہم اس اہم مسئلۂ ملّی کے ہر پہلو پر غور کریں اور کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ ہمارے مسائل گوناگوں ہیں۔ اس لیے ہمارے فرائض کی نوعیت بھی عام حالات سے مختلف ہے۔ انتشار و افتراق کی تمام قوتوں کی کارفرمائیوں کے باوجود پاکستان کی ایک نظریاتی مملکت ہونے کی حقیقت موجود ہے اور مجروح و مقطوع ہونے کے باوجود اس کی اسلامیت کی نفی نہیں کی جاسکتی اور نفیٔ اسلامیت کی کوششیں مقبول نہیں ہوسکتیں اور فکر و عمل میں انتشار پیدا کرنے کی کوئی سعی نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔

ابھی جناب محترم حافظ عتیق الرحمٰن صاحب نے ایک آیت تلاوت فرمائی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۔

یعنی: خدا کو وہ لوگ محبوب ہیں کہ جو اس کی راہ میں صف باندھ کر اس طرح لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ (الصف آیہ: ۴)

خدا اور راہِ خدا ہمارا مرکزی نقطۂ فکر ہے۔ احترامِ عسکریت اور احترامِ عوامی فوج جب اس نقطۂ فکر کے تابع ہوگا تو اُس کی شکل و صورت بدیہی طور پر وہی ہوگی کہ جو تعلیماتِ اسلام سے ماخوذ ہے۔ لیکن اگر ہم اس نقطۂ فکر سے ہٹ کر کوئی تنظیم پیش کریں گے تو اس سے شدید انتشار و افتراق کے مہلک خطرات کو دعوت دیں گے۔

پاکستان اسلام کی لیبوریٹری کے طور پر عالم وجود میں آیا ہے۔ اس لیبوریٹری میں کوئی ایسا تجربہ کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیئے کہ جو اس کی بنیاد ہی کو متزلزل کر دے۔

ہم نے ایسے تجربات کرنے کی غلطیاں کی ہیں اور ان غلطیوں کے ہولناک اور دل دوز نتائج آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔ "عمارتِ نو ساختن" کی ہر کوشش ہمارے ضعف و نحافت کا سبب بنی ہے اور اب ہر نئے آنے والے کو نئی عمارت بنانے کی کوشش کرنے سے پہلے اس کے انجام و نتائج کا جائزہ لینا چاہیئے اور اس تباہ حال ملت کو کسی نئی تباہی سے دوچار کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔

اس موضوع پر میں اس سے زیادہ کہنے کا خود کو اہل نہیں پاتا۔ جناب محترم میجر جنرل فضل قیم صاحب ایک بہادر، جری اور زیرک سپاہی ہیں۔ ان کے مرتبۂ فکر سے ہم واقف ہیں اور اُن کے جذبۂ عمل کے مظاہر ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ جنرل صاحب جری و شجیع افواج پاکستان کی تعمیر میں نہایت اہم کردار ادا کر رہے ہیں اور اُن کی تمام فکری و عملی صلاحیتیں ہنوز اس نکتے پر مرکوز ہیں۔ اس لیے اس موضوع پر جو ... وہ فرمائیں گے قابلِ فکر اور لائق عمل ہونی چاہیئے۔

اس شامِ ہمدرد کے صدر ... محترم جسٹس قدیر الدین احمد صاحب ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ اُن کے آبا و اجداد کا تعلق افواج سے رہا ہے ... کے لیے یہ نئی بات ہوگی۔ اُن کا شمار پاکستان کی ان شخصیتوں میں ہے کہ جن کا مرتبۂ فکر اور ... ج کا درجِ ذیل ... پاکستان ہے۔ ... سرحدوں کے زیادہ

... اکہ نا ادر جنگ کے دوران آرمی کو

جناب محترم میجر جنرل فضل مقیم

اس برِصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ ایک عسکری معرکے سے شروع ہوئی۔ یہ پہلا معرکہ اسی شہر کراچی کے نواح میں رونما ہوا جہاں ہم آج بیٹھے ہیں۔ یہ کیوں ہوا اور اس کے اسباب کیا تھے ان کا ذکر کرنا نہ اس وقت پیشِ نظر ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ صرف یہی سمجھ لینا کافی ہے کہ اس برصغیر میں مسلمانوں کے ہزار سالہ تسلّط کا راز دو باتوں میں مضمر تھا: ایک اُن کا دین جو سپاہیانہ زندگی کے مترادف ہے۔ دوسرا احترام عسکریت۔ اگر مسلمانوں کی برتری کے ستون ان بنیادوں پر استوار نہ ہوتے تو وہ کیسے اتنے بڑے ملک پر اتنی تھوڑی تعداد کے باوجود اتنے لمبے عرصے تک اپنا تسلّط جمائے رکھتے۔ عسکری برتری صرف ہتھیاروں کی برتری اور اُن کی فراوانی پر ہی نہیں ہوتی بلکہ اُس کا زیادہ تر دارومدار تو سپاہی کی قوتِ ایمانی اور جذبۂ شجاعت کا رہینِ منت ہوتا ہے، اور جب ان اوصاف کے ساتھ ساتھ ایک سپاہی کی عسکری تربیت بھی مثالی ہو اور اس کے ہتھیار بھی اپنے زمانے کے بہتر ہتھیار ہوں تو پھر وہ سپاہی ناقابلِ تسخیر بن جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جنگیں صرف تعداد کے بل پر جیتی جاتیں۔ دنیا کی پُرانی اور نئی تاریخ میں ایسے واقعات کم ملتے ہیں کہ جنگیں اُنھی اقوام نے جیتی ہوں جن کی افواج تعداد میں زیادہ اور جن کا سامانِ حرب اپنے مدِمقابل سے وافر ہوتا تھا۔ ایک جنگ بدر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں نے جب تک وہ اسلامی صفات سے متصف رہے ایسی کتنی ہی جنگیں بے سروسامانی اور کم تعداد کے باوجود جیتیں۔ علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے:

کافر ہو تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اس شعر کی یہی تفسیر ہے کہ اگر سپاہی میں مومن کی صفات ہوں جس میں عسکری تربیت بھی شامل ہے تو وہ معرکے کے دوران دشمن ہی سے شمشیر و سنان چھین کر اُنھی سے دشمن کا صفایا کر سکتا ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس برِصغیر میں مسلمانوں کی برتری اُن کی دین داری اور احترامِ عسکریت پر مبنی تھی۔ عسکریت کا مطلب جنگ جوئی (Militarism) بالکل نہیں کہ جنگ جوئی آمرانہ خواہشات پُورا کرنے کے لیے فوج کو ذریعہ بنانے کا دوسرا نام ہے۔ آئیے یہاں یہ بھی دیکھ لیں کہ عسکری صفات (Soldierly Virtues) کون کون سی ہیں۔

یہ ہیں تو بہت سی لیکن اُن میں بنیادی خوبیاں صرف پانچ ہیں۔ ایمان (Faith)

وفاشعاری (Loyalty) شجاعت (Courage) قوتِ برداشت (Eudurance) اور نظم وضبط (Discipline) - اگر آپ ان کو غور سے مطالعہ کریں تو یہی صفات ایک مسلمان کی ہونی چاہییں۔ اسی بنا پر سپاہی کے لیے ہمارا پاکیزہ لفظ مجاھد ہے۔

عسکری صفات احترام عسکریت ہی سے پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس برصغیر کے مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جب تک یہ احترام اُن کا شیوہ رہا اور جب تک انھوں نے ان خصوصیات کو اپنے وجود اور اپنی ثقافت کے قیام کی بنیاد سمجھا وہ ایک باوقار اور باشعار زندگی بسر کرتے رہے اور اُن کا نام دُنیا میں عزت و احترام سے لیا جاتا رہا۔ اُن کی اس تاریخ میں ایسے سبق آموز مواقع بھی آئے کہ جب کبھی اُنھوں نے ان عسکری صفات کا دامن چھوڑا اُنھیں اس کے نتیجے میں افسوس ناک سزا بھگتنی پڑی۔ وہ مدتوں اس غفلت اور کمزوری کے باعث ایسے حملہ آوروں سے شکست کھاتے رہے جو خود مسلمان ہوتے تھے۔

شمال مغرب سے جو حملہ آور آتے وہ جسمانی اور رُوحانی لحاظ سے ہی زیادہ طاقت ور نہیں ہوتے تھے بلکہ عام طور سے وہ اپنی تنظیم اور اسلحہ کے اعتبار سے مقامی تنظیموں اور ہتھیاروں پر فوقیت رکھتے تھے۔ اُن کے آنے سے مُردہ رگوں میں پھر تازہ خون دوڑنے لگتا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک یورپی قوموں نے ایک نئی سمت یعنی سمندر کے راستوں سے ہندستان پر چڑھائی نہ کی۔ وہ خالی شہنشاہیت لے کر آئے تھے اور انھوں نے مسلمانوں کے رہے سہے عسکری جذبے کو بھی کچل کر رکھ دیا۔ میرے خیال میں انگریزی سلطنت نے جو مسلمانوں پر سب سے بڑا ظلم کیا وہ یہ تھا کہ انھوں نے آہستہ آہستہ وہ سب لیڈر اور لیڈر پیدا کرنے والے خاندان یا ادارے ختم کردیے جو ہمیں احترام عسکریت کی تعلیم و تربیت دیتے تھے۔ اُن کے ساتھ ہی اس قوم کے علم و دانش کے چشمے بھی خشک ہوگئے۔

جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے اپنے دورِ انحطاط میں بھی مسلمانوں نے احترامِ عسکریت کو نہیں چھوڑا لیکن فرق صرف اتنا ہوگیا کہ اس زمانے میں مسلمان اپنے اسلاف کی مبالغہ آمیز داستانیں اور رہے سہے اسلامی ممالک کے ہیروز (Heroes) کی کہانیاں پڑھ کر دل بہلاتے رہے اور خود عسکری صفات کو اپنانا چھوڑ دیا۔ سپاہیانہ خوبیاں اب نظریے تک محدود ہوگئیں، عملاً اُن کو نظرانداز کر دیا گیا، یہاں تک کہ غالب جیسا شخص بھی جب اپنی شاعری میں طنز کے تیروں سے تنگ آجاتا ہے تو اپنے آبا کے پیشۂ سپہ گری پر فخر کرتا ہے۔ یہ تھی حالت ان علاقوں کی جہاں مسلمانوں نے انڈو اسلامک (Indo-Islamic) تہذیب کو جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ مثلاً دہلی، لکھنؤ، دکن

بنگالہ کے علاقے۔ جن چند علاقوں میں احترامِ عسکریت کو عملاً بھی سراہا جاتا رہا ان میں سرفہرست سرحد اور پنجاب ہیں۔ اس کی وجوہات کچھ ہی ہوں لیکن ان علاقوں میں عسکریت کا درجہ ہمیشہ بلند رہا اور وہاں کے لوگوں میں بھی سپاہی اور اُس کے کردار کی خوبیوں کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ مثال کے طور پر پشتو کا ایک ٹپہ یوں شروع ہوتا ہے۔

"اے میرے بہادر محبوب! مورچے پر جلد پہنچ۔ میں نے تیری شجاعت پر اپنی
محبّت کی شرط لگادی ہے۔"

ایک پوٹھوہاری لوک گیت کے ٹیپ کا بند یوں ہے۔۔۔

"آگے آگے میرا دیہ لڑے ۔ پچھے فوج انگریزان نی"

خواجہ فرید نے تو اپنی ایک مشہور کافی میں سپاہی کو اتنا بلند درجہ دیا کہ اللہ سے ہی جا ملایا۔

"یار سپاہیا آ ورس مینڈڑے کول"

مجاہدانہ صفات پوری قوم میں ہونی چاہییں۔ ہم یہ صفات یا خصوصیات ایک پیشہ ور سپاہی کے لیے محدود نہیں کرسکتے اور نہ اس پر اکتفا کرسکتے ہیں کہ صرف سپاہی میں ایسی خصوصیات کا ہونا کافی ہے، قوم کے باقی افراد جو چاہیں اپنا لیں اور جب سپاہی باقی قوم کے نقش قدم پر چلنے [illegible] نہیں تو واویلا مچادیں۔ یہ تو کمزور اور اپنے راستے سے بھٹکی ہوئی قوموں کا شعار [illegible] رہا ہے' اور اس طریقے سے سوچنا بھی ایک قسم کا شرک ہے۔ اور بدقسمتی سے یہ سب لوگ اس گناہ [illegible] کے مرتکب رہے ہیں۔ اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مجاہدانہ صفات قوم کے ہر فرد میں [illegible] ہونی چاہییں، اور یہ احترامِ عسکریت سے ہی پیدا ہوسکتی ہیں، تو لازم ہے کہ تعلیم و تربیت [illegible] کے نظریاتی اور عملی دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیں۔ جہاں تک نظریہ یا تصوّر کا تعلق ہے [illegible] اوّل ملک کی تعلیم کے مقاصد میں سب سے اہم یہ ہونا چاہیئے کہ طالب علم میں مجاہدا[illegible] خوبیاں یعنی ایمان، وفاشعاری، شجاعت، قوت برداشت اور نظم و ضبط کی صفات پیدا کی جائیں۔ اگر آپ ان خصوصیات پر غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ انسانی کردار کی باقی ماندہ صفات کا منبع ہیں اور میں تو یہ کہوں گا کہ یہ ہماری تہذیب کی بنیاد ہیں۔ دوئم ہمارے ادب میں ان خوبیوں کو اُجاگر کیا جائے۔ سوئم پاکستانی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ایک اختیاری مضمون عسکری تعلیمات یا Military Studies کا ہونا چاہیئے تاکہ معاشرے میں عسکریت کے اصول سمجھنے والے افراد بھی پیدا ہوسکیں۔

۱۔ عملی پہلو لیجیے۔ جب تعلیم و تربیت ٹھوس بنیادوں پر اُٹھے گی اُس وقت جو کچھ طلبہ پڑھیں گے اور سیکھیں گے اس پر عمل کرنے کی ضرور کوشش کریں گے لیکن احترامِ عسکریت کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی عملی تربیت بھی ہو تاکہ احترامِ عسکریت کے ساتھ اُن میں شروع ہی سے ملک و ملّت کے

دفاع کا شعور اُبھرے اور ذمّے داری کا احساس پیدا ہو۔ عملی تربیت کا بہترین اور آزمودہ طریقہ یہی ہے کہ ہر عمر کے افراد کے لیے ایسی تنظیمیں ہوں جہاں تعلیم کا یہ پہلو عملاً سکھایا جا سکے۔ دوسرے کیڈٹ کور قسم کی تنظیمیں عام ہوں اور عسکری تربیت دینے کے لیے معقول انتظامات ہوں۔ تیسرے مستقل فوج کے ساتھ ساتھ عوامی فوج بھی ہو تاکہ وقت پڑنے پر پوری قوم اپنے دفاع کے لیے تیار ہو۔

اس مختصر سے جائزے کے بعد میں عوامی فوج کی تشکیل کا ذکر ذرا تفصیل سے کروں گا۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس مقالے میں بحث بڑی فوج ہی تک محدود ہے لیکن جو اصول میں یہاں بیان کروں گا اُن کو دوسری قسم کی افواج کے منظم کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

"تجربہ شاہد ہے کہ قومی وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیشہ ور یا مستقل افواج ہی کافی نہیں ہوتیں۔ عوامی دفاع کی حامل قوم ہمیشہ ناقابل تسخیر ہوتی ہے۔ ایسی قوم کو کبھی فتح نہیں کیا جا سکتا۔" یہ الفاظ میرے نہیں، یہ نپولین کا ایک مقولہ ہے۔

پاکستان د[illegible] واحد آزاد اور تہذیب یافتہ مملکت ہے جس کی کوئی عوامی فوج نہیں اور جس کا کوئی عوامی دفاع نہیں [illegible] یہ ایک حقیقت ہے۔ ہماری اپنی روایات کا تقاضا تو یہی ہے کہ اپنے ملک و ملّت کا دفاع عوام کریں [illegible] دنیا کی تاریخ سے بھی یہی سبق ملتا ہے۔ ہمارا جغرافیائی محلِّ وقوع بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔ اور عوام کی مسلسل آج خواہش بھی یہی رہی ہے کہ ہم اپنا دفاع ایک عوامی دفاع کی سطح پر منظم کریں۔ پھر گزشتہ ۲۴ سال میں ایسا کیوں [illegible] نہیں ہوا اور کس لیے نہیں ہوا۔ اس کا ذکر کرنا یہاں مقصود نہیں۔ یہاں تو صرف اتنا جتا دینا ضروری ہے کہ ہمارے ہاں عوامی دفاع کو سمجھنے والے بھی موجود تھے اور فوج کو تیار کرنے کی تجاویز بنانے والے اور اُسے منظم کرنے والے بھی حاضر تھے، لیکن کسی بنا پر اُسے درست نہیں سمجھا گیا۔ اب ہم اپنی تاریخ کے ایسے موڑ پر پہنچ گئے ہیں [illegible] ایک مرتبہ پھر نئی نئی اُمنگیں اُبھرنے لگی ہیں۔ نئے نئے خیالات سامنے آنے لگے ہیں۔ ملک کو جو خطرات درپیش ہیں اُن سے نمٹنے کے لیے باقاعدہ اور مستقل فوج کے علاوہ دفاع کے سستے اور موثر طریقے سوچے جانے لگے ہیں۔

قبل اس کے کہ کچھ اور عرض کیا جائے تاریخی پس منظر مختصراً پیش کر دینا بہتر ہے۔ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں ہر صحت مند مسلمان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے دین اور ملّت کا دفاع کرے۔ اس کو اس بات کا اہل بنانے کے لیے باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی اور یہی قرآن پاک نے انھیں سکھایا تھا۔ اسی بنا پر اس زمانے کی جنگیں عوامی معرکوں کی حیثیت رکھتی تھیں جن میں عوام ہی برسرِ پیکار ہوا کرتے تھے۔ اسلامی سلطنتوں کے زمانۂ آخری میں فوج کی تعمیر کے مختلف طریقہ ہائے کار اختیار کیے گئے

ہیں جن میں سب سے اہم طریق جاگیردارانہ اندازِ تعمیرِ فوج تھا، لیکن پھر بھی اسلام کی تاریخ کے مکمل دور میں عالم گیر فوجی خدمت کے اصول کو ہمیشہ ایک مسلمہ امر سمجھا گیا اور جب اس اصول سے رُوگردانی کی گئی تو مسلمان اسی دور سے محدودیت کا شکار ہو گئے اور یکے بعد دیگرے اُن کی تمام سلطنتیں صفحۂ ہستی سے مٹتی چلی گئیں۔

ماضیٔ قریب کی تاریخ میں یعنی نپولین بوناپارٹ کے زمانے سے یورپ میں بھی جنگوں نے ہمہ گیر جنگ (Total War) کا روپ دھار لیا اور جنگیں عام طور پر عوامی فوج ہی کے ذریعہ سے لڑی جانے لگیں جو پہلے ہی سے تیار کر لی جاتی تھیں۔ عوامی افواج کے بغیر ایسی جنگیں لڑنا ممکن نہ تھا۔ جنگیں اتنے وسیع پیمانے پر ہونے لگیں کہ دنیا کی امیر ترین قوم بھی اس زمانے میں ایک مستقل عظیم فوج اور اس کے لیے ضروری ساز و سامان کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی بنا پر دانش مندانہ اقدام یہی سمجھا گیا کہ مستقل فوج کو اپنی بساط کے مطابق مقابلتاً تھوڑی تعداد میں رکھا جائے اور بوقتِ ضرورت اس فوج کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے ضمنی فوجیں تیار ہونے لگیں، جن کو مختلف ممالک میں مختلف نام دیے گئے۔ مثال کے طور پر برطانیہ میں Territorial Army جرمن اور فرانس میں Militia اور امریکہ میں National Guard کہلائیں۔ باوجود جدا جدا ناموں کے ان افواج کا مقصد ایک ہی تھا۔ ان حالات میں مستقل افواج کے اہم فرائض تین ہی رہ گئے:

اوّل۔ جنگی منصوبوں کی تیاری اور زمانۂ امن میں سرحدوں کی حفاظت۔

دوم۔ جنگی تکنیک اور فنِ حرب کو ترقی پذیر رکھنا اور اُسے وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا۔

سوئم۔ عوامی فوج کی تربیت اور حسبِ ضرورت اُس کے لیے اعلا اور دوسرے مدارج کے لیڈر مہیا کرنا۔

جوں ہی یورپ کی اقوام نے ہمہ گیر جنگ (Total War) کے نظریے کو سمجھ لیا انھوں نے اپنے مخصوص جنگی تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عوامی فوج کی تنظیم و ترتیب کا طریقہ کار بھی اختیار کر لیا۔ یورپی ممالک نے جبری بھرتی کا اصول اپنایا، کیونکہ اُن کی سرحدیں مستقبل کے دشمنوں سے ملحق تھیں۔ اس اصول کے تحت ہر فرد کو سپاہی بننا ضروری تھا، خواہ وہ اسے پسند کرے یا نہ کرے۔ اس کے برعکس برطانیہ نے جس کی سرحدیں کھلے سمندر نے محفوظ کر رکھی تھیں اور جسے جنگ چھڑ جانے کے بعد بھی افواج کی تعمیر کے لیے کافی وقت میسّر آ جاتا تھا، رضاکار ضمنی فوج کو ترقی دی، لیکن اسے بھی دونوں عالمی جنگوں کے دوران عام لام بندی کی جانب پوری توجّہ دینی پڑی۔ امریکا نے بھی جو یورپ کی برسرِ پیکار قوموں سے دور تھا رضاکارانہ اصول پر نیشنل گارڈ

کی تنظیم کی۔ لیکن اسے بھی دوسری عالم گیر جنگ اور اس کے بعد جنگوں میں جبری بھرتی پر عمل پیرا ہونا پڑا۔ جبری بھرتی کو پاکستان میں ایک قابلِ نفرت لفظ سمجھا جاتا ہے اور محض برطانوی ذہنیت سے متاثر ہونے کی بنا پر اس لفظ سے گویا ہمیں چڑ ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ فنی ترقی اور سامانِ حرب کے پیچیدہ اور وسیع ہونے کی بنا پر دنیا میں دوبارہ بہترین تربیت یافتہ اور ہنرمند افواج کی ضرورت کا رجحان تقویت پکڑ رہا ہے اور اس لیے عوامی فوج کی اب ضرورت نہیں رہی لیکن اصولاً صنعتی اور سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی شعور میں بھی اسی رفتار سے اضافہ ہوتا ہے اس لیے جس سوسائٹی میں پیچیدہ آلاتِ جنگ تیار کیے جاتے ہیں۔ وہاں پر ان کا سمجھنا اور ان کا استعمال میں لانا ہرگز مشکل نہیں ہوتا۔ ہم نے پہلے بیس سال میں خود دیکھ لیا کہ امریکا میں بھرپور جواب دینے (Massive Retaliation) کی فوجی حکمت عملی (Strategy) جس کا انحصار انتہائی پیچیدہ اور خطرناک ہتھیاروں اور بہترین تربیت یافتہ مستقل فوج پر تھا کبھی کا ناکام ہو چکا ہے۔ کوریا اور ویتنام کی جنگوں میں امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک کو عوامی فوج پر انحصار کرنا پڑا۔ کچھ بھی ہو پاکستان کی جغرافیائی حیثیت اور دوسرے حالات بالکل مختلف اور کچھ ایسے ہیں کہ اسے ایک طویل عرصے تک اپنے دفاع کے لیے بہتر تربیت یافتہ ہتھیار بند مستقل لیکن محدود فوج کے ساتھ وسیع عوامی فوج بھی تیار رکھنی پڑے گی۔

پاکستان میں عوامی فوج کی اہمیت عیاں ہے۔ مقابلتاً ایک ایسی چھوٹی مملکت ہے جس کے پاس ترقی کے لامحدود ذرائع اور مواقع موجود ہیں جن سے فائدہ اٹھانے اور اقوامِ عالم میں ایک باعزت اور نمایاں مقام حاصل کرنے کا خواب پورا کرنے کے لیے ایک طویل پُرامن عرصے کی ضرورت ہے۔ مگر اس کی قسمت تو دائم رہتا ہے۔ اس تیاری کے لیے یقین کر... طریقہ تو یہی ہے کہ مستقل فوج کی تعداد کو ضرورت کے مطابق اور وسیع کیا جائے لیکن ایسا کرنے ... ہماری مجموعی قومی آمدنی کے ذرائع انتہائی محدود ہیں۔ آج بھی ملک کو فوج پر اتنا خرچ کرنا پڑ رہا ہے اس میں گنجائش نہیں پھر بھی حال یہ ہے کہ فوج میں توازن نہیں۔

دوسرے پاکستان عظیم پڑوسیوں سے محصور ہے۔ جن میں تین ملک دنیا کے عظیم ممالک میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو تو کھلم کھلا پاکستان کے وجود کے خواہاں نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیپٹن لڈل ہارٹ کے ذہن میں یہ سطور لکھتے وقت پاکستان کا خیال موجود ہوگا:

"۔۔۔۔۔ کسی ملک کی امن پسندی اور شرافت بیرونی حملے سے مدافعت کے لیے ناکافی ہیں، خاص کر جب کوئی چھوٹا ملک عظیم پڑوسیوں میں محصور ہو۔"

تحفظ کا زیادہ انحصار جغرافیائی حالت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے فرد کے قریب
ایک ہی بستر پر خاموش لیٹے رہنا جو زیادہ جگہ گھیرنے کا خواہش مند ہو
آسان نہیں۔ اور ایسے حالات میں سو جانا تو فرش پر دھڑام سے گر کر
آنکھ کھلنے کا خطرہ مول لینا ہے۔"

تیسرے پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کی حدیں بہت وسیع اور عام طور سے کھلی ہیں۔ اس لیے مستقل فوج اور سول آرمڈ فورسز کے لیے ممکن نہیں کہ ہنگامی حالات میں ان حدود کا موثر انداز میں دفاع کر سکیں۔ مزید برآں ملک کو جغرافیائی محلِ وقوع کی بنا پر بھی کوئی اہم مفاد حاصل نہیں۔ اس ملک کی گہرائی بہت کم ہے۔ لاہور سے پشاور تک صرف دو سو چالیس میل کا فاصلہ ہے، سرحدوں سے سرحدوں تک۔ باقی فاصلے بہت ہی کم ہیں۔ سوائے اس کے کہ تمام شہری اپنے طور پر سرحدوں اور اندرونی علاقوں کی حفاظت کی اہلیت رکھتے ہوں۔ Tactical Defence کے حاصل کرنے کا جو دفاع کے لیے بہت اہم ہے اور کوئی موثر طریقہ معلوم نہیں ہوتا اس کے لیے ضروری ہے کہ عوام کو اپنے دفاع کا اہل بنانے کے لیے فوجی تربیت دی جائے۔

چوتھے۔ پاکستان میں عوامی فوج کی اہمیت اس بنا پر بھی بہت ہے کہ ایسا کرنے سے عوام میں اپنے دفاع کا شعور و جذبہ پیدا ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی روایتی عسکری صلاحیتیں اُجاگر ہوں گی، کیونکہ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد بہت سے علاقوں کے مسلمان اپنی عسکری خوبیوں سے محروم ہو گئے۔ اکثر علاقوں میں اس واقعہ کے بعد اُن کے ہتھیار رکھنے پر پابندی لگا دی گئی۔ برطانوی سامراج اس ملک کے دفاع میں آہستہ آہستہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ اس لیے قومی سطح پر عوام آرام طلب، غیر ذمّے دار اور کمزور ہوتے چلے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ فوج کی اکثریت اب چند غیر صنعتی اور غیر زرعی علاقوں یعنی جہلم، راولپنڈی، کیمبل پور، کوہاٹ اور قبائلی علاقوں کے جوانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

پانچواں۔ بدقسمتی سے پچھلے ۲۴ سال میں یہ تاثر بڑی شدّت سے موجود رہا ہے کہ اُن کی افواج اُن کے دفاع کے لیے کافی ہیں اور وہ اُن کی موجودگی میں بغیر کسی دفاعی ذمّے داریوں کے قبول کیے امن و آشتی سے رہ سکتے ہیں۔ مگر یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک ہے اور جتنی جلدی اس تاثر کو ختم کر دیا جائے اچھا ہے۔ اُن پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دینی چاہیئے کہ نوآبادیات اور مقبوضات کا دفاع سامراجی قوتیں اپنی مستقل افواج کے ذریعہ سے کرتی ہیں جب کہ آزاد ملکوں کا دفاع عوام خود کرتے ہیں۔ اور جب تک عوام کو فوجی تربیت نہیں دی جاتی سنہ ۱۹۴۷ء اور سنہ ۱۹۶۵ء اور سنہ ۱۹۷۱ء کے واقعات کی مثال بار بار دہرائی جا سکتی ہے۔

عسکری تیاری کے لوازمات

موجودہ دفاعی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اور ملک کے دفاع میں جو خامیاں ہیں اُن کو دُور کرنے کے لیے دفاع کے بنیادی نظریات کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

ہمہ وقت عسکری تیاری کے لیے پاکستان کو مندرجہ ذیل لوازمات درکار ہیں:

(الف) ایک مختصر مگر اعلیٰ پیمانے پر تربیت یافتہ متحرک فوج جو ایک لمحے میں میدانِ کارزار میں کود پڑے اور جس میں عوامی فوج کے لیے تربیت دینے اور اعلا لیڈر مہیا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔

(ب) ایک عوامی فوج جو ہنگامی حالات میں مستقل فوج کی معاونت کے لیے ہر دم تیار رہے۔

(ج) نیم تربیت یافتہ اور نیم منظم عوامی تنظیمیں جنھیں تھوڑی سی مزید تربیت کے بعد میدانِ کارزار میں لایا جا سکے۔ اس ضمن میں یوتھ موومنٹ اور نیم عسکری تنظیمیں مثلاً رضاکار اور رائفل کلب وغیرہ شامل ہیں۔ اُن کے بھرپور کام کے لیے حکومت کے مکمل تعاون کی خصوصی ضرورت ہے۔

(د) ایسے صنعتی ادارے جو بوقتِ ضرورت اسلحہ اور فوجی ساز و سامان بھی بنا سکیں۔

کردار

اس مقالے کی روشنی میں عوامی فوج کا درجِ ذیل کردار مدِنظر ہے:

(الف) بصورتِ جنگ شروع ہی سے ملکی سرحدوں کے زیادہ سے زیادہ حصے کے دفاع کی ذمہ داری سنبھالنا۔

(ب) مستقل فوج کے لیے دفاع کی دوسری لائن کا کردار ادا کرنا اور جنگ کے دوران آرمی کو توسیع دینے کے لیے مددگار ثابت ہونا۔

(ج) اندرونِ ملک واقع اہم دفاعی مقامات اور مواصلات کی حفاظت کے لیے بھرپور کردار ادا کرنا۔

اصول

پاکستان میں عوامی فوج قائم کرنے کے لیے دوسری قوموں کے مشاہدات اور تجربات کو مدِنظر رکھنا انتہائی ضروری ہے جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ تمام ممالک نے جہاں کہیں بھی اس قسم کی فوج کو تشکیل دی گئی اپنے جغرافیائی اور دوسرے ملکی خواص کو سامنے رکھا۔ پاکستان کا جغرافیائی محلِ وقوع اور اُس کے عوام کی خصوصیات کئی ایک ایسے مسائل پیش کرتی ہیں کہ کوئی بھی ایسا منصوبہ بنانے سے پہلے اُن کا تجزیہ کرنا بہت اہم ہے۔ ملک کی آزادی کے فوراً بعد پاکستان نیشنل گارڈز کا قیام

ایک نہایت مناسب منصوبہ تھا، مگر قدیم اور فرسودہ تصورات پر مشتمل ہونے کی بنا پر ناکام ہو گیا۔ اسی طرح موجودہ مجاہد فورس کا تجربہ بھی اتنا کامیاب نہیں۔ میرے خیال میں بہترین عوامی فوج کی تشکیل جو ہنگامی حالات میں ملک کے کام آسکے محض ان اُصولوں پر ہو سکتی ہے:

۱۔ پاکستان کے صحت مند شہری (بلا امتیاز جنس) کا فرض ہے کہ ملکی دفاع میں حصّہ لے اس لیے کہ اس کے دفاع کی تربیت حاصل کرنا اس کا حق ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ملک کا دفاع ہر شہری کا فرض ہے۔ اس کا بوجھ اور ذمّے داری آبادی کے کسی مخصوص یا محدود حصّے پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ دوسرے الفاظ میں ان تمام نظریات و مفروضات کو یکسر ختم کر دینا چاہیئے جن کے تحت یہ حد بندی کی جاتی ہے کہ کسی میں عسکری صلاحیتیں ہیں کسی میں نہیں ہیں۔ اور کون لڑے گا اور کون نہیں لڑے گا۔ یہ بات کا سلسلہ ہمارے ہاں جائز نہیں۔ عوام کی خواہشات جو وہ اپنے دفاع کے لیے رکھتے ہیں جب پُوری نہیں ہوتیں تو وہ اُلٹی سیدھی تنظیمیں بنانے لگتے ہیں اور انھیں صرف نعرہ بازی اور دھولڑ[illegible] دھار جذباتی تقریروں کے ذریعہ سے زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن بغیر [illegible] تربیت اور ہتھیاروں کے اُن کی کوئی اہمیّت نہیں ہوتی۔ ایسی خطرناک تنظیموں [illegible] سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ عوام کو مؤثر تربیت دینے کا بندوبست کیا جائے [illegible] فوج کے زیر نگرانی ہو۔

۲۔ عوامی فوج کے لیے جذبۂ قومیت کی بیداری [illegible] ہونا لازم ہے [illegible]

یہ عام مشاہدہ ہے کہ عوامی فوجیں [illegible] ہتھیار بند لٹیرے اور غیر ذمّے دار گروہ بن کر رہ جاتی ہیں اور انتہائی خطرناک [illegible] ثابت ہوتی ہیں اگر انھیں بھرپور مقاصد و نظریات کی بھرپور تعلیم نہ دی جائے۔

پاکستان میں دَورِ جدید کا رُجحان اسلام اور قومیت کی جانب ہے۔ کسی تنظیم کی کامیابی کے لیے اس رُجحان کا سہارا ضروری ہے۔ مختصراً اس تنظیم میں اسلامی رنگ کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا نام بھی اپنی زبان میں ہو یا اسلامی تاریخ سے اخذ کیا گیا ہو۔ ایسی تنظیم کا لباس بھی امتیازی ہونا چاہیئے۔

۳۔ پُر امن حالات میں دفاعی اخراجات بوجھ نہ بنیں۔

عوام میں اس تنظیم کی کشش میں اضافے کے لیے بہرحال کچھ رقم بصورت الاؤنس تو ادا کرنی ہوگی، لیکن اس طریقے پر خرچ ہونے والی رقم طویل عرصے کے منصوبوں اور فوج کی نقل و حرکت کے اخراجات میں بہت کم ہوگی اس لیے عوامی فوج کے دستوں کا قیام دفاعی اہمیت کے مقامات میں عمل میں لایا جائے اور یہ اُنھیں علاقوں کی مقامی آبادی کے افراد پر مشتمل ہو۔

اخراجات میں مزید بچت کے لیے فوجی انسٹرکٹروں کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ جو معمولی الاؤنس کے عوض اپنے فارغ اوقات میں تربیت کا کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور مناسب شرائط پر سابق افسروں اور نان کمیشنڈ افسروں کو اُن کے گاؤں اور علاقوں میں تربیت دینے پر فائز کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ عوامی فوج میں شرکت کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے مناسب سہولتیں مہیا کی جائیں۔

بہت سے لوگ عوامی فوج میں شرکت کے لیے رضامند نہ ہوں گے۔ اگر انھیں زمانۂ امن میں اپنے گھر اور بچوں کو چھوڑ کر دُور جانا پڑے گا۔ علاوہ ازیں تربیت کے لیے بھی اپنے جائے رہائش سے دُور جانا پسند نہیں کریں گے۔ اس لیے اول تو انھیں اِس بات کا یقین دلایا جائے کہ اُنھیں اُن کی مرضی اور رضامندی کے خلاف اُن کے اہل وعیال سے دُور نہیں کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک کراچی کا باشندہ کراچی کے دفاع ہی کے لیے رہے گا۔ دوم، تربیت کی سہولتیں گاؤں اور محلوں میں مہیا کی جائیں۔ اصول یہ ہونا چاہیے کہ اگر عوام کو تربیت حاصل کرنے کے لیے کسی مخصوص جگہ جانا دشوار اور ناگوار ہو تو تربیت گاہ اُن کے قریب لائی جائے۔ سوم، ان کا اسلحہ اور سازوسامان نزدیکی پولیس چوکیوں میں جمع ہو تاکہ بوقتِ ضرورت اُسے بہ آسانی حاصل کیا جاسکے۔

اگر متعلقہ علاقے کے ذمے دار افراد پر مشتمل کمیٹیوں کی تشکیل دے دی جائے جو افراد کی بھرتی اور دوسرے مطلوبہ امور میں وزارتِ دفاع کی مدد کرسکیں تو اس سے دور رس نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

۵۔ ٹریننگ یا تربیت مختصر اور بامقصد ہونی چاہیے۔

عوامی فوج کی ٹریننگ کا انداز مختلف ہونا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ اُس کی ٹریننگ فوجی رنگروٹوں کی طرح ہو۔ اُسے مختصر ہونا چاہیے اور تنظیم کے لیے ضروری پہلوؤں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر پیادہ دستوں کی ٹریننگ تربیت کے افادی پہلوؤں کے ساتھ درجِ ذیل ہے:

(الف) ہتھیاروں کے فنی اور تکنیکی استعمال کی تربیت۔

(ب) Fieldcraft, Cancealment and Camouflage

(ج) گوریلا جنگ۔

(د) ٹینکوں کی تباہی کی تربیت

(ہ) آزاد علاقوں میں جنگ کرنے کی تربیت۔

(و) ڈرل اور پی ٹی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مضامین میں اضافہ کیا جا سکتا ہے ۔ اسی اصول پر باقی دستوں مثلاً توپ خانہ، ٹینک وغیرہ کی ٹریننگ ہو سکتی ہے ۔

۶ ۔ حوصلے کی بلندی اور جنگ کرنے کے عزم کی تعمیر ضروری ہے ۔

ہمارے عوام فی الحال اتنے تعلیم یافتہ نہیں کہ حبّ الوطنی کی صحیح حقیقت سے آشنا ہوں ۔ حبّ الوطنی کی کڑی میں اُن کے جذبے کی بنیادی چیز اپنے گھر اور خاندان سے وفاداری ہے ۔ اس کے بعد ملکی سالمیت کے جذبے کی باری آتی ہے ۔ دو عملی طریقے جن سے اُن کا حوصلہ بلند اور جنگ کرنے کا عزم ہر دم تازہ رکھا جا سکتا ہے یہ ہیں :

اوّل ۔ یونٹوں کے نام علاقائی قسم کے ہوں ۔ مثال کے طور پر ناظم آباد بریگیڈ ۔ لال کرتی پلٹن وغیرہ ۔

دوم ۔ ایسے یونٹ اپنے علاقوں میں لڑیں ۔ فوجی تاریخ نے بار بار ثابت کیا ہے کہ نیم تربیت یافتہ افراد بھی جب اپنے کنبوں اور علاقوں کے لیے لڑتے ہیں تو انتہائی بے جگری اور جوش سے لڑتے ہیں ۔

۷ ۔ ایسی تنظیم کی خدمات مختصر ترین وقت میں دفاعی اہمیت کے مقامات کے لیے دستیاب ہوں ۔ (فوری تربیت یافتہ تنظیم)

تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ مستقبل کی کوئی بھی جارحیت دشمن کی جانب سے انتہائی تیز رفتاری سے عمل پذیر ہو سکتی ہے ۔ اس کے مقابلے کے لیے ہمیں ہر وقت اور ہر صورت تیار رہنا چاہیئے ۔ عوامی فوج کی فوری دستیابی کا تعین اسی صورت میں ہو سکتا ہے اگر ضرورت کے مطابق یونٹوں کو دفاعی اہمیت کے مقامات پر تشکیل کیا جائے اور ان کے لیے ہتھیار اور باقی ساز و سامان پھر انہی علاقوں میں پہلے سے جمع کر دیا جائے ۔

منصوبہ

یہ تھے بڑے بڑے اصول جن پر پاکستان میں کوئی بھی عوامی فوج بناتے وقت عمل کرنا لازم ہے ۔ یا یہ کہنا چاہیئے کہ ان اصولوں کا پابند رہتے ہوئے جس عوامی فوج کی تشکیل کی جائے گی وہ پاکستان کے لیے سود مند ثابت ہوگی کیونکہ یہ اصول اپنے حقائق کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے ہیں ۔ اب عوامی فوج کی تشکیل کے ایک منصوبے کا خاکہ پیش کرتا ہوں ۔

عوامی فوج بغیر قومی اسمبلی کی منظوری کے نہیں بنائی جا سکتی ۔ اس لیے اوّل ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی اسمبلی ایسی فوج بنانے کی منظوری اور اُس کی تشکیل کے اصولوں کو ایک بل کی صورت میں پاس کرے ۔ اس کے بعد فوجی ماہرین اس کی تنظیم و تربیت کا مفصّل خاکہ تیار کر کے وزارتِ دفاع کو پیش کریں جو گورنمنٹ کی منظوری کے بعد فوج کو اس پر عمل درآمد کرنے کا حکم صادر کرے ۔

عوامی فوج رضاکارانہ طور پر قائم کی جائے۔ اگر بذریعہ ترغیب بھرتی کرنے میں ناکامی ہو تو متبادل طریقے یا جبری بھرتی کا اصول استعمال کیا جائے۔ تنظیم کا نام قومی زبان میں ہو یا تاریخِ اسلام کے کسی دور سے ماخوذ ہو۔ یونٹوں وغیرہ کے ناموں میں علاقائی جھلک ہو مثلاً حیدرآباد ڈویژن، ناظم آباد بریگیڈ، انارکلی بلٹن۔ یا یہ نام بھی اسلامی تاریخ سے ماخوذ ہوں۔ تنظیم میں بھرتی کا موقع سب شہریوں کو یکساں ملنا چاہیئے۔ البتہ یہ شرط لازم ہے کہ وہ طبی نقطۂ نگاہ سے صحت مند ہوں اور متعلقہ قصبے یا گاؤں کے مکین ہوں۔

تمام بڑے بڑے شہر مثلاً کراچی، حیدرآباد، کوئٹہ، ملتان، لاہور، پشاور وغیرہ میں ایک بریگیڈ سے شروع کر کے ایک ڈویژن یا اس سے بھی زیادہ تک بڑھ جانا چاہیئے۔ چھوٹے شہروں مثلاً خیرپور، نواب شاہ، ساہیوال، نوشہرہ وغیرہ میں ایک ایک بریگیڈ گروپ ہو۔ قصبات میں ایک ایک بلٹن یا رجمنٹ تیار کی جائے۔ جس طرح ہر گاؤں خاص طور پر سرحدی گاؤں میں اُن کی آبادی کے مطابق سیکشن یا پلاٹون ہوں جنھیں اردگرد کے گاؤں سے ملا کر بڑے یونٹوں میں منظم کیا جا سکتا ہے۔ سرحدی قصبات اور گاؤں کے لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ بصورتِ جنگ وہاں کے دستوں کو اپنے ہی علاقوں کے دفاع کے لیے مامور کیا جائے گا۔ عوامی فوج کے دستوں کے لیے اسلحہ اور باقی ساز و سامان قریبی چھاؤنیوں اور پولیس اسٹیشنوں میں جمع کر دیا جائے تاکہ بوقتِ ضرورت آسانی سے حاصل کیا جا سکے۔

کمانڈ اور کنٹرول

اس تنظیم کی کمانڈ اور کنٹرول مکمل طور پر فوج کے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے۔ اور اس کا ہر فرد تنظیم کے قانون کا پابند ہو۔ ذاتی افواج اور نجی ہتھیار بند تنظیمیں دفاع کے فرائض کم انجام دیتی ہیں اور ملک میں انتشار پھیلانے کے لیے زیادہ۔ شروع شروع میں شاید فوج کے لیے بہت سے افسر اس کام کے لیے مہیّا کرنے ممکن نہ ہوں۔ بہ فرض چند پیشہ ور افسروں کی نگرانی میں بھی شروع کیا جا سکتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ افسروں کی تعداد میں بھی تقاضوں کے ساتھ ساتھ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ایسے ہونہار اور مقامی افراد سامنے آ جائیں گے جو کم از کم غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم گروہ سے بہر صورت بہتر ثابت ہوں گے اور آہستہ آہستہ مزید تربیت اور تجربے کے بعد اپنا فرض بخوبی انجام دے سکیں گے۔

جہاں تک کمانڈ اور کنٹرول کا تعلق ہے:

(الف) جنرل ہیڈکوارٹرز میں موجودہ تنظیم کے اور اپنی عوامی فوج کا ایک ڈسٹرکٹ بنانا چاہیئے۔

(ب) ڈویژن، سب ایریا اور اسٹیشن جی۔ ایچ۔ کیو کی ہدایات کے مطابق ٹریننگ اور تنظیم میں

مدد دیں۔ اور اگر ضرورت ہو تو ہر مستقل ڈویژن کے ساتھ ایک ٹریننگ بریگیڈ قائم کی جا سکتی ہے۔

(ج) موجودہ کمانڈ کی ہر سطح پر ضرورت کے مطابق تھوڑا سا اسٹاف مہیا کیا جائے جو عوامی فوج کی ٹریننگ اور اس کے انتظام کرنے میں مددگار ثابت ہو۔

(د) قصبوں اور گاؤں میں با اثر اور باعزت افراد پر مشتمل کمیٹیوں کی تشکیل ہونی چاہیئے جو وزارتِ دفاع سے منظور شدہ معاملات میں اور بھرتی کے لیے مددگار ثابت ہوں۔

یہ تھا مختصر سا منصوبہ۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ جو اصول میں نے شروع میں بیان کیے تھے یہ اُن کے بالکل مطابق ہے اور قوم کی موجودہ دفاعی ضروریات اور مقاصد کے لیے بھی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ شہری آبادی اس طریقے سے کسی نہ کسی طرح ملک کے دفاع سے منسلک ہو جاتی ہے اور قوم کی دفاعی استعداد کو مزید توسیعی انداز میں بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قوم میں جو دفاعی نظریہ پہلے سے موجود ہے وہ اور گہری بنیادوں پر استوار ہو سکتا ہے۔

اختتامیہ

قومی جذبے کی کیفیت بار بار عیاں ہو چکی ہے اور حال ہی میں ایک بار پھر ہوئی ہے۔ مطلوبہ افراد اب بھی موجود ہیں اور بلاشک وہ اس قسم کی کسی بھی تنظیم میں شامل ہو کر اپنے جذبے کا عملی ثبوت دینے کو تیار رہیں۔ وقت کی سب سے اہم ضرورت کسی ایسی تنظیم کا قیام ہے جس کی بدولت ملک کو بیرونی جارحیت سے موثر انداز میں محفوظ رکھا جا سکے، اور جو قومی جذبے اور قومی کردار کے مطابق ہو۔ توقع ہے کہ یہ منصوبہ ان ضروریات پر پُورا اتر سکتا ہے۔

کسی بھی قومی حکمتِ عملی کی کامیابی کا انحصار سیاست، سفارت اور عسکریت پر ہوتا ہے۔ ان تینوں اجزا کے دانشمندانہ استعمال ہی سے ہم ایک بار پھر اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ملک کی سیاست حال ہی میں عوامی نمائندوں کے ہاتھ میں آئی ہے۔ اور اُمید رکھنی چاہیئے اب ہماری سیاست کامیابی کی طرف گامزن ہوگی۔ ایک کامیاب سیاست کے ساتھ سفارت کا کام بھی آسان اور موثر ہو جاتا ہے۔ عسکری قوت کو بڑھانے میں عوامی فوج ایک اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ میں نے عوامی فوج کی تشکیل کے جو اصول اور منصوبہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے وہ ایسی عوامی فوج بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے اور اس سے ہماری عسکری قوت میں ایک اہم اضافہ ہو سکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم کے لیے وہ لمحات انتہائی پُرشکوہ اور اُس کی تاریخ کے سنہری باب ہوتے ہیں جب سپاہی اور عام آدمی ایک دوسرے کا متبادل بن جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو خوش قسمتی سے پاکستان میں بعید از حصول نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ منصوبہ تمام مقاصد کے حصول پر حاوی نہ ہو تاہم اصل مقصد کے حصول کی بنیاد ڈال سکتا ہے۔

جناب محترم جسٹس (ریٹائرڈ) قدیرالدین احمد صاحب

آپ نے میجر جنرل فضلِ مقیم صاحب کے خیالات "احترامِ عسکریت اور عوامی فوج" کے مضمون پر سُنے، انھوں نے محنت سے اپنا مقالہ شامِ ہمدرد تیار کیا ہے اور بہت سی ایسی باتیں بتائی ہیں جو مفید اور کارآمد ہیں۔ آج کا مضمون اُن کے ذاتی فن اور قابلیت سے خاص مناسبت رکھتا تھا اور ہمارے ملک کی جنگ اور شکست کے بعد اس کی اہمیت بھی خاص تھی۔ میرا تعلق اس مضمون سے دو طرح سے ہے۔ ایک پُرانی خاندانی روایت کی بنا پر ہے اور دوسرا آج کل ملک اور ملّت کو جو ضرورت ہر فرد کی خدمت کی ہے اس بنا پر ہے۔

آج کے مضمون کے دو جزو ہیں۔ ایک افواج کے احترام کا اور دوسرا افواج کے عوامی ہونے کا۔ "عوامی" کے لفظ سے غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس سے مُراد نہ ولی خاں صاحب کے "ذلمے" سے ہے اور نہ جنرل اکبر خاں کے نیشنل گارڈ سے ہے۔ بلکہ مُراد یہ ہے کہ ساری قوم تربیت حاصل کر کے ایک عوامی فوج بن جائے۔ ایسی فوج پیشہ ور فوج سے مزاج اور مقاصد دونوں میں بہت مختلف ہوتی ہے۔

میجر جنرل فضلِ مقیم صاحب نے فنی لحاظ سے یہ تجویز پیش کی ہے کہ پیشہ ور فوج تھوڑی سی ہونی چاہیے اور عوامی فوج بنیادی طور پر تیار کی جانی چاہیے۔ انھوں نے سات دلائل اس تجویز کی تائید میں بیان کیے ہیں، جن میں سے مجھے چار خاصے وزنی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ عوامی فوج مقابلتاً سستی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس کی وسعت اور تعداد بہت بڑی ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ وقت پڑنے پر اُس میں سے پیشہ ور فوج کو بھی وسعت دی جا سکتی ہے۔ چوتھے یہ کہ شروع ہی سے ملک کی حفاظت میں عوام کو شریک کرنے سے افواج کے قومی احساس اور جذبۂ ملّی کو تقویت پہنچتی ہے۔

میں فنِ عسکریت کے متعلق نہیں بلکہ اُس کی قومی نفسیات پر چند الفاظ کہوں گا۔ آج کا مضمون بہت باموقع ہے، کیونکہ ملک حیران ہے کہ پاکستان کی فوج کو اُس کی جاں بازی کی بنا پر اپنا دوست سمجھے یا فوج کی حکومت کی بنا پر اُس کو ایک فریق سمجھے۔ ایک طرف ہماری افواج اور نوجوانوں، افسروں اور سپاہیوں نے جاں بازیاں دکھائیں اور بڑے بڑے کارنامے کیے اور دوسری طرف ملک کے ہر ہر گوشے اور ہر گلی کوچے میں فوج کی طاقت اور بالادستی کا سب عوام و خواص کو احساس ہے۔ ہر چیز میں فوج کا دخل ہے۔ قانون فوجی ہے۔ چناں چہ بعض گرفتاریاں بھی فوج ہی کے نام سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعض مقامات بھی

فوجی ہیں۔ شکست بھی فوجی ہے اور رات دن چرچا ہی یہ ہے۔

ان حالات میں سوچنا یہ ہے کہ فوج کا احترام کیا معنی رکھتا ہے۔ احترام اور عزت کے معنی بہت کچھ ایک سے ہیں۔ مگر احترام میں عزت کی نسبت احساس کی گہرائی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ الفاظ جن خدمات کی ترجمانی کرتے ہیں وہ تعریف، قدر دانی اور تعظیم سے دُور ہیں۔ تعریف تو محض افرادِ کمال کی ہو سکتی ہے خواہ وہ پسندیدہ صفت کی ہو یا نہ ہو۔ مثلاً اگر کوئی فنکار کسی فن کا مظاہرہ کرے تو اُس کے فن کی دل کھول کر داد دی جا سکتی ہے۔ مگر عزت اور چیز ہے۔ قدر دانی اس چیز کی ہوتی ہے جو اپنے لیے کار آمد ہو۔ اگر کوئی ذرا فائدہ پہنچائے تو اُس کی قدر ہوتی ہے عزت نہیں۔ تعظیم ادب کے اظہار کو کہتے ہیں۔ ہر طاقت ور اپنی تعظیم کرا سکتا ہے مگر عزت اور احترام اُس وقت ہوتا ہے۔

جب کسی چیز یا انسان کے ساتھ یہ احساس وابستہ ہو کہ ذاتی غرض سے مبرا ہے اور اُس کا وجود کسی ایسی اعلا قدر کے مطابق ہے جسے ہمارا ضمیر مانتا ہے۔ خود غرضی کی دنیا میں کبھی عزت نہیں ہوتی۔ غور سے دیکھیے تو اس نتیجے پر پہنچیے گا کہ کسی شخص کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ بے غرض ہو۔ عزت اور احترام ہمیشہ اس صفت کا ہوتا ہے جو ہمارے ضمیر کی پکار کے مطابق ہو۔ چنانچہ پیشہ ور فوجوں کی تعریف ہو سکتی ہے، قدر دانی ہو سکتی ہے اور تعظیم ہو سکتی ہے مگر اُن کی عسکریت کا احترام نہیں ہو سکتا۔

عسکریت اور سپہ گری میں فرق ہے۔ سپہ گری کا تصور چند خاص صفات سے وابستہ ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک اچھا سپاہی جری اور جاں باز ہوتا ہے۔ اُس کا جسم تربیت یافتہ اور مضبوط ہوتا ہے تاکہ وہ مشکلات کا مقابلہ کر سکے۔ وہ وفادار اور فرماں بردار ہوتا ہے اور اسلحہ کے استعمال کا ماہر ہوتا ہے۔ وہ آرام طلبی سے دُور سخت کوش اور مشکل پسند ہوتا ہے۔ ان صفات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دُنیا کے ہیر پھیر اور دیگر آلائشوں سے دُور اور پاک ہوتا ہے۔ ان صفات کو مشرقی روایات نے ہمیشہ سراہا ہے۔ اور سپاہیوں نے خود اُن پر فخر کیا ہے۔ بہادری، سادگی اور بے غرضی سپاہیوں کے خاص تمغے رہے ہیں جن کی چمک اُن کی قوموں کے دل لبھاتی رہی ہے اور خود سپاہیوں کے دلوں کو تقویت دیتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب غالب جیسا شاعر اپنی شاعری پر اعتراض ہونے سے افسردہ خاطر ہوا تو اُس نے سپہ گری کی خاندانی روایت پر فخر کر کے اپنی عزت کو سنبھالا۔

عسکریت ان معنوں میں سپہ گری نہیں ہے بلکہ وہ تو سپاہیوں کی تنظیم ہے جس میں سیکڑوں اور ہزاروں سپاہی مل کر ایک لشکر بن جاتے ہیں۔ اُس کی اعلا صفات قواعد، پریڈ اور ڈرل ہے۔ چھوٹے افسروں کا کام میدانِ کارزار میں نئے سے نئے اسلوب اور طریقے اختیار کرنا ہے اور بڑے بڑے افسروں کا کام میدان سے باہر نئی چالیں اور مصلحتیں اختیار کرنا ہے۔ اس فن اور ہنر اور تنظیم کی تعریف ہو سکتی ہے، قدر دانی ہو سکتی ہے اور تعظیم بھی ہو سکتی ہے مگر احترام نہیں ہو سکتا، کیونکہ

محض تنظیم میں نہ بے غرضی ہے اور نہ کسی اعلا قدر کے حاصل کرنے کی جستجو ہے۔ عسکریت کی خوبیوں کا انحصار تنظیم کی خوبی اور اسلحہ کی برتری پر ہوتا ہے اور یہ دونوں خوبیاں رُوحانی اقدار سے خالی ہیں۔ بغیر رُوحانی صفت کے احترام کا تصوّر بے معنی اور بے جان ہے۔

البتہ رُوحانی قوّت افواج میں اُس وقت آتی ہے جب اُن کا اور اُن کی کارگزاری کا مظہر ایسا ہو جو انسانوں کے ضمیر کی پکار کا جواب ہو۔ مذہبی زبان میں اُس کو جہاد کہا جاتا ہے۔ ایک مجاہد خود غرضی سے دُور رہتا ہے اور ایک مقصدِ اعلا و ارفع کا فدائی ہوتا ہے۔ وہ اور اُس کا کام دونوں محترم ہوتے ہیں۔

نپولین دنیا کا ایک غیر معمولی اور مانا ہوا جنرل تھا۔ اُس نے چالیس لڑائیاں جیتی تھیں۔ آخر میں وہ ایلبا میں قید تھا تو کسی کے سوال پر اُس نے کہا کہ میدانِ جنگ اور چالیس معرکے میرا نام دنیا میں زندہ رکھ سکیں گے لیکن میں نے جو ضابطہ اور قانون تیار کرایا ہے اُس سے میری یاد قائم رہے گی۔ چنانچہ آج بھی اُس کا ضابطۂ قانون یورپ کے بہت سے ملکوں اور جنوبی امریکا میں کسی نہ کسی صورت میں رائج ہے۔

عسکریت اس وقت قابلِ احترام ہوتی ہے جب اُس کا وجود اُس کے افراد کی زندگی کسی اعلا مقصد کے حاصل کرنے کے لیے وقف ہو۔ جب وہ خالصًا ملک کی حفاظت اور ملّت کی طرفداری میں محرک ہوتی ہے تو اعلیٰ قدروں کی ہم رکابی کی وجہ سے وہ قابلِ احترام ہوجاتی ہے۔ اگر عسکریت ملک گیری کا شکار ہوجائے تو ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت رہ جاتی ہے۔ احترام کے حق دار ہونے کے لیے عسکریت کو خود غرضی سے پاک اور مقصدِ اعلا کا شیدائی ہونا ضروری ہے۔ ہم اپنے دل و جان سے مسلمانوں کے سپاہیوں اور فوجوں کا احترام کرتے ہیں۔ اپنے ان جاں بازوں اور نوجوانوں کا بھی احترام کرتے ہیں جنھوں نے اپنے خون کے چراغ جلا کر ہمارے دلوں کو روشن کیا۔ جو تصوّر ہماری روحوں کو تسخیر کرتا ہے اس کا کچھ بیان سننا ہو تو حضرت علامہ اقبال کے تین اشعار پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی



ڈاکٹر اسرار الحق خطاب کر رہے ہیں



ڈاکٹر اسرار الحق، پروفیسر حمید احمد خاں (صدرِ مجلس)، حکیم محمد سعید



مسٹر جسٹس سجاد احمد جان
حکیم محمد سعید کے ساتھ
مصروف گفت گو

آغازِ اجلاس سے قبل



حکیم محمد سعید
آٹوگراف
دے رہے ہیں

احترامِ کسان

کلمات ابتدائیہ : حکیم محمد سعید

مقالہ : جناب محترم ڈاکٹر اسرار الحق

کلمات صدارت : جناب محترم پروفیسر حمید احمد خاں

شامِ ہمدرد، لاہور

۲ مارچ ۱۹۷۲ء

حکیم محمدؐ سعید

مختلف پیشوں کے افراد انسانی معاشرے کے قیام، اس کی تعمیر اور فلاح و بہبود میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور انھی افراد کی بھرپور اور وفادارانہ شرکت پر تمدن کی بقا و ترقی کا انحصار ہوتا ہے۔ کوئی تمدن مختلف پیشوں کے تعاون اور شرکت کے بغیر پھل پھول نہیں سکتا۔ کوئی انسانی معاشرہ اس وقت تک متوازن ترقی نہیں کرسکتا جب تک اس کے افراد دل وجان کے ساتھ اپنے حصے کے کام انجام نہ دیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف پیشے اور طبقے باہمی تعاون اور انصاف سے کام لیں اور کوئی پیشہ یا طبقہ اپنی موثر اور مقتدر حیثیت کا غلط فائدہ اٹھاکر دوسرے پیشوں کے ساتھ ناانصافی نہ کرے۔ اگر مقتدر طبقہ انصاف اور دیانت سے کام نہیں لے گا تو وقتی طور پر وہ فائدہ اٹھاسکتا ہے اور اپنے اثر کو عارضی طور پر تو بڑھا سکتا ہے لیکن آخر کار ناانصافی رنگ لائے گی اور میزانِ تمدن کے پلڑے مساوی نہیں رہ سکیں گے۔ نتیجے میں معاشرہ اتھل پتھل ہوجائے گا اور افراتفری کی دلدل میں پھنس کر استحکام کے بجائے انتشار اور افتراق کا شکار ہوجائے گا اور معاشرے کی ہم آہنگ ترقی کے منصوبے غتر بود ہوجائیں گے۔

پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور ہماری آبادی کی عظیم اکثریت دیہات میں رہتی ہے جس کا پیشہ زراعت اور کھیتی باڑی ہے۔ ہمارے معاشرے میں کسان اہم کردار ادا کرتا ہے اس لیے کسان ہمارے معاشرے کا اہم ترین رکن ہونا چاہیے اور اس کی اہمیت کو ہمیں مجبوراً نہیں بلکہ دل سے محسوس کرنا چاہیے۔ معاشرے کی بقا کے لیے دو قسم کی غذائیں ضروری ہیں۔ ایک وہ غذا جو جسم وجان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے، دوسری وہ غذا جو ذہن و روح کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ پہلی غذا کسان فراہم کرتا ہے اور دوسری قسم کی غذا ہمیں دانشور عطا کرتا ہے۔ جسم کی بقا اور صحت کے بغیر ذہن کی توانائی ممکن نہیں۔ اس لیے ہمارا اوّلین مسئلہ پہلی قسم کی غذا اور ہمارا اوّلین دوست کسان ہے۔ کسان جو اپنا خون پسینہ ایک کرکے چلچلاتی دھوپ اور برفانی ہواؤں میں زمین کا سینہ چیرتا ہے اور ہمیں زندہ رہنے کی طاقت بخشتا ہے۔ کسان جس کا پسینہ خون بن کر قومی زندگی کے جسم میں دوڑتا ہے اور جو ادیب کے قلم کو تیکھاپن، سپاہی کو ہمت و حوصلہ، مزدور کو طاقت، کارخانے دار کو دولت، تاجر کو منفعت، اُستاد کو عزت اور سیاست داں کو حکومت عطا کرتا ہے۔ کسان کے بغیر ہمارا جسد خاکی بے جان، ہمارا وجود ذہنی مُردہ اور ہمارا وجودِ قومی

بے آن ہوتا ہے۔ کسان کی زندگی ہماری زندگی ہے، کسان کا اطمینان ہمارا اطمینان ہے۔ کسان کی خوش حالی ہماری فارغ البالی ہے، کسان کی عزّت ہمارا افتخار ہے، کسان کا احترام ہمارا اپنا احترام ہے۔ کسان کی عزّت نہ کرکے ہم اپنی زندگی گھٹا سکتے ہیں بڑھا نہیں سکتے۔ میری یہ بات محض دعوا نہیں ایک حقیقت ہے اور بالکل کھلی ہوئی حقیقت جس کا احساس ہم بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ غذائی قلّت اور غلّے کی نایابی ہمیں دوسرے ملکوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مجبوری ہماری خودداری کو زخمی کرتی ہے اور عزّتِ نفس سے محروم ہو کر ہم ذہنی طور پر پست اور سیاسی طور پر مضمحل ہو جاتے ہیں۔

کسان ہمارا دوست اور محسن ہی نہیں رہنما بھی ہے۔ اگر ہم احساسِ برتری کے جال سے نکل کر غور کریں تو کسان کی زندگی میں بہت سے سبق پنہاں ہیں۔ سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ محنت زندگی کی اصل ہے۔ محنت کے بغیر زندگی کا تصوّر نہیں ہو سکتا۔ محنت ہی سے انسان ارضی و سماوی آفات کا مقابلہ کرتا ہے۔ محنت ہی سے ذاتی مشکلات اور قومی بحران پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ محنت ہی سے صحت قائم رہتی ہے۔ کسان صبح سے شام تک محنت کرتا ہے، موٹا جھوٹا پہنتا ہے اور روکھی سوکھی کھاتا ہے۔ مصائب سے دوچار ہے، مشکلات میں گھرا ہوا ہے لیکن پھر بھی ہمّت نہیں ہارتا۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ فطرت سے قریب ہے اور فطرت کے سادہ اصولوں کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ اس لیے بہت سی تہذیبی مصیبتوں سے محفوظ ہے۔ تازہ ہوا اور صاف پانی سے مستفید ہونے کی بنا پر مصائب اور امراض کا مقابلہ کر لیتا ہے۔ غنیمت ہے کہ اب تک شہر کے باسیوں کے قبضے میں صاف ہوا اور آلودہ ہوا کو تبدیل کرنے کا کوئی ہتھیار نہیں آیا ہے۔ ورنہ شاید کسان قدرت کی اس نعمت سے محروم کر دیا جاتا، اور قوم کو زندگی بخشنے والا کسان رہی سہی توانائی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔

اگر ہم معاشرے کو غیر متوازن کرنا نہیں چاہتے، اگر ہم ٹھوس بنیادوں پر ترقی کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم عزّتِ نفس اور خودی سے محروم ہونا نہیں چاہتے تو ہمیں کسان کا احترام کرنا چاہیے اور اس کے احترام کو اپنی فکر کا جزو بنانا چاہیے۔

"احترامِ کسان" کے موضوع پر تقریر کے لیے آج ہم نے ملک کے نامور سائنس داں جناب محترم ڈاکٹر اسرار الحق، وائس چانسلر مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی (لائل پور) کو دعوت دی ہے۔ ڈاکٹر حق صاحب تعمیرِ ملک و ملّت کی کوششوں میں پیش پیش ہیں۔ وہ پاکستان کو نہ صرف سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں سربلند دیکھنے کے آرزو مند ہیں بلکہ وہ غذا کے معاملے میں پاکستان کو خود کفیل بنانے کی جدوجہد میں پیش پیش ہیں۔ وہ ایک طرف تعلیم سائنس کو عام اور مفید مطلب بنانا چاہتے ہیں، دوسری طرف وہ سائنسی جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان کی خوش حالی چاہتے ہیں۔ ہمارے درمیان آج ڈاکٹر

محترم ڈاکٹر اسرار الحق صاحب ہیں اور ہم اُن سے "احترام کسان" کے موضوع پر یقیناً اہم باتیں سُن سکیں گے۔

آج شام ہمدرد کی صدارت دنیائے تعلیم کی معروف اور بین الاقوامی شخصیت جناب محترم پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کر رہے ہیں۔ جامعہ پنجاب کے شیخ (وائس چانسلر) کی حیثیت سے پروفیسر صاحب نے پاکستان کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں اور تعلیم کے معیار کو بڑے عزم کے ساتھ بلند رکھنے کی سعی کی ہے۔ تعمیرِ اذہان سب سے بنیادی مسئلہ جانتے ہیں۔ سیاسی آزادی کے باوجود ہم فکری غلامی میں مبتلا ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اس نکتے کا بھرپور ادراک کرتے ہیں اور طلبہ کو فکری آزادی حاصل کرنے کی تلقین میں شب و روز گزارتے ہیں۔ اُن کی جدوجہد معروف ہے اور اس کے اثرات بھی ہم افرادِ ملت میں پاتے ہیں۔ پاکستان کے لیے یہ لوگ انتہائی محترم اور مغتنم ہیں۔ ہم اُن کی جس درجہ قدر و منزلت کریں کم ہے۔

جناب محترم ڈاکٹر اسرار الحق

ستارۂ قائد اعظم، تمغۂ قائد اعظم
وائس چانسلر، مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی، لائل پور

آپ کو غالباً اس بات کا علم ہوگا کہ شام ہمدرد کے اس سال کے ماہانہ سلسلۂ تقاریر کی آج یہ لاہور میں تیسری تقریر ہے اور اس کا عنوان "احترام کسان" ہے۔

میں دانش وردوں کے اس ممتاز اجتماع کے سامنے اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ احترام انسان بالخصوص احترامِ کسان کو، جسے ہم بہ حیثیت قوم فراموش کر چکے ہیں، جاننے، پہچاننے اور اپنانے کی ضرورت واضح کروں، اور ایسی تدابیر اختیار کرنے پر زور دوں جن سے قومی سطح پر اس کا صحیح تصوّر قائم ہو سکے۔ ہماری قوم کا اندازِ گفتار و کردار جب تک اس احترام سے مزیّن نہیں ہوتا اس وقت تک ہمارے علم و عمل کے خزینے بھی قابلِ تحسین و احترام نہیں ہوں گے۔

قبل اس کے کہ میں کسان کے کردار کے واجب الاحترام پہلوؤں کو پیش کروں، مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ ہمدرد فاؤنڈیشن کے فاضل حکیم محمّد سعید صاحب نے اس سال کے سلسلۂ تقاریر کو مختلف طبقوں کے احترام سے مربوط کر کے ہمیں اخلاق کے ایک ایسے رُخ کی جانب متوجّہ کیا ہے جسے اپنانے سے ہم نہ صرف اخلاقی برتری کے حامل ہو سکتے ہیں بلکہ اپنی قومی سرگرمیاں تیز تر کر کے اپنا مقدر بنا سکتے ہیں۔ احترام و عمل کا فقدان ہمیشہ بدنصیبی کی علامت ہوتا ہے۔ احترام اتنا پاکیزہ اور اس قدر روح پرور عمل ہے کہ اس کا پابند ہو کر انسان مخلوق کی خدمت اور خالق کی عبادت کے اونچے درجات تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کائنات کی تمام موجودات کا احترام اور اُن کے خالق کی ہمہ گیر قدرت اور وحدانیت کا اعتراف ہر ذی ہوش انسان کے ایمان کی پختگی و سلامتی کی نشان دہی کرتا ہے۔

دوسروں کا احترام کرنے والا اپنے عقیدۂ احترام سے اپنے اور دوسروں کے درمیان نیز اپنے خالق کے ساتھ ایک خوش گوار رشتہ استوار کر لیتا ہے اور تمام کائنات کو واجب الاحترام اور ذات باری کو اُن کا خالق و مالک مان کر اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشرے کے مختلف طبقات میں سے کسانوں کے طبقے کے احترام کو موضوع گفتگو بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ سرسری نظر سے دیکھنے پر بھی یہ بات واضح طور پر محسوس ہوتی ہے کہ کسانوں کے کثرت، جفاکش اور خدا ترس ہونے کے باوجود ان کی قدر و منزلت اتنی نہیں کی جاتی جتنی کہ ہونی چاہیے۔ اس کے تین بڑے سبب ہیں:

ایک تو یہ کہ ہم اسلامی قانونی مساوات سے دور ہو گئے ہیں جو ملت کے ہر فرد کے احترام اور اس کے حقوق کا ضامن ہے۔

دوسرے یہ کہ بنی نوعِ انسان کی مادہ پسندی نے احترام کو ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا ہے جو عالم اور ہنرمند ہونے کے بجائے دولت مند اور سرمایہ دار ہوں، جو روحانیت اور عدل کی جگہ زورِ بازو اور خمار مقام کے معتقد ہوں اور جو فرض شناسی اور جفاکشی پر غیر ذمے داری اور تن آسانی کو ترجیح دیتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ زمانۂ سلف سے ہی کسان زیادہ تر ناخواندہ و نادار رہے۔ لہٰذا مجموعی طور پر انھیں واجب الاحترام نہیں گردانا گیا۔ فصلوں کے اچھے سالوں میں پیداوار کی تعریف تو ہوئی، مگر پیداوار بڑھانے والے کاشت کار عزت و احترام انسانی سے محروم رہے اور ان کی اصلاحی حاجات کی جانب نسبتاً کم توجہ دی گئی۔

ان حقائق کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ ہماری قوم کا ہر ہوش مند فرد احترام کسان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھے اور اپنائے تاکہ اس احترام کے زیر سایہ کسانوں کا طبقہ اس طرح پروان چڑھے کہ وہ پاکستان کو مثالی طور پر خوش حال، مضبوط اور باوقار مملکت بنا سکے۔

ہماری تین چوتھائی آبادی کسانوں پر مشتمل ہے۔ پاکستان میں قریب ایک لاکھ دیہات ہیں اور ان کی مجموعی آبادی قصبوں اور شہروں میں رہنے والوں سے تقریباً چھ گنی ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر قوم کے اتنے بڑے طبقے کو انفرادی اور مجموعی طور پر احترام سے محروم کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پوری کی پوری قوم خود اپنی اور پرائی نظروں میں واجب الاحترام نہیں رہے گی اور یہ ملک قومی اور بین الاقوامی سطح پر باوقار حیثیت حاصل نہ کر سکے گا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے کسانوں میں یعنی دیہات میں خواندگی کی شرح صرف ۱۷ فی صد ہے (۲۵ فی صد مردوں میں اور ۷ فی صد عورتوں میں) اور کسانوں کو گنوار کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ مگر سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر ان میں رسمی تعلیم کی کمی ہے تو اس میں اُن کی کیا خطا ہے؟ صدیوں سے معاشرے کے تعلیم یافتہ اور برسرِ اقتدار افراد اُن کی تعلیم و تربیت کی طرف بے توجہی اور بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ کسانوں سے زیادہ سے زیادہ پیداوار اور لگان حاصل کرنے کی کوششیں تو ہر زمانے میں ہوتی رہیں، مگر ان کی ناخواندگی اور پس ماندگی کو دُور کرنے کی تدابیر اس کرۂ ارض کے بیشتر خطوں میں بہت کم کی گئی ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاشرے کے کسی طبقے یا اُس کے کسی فرد کی خدمت میں عقیدت و احترام کا نذرانہ پیش کرنا اس کی ترغیب اور حوصلہ افزائی کا موثر ذریعہ ہے۔ کسان کا احترام بھی اُسے اپنے پیشے پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم رکھنے اور اس کو فروغ دینے کا زبردست محرک ہے۔

ہمارے اکثر دیہی نوجوان جن کا آبائی پیشہ زراعت ہے، اپنے پیشے کو ترک کرکے زیادہ منفعت بخش پیشے اختیار کرنے کے لیے شہروں کا رخ کرتے رہتے ہیں۔ اکرام محنت کے نزدیک اسلامی شعار کا تقاضا محنت کشوں کا صرف احترام کرنا ہی نہیں انہیں قابلِ احترام بنانا بھی ہے۔ اس لیے کسانوں کا رسمی طور سے ادب کر لینا ہی کافی نہیں ان کے پیشے کو اُن کے لیے زیادہ دلچسپ، پرکشش، دلفریب اور منفعت بخش بنانا بھی ضروری ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ کسانوں کو جاگیرداروں کی حرص و ہوس، قرض خواہوں کی گرفت اور زرعی مستعملات کی احتیاج سے نجات دلائی جائے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ہاں تاریخ میں پہلی بار عوامی حکومت برسرِ اقتدار آئی ہے اور اب یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں نہ صرف کسانوں کو پس ماندگی سے نجات دلانے کی مناسب تدابیر کی جائیں گی بلکہ ان کا وہ وقار و احترام بھی بحال ہو جائے گا جس کے وہ فی الواقع مستحق ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی ضروری ہے کہ جب تک تمام مفکرین، کارکن اور عوام اپنے اپنے فرائض ادا نہ کریں اور حکومت سے دلی تعاون نہ کریں تنہا حکومت کی کوششیں تمام مسائل کو حل نہیں کر سکتیں۔

کسانوں کی یہ بات بھی قابلِ احترام و ستائش ہے کہ رسمی تعلیم کی کمی کے باوجود وہ مجموعی طور پر دیگر طبقات کی نسبت اسلامی احکام کے زیادہ پابند ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اہلِ ہنود کے ساتھ کئی سو سال رہنے کے سبب ہمارے دیہی عوام نے چند غیر اسلامی رسوم اپنا رکھی ہیں مگر وہ بنیادی طور پر اچھے مسلمان ہیں اور اس لحاظ سے شہری لوگوں سے کہیں بہتر ہیں جو زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مغربی زندگی کا شکار ہیں اور اسلامیات سے دور بھاگ رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دیہی زندگی کی سادگی، کسانوں میں محنت، اخلاق اور خدا ترسی کے وہ اوصاف پیدا کرتی ہے جو انہیں واجب الاحترام بناتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے ہاں زیادہ تر لوگ ایسی سادگی کو اختیار کرنے کے بجائے درآمد کردہ فلسفوں اور مسائل میں اُلجھ جاتے ہیں۔ لہٰذا آج ایک ایسے نظامِ تربیت کی ضرورت ہے جو ہم سب کو اسلامی قدروں کو اختیار کرنے اور انسانیت کا احترام کرنے کی ترغیب دے سکے۔ ہمارے قومی شاعر نے بھی یہی کہا ہے:

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

کسانوں کے کردار کا ایک اور بڑا پہلو اُن کی جفاکشی ہے جو ایک طرف اُن کی فرض شناسی پر دلالت کرتی ہے اور دوسری طرف قومی پیداوار اور اقتصادیات کو فروغ دینے کی ضمانت دیتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ یہ فرض شناسی ہی کا جذبہ ہے جس کے تحت وہ جسم کو ٹھٹھرا دینے والی سردی اور بدن کو جھلسا دینے والی گرمی میں بھی دن رات کھیتی باڑی کے کاموں میں باقاعدگی سے مصروف رہتے

ہیں۔ یہ ان ہی کی جفاکشی کا کرشمہ ہے کہ ہمارے ملک میں پونے سات کروڑ ایکڑ اراضی سے ہر سال کثیر المقدار زرعی پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ پندرہ کروڑ چوپایوں اور مرغیوں کی پیداوار سے قومی ضروریات پوری ہوتی ہیں، اور کروڑوں من دیگر خوردنی اور غیر خوردنی اجناس دستیاب ہوتی ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہمارے ملک کی مجموعی قومی آمدنی کا تقریباً نصف حصہ زرعی شعبے کا مرہونِ منت ہے۔ زرعی شعبہ اہلِ پاکستان کی اساسی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور قومی آبادی کا چار بٹے پانچ حصہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی روزی اسی شعبے سے حاصل کرتا ہے۔ ہمارے وطن عزیز کی معیشت اور بقا کا جب کسانوں کی جفاکشی سے اس قدر گہرا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ اُن کے احترام میں کبھی ہمیں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھنی چاہیے خصوصاً اس لیے کہ فرض شناس، جفاکش اور خدا ترس عوام کا احترام نہ کرنا ایک مسلمان کو الحاد کی طرف لے جاتا ہے یعنی خود اُسے اپنے خالق سے برگشتہ کر دیتا ہے۔

اس موضوع کا ایک اور رُخ بھی غور طلب ہے۔ گزشتہ پانچ چھے ہزار سال یعنی مغربی پاکستان کی شمال مغربی پہاڑیوں کے تمدّن کے دور سے لے کر اب تک چوں کہ کسانوں کے حقوق اکثر پامال ہوتے رہے ہیں اس لیے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کے حقوق جن میں اُن کا احترام پیش پیش ہے نہ صرف جلد بحال کیے جائیں بلکہ اس طرح بحال کیے جائیں کہ گزشتہ صدیوں کی کوتاہیوں کی تلافی ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض قدیم حکمرانوں مثلاً اشوک اعظم، علاؤالدین خلجی اور اکبر اعظم نے کسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے اقدامات کیے لیکن ان کی قدر و منزلت کا درجہ اتنا بلند نہ ہو سکا جتنا کہ آج امریکا اور چین جیسے ممالک کے کسانوں کا ہے۔ اس طرح کی قدر و منزلت نہ صرف قومی وقار کو بلند تر کر دیتی ہے بلکہ قومی معیشت، آسودہ حالی اور اتحاد کو فروغ دینے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی اخلاق و تمدن کے نگراں اور مبلّغ اپنی ذمّے داریاں اور فرائض دوسروں کے سپرد کر نے چلے جا رہے ہیں۔

افرادِ قوم میں احترام کا جذبہ صرف تلقینِ احترام سے پیدا نہیں کیا جا سکتا، ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے رائج کرنے کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کی جائیں۔ مدرسے جانے والے بچّوں کو اوائل عمر ہی سے احترام کا درس دینے کے لیے نصاب میں نہ صرف ضروری ترامیم کی جائیں بلکہ جدید طریقے اختیار کر کے اس کا نقش دل و دماغ پر بٹھایا جائے۔ جو لوگ حصول تعلیم کے لیے مدرسوں اور اعلا درس گاہوں میں نہیں جا پاتے اُن کی تربیت کا انتظام بھی بے حد ضروری ہے۔ اِس لیے کہ اُن کی کل تعداد تقریباً ۸۳ فی صد ہے۔ یہ کام مناسب سمعی اور بصری اعانات کے ذریعہ سے بخوبی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک جامع منصوبہ تیار کرنے کی ضرورت ہے جو ایسی تجاویز پر مشتمل ہو جن کو سرکاری اور غیر سرکاری ادارے آسانی سے عملی جامہ پہنا سکیں اور جن پر والدین خصوصاً عورتیں عمل کر سکیں۔

ریڈیو، ٹیلے وژن، فلمیں اور درسی خط وکتابت اس ضمن میں بہت مفید ذرائع ثابت ہوسکتے ہیں۔ اخلاقیات و تحریمات کے اہم پہلو اعلا کالجوں کے نصاب میں بھی شامل کرنا ضروری ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ قومی رہبر، خواہ اُن کا تعلق کسی علم یا ہنر سے ہو، اپنی روزمرّہ کی زندگی میں احترام کی عملی مثالیں پیش کریں تاکہ عوام الناس اُن کی پیروی کریں اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجائے جو اخلاقی اور جمالیاتی اعتبار سے قابلِ ادب و احترام ہو۔ مولانا روم نے بھی فرمایا ہے

از خدا جوئیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

ملک کے اس بحران اور ابتلا کے دور میں ہر بالغ شہری کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنی اخلاقی قدروں کے اختیار کرنے اور فرائض کے ادا کرنے میں کن کوتاہیوں اور خامیوں کا مرتکب ہو رہا ہے تاکہ وہ اُن کا ازالہ کر کے اپنی ذاتی کارکردگی میں اضافہ کر سکے اور قومی زندگی کے معیار کو بلند کر سکے۔ ہماری تاریخ میں کبھی اتنا سیاہ دور نہیں آیا جتنا ہم نے اس سال عیدین کے درمیان دیکھا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم پر یہ وقت سوء اس لیے آپڑا ہے کہ ہم نے گزشتہ چوبیس برس میں اپنی مملکت خداداد پاکستان کی نگہبانی کرنے میں قرآن و سنت پر پوری طرح عمل نہیں کیا۔ اور اپنے فرائض سرانجام دینے میں صداقت سے کام نہیں لیا۔ بہرحال ہمیں آزردہ خاطر اور دل برداشتہ ہونے کے بجائے فی الفور کمرِ ہمت کس کر ملک و ملت کو مستحکم کرنے کی نئی راہوں پر گامزن ہونا چاہیے۔ گزشتہ دسمبر کے قومی حادثے کو جنگِ اُحد کی طرح ایک عارضی شکست سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے تاکہ ہم اپنے پریشان کن حال کو آبرومندانہ مستقبل میں تبدیل کر سکیں۔ اگر تمام قوم ایک یقین کامل کے ساتھ متحد و منظم ہو کر آگے بڑھے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم فتح و نصرت سے جلد ہم کنار نہ ہو سکیں۔

آخر میں، میں خدائے بزرگ و برتر سے دعا کروں گا کہ وہ پاکستان کے ہر شہری کو احترام انسانی کے جذبے سے سرشار فرمائے تاکہ اس کی بدولت تمام افرادِ قوم ایک دوسرے کی صدقِ دل سے قدر کرنے لگیں، متحد ہو کر آگے بڑھیں اور اپنے وطن عزیز کو مضبوط، خوش حال اور باوقار بنائیں۔ وقت کم ہے کام زیادہ ہونے کے باعث ضرورت اس بات کی ہے کہ فکر و عمل کے درمیان وقفہ کم سے کم کیا جائے اور خلوص و محنت سے عمل کو نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کی جائے۔

جناب محترم پروفیسر حمید احمد خاں
سابق شیخ الجامعہ پنجاب

احترام کے مضمون پر جو سلسلۂ تقاریر اس سال "شام ہمدرد" کے زیرِ اہتمام ہو رہا ہے اس میں موضوعِ سخن کا لحاظ کیجیے تو سب سے بصیرت افروز وہ تقریر ہے جو ہم نے آج شام سُنی۔ میں حکیم محمد سعید صاحب کو اُن کے اِس اجتہاد پر مبارکباد دیتا ہوں کہ اُستاد کے احترام اور قانون کے احترام کے علاوہ اُن کی دقیقہ رَس نگاہوں نے کسان کے احترام جیسا اچھوتا مضمون بھی ڈھونڈ نکالا۔ اور پھر ہم خوش نصیب ہیں کہ اس اچھوتے مضمون کے سب مضمرات پر کماحقہ روشنی ڈالنے کے لیے ہمیں زرعی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اسرار الحق صاحب کی فضیلت علمی اور مہارتِ فن سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر اسرار الحق صاحب نے اس اہم مسئلے پر ہمارے لیے بھی اسرارِ حق جس خوبی سے فاش کیے ہیں اس کے لیے میں اپنی طرف سے، اور آپ سب کی طرف سے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ سب اس لطیفہ غیبی کی بھی داد دینا چاہتے ہیں کہ جس دن ہم لاہور میں کسان کے احترام کا اثبات کرنے کے لیے جمع ہوئے اُسی صبح کے اخبارات نے ہمیں یہ خبر سنائی کہ حکومتِ پاکستان نے زرعی اصلاحات کے نفاذ کا اعلان کر کے ہمارے آج شام کے اجلاس کے لیے ایک غیر مترقبہ تمہید مہیا کر دی۔ عالمِ شعر میں توارد کی مثالیں ہم سب کو یاد ہیں، مگر عالمِ فکر و عمل میں اس قسم کا خوش گوار توارد ہماری تہذیبی زندگی میں شاید اپنی مثال آپ ہے۔

اگر آپ غور فرمائیں تو تسلیم کریں گے کہ ہر معاشرے کی بنیاد انسانوں کی باہمی خیر سگالی اور احترام کے جذبے پر رکھی جاتی ہے۔ حاکم و محکوم، پیر و مرید، اُستاد و شاگرد، گاہک اور دکان دار، سبھی کے تعلقات بجز دو طرفہ رواداری کے قائم نہیں رہ سکتے۔ یوں دیکھیے تو شامِ ہمدرد کی امسالہ تقریبات کا موضوع ہمیں شائستہ زندگی کے اصلِ اصول کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ اس موقع پر مجھے نپولین کے سوانح حیات کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ اپنے دربار کی ایک خاتون کو ایک مزدور کے رستے میں حائل دیکھ کر اس نے برجستہ کہا، "ہٹو، میڈم، مزدور کے بوجھ کی عزت کرو!" عزت باہر سے آ کر کسی شخص کے سر پر نازل نہیں ہوتی، اس کی اپنی سیرت و کردار اُسے عزت کا مستحق بناتے ہیں، چنانچہ گو ہم بجا کہتے ہیں کہ فلاں ماں باپ کس درجہ خوش نصیب ہیں کہ اُن کی اولاد اُن کا اس قدر ادب کرتی ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ اولاد کے

دل میں والدین کا ادب اس لیے پیدا ہوا کہ پہلے ماں باپ نے اُن کا لحاظ کیا اور دلی محبت کی دولت اُن پر نچھاور کی۔ صاحبِ احترام وہی شخص ہو سکتا ہے کہ جو احترام کا استحقاق اپنے اندر پیدا کرے۔ اگر ہم اپنے گرد و پیش نظر ڈالیں تو خود بخود ظاہر ہوگا کہ آپ اور ہم ہمیشہ احترام کرتے ہیں اُس شخص کا جو احترام کے لائق ہے۔

آیئے، اب دیکھیں کہ ملتِ پاکستان کے سوادِ اعظم کے اُس نمائندے کو جسے ہم کسان کہتے ہیں ہمارے احترام پر کیا خاص حق حاصل ہے۔ برطانوی مورخ ٹائن بی نے اپنے متفرق مضامین میں ایک جگہ مظاہرِ فطرت اور نسلِ انسانی کے باہمی تعلقات کی داستان سنا کر ایک نکتہ پیدا کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انسان نے قوانینِ فطرت کو تقدس کا وہ مرتبہ دیا جو توہم پرستی کی حد تک پہنچ گیا۔ پھر وقت کے انقلاب نے دوسری انتہا کی طرف حرکت کی اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دورِ جدید میں انسان کے گستاخ ہاتھوں نے احترامِ فطرت کی ردا پارہ پارہ کر دی۔ نسلِ انسانی نے فطرت کی شان میں گستاخی کر کے بے حد و حساب مادّی فوائد حاصل کیے مگر ساتھ ہی اپنے سکونِ خاطر کا خاتمہ کر دیا۔ فطرت سے بگاڑ پیدا کر کے انسان نے خود اپنی روح کا فساد مول لیا۔ رُوح کا یہی فساد ہے جس سے ہمارا کسان اب تک محفوظ ہے اور صدیوں سے محفوظ رہا ہے۔ وہ بجلی کی مصنوعی روشنی سے اپنی رات کو دن نہیں بناتا۔ اُس کے اوقاتِ محنت سورج کے طلوع و غروب سے مقرر ہوتے ہیں۔ اس کا دل و دماغ خود بخود موسموں کے تغیّر و تبدّل کا ساتھ دیتا ہے۔ اُس کی رُوح سازِ فطرت سے ہم آہنگ بنی ہے۔ یہاں تصنّع کے پیدا کیے ہوئے خوارج اور انحراف راہ نہیں پاتے۔ کسان کی بات چیت، اُس کی پوشش، اُس کی خوراک، سادگی سے عبارت ہے۔ یہ سادگی، یہ فطرت کے مطابق زندگی، اہلِ نظر کے دل میں اس کا احترام پیدا کرتی ہے اور اُس کی صحتِ بدن اور صحتِ ذہن کا بدیہی ثبوت بھی ہے۔ گزشتہ صدی میں رُوس کے شہرۂ آفاق ادیب و مفکر ٹالسٹائے نے کسان کے احترام کا نعرہ بلند کیا، بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ فنونِ لطیفہ کی گراں مائیگی کا معیار شہر و دربار کے تکلّفات میں تربیت پائے ہوئے ذہن نہیں بلکہ دیہاتی کسانوں کے وہ بے لوث ذہن ہیں جنھیں فطری سادگی میں پروان چڑھنے کا موقع ملا ہے۔ مُراد یہ ہے کہ جس فن سے کسان کا بے ریا اور خالص ذہن لطف اندوز نہ ہو سکے وہ سچا فن نہیں ہے۔ ٹالسٹائے سے ایک صدی پہلے انگلستان میں ورڈزورتھ نے کہا کہ شعر کی صحیح زبان وہ ہے جو کسانوں کی زندہ زبان سے ماخوذ و منتخب ہو۔ ٹالسٹائے اور ورڈزورتھ کے ان خیالات سے کسی کا متفق نہ ہونا بھی ممکن ہے مگر اختلاف کا یارا اگر نہیں ہے تو اٹھارہویں صدی کے برطانوی اہلِ کمال گولڈسمتھ کے اس قولِ فیصل سے:

نہیں، یہ نواب، سرسبز ہوں تو کیا، اور مرجھا جائیں تو کیا،
(بادشاہِ وقت کا) ایک لفظ اِنھیں اُسی طرح پیدا کر سکتا ہے جیسے (اُس کا)
ایک لفظ اِنھیں (اِس سے پہلے) پیدا کر چکا ہے۔
لیکن وہ جسور و سخت کوش کسان جو اپنے ملک کا سرمایۂ افتخار ہیں
ایک دفعہ فنا ہو جائیں تو ان کی کمی پھر کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ *

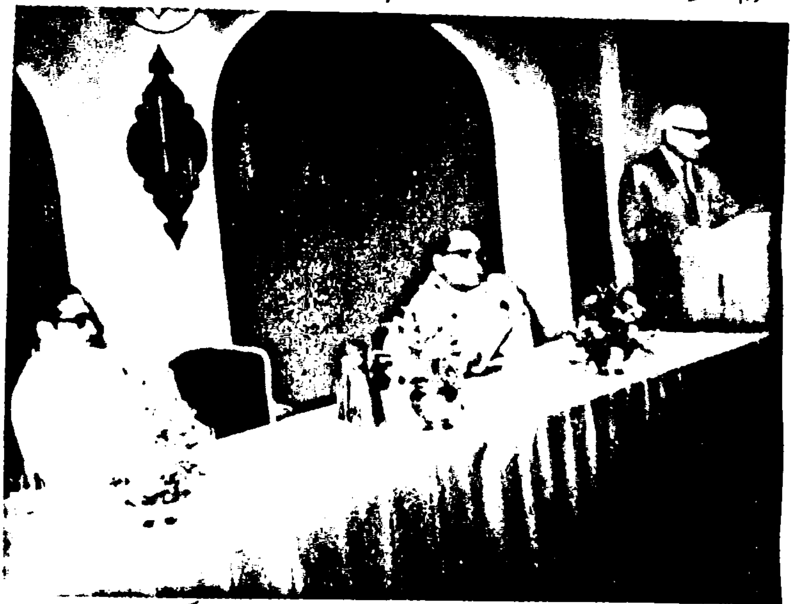
خود ہمارے ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے اپنی نظم "الارض للہ" میں نوامیسِ فطرت کو کسان کے شبانہ روز کاروبار میں شریک و سہیم کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار ؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟

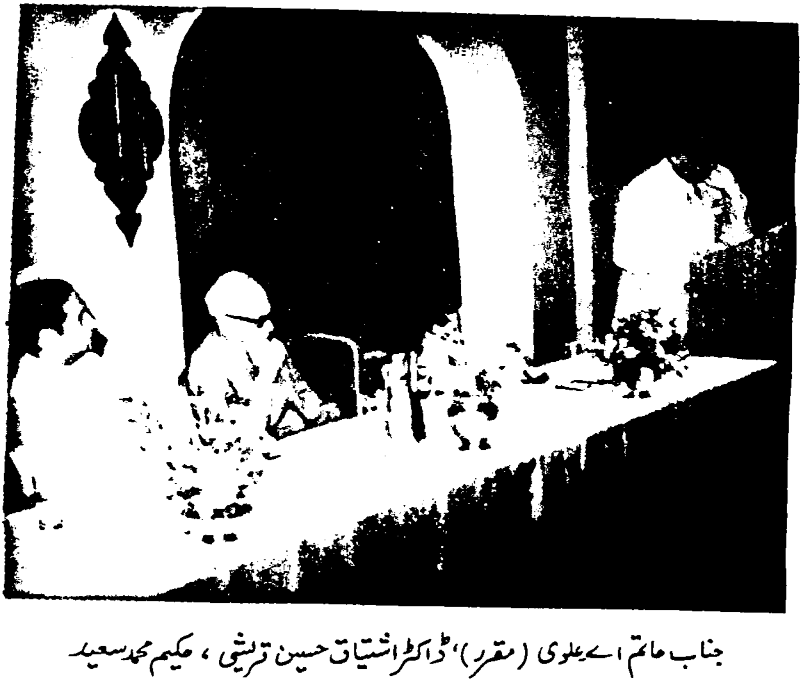
اقبال ہی نے ایک اور جگہ "بندۂ مومن" کی توصیف ان زندۂ جاوید الفاظ میں کی ہے ؎

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات

جس "بندۂ مولا صفات" کا ذکر ہم آج شام کر رہے ہیں اس کے خالق نے کم از کم اپنی ایک صفت "رزّاقی" میں اُسے اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔ کسان کا یہ بڑا اعزاز ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اُسے نسلِ انسانی کو رزق بہم پہنچانے کا وسیلہ بنایا ہے۔ اس لحاظ سے کسان بنی نوع انسان کا محسن ہے۔ بارہا وہ اس وقت کام میں لگا ہوتا ہے جب ہم سوتے ہیں اور ایسے موسم میں کھلے آسمان کے نیچے مشقت برداشت کرتا ہے جب ہم گھر کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے احسان کی شکر گزاری سے قطع نظر، یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ وہ اپنی ذات و کردار کی سادگی اور خلوص میں فطرت سے براہ راست فیض پاتا ہے اور اس لحاظ سے بھی ایک محترم شخصیت ہے۔ یہ خود اپنی عقلِ سلیم اور ذہنی شائستگی کا ثبوت ہے کہ ہم کسان کو اپنے معاشرے میں ایک باعزت مقام دیں۔ جو شخص وہاں احترام نہیں کرتا جہاں احترام واجب ہو، وہ خود اپنے احترام میں کمی کرتا ہے۔



ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (صدر مجلس)، جناب حاتم اے علوی، حکیم محمد سعید



جناب حاتم اے علوی (مقرر)، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، حکیم محمد سعید

آغاز اجلاس سے قبل



جناب حاتم اے۔علوی، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

احترامِ فطرت

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمد سعید

مقالہ : جناب محترم حاتم۔ اے علوی

شامِ ہمدرد، کراچی

۱۶۔ مارچ ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

آج کی دنیا میں سائنس عروج پر ہے لیکن مذہبی تحریک زوال پذیر ہے۔ اسی وجہ سے خلوت ہو یا جلوت اخلاقی اقدار پامال ہوتی جارہی ہیں اور جمالیاتی ذوق میں بھی کمی ہوتی جارہی ہے۔ چنانچہ رُوح کا یہ سرطان، تعظیم و تکریم کی یہ نفی، عزّت و حرمت اور شرافت و نفاست کا یہ فقدان تحت الانسانی میں آشکارا ہے۔ بیسویں صدی کے آرٹ اور ادب و موسیقی میں حیوانیت جس بھونڈے انداز میں چھائی ہوئی ہے وہ بھی اسی بات کی غمّازی کرتی ہے۔

زندگی اپنے ہر رنگ میں قوت و کمال کی مظہر ہے اور یہ بات خود قدرت کی دست کاری یعنی فطرت میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝ (الانعام - ۱)

"تعریف اُس خدا کی جس نے آسمان اور زمین کو بنایا اور تاریکی اور روشنی بنائی۔ پھر بھی یہ کافر اپنے رب کے ساتھ اوروں کو برابر کیے دیتے ہیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۝ (زخرف - ۹)

یعنی :" اگر تم اُن سے پوچھو گے کہ یہ زمین اور آسمان کس نے بنائے ؟ تو وہ یقیناً یہ جواب دیں گے کہ انہیں خدا نے بنایا ہے جو قادرِ مطلق ہے اور جسے ہر بات کا علم ہے (ہاں وہی خدا) جس نے تمہارے واسطے زمین کا فرش بچھایا اور جس نے تمہارے واسطے اس میں سڑکیں بنائیں تاکہ تمہاری رہ نمائی ہو سکے۔ وہی خدا جو آسمان سے مناسب مقدار میں پانی برساتا ہے، چناں چہ ہم اس بارش سے مُردہ زمین کو زندگی بخشتے ہیں۔ اسی طرح سے تم کو بھی (مرنے کے بعد) زندگی بخشی جائے گی (ہاں وہی خدا) جس نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے اور جس نے تمہارے واسطے جہاز اور مویشی بنائے جن پر تم سواری کرتے ہو۔"

یہ کائنات نہایت عجیب وغریب ہے۔ ظاہری طور پر یہ مادّی ہے لیکن عملی اعتبار سے رُوحانی ہے۔ آسمان کے چاند، سُورج اور ستارے ہوں یا زمین پر بسنے والے چرند و پرند، ہر شے ایک دوسرے سے مختلف اور حیران کن ہے۔ یہ لہراتی ہوئی ندیاں، یہ درخشاں آسمان، یہ زرخیز زمین، یہ بدلتے ہوئے موسم و مناظر! سب زندگی کے عالم گیر ربط و اتحاد کی عکّاسی کرتے ہیں۔ دنیا کی یہ تمام چیزیں زندگی کے لیے محض مفید ہی نہیں بلکہ وہ اپنے حسن و اسرار سے ہمیں سرشار بھی کرتی رہتی ہیں۔ اور ان سب کے پسِ پردہ ہمیں اپنے خالق کے وجود کا احساس ہونے لگتا ہے، لہٰذا ہم نہایت تحریم و تکریم کے ساتھ اس کے آگے سرِتسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

فطرت مادّی بھی ہے اور رُوحانی بھی۔ مثال کے طور پر قوس و قزح کو لے لیجیے۔ قوس و قزح کے بارے میں سمجھ لینا مادّی معاملہ ہے لیکن اس سے جو مسرّت حاصل ہوتی ہے وہ رُوحانی بات ہے۔ محض سمجھ لینے کی بنا پر مسرّت تباہ نہیں ہو سکتی اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔ درحقیقت یہ کبھی نہیں ہوتا۔ فہم و ادراک حاصل ہو جانے کے بعد بھی انسان کا دل نیکی، انصاف، رحم دلی اور حُسن سے متاثر ہو جاتا ہے۔ یہ جان لینے کے بعد کہ خدا کہ جو ہر شے کا خالق ہے وہ ہم سے نہایت بالا و برتر ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں رہ جاتی کہ ہم بھی اپنی بہترین صلاحیتوں کو اُجاگر کریں اور ان ہی کے مطابق اپنی زندگی بسر کریں۔ اچھی زندگی گزارنا اور اپنی اعلا صفات کے مطابق عمل کرنا اور فطرت کا احترام کرنا ہی صحیح طریقۂ کار ہے۔ دنیا جب سے قائم ہے علما، اولیا، فلسفیوں اور پیغمبروں نے فطرت کے حُسن و صداقت اور فضیلت کا اعتراف کیا ہے اور اُس کا احترام کیا ہے۔

یہ ہے مختصر سی تمہید آج شامِ ہمدرد کے موضوع "احترامِ فطرت" کی۔ ہمارے معزّز مہمان مقرّر جناب حاتم۔ اے۔ علوی صاحب ایک ایسی مشہور و معروف شخصیت ہیں کہ انھیں متعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ موصوف قائدِ اعظم کے دوش بدوش برِّصغیر کی جنگِ آزادی میں نہایت نمایاں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ کراچی کے شہریوں میں آپ کا نہایت ممتاز مقام ہے۔ آپ یہاں کے رئیس بلدیہ بھی رہ چکے ہیں۔ ۲۲-۱۹۲۰ء کے دوران جو عدم تعاون اور خلافت کی تحریکیں چلی تھیں اُن میں بھی آپ پیش پیش تھے۔ حالاں کہ آپ کانگریس کے رُکن تھے لیکن اُس کے غیر مسلم رویّے کی وجہ سے آپ نے ۱۹۲۸ء میں اِس سے علیحدگی اختیار کر لی، چناں چہ ۱۹۳۷ء کے بعد سے مسلم لیگ کو منظّم کرنے میں آپ کا نہایت نمایاں کردار رہا ہے۔ ایک اعلا صنعت کار اور تاجر کی حیثیت سے آپ نے پاکستان کی معاشی ترقی میں بھی بھرپور حصّہ لیا۔ ۱۹۴۸ء میں انگلستان میں اسٹرلنگ بیلنس کے سلسلے میں جو کانفرنس ہوئی تھی اُس میں آپ پاکستانی وفد کے ایک رُکن تھے اور سردست آپ

اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ڈائرکٹر ہیں۔

جناب محترم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب (سابق وائس چانسلر جامعہ کراچی) نے آج شام ہمدرد کی صدارت قبول فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی ہے۔ آپ سے ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرانے کی چنداں ضرورت نہیں، کیوں کہ موصوف اپنے علم و فضل اور تجربے کی وجہ سے پاکستان کے تعلیمی میدان میں پیش پیش رہ چکے ہیں۔

میں جناب محترم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب اور جناب محترم حاتم۔ اے۔ علوی صاحب دونوں کا بے حد ممنون ہوں۔

جناب محترم حاتم - اے - عَلوی

ہم سب جناب حکیم محمد سعید صاحب کے ممنون ہیں جنھوں نے احترام فطرت کے موضوع پر تقریروں کا یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ میں اس سعی کا خلاصہ لارڈ ٹینیسن کی اس خوبصورت نظم کے ذریعہ سے پیش کرتا ہوں جس میں انھوں نے کہا ہے:

Let knowledge flow from more to more
But more of reverence in us dwell

یعنی: علم میں جتنا بھی اضافہ ہوتا جائے وہ تو اچھا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں احترام کا جذبہ جاگزیں ہو۔

چوں کہ علم پر آج کل ہر چہار طرف سے دھاوا بول دیا گیا ہے اور گھٹیا کتابوں اور شام کو شائع ہونے والے اخبارات نے ہمارے شہروں میں مغرب کی غلاظت کے پرنالے اِس انداز سے کھول رکھے ہیں کہ جیسے خود ہمارے گندے نالوں کا سیلاب کچھ کم تھا! اور یہی صورت اخبارات و تفریحات کی بھی ہے کہ اُن سے حواس خمسہ تو لطف اندوز ہوجاتے ہیں مگر دل و دماغ کو کوئی فیض نہیں پہنچتا، لہٰذا احترام کے موضوع پر تقریروں کا یہ اہتمام اس نخلستان کی طرح ہے جو تپتے ہوئے ریگستان کے درمیان ہو۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہے کہ جس طرح سے ہزاروں گندے اور غیر صحت مند مکانات کے درمیان یہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میری آج شام کی تقریر کا موضوع ہے احترامِ فطرت۔ ہماری زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا جب فطرت یکے بعد دیگرے مختلف مناظر پیش نہ کرتی رہتی ہو۔ ایک تصویر نظر کے سامنے سے جوں ہی ہٹتی ہے دوسری فوراً سامنے آجاتی ہے۔ فطرت کی یہ رنگارنگی حُسنِ کامل کے جن اصولوں پر کارفرما رہتی ہے، ان کے بارے میں جب غور کیا جاتا ہے تو ہمارا دل دائمی احساسِ احترام پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ہر شخص خواہ وہ کہیں بھی رہتا ہو اور دیگر حُسن و دل چسپیوں کے ذرائع سے کتنا ہی دُور کیوں نہ ہو ان کیفیتوں کو مسلسل دیکھتا رہتا ہے۔ زمین کے مختلف مناظر دیکھنے کے مواقع تو صرف چند ہی لوگوں کو میسّر آتے ہیں اور انسان اُن کے درمیان ہمیشہ زندگی بسر کرنے پر مجبور بھی نہیں ہوتا لیکن آسمان ہر ایک کے لیے ہے۔ وہ درخشاں تو ہے لیکن بقولِ شاعر اتنا درخشاں بھی نہیں کہ انسان اس سے روزانہ لطف اندوز نہ ہو سکے۔

Too bright and good
For human nature's daily food;

آسمان اپنے چاند، سورج اور ستاروں کی کارکردگی سے ہمیشہ دل کو سکون اور راحت بخشتا رہتا ہے اور دل کو گرد و غبار سے پاک کرتا رہتا ہے۔ یہ دو منٹ بھی یکساں نہیں رہتا۔ کبھی حلیم و بردبار ہے تو کبھی متلوّن اور کبھی دہشت ناک۔ یہ جذباتی اعتبار سے انسانی، نزاکت کے لحاظ سے رُوحانی اور الوہیت کے اعتبار سے لاانتہا ہی ہے، چناں چہ ہمارے اندر جو لافانی عنصر ہے اس کے لیے اس کی دل کشی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح سے کہ سزا اور جزا کے سلسلے میں اس کی اعانت ہماری فانی ذات کے لیے ضروری ہے۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ آسمان دو منٹ بھی یکساں نہیں رہتا۔ اس سے مجھے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول یاد آگیا۔ انھوں نے فرمایا تھا، "جس شخص کے دو دن بالکل یکساں طور پر گزر جائیں وہ مومن نہیں ہو سکتا" اب آپ خود غور فرمائیے کہ احترامِ فطرت کے بغیر انسان کو رُوحانی مسرّت نصیب ہونا قریب قریب ناممکن ہے۔ اسی طرح سورۂ رحمٰن کی اس آیت کو سمجھنا بھی محال ہے جس میں خدا کے بارے میں کہا گیا ہے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۵۵: ۲۹)

یعنی ہر روز خدا کی ایک نئی شانِ کبریائی نظر آتی ہے

ایک مومن جب روزانہ ایک شانِ کبریائی دیکھے گا تو اُس کے دو دن بالکل یکساں طور پر کبھی بسر نہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے جو روزانہ قرآن کی تلاوت پر اصرار کیا جاتا ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب فطرت کی رنگا رنگی کی جانب اس طرح سے توجہ مبذول نہیں کراتی جیسے کہ قرآن حکیم۔ قرآن ہمیں فطرت کی نیرنگیوں کے بارے میں احترام کے ساتھ غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ جو شخص واقعی قرآن کی روح اور تعلیم کو سمجھ جائے وہ مومن بن جائے۔ اسی مومن کے بارے میں علّامہ اقبال نے فرمایا ہے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

النحل کی تیسری آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ "خدا نے آسمان اور زمین کو سچّائی کے ساتھ پیدا کیا" چناں چہ قرآن حکیم میں بار بار یہ حکم دیا گیا ہے کہ فطرت کا احترام کرتے ہوئے اس سچّائی پر غور کرو۔ یہاں پر میں ایک بار پھر شاعرِ مشرق کے الفاظ دہرانا مناسب سمجھتا ہوں

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں

احترام کا ایک پہلو ایسا ہے جس کے خلاف ہماری نئی نسل عَلَم بغاوت بلند کرتی ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک رُجحان یہ ہے کہ پُرانی ہر بات کو مقدس سمجھا جاتا ہے اور ماضی کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیے بغیر اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ بیسویں صدی کے اس آخری چوتھائی حصّے میں ماضی کی یہ باتیں قطعی ناموزوں ہیں۔ سیاست کے میدان میں اکثر میں نے دیکھا ہے کہ لوگ خلافتِ راشدہ کے زرّیں دَور کا تذکرہ کرتے کرتے آب دیدہ ہو گئے ہیں۔ اُس زمانے میں بازپُرسی کا یہ عالم تھا کہ ایک غریب بوڑھی عورت بھی خلیفۂ وقت سے یہ دریافت کر سکتی تھی کہ تم کو اپنی عبا کے لیے یہ چند گز فالتو کپڑا کہاں سے ملا۔ یہ وقت وہ تھا کہ جب حکومت کا دائرہ کار اتنا محدود تھا کہ خلیفہ اپنے دارالخلافت کے ہر شخص سے واقف ہوتا تھا۔ اُس کے مقابلے میں آج ایک بڑے صنعتی ادارے کا منیجر اپنے کارخانے کے مزدوروں کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ اسی طرح حکومت کا ایک سکریٹری اپنی وزارت میں کام کرنے والوں کی کُل تعداد بھی نہیں بتا سکے گا۔ علاوہ ازیں اُن دنوں لوگ جن خراب حالات میں کام کرتے تھے اُس کے مقابلے میں آج ایک اوسط درجے کا شہری اس قدر خوش حال ہے کہ ہمارے غریب بھائی بھی اس بیس گز کپڑے پر اعتراض نہ کریں گے جو ہمارے بعض وڈیرے اپنی شلوار کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

انسانی تہذیب کے ہر دور میں جن متنازعہ مسائل کو تبدیلی کے طور پر محسوس کیا جاتا ہے انھیں اکثر ابتدا میں ترقی سمجھا جاتا ہے لیکن بعد میں اُنھیں مراجعت تصور کیا جاتا ہے اور پھر ایک ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ جب مبالغہ آمیزی شروع ہو جاتی ہے۔ ذرا دیر کے لیے اپنے دماغ کو خلفائے راشدین اور مارشل لا کے دَور سے آزاد کر لیجیے اور نیوکلیر پاور کے بارے میں سوچیے۔ ایک چوتھائی صدی قبل جب اس کے بارے میں پہلی بار تذکرہ ہوا تھا تو یہ خیال ہوا تھا کہ اس ایجاد کی بدولت انسان کو بجلی کی کوئی کمی نہ رہ جائے گی۔ مغربی ممالک میں تو لوگ یہاں تک کہنے لگے تھے کہ اب پینے کا پانی منجمد کر کے بجلی کے ذریعہ سے تین سو میل دُور افریقہ کے صحرائے اعظم تک پہنچا دیا جائے گا اور وہاں گھنے جنگلات اُگ آئیں گے۔ یہ پہلی منزل تھی جسے ترقی کہا جاتا ہے، لیکن جب نیوکلیر پاور پلانٹ لگا دیے گئے تو پتہ چلا کہ انھیں ٹھنڈا کرنے کے لیے دریائی پانی کی بہت بڑی مقدار درکار ہو گی۔ اور جب یہی پانی گرم ہو کر خارج ہو گا تو وہ اس قدر زہر آلود ہو چکے گا کہ پانی میں رہنے والی ہر جاندار شے تباہ ہو جائے گی۔ یہ تھی دوسری منزل یعنی مراجعت، چناں چہ محافظین نے مطالبہ کیا کہ نیوکلیر پاور کے ذریعہ سے بجلی پیدا کرنے کا سلسلہ بالکل ختم کر دیا جائے۔ یہ تھی تیسری منزل یعنی ردِ عمل کی انتہا۔ دراصل ضرورت اس بات کی ہے کہ پانی کو ٹھنڈا کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے تاکہ نیوکلیری ایکٹر سے جو فائدہ ہو سکتا ہے اُسے تو حاصل کیا جا سکے مگر اس کی وجہ سے جو آلودگی پیدا ہوتی

ہے اس سے بچا جا سکے ۔

قرآن حکیم اور نواتی انشقاق (Nuclear Fission) کے تذکرے سے مجھے دس سال پرانا ایک واقعہ یاد آگیا کہ جب نا کے صدر ڈاکٹر خوام نکرومہ نے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی تھی ۔ کانفرنس کا موضوع تھا : A world without a bomb (یعنی ایک ایسی دنیا جس میں بم کا خطرہ نہ ہو) مقصد یہ تھا کہ نیوکلیر بم کے خطرات کی جانب دنیا کی توجہ مبذول کرائی جائے ۔ صدر پاکستان کے سائنسی مشیر ڈاکٹر عبدالسّلام پاکستانی وفد کے ایک رکن تھے ۔ ایک روز شام کے وقت ہم دونوں جب ٹہل رہے تھے تو انھوں نے مجھے قرآن کی ایک آیت پڑھ کر سنائی اور کہنے لگے کہ نواتی انشقاق کی اس سے زیادہ بہتر اور جامع تعریف اُن کے علم میں اب تک اور کوئی نہیں آئی ۔ تو یہ تھی پاکستان کے سب سے بڑے نیوکلیر سائنس داں کی رائے !

برسبیلِ تذکرہ میں آپ کو اسی زمانے کا ایک اور واقعہ سناتا ہوں ۔ کانفرنس میں جب اصل موضوع کے بارے میں میرے بولنے کی باری آئی تو میں نے بھی جو کچھ کہنا تھا کہا ، لیکن میں نے اپنی تقریر کا اختتام ان الفاظ پر کیا کہ " آیئے ہم سب مل کر ایک ایسی دنیا بنائیں جس میں بم کا خطرہ نہ ہو ۔ یاد رکھیے اگر ہم اس میں ناکام رہے تو پھر وہ دن دُور نہیں جب بم تو ہوگا مگر دنیا نہ ہوگی "

دوسرے دن کے اخبارات نے پاکستانی وفد کے اِس رکن کو خوب اچھالا اور کئی روز تک بڑی بڑی سرخیاں دیتے رہے ۔ اس کے علاوہ کچھ دنوں تک تو اس رکن کا خیر مقدم بھی ان ہی الفاظ سے ہوتا رہا کہ A bomb without a world یعنی بغیر دنیا کا بم !

ایک بار میں جہاز پر ہانگ کانگ سے کراچی آ رہا تھا ۔ گرمیوں کا زمانہ تھا اور قمری مہینے کا درمیانی حصہ ۔ چاند روزانہ رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا اور اس کی چمک دمک میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ۔ جہاز پر اعلا درجے کے مسافروں کے لیے رات کے کھانے کے بعد انواع و اقسام کی تفریحات کا انتظام کیا جاتا ہے ۔ ان میں مے نوشی ، سینما ، رقص اور جادو کے کرتب وغیرہ شامل ہوتے ہیں ۔ بہرحال میں چپکے سے عرشے پر نکل جاتا تھا اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر اکیلا چاند کو اور سمندر کی سطح پر اس کی کرنوں کو اٹھکھیلیاں کرتے دیکھتا رہتا تھا ، چناں چہ اس طرح سے میں اپنے وجود میں رات کے حُسن و سکوت کو تحلیل کرتا رہتا تھا ۔ ہر روز صبح کو میرے ہم سفر مجھ سے دریافت کرتے کہ رات کو کھانے کے بعد میں کہاں غائب ہو جاتا ہوں ۔ ان لوگوں نے آخر کار یہ نتیجہ نکالا کہ شاید میں سرِ شام سو جانے اور اندھیرے منہ اُٹھ جانے کے اصول پر سختی سے کاربند ہوں ۔ میں نے انھیں کچھ نہ بتایا ۔ اگر میں بتا دیتا تو ضرور کوئی نہ کوئی میرا پیچھا کر کے جہاز کے عرشے پر آجاتا اور میرے سکوت اور محویت کو تہہ و بالا کر ڈالتا ۔ میرا بہترین دوست بھی کم از کم اتنا ضرور بول اٹھتا کہ " ارے ، کتنی حسین رات

ہے۔ واقعی۔ اندنی تو غضب ڈھائے ہوئے ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔ لوگ اکثر اس قسم کی بے تُکی باتیں ضبط نہیں کر پاتے۔ مجھے اس پر مثنوی مولانا رُوم کا ایک قصہ یاد آگیا۔

چار دوستوں نے یہ طے کیا کہ ایک مسجد میں جا کر خاموش بیٹھ جائیں گے اور ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالیں گے، چناں چہ جب یہ لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے تو ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور بڑے زور زور سے کھڑکیاں کھولنے لگا۔ ان چار دوستوں میں سے ایک ضبط نہ کر سکا اور ناراض ہو کر اس شخص سے بولا، "تمہیں دوسروں کی کوئی پرواہ نہیں۔ تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ اس شور و غل سے ان کو تکلیف ہوگی۔" یہ سُن کر دوسرے دوست نے جو برابر ہی بیٹھا ہوا تھا اُسے ٹوکا اور بولا، "تم اس شخص کے لیے کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ دیکھتے نہیں کہ تم نے اس طرح اپنی خاموشی ختم کر ڈالی۔" اس پر تیسرے دوست نے دوسرے دوست سے کہا، "بھلے آدمی۔ کیا یہ کافی نہ تھا کہ ہمارے ایک دوست نے اس شخص پر ناراض ہو کر ہمارے فیصلے پر پانی پھیر دیا۔ اب کم از کم تم تو خاموش رہتے۔" جس وقت تیسرے اور دوسرے دوست کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی اُس وقت چوتھا دوست اپنے دل میں سوچنے لگا۔ "شکر ہے خدا کا میں محفوظ ہوں، کیونکہ میری خاموشی برقرار ہے۔"

اس قصے کو ختم کرتے ہوئے اس عظیم فلسفی شاعر اور ولی نے کہا کہ ان چاروں دوستوں میں سب سے بڑا قصور چوتھے دوست کا تھا جو خاموش تو رہا لیکن خاموشی کے باوجود اس کا ذہن ہر وقت پراگندہ رہا۔ مزید یہ کہ اُس نے اپنے دوستوں کی فطری کمزوریوں پر افسوس کرنے کے بجائے اپنی بے گناہی پر خوش ہو کر گناہِ پارسائی کا بھی اضافہ کر لیا۔

جس وقت ذہن میں خیالات کی نقل و حرکت بالکل ختم ہو اور مکمل سکوت طاری ہو۔ خواہ وہ ریگستان کی وسعت میں ہو یا کسی غار کی تہہ میں، صرف اسی حالت میں فطرت کا مشاہدہ و احترام کرنے سے لاالٰہ الااللہ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ اسی طرح احترام کے بغیر کلمہ طیبہ زبان سے ادا تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے سمجھا نہیں جا سکتا۔

معلوم نہیں آپ لوگوں میں سے کتنے حضرات نے وکٹر ہیوگو کے عظیم شاہکار (LES MISERABLES) (لامِضرابلے) کا مطالعہ کیا ہے۔ بہرحال اس کتاب میں مصنف نے ایک پادری کا تذکرہ کیا ہے جو اپنے علاقے کا دورہ کرتے کرتے ایک ایسے مکان پر پہنچ گیا جو ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا اور وہاں سے ایک وادی نظر آتی تھی۔ جس شخص کا یہ مکان تھا اس کے بارے میں گاؤں والوں نے پادری سے شکایت کی اور بتایا کہ یہ شخص اتنا غیر دین دار ہے کہ اتوار کے روز بھی گرجا گھر نہیں جاتا، چناں چہ پادری نے موقع پا کر اپنے میزبان سے اس سلسلے میں گفتگو کی اور

پوچھا کہ تم آخر اتوار کے دن گرجا گھر کی عبادت میں کیوں شریک نہیں ہوتے ؟ اس پر اس شخص نے پشیمانی کا اظہار کیا لیکن اسی کے ساتھ اُس نے پادری سے کہا، "جناب، ہر روز صبح کو جب میں اُٹھتا ہوں اور اپنے کوٹھے پر سے سُورج کو نکلتے دیکھتا ہوں تو میرے دل سے بے ساختہ ایک آہ نکل جاتی ہے اور میں چُپ چاپ کئی منٹ تک قدرت کا یہ کرشمہ دیکھتا رہتا ہوں"۔ یہ سُن کر پادری نے اس شخص کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولا، "میرے عزیز دوست! جتنی بکواس میں کرتا رہتا ہوں اس کے بجائے کاش میں بھی خدا کی پرستش کر سکتا جس جذبۂ احترام کے ساتھ تم طلوعِ آفتاب کے منظر کو دیکھتے ہو"۔

سنسکرت کی ایک کہاوت ہے: "پنڈے سو برہمن ڈے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہے وہی تمہارے جسم میں ہے آج کل کی سائنٹی فک اصطلاح میں یوں سمجھ لیجیے کہ عالمِ صغیر (Microcosm) میں عالمِ کبیر (Macrocosm) پوشیدہ ہے۔

چند روز ہوئے میرے ایک دوست کہ جو کراچی کے ایک مشہور ماہر امراضِ چشم ہیں مجھ سے کہنے لگے کہ گزشتہ چالیس سال سے میں صرف آنکھ کے ڈھیلے کے بارے میں غور و فکر کرتا رہا ہوں جو کہ جسمِ انسانی کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہے۔ اور اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسانی آنکھ کے بارے میں میری معلومات مختصر ہیں۔ اس ماہر امراضِ چشم نے کہا ہے کہ آنکھ کا ڈھیلا اتنا حیرت انگیز اور پیچیدہ ہے کہ قدرت کی بنائی ہوئی اس شے کو میں احترام کے بغیر کبھی چھو ہی نہیں سکتا اور جب بھی اس کے بارے میں غور کرتا ہوں تو میرا دل تحیّر سے لبریز ہو جاتا ہے!

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا، "ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو سچے دین کے مطابق ہوتا ہے۔ بعد میں اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا موبد (Magian) بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ایک جانور پیدا ہوتا ہے تو اُس کے تمام اعضا صحیح سلامت ہوتے ہیں۔ کیا تم کو کوئی زخمی یا کٹا پِٹا دکھائی دیتا ہے؟" اس کے بعد آنحضرتؐ نے قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھی۔ "۳۰۔ تو پھر صحیح دین کی جانب تم اپنا رُخ کر لو۔ یعنی اس فطرت کی جانب جسے اللہ نے بنایا اور جس کے تحت اللہ نے بندوں کو بنایا۔ اللہ کی مخلوق کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سچا دین ہے، مگر بہت سے لوگ یہ بات نہیں جانتے"۔

آج شام جس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے اس کے سلسلے میں، میں آپ کی توجہ اس امر کے بارے میں مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اس واضح کتاب میں چالیس ابواب ایسے ہیں جن میں فطرت اور اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف نشان دہی کی گئی ہے۔ اس پاک کتاب کے وہ چالیس ابواب عربی زبان میں حسبِ ذیل ہیں:

(۱) البقرہ (۲) المائدہ (۳) انعام (۴) الرعد (۵) الحجر (۶) النحل (۷) الکہف (۸) العنکبوت
(۹) سبأ (۱۰) الدُّخان (۱۱) الاحقاف (۱۲) الطور (۱۳) النجم (۱۴) القمر (۱۵) الحدید
(۱۶) الملک (۱۷) القلم (۱۸) الجن (۱۹) الانسان (۲۰) الانشقاق (۲۱) البروج (۲۲) الغاشیہ
(۲۳) الفجر (۲۴) البلاد (۲۵) الشمس (۲۶) اللیل (۲۷) الضحیٰ (۲۸) الانشراح (۲۹) التین
(۳۰) العلق (۳۱) القدر (۳۲) زلزلۃ (۳۳) القارعہ (۳۴) التکاثر (۳۵) العصر (۳۶) الفیل
(۳۷) الکوثر (۳۸) اللہب (۳۹) الفلق (۴۰) الناس

سورۂ رحمٰن میں دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں اور ریگستانوں کی جانب اور ان سب چیزوں کے درمیان جو کچھ ہے اُس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے انسان جذبۂ احترام سے سرشار ہوکر تیئیس بار فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پکار اُٹھتا ہے۔ انگریزی شاعری بھی فطرت کی پرستش سے بھری پڑی ہے۔ ابھی تک میں نے اس علمی خزانے کو ہاتھ لگانے سے گریز کیا ہے لیکن قبل اس کے کہ میں اپنی تقریر ختم کروں میں آپ کی خدمت میں ورڈسورتھ کے یہ خوبصورت خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں:

"Nature never did betray
The heart that loved her; 'tis her privilege,
Through all the years of this our life, to lead
From joy to joy; for she can so inform
The mind that is within us, so impress
With quietness and beauty, and so feed
With lofty thoughts, that neither evil tongues,
Rash judgements, nor the sneers of selfish men,
Nor dreary intercourse of daily life,
Shall ever prevail against us, or disturb
Our cheerful faith, that all which we behold
Is full of blessing."

یعنی یہ کہ: فطرت نے کبھی اس دل سے بے وفائی نہ کی جس نے اس سے محبت کی۔ صرف فطرت ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہمیں زندگی بھر مسرتوں سے ہمکنار کرتی رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمارے دل و دماغ کو اس طرح سکون اور خوبصورتی سے متاثر کرتی ہے اور ہمارے

خیالات کو اتنا بلند کر دیتی ہے کہ پھر کوئی بات بھی ہمارے اس عقیدے کو متزلزل نہیں کرپاتی کہ ہمارے گرد و پیش جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہے اس میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ پھر نہ تو لوگوں کی بدزبانی دل پر اثر کر پاتی ہے اور نہ خود غرض لوگوں کی طنز و حقارت۔ پھر زندگی کی بے کیفی بھی دل کو مغموم نہیں کر پاتی ہے"

ہمیں بار بار یہ بتایا جاتا ہے اور صحیح بتایا جاتا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ لہٰذا قبل اس کے کہ میں اپنی یہ گفت گو ختم کروں میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ اگر اسلام دینِ فطرت ہے تو پھر احترام فطرت ہین اسلامی عمل ہے

(انگریزی سے ترجمہ: از جناب محترم علی اسد)



جناب یعقوب ہاشمی ، جناب محمد یوسف گورایا ، جناب حکیم محمد سعید



مقرر : محترم محمد یوسف گورایا

آغاز اجلاس سے قبل



دائیں طرف سے،
جناب یعقوب ہاشمی
حکیم محمد سعید
جناب محمد یوسف گورایا

سامعین



احترامِ تعلیم

کلماتِ ابتدائیہ	:	حکیم محمد سعید
مقالہ	:	جناب محترم محمد یوسف گورایا

شامِ ہمدرد، راولپنڈی

۴-۱ اپریل ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

یہ ظاہر تو یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ تعلیم کے احترام کو کسی تقریر کا موضوع بنایا جائے، کیوں کہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی مہذب معاشرہ احترامِ تعلیم سے عاری نہیں ہو سکتا اور خاص طور پر ایک مسلم معاشرے کا تعلیم کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ علم دوستی اور علم پرستی مسلمانوں کے خمیر میں ہے نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو کوئی حصولِ علم کی خاطر سفر کرتا ہے خدا اُس کے لیے جنّت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔ آپؐ کا یہ بھی فرمان ہے کہ

"فرشتے طالب علم کی راہ میں اپنے پَر بچھاتے ہیں۔"

اس لیے ایک مہذب معاشرے اور مسلم معاشرے کی حیثیت سے احترامِ تعلیم ہمارے عقائد کا جزو ہونا چاہیے، لیکن جب ہم ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہم احترامِ تعلیم کے وصف سے متصف نہیں رہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم پہلے سے زیادہ عام ہو گئی ہے، طلبہ اور درس گاہوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے اور تعلیم یافتہ افراد کا تناسب پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے، لیکن اس کے باوجود علم کی قدر اور تعلیم کا احترام گھٹتا جا رہا ہے، کتاب کی محبّت کم ہو رہی ہے، مصنّف سے عقیدت میں کمی ہو رہی ہے، اُستاد کے ادب میں کمی ہو رہی ہے اور اہلِ علم کا احترام دلوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ اب ہمارے معاشرے میں عظمت کا معیار علم نہیں رہا بلکہ دولت، شہرت یا حکومت کو معیارِ شرَف گردان لیا گیا ہے۔ زبان سے نہ سہی عمل سے ہم اسی کی گواہی دے رہے ہیں۔ احترامِ تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ تعلیم کو تجارت نہ بنایا جائے بلکہ تعلیم کے تقدّس کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کو منضبط کیا جائے۔ احترامِ تعلیم کی کمی ہی نے ہمیں اب تک صحیح نظامِ تعلیم سے محروم رکھا۔ صرف یہی ایک وجہ احترامِ تعلیم کی اہمیت کو یاد دلانے اور تازہ کرنے کی ضرورت کو ثابت کرتی ہے۔

پاکستان ایک وہ بدقسمت ملک ہے کہ جس کے باشندے صحیح نظامِ تعلیم سے محروم ہیں۔ اس ملّتِ اسلامیہ کا حال بڑا عجیب ہے۔ اس نے پاکستان اسلام کے نام و عنوان پر بنایا۔ اُس نے یہ دعوا کیا تھا اور فیصلہ کہ وہ دنیا میں ایک نئے ملک کو اس لیے عالمِ وجود میں لائے گی کہ وہاں نظامِ اسلام قایم کیا جائے گا۔ اس ملک میں اللہ کا قانون اور اُس کے رسولؐ کا دستور نافذ ہوگا اور حیات کا کاز بار تمام و کمال طور پر اُن خطوط پر چلایا جائے گا جو اسلام کو عرب کے ریگ زاروں سے دُنیا کے ہر

گوشے میں پہنچا دینے کا سبب بنے اور جنھوں نے دنیا کے ہر نظام کو متاثر کر کے رکھ دیا۔ اس عزم اور ارادے نے برصغیر کے مسلمانوں میں ایک رُوحِ عمل پھونک دی۔ نیک نیتی اور صالح فکری نے ان کی راہوں کو ہموار کر دیا اور ایک نئی مملکت خداداد عالمِ وجود میں آگئی اور اُس کا نام پاکستان رکھا گیا۔ یہ پاکستان جسے دنیا کو اسلام کی روشنی پہنچانی تھی، اس کے بنانے والے خود ہی اسلام کی روشنی سے محروم ہو کر رہ گئے۔ وہ روشنیٔ اسلام سے کیا محروم ہوئے وہ تو اپنے ملی تشخص کو بھی کھو بیٹھے۔ اُن کا حال تو یہ ہے کہ اُن کا اپنا کوئی لباس تک نہیں ہے، وہ مغرب کے نقّال بن گئے ہیں۔ یہ پاکستانی تو ہیں جن کا اپنا خود کا نظامِ تعلیم اسلامی نہیں ہے۔ وہ جو دوسروں کو روشنی عطا کرنے چلے تھے خود ہی بے نور ہو گئے۔ پھر ان میں تعلیم سے بھی کوئی شغف باقی نہ رہا۔ نہ وہ علم کی قدر کر سکے اور نہ عالم کا احترام کر سکے۔ ان کے پاس علم کا مقام کوئی نہیں ہے۔ اور عالم کو وہ طاقِ نسیاں میں بٹھا کر گویا وہ اپنے فرائض سے سبک دوش ہو گئے۔ تعلیم و تعلّم کا کام انھوں نے اب اغیار کو سونپ دیا ہے۔ اغیار ہی اُن کے نصاب تعلیم کا اب فیصلہ کرتے ہیں۔ اُن کی نصابی و درسی کتابیں بھی اب اغیار ہی لکھ کر دیتے ہیں۔ اُن کے لیے کتابیں تک باہر سے آتی ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جس ملّتِ اسلامیہ نے دنیا کو علم دیا اور درس دیا آج اُسی ملّت کا حال یہ ہے کہ جس کا میں نے نقشہ کھینچا ہے!

ملّتِ پاکستانیہ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اُسے آج خود کو مسلمان کہنے اور پکارنے میں عار محسوس ہوتی ہے۔ وہ اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم ساری محسوس کرتی ہے۔ وہ قرآن پڑھنے سے کتراتی ہے اس کے بچے انگریزی مدرسوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ اُن کے قرآنی مدرسے حقیر قرار دیے گئے ہیں۔ ان مدرسوں کے عالموں کا یہ حال ہے کہ آج تک اُن کا نام چوروں کی فہرست میں درج ہے کیونکہ انگریز کے ہاں اُن کا یہی مقام تھا۔ پاکستان بن جانے کے ۲۵ سال بعد بھی ہم علما کو اس فہرست سے خارج نہیں کر سکے ہیں اور ہماری غیرت نے کوئی چیلنج قبول نہیں کیا ہے۔

اس ملّت پر غیر ملکی جارحیتوں کا حال یہ ہے کہ اُس کی تعلیم گاہیں درحقیقت تفریح گاہیں بنا دی گئی ہیں۔ غیر ملکی فلموں نے جن کی نمائش سینما گھروں اور ٹیلی وژنوں پر بے دھڑک ہو رہی ہے اس ملّت کو خود شناسی کی خُو سے محروم کر دیا ہے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت خاص قسم کی فلمیں اس ملّت کے لیے تیار کر کے بھیجی جاتی ہیں جو اس میں عزّتِ نفس کو ختم کر کے اس میں جنسی بے راہ روی اور فحاشی کو پیدا کر دے۔ اس ملّت کو گستاخ بنانے میں ان فلموں نے جو کردار ادا کیا ہے اُس نے اس ملّت کو وحشت میں مبتلا کر کے رکھ دیا ہے۔ اب یہ ملّت اسلام کو چھوڑ کر ہر اُس طرزِ فکر کی طرف دوڑ رہی ہے جس کا چرچا زیادہ ہوتا ہے۔ اسے اب ہر بیرونی ادا پسند آتی ہے مگر اسلام اسے ناپسند ہے۔

یہ حالات ہیں جن میں ہم اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ ملتِ پاکستانیہ کو اُس کے مرکز کے قریب واپس لے آئیں۔ ہم احترام کے ذیل میں ہر اُس درس کو دہرانے کی سعی کر رہے ہیں جو اسلام نے ہمیں دیا، اُس میں تعلیم بھی ایک درس ہے۔ اس کے احترام میں آج یہ شامِ ہمدرد منعقد ہوئی ہے۔
آج ہمارے مہمان مقرر جناب محترم محمد یوسف گورایا صاحب ہیں جو ادارہ تحقیقاتِ اسلامی سے منسلک ہیں اور جن کا موضوع تعلیم ہی ہے۔

جناب محترم محمد یوسف گورایا

احترام عربی زبان کا لفظ ہے اور حرمت سے مشتق ہے۔ قول و قرار اور عہد و پیمان یا حقوق و واجبات کی ذمے داریوں کو پورا پورا ادا کرنا اُن کی حرمت کہلاتا ہے۔ اگر ہم یہ عہد کریں یا اسے تسلیم کرلیں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اللہ ہمارا مقتدرِ اعلا ہے تو اس قول و عہد کو ماننے کے بعد ہمارے اوپر جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں انھیں ادا کرنا احترام کہلائے گا۔ اور اس کے برعکس عمل کو ہم احترام کا نقیض خیال کریں گے۔

حرمت میں ایک مفہوم ڈرنے اور خوف کرنے کا بھی پایا جاتا ہے جس سے تعظیم و احترام کے معنی نکلتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں ہے "ومن یعظم حرمات اللہ فھو خیر لہ" (۲۲/۳۰) یعنی اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کا جو مقام متعین کر دیا ہے یا جن اشیا کی جو حدود مقرر کر دی ہیں اُن سے تجاوز کرتے ہوئے ڈر محسوس کرنا چاہیے۔

حرمت اضداد میں سے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی چیز عظمت و تقدس کی متقاضی ہے تو اُس کی عزت و احترام کی تعمیل و تنفیذ کے لیے تمام ذرائع و وسائل بروئے کار لائے جائیں اور ان عناصر و عوامل کی تعطیل و تعدیم کی جائے جو اُس کے مقامِ رفیع کی تحقیر کا سبب بنیں۔ اور اگر کوئی چیز ذلت و تحقیر کی متقاضی ہے تو تمام قوت و بکمال طاقت اُس کی مخالفت کی جائے اور ان تمام عناصر و عوامل کی تعطیل و تعدیم کی جائے جو اس کی تعمیل و تنفیذ کے لیے سرگرم ہوں۔ ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں، "المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ" مسلمان پر مسلمان کی جان و آبرو اور مال حرام ہے۔ یعنی ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی پوری پوری حفاظت کرے اور اُس پر کسی قسم کے حملے کی صورت میں اپنے تمام وسائل سے مدافعت کرے۔ حرمت کی ایک تعریف یہ بھی ہے: الحرمۃ: الحق المانع من تحلیلہ حرمت وہ حق ہے جو کسی چیز کے حلال و جائز ہونے کو روکنے والا ہو۔ قرآن حکیم میں یہ مفہوم یوں ادا ہوا ہے: قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الاٰخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ (۹: ۲۹) ان لوگوں سے جہاد کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے، یومِ آخر کو نہیں مانتے اور اللہ اور رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کی حرمت نہیں کرتے۔ اس آیت میں "ما حرم اللہ" کی حرمت یہ ہے کہ اُن کی حلّت سے باز رہا جائے، اور جو لوگ انھیں حلال کرنے کے درپے ہوں

اُن کے خلاف جہاد کیا جائے۔ "حرمۃ اللہ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہر الٰہ کی دل و زبان اور اعمال کی پُرزور تردید کی جائے۔ حرمۃ اللہ پر یقین رکھنے والے کے دل میں اگر غیر اللہ کی ذرّہ برابر بھی عزّت باقی ہے تو اسی نسبت سے اُس کے دل میں اللہ کے خلاف حقارت کا پایا جانا لازمی امر ہے۔ اور جب تک غیر اللہ کی ذرّہ برابر بھی عزّت اُس کے دل سے خارج نہ ہو جائے اللہ کی مکمّل عظمت اُس کے دل میں جگہ نہیں پا سکتی۔ قرآن حکیم نے اس پُورے مفہوم کو ایک جُملے میں یوں ادا کیا ہے

لا الٰہ الّا اللہ : یعنی اللہ کو الٰہ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو کسی بھی حد تک اور کسی بھی شکل میں الٰہ نہ مانا جائے۔ "احترامِ قرآن" یہ ہے کہ معروف کی مکمل و تمام تعمیل و تنفیذ ہو اور مُنکر کی پُوری طرح تعطیل و تعدیم ہو جس ملک و معاشرے میں جس حد تک مُنکر موجود ہوگا اُسی حد تک وہاں معروف اپنی تعمیل و تنفیذ سے قاصر رہے گا۔ اور اسی نسبت سے احترامِ قرآن مجروح ہوگا۔

اس معنوی و دینی بحث کی روشنی میں احترامِ تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ علم کی عظمت و افادیت کے پیشِ نظر اس کی تعمیل و تنفیذ اور نشر و اشاعت کے لیے تمام انفرادی و اجتماعی وسائل بروئے کار لائے جائیں اور ان تمام عناصر و عوامل کی مکمّل طور پر تعطیل و تعدیم کر دی جائے جو اس راہ میں حائل ہوں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جس معاشرے میں علم کی ضد' جہالت' موجود ہو' وہاں علم کی تذلیل و تحقیر ہے۔ اور علم کے مقابلے میں جہالت جس نسبت سے وہاں موجود ہوگی اسی نسبت سے علم کی عظمت مجروح ہوگی۔

علم کی عظمت و افادیت ہر جگہ مسلّم ہے لیکن اسلام نے اُسے بطورِ خاص اہمیّت دی۔ وحی کا آغاز ہی "اِقْرَا" ' پڑھو' سے ہوا۔ پڑھائی کے ساتھ لکھائی کی طرف فوری توجّہ دلائی: "علّم بالقلم" (۹۶ : ۴) اسلام نے تخلیقِ انسانیت کے ساتھ ہی یہ بات واضح کر دی تھی کہ علم، حصولِ مقصد کا لازمی ذریعہ ہے۔ ملائکہ کے نزدیک مقصدِ تخلیق تسبیح و تقدیس تھا: نحن نسبّح بحمدك ونقدّس لك (۲ : ۳۰) اللہ کے نزدیک عبادت کا یہ تصوّر محدود تھا۔ وہ ایسی مخلوق چاہتا تھا جو "اللہ، اللہ" کے معانی و مطالب سے بھی پُوری طرح آگاہ ہو، اور جو عبادت کو علم کی روشنی میں عقل و فکر سے ہم آہنگ کر سکے۔ علم کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ خود ذاتِ خداوندی نے معلّم کے فرائض انجام دیے: وعلّم آدم الاسمآء کلّها (۲ : ۳۱) فرشتے آدم کی علمی عظمت کو دیکھتے ہی پکار اُٹھے: سُبحٰنك لاعلم لنا الّا ما علّمتنا انّك انت العلیم الحکیم (۲ : ۳۲) لیکن جب آدمؑ شے

باقاعدہ اپنے علم کا اظہار کیا: "فلما انبأھم باسمآئھم" تو بحکم خداوندی ملائکہ کے لیے سوائے اس کے چارہ نہ رہا کہ وہ علم و عبودیت کے اس مجسّمے کی تعظیم و تکریم کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں: واذ قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لاٰدم فسجدوا (۲: ۳۴) علمی و فکری تربیت کے بعد جب انسان کو معرکۂ کارزار کی طرف روانہ کیا تو ساتھ ہی فلاح و کامرانی کا یہ گرُ بھی بتا دیا: فامّا یاتینّکم منّی ھُدًی فمن تبع ھُدای فلاخوفٌ علیھم ولاھم یحزنُون (۲: ۳۸) علم و حکمت پر مبنی ہدایت تمہارے پاس آتی رہے گی جو اس کی پیروی کریں گے اُن پر نہ خوف ہوگا نہ غم۔

قرآن میں احترامِ تعلیم کا یہ پہلو ادیانِ عالم میں اپنی مثال آپ ہے کہ اس میں ایمان و علم، لازم و ملزوم ہیں۔ ایمان، چند حقائق کو پوری طرح جان کر مان لینے کا نام ہے۔ ان حقائق کی معرفت بغیر علم کے ممکن نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا:

اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ
وَمَآ اَنْتَ بِھَادِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِھِمْ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا
فَھُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۷: ۸۰-۸۱)

آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سنا سکتے ہیں (خصوصاً جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چل دیں) اور نہ آپ اندھوں کو اُن کی گمراہی سے بچا کر راستہ دکھانے والے ہیں۔ آپ تو صرف اُنھی کو سنا سکتے ہیں جو ہمارے کھلے دلائل پر یقین رکھتے ہیں اور پھر وہ مانتے بھی ہیں۔

اس آیت میں ایمان اور جہالت کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا گیا ہے۔ دل و دماغ اور سمع و نظر کی صلاحیتوں سے عاری انسان قرآنی تعلیمات پر ایمان لانے سے قاصر رہتا ہے حتیٰ کہ رسولِ اکرم ؐ بھی ایسے انسان کو قرآن کی طرف مائل نہیں کر سکتے۔

قرآن پر صرف وہی لوگ ایمان لاتے ہیں، جو انفس و آفاق میں پھیلے ہوئے کھلے دلائل و براہین کو علم و فکر کی روشنی میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ قرآن نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ اندھے اور بہرے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بصارت اور سماعت کی صلاحیتوں ہی سے محروم ہیں، بلکہ درحقیقت وہ لوگ جس صلاحیت سے محروم ہیں وہ بصیرت ہے اور تفکر و تعقل کا فقدان ہے۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَآ اَوْ اٰذَانٌ
یَّسْمَعُوْنَ بِھَا فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ

فی الصّدور (۲۲ : ۴۶)

کیا یہ لوگ دنیا میں گھومے پھرے نہیں، جس سے ان کے دل ایسے ہوجاتے کہ ان سے سمجھنے لگتے یا اُن کے کان ایسے ہوجاتے کہ وہ اُن سے سننے لگتے۔ بات یہ ہے کہ (اُن کی) آنکھیں اندھی نہیں ہیں، بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہیں۔

دوسری جگہ یوں فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷: ۲۳-۲۴)

یہی وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اپنی رحمت سے دُور کر کے اُن کو بہرا کر دیا اور اُن کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔

یہاں ذرائع علم، سماعت و بصیرت سے محرومی کو، اللہ کی لعنت سے بھی زیادہ بڑی سزا بیان کیا گیا ہے۔

قرآن، دلیل و برہان کی زبان میں بات کرتا ہے: ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین ۲ : ۱۱۱ اگر تم سچے ہو تو اپنی صداقت کے دلائل پیش کرو۔ اور نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۶ : ۱۴۳) اگر تم سچے ہو تو مجھے کسی علمی و عقلی دلیل سے تو آگاہ کرو۔

ایمان و علم کے التزام کے سبب اسلام جبر و اکراہ پر مبنی دین کو تسلیم نہیں کرتا" لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (۲: ۲۵۶) دین میں زبردستی (کا فی نفسہٖ کوئی موقع) نہیں (کیونکہ) ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّ یَحْیٰى مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ (۸ : ۴۲) تاکہ جسے برباد ہونا ہو وہ واضح ثبوت کی بنا پر ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ واضح دلیل کی موجودگی میں زندہ رہے۔

علم و یقین کے التزام کو ایک جگہ یوں بیان کیا ہے: وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۷: ۳۶) اس چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو، یعنی جب تک کسی چیز کی حقیقت نہ معلوم ہو جائے اس کی تصدیق نہ کرو اور نہ ہی اُس کو مانو۔

علم و ایمان کی ہم آہنگی کے اس بنیادی نظریے کے مطابق قرآن حکیم اُن لوگوں کے ایمان کا اعتبار نہیں کرتا جو اسلامی حقائق کو علمی معیار۔ سمع، بصر اور فؤاد۔ پر پرکھے بغیر غیر علمی وجوہ۔ سیاسی،

معاشی - کی بنا پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو واضح طور پر بتا دیا گیا کہ وہ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اسلام کی بالادستی کو تسلیم کر لیا ہے، لیکن ایمان کا دعویٰ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ کسی چیز پر ایمان اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ جب اُس کے دلائل کو علم و فکر کی کسوٹی پر پرکھ کر بلا جبر و اکراہ اسے قلب صمیم میں جگہ دے لی جائے:

قالت الاعراب اٰمنّا قل لم تؤمنوا ولٰکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (۴۹: ۱۴)

جاہل و گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے۔ لیکن یوں کہو کہ ہم نے مخالفت چھوڑ کر اسلام کی بالادستی قبول کر لی ہے۔ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

اس نظریے کی مزید وضاحت یوں فرمائی:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ (۹: ۹۷)

جاہل و گنوار کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں۔ اور اُن کی حالت اس بات کی زیادہ متقاضی ہے کہ وہ ان حدود (کی حکمتوں) کو نہ سمجھ سکیں جنھیں اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔

مقاصدِ تعلیم (مقاصد اسلام)

اسلام میں تعلیم کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان کی خداداد صلاحیتوں کی مناسب تربیت کی جائے، انسانی صلاحیتیں امانت ہیں اُن میں سے ہر ایک کے متعلق باقاعدہ جواب طلبی ہو گی۔ اس لیے امکانی حد تک اُن کی تربیت کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا (۱۷: ۳۶)

کان، آنکھ اور دل کے متعلق ہر شخص سے پوچھ ہو گی۔

لیکن ان صلاحیتوں کی تربیت فی نفسہٖ مقصود نہیں، بلکہ یہ سب حصول مقصود کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد، مقصدِ تخلیق کا حصول ہے۔ اور مقصدِ تخلیق یہ ہے کہ خالق کی طرف سے دی ہوئی ہدایت کے مطابق، مخلوق کی خدمت کرنا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (۵۱: ۵۶)

میں نے جن اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ میری عبادت کیا کریں۔

قرآنی عبادت کا مختصر خاکہ یہ ہے:

لیس البرّ ان تولّوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البرّ
من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملائکۃ والکتاب والنبیّین
واٰتی المال علیٰ حبّہ ذوی القربیٰ والیتٰمیٰ والمساکین وابن
السّبیل والسّائلین وفی الرّقاب واقام الصّلوٰۃ واٰتی الزّکوٰۃ
والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصّابرین فی البأسآء
والضّرّاء وحین البأس اولٰئک الّذین صدقوا واولٰئک
ھم المتّقون (۲: ۱۷۷)

نیکی اور بھلائی (کی راہ) یہ نہیں ہے کہ تم نے عبادت کے وقت اپنا منہ مشرق کی طرف پھیرلیا یا مغرب کی طرف کرلیا۔ نیکی کی راہ تو اُن لوگوں کی راہ ہے جو: اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر آسمانی کتابوں پر اور خدا کے تمام نبیوں پر ایمان لاتے ہیں، خدا کی راہ میں اپنا مال، رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیتے ہیں اور غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ نماز قایم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اپنی بات کے پکّے ہوتے ہیں، جب قول و قرار کرلیتے ہیں تو اُسے پورا کرکے رہتے ہیں۔ تنگی و مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت ہر حال میں صبر کرنے والے (اور اپنی راہ میں ثابت قدم) ہوتے ہیں۔ تو بلا شبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو نیکی کی راہ میں سچّے ہوئے اور یہی ہیں جو بُرائیوں سے بچنے والے انسان ہیں۔

مقصدِ تخلیق کا یہ مختصر خاکہ اس بات کا متقاضی ہے کہ نظامِ تعلیم جان دار اصولوں پر استوار ہو جس سے مسلسل ایسے با صلاحیت انسان پیدا ہوتے رہیں جو نہ صرف مسلمان معاشرے کی بہتر سے بہتر خدمت بجا لائیں، بلکہ پوری انسانیت کی خدمت کی قیادت بھی انھیں کے ہاتھوں میں ہو: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۳: ۱۱۰) مسلمانو! تم تمام اُمتوں میں بہتر اُمت ہو جو پوری انسانیت (کی اصلاح اور خدمت) کے لیے ظہور میں آئی ہے۔ تم معروف (خیر و فلاح) کا حکم دینے والے اور منکر (ظلم و عدوان) سے روکنے والے اور اللہ پر ایمان رکھنے والے ہو۔

خیر و خدمت کے اصولوں کے محافظ پیدا کرنا بھی مقاصدِ تعلیم میں سے ہے۔ ماضی و حال میں جہاں کہیں بھی خیر و خدمت کے اصول موجود ہوں اُن کی پیروی اور حفاظت مسلمانوں

پر فرض ہے : وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ (۵ : ۴۸) ہم نے یہ کتاب آپ کے پاس بھیجی ہے جو خود بھی صدق کے ساتھ موصوف ہے۔ اس سے پہلے جو کتابیں ہیں اُن کی بھی تصدیق کرتی ہے۔ اور اُن کی محافظ بھی ہے۔

اسلام چونکہ خیر و خدمت اور عدل و مساوات کا دین ہے، اس لیے ان اصولوں کو ظلم و عدوان پر غالب کرنے والے، انسانوں کی فراہمی تعلیم کے مقاصد میں سے ہے :
هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ (۹ : ۶۱) اللہ نے اپنا رسول ہدایت اور حق و صداقت پر مبنی دین دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اُسے تمام ادیان پر غالب کر دے۔

اسلام کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں : قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ (۷ : ۱۵۸) آپ کہہ دیجیے کہ اے (دنیا جہان کے) لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

اس لیے یہ بات بھی مقاصدِ تعلیم میں شامل ہے کہ مسلم معاشرے میں ایسے انسان پیدا ہوں جو پوری انسانیت کی ہر اعتبار سے قیادت کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ خود قرآن نے پوری وضاحت کے ساتھ اس اصولِ تعلیم کو بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کو عالم انسانیت میں وہی کردار ادا کرنا ہوتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمتِ مسلمہ میں ادا کرتے ہیں۔ لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا (۲ : ۱۴۳)

احترامِ تعلیم کے نقطۂ نظر سے اگر اسلام کے ان بنیادی مقاصد پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علم اور مقاصدِ اسلام بھی لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں کمال حاصل کرنا اور پھر اس درجہ کمال حاصل کرنا کہ ہر شعبۂ حیات میں عالمی قیادت کی اہلیت پیدا ہو جائے، بغیر علمی و فکری کمال کے ناممکن ہے۔ ایمان اور مقاصدِ اسلام دونوں کا دار و مدار علم پر ہے، اس لیے جہالت ایمان اور مقاصدِ اسلام دونوں کی نقیض ہے۔ جس معاشرے میں جتنی جہالت ہوگی اتنی ہی ایمان اور مقاصدِ اسلام کی توہین ہوگی۔

اہلِ علم کی عظمت

قرآن حکیم میں اہلِ علم کو سب مخلوق پر فوقیت حاصل ہے۔ توحید قرآن کا سب سے اہم موضوع ہے، اس کے اثبات پر اللہ اور فرشتوں کی شہادت کے ساتھ اہلِ علم کی شہادت کو سب سے بڑی اور ٹھوس شہادت سمجھا گیا ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ (۳ : ۱۸) اقوام و ملل کے عروج و زوال کے فلسفے کا ادراک اور تاریخی حقائق سے تعمیری نتائج کے استخراج کا کام، انفرادی اور اجتماعی ترقی و عروج کے لیے ناگزیر ہے۔ اتنا اہم اور بنیادی کام صرف اہلِ علم ہی انجام دے سکتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اہلِ علم کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے: وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۲۹: ۴۳) ہم ان قرآنی مثالوں کو لوگوں کے سمجھانے کے لیے بیان کرتے ہیں اور اُن کو صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔ دینی اور تاریخی حقائق اہلِ علم کے دل میں جگہ پاتے ہیں: بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۲۹: ۴۹)

قرآن نے علم کو بصیرت، نور، حیات، ادراک، بیّنہ جیسے ناموں سے پکارا ہے۔ علم و جہالت کا موازنہ یوں کیا گیا ہے: اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے اور نہ تاریکی اور روشنی اور نہ چھاؤں اور نہ دھوپ اور نہ ہی زندہ اور مُردہ برابر ہو سکتے ہیں۔ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ (۳۵: ۱۹ - ۲۲)

علم و ہدایت میں براہِ راست وابستگی کے سبب قرآن نے اس بات کو پُرزور انداز میں پیش کیا ہے کہ قرآنی ہدایات کے اسرار و رموز سے صحیح واقفیت اہلِ علم کو ہوتی ہے۔ جاہل افراد یا اقوام قرآنی تعلیمات سے مستفید نہیں ہو سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹: ۹) کیا اہلِ علم اور اہلِ جہل برابر ہو سکتے ہیں؟ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۹: ۹) وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہلِ عقل (سلیم) ہوں۔ خشیت الٰہی اللہ پر ایمان کی بنیاد ہے اور یہ صرف اہلِ علم کو نصیب ہوتی ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (۳۵: ۲۸) اس کی مخلوق میں سے صرف اہلِ علم ہی ڈرتے ہیں۔ اہلِ علم کی اسی فضیلت کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: اہلِ علم کی اہلِ عبادت پر اسی طرح فضیلت ہے جس طرح میری فضیلت میری اُمّت پر ہے: فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلٰى اُمَّتِيْ (جامع بیان العلم و فضلہ ص۲۱) دوسری روایت میں ہے: جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ ترین پر ہو كَفَضْلِي عَلٰى اَدْنَاكُمْ۔ (الترمذی، مشکوٰۃ، کتاب العلم ص۳۴) آپ نے ایک جگہ فرمایا: ایک فقیہہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ گراں ہوتا ہے۔ "فقيه واحد اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ الف عابد" (رواہ الترمذی ابن ماجہ (مشکوٰۃ ص۳۴)

جہالت کی مذمّت

احترام کے بنیادی تصور کے مطابق علم اپنی عظمت و اہمیت کی رُو سے اس بات کا متقاضی ہے کہ اُس کی ضد، جہالت، کی مکمّل تعطیل و تعدیم ہو۔ جس طرح علم و ایمان لازم و ملزوم ہیں اسی طرح جہالت و کفر لازم و ملزوم ہیں۔ قرآن نے جہالت کے انھی تباہ کن نتائج کی بنا پر اس کی سخت ترین الفاظ میں مذمّت کی ہے۔ جہالت اور ایمان کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہا گیا ہے کہ جاہلوں کے پاس اگر فرشتے بھیج دیے جاتے اور مُردے اُن سے باتیں کرنے لگتے اور تمام موجودات (غیبیہ) کو اُن کے پاس اُن کی آنکھوں کے روبرو لا جمع کر دیا جاتا، تب بھی وہ ایمان نہ لاتے: وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ (۶: ۱۱۱) حضرت نوحؑ کے علمی و عقلی دلائل کا جب اُن کی قوم پر کوئی اثر نہ ہوا تو انھوں نے اس کا سب سے بڑا سبب یہی بیان کیا کہ مجھے نظر آرہا ہے کہ تم وہ لوگ ہو جو جہالت میں مبتلا ہو: وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (۱۱: ۲۹) حضرت لوطؑ کے بیان کے مطابق اُن کی قوم بھی جہالت کی بنا پر ایمان لانے سے قاصر رہی تھی: اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (۲۷: ۵۵) حضرت موسیٰؑ نے بھی اپنی قوم کے کفر پر جمے رہنے کا سبب اُن کی جہالت ہی بیان کیا تھا: قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (۷: ۱۳۸) جہالت اتنی تباہ کن اور خوفناک چیز ہے کہ شعور تو شعور لاشعور میں بھی اس سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ خود سیّد الرسلؐ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۶: ۳۵) دیکھیے آپ جاہلوں میں سے نہ ہو جانا۔ جہالت کی انھی تباہ کاریوں کا نتیجہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر جہالت سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے: قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۲: ۶۷) قرآن سے تو یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جہالت، کفر سے بھی بُری چیز ہے، اس لیے اکثر جگہ جاہلوں کو لاعلاج قرار دیتے ہوئے اُن سے اِعراض کرنے کی ہدایت کی گئی ہے: وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (۷: ۱۹۹)

قرآن نے جہالت کی شدید مذمّت اس لیے بھی کی ہے کہ اس کی موجودگی میں ایمان اور مقاصدِ اسلام کا حصول تو درکنار عام انسانی سطح کا حصول بھی ناممکن ہے۔ قرآن نے علم و عقل سے بے گانہ لوگوں کو تو حیوانوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے، بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ وہ حیوانوں میں سے بدترین قسم کے حیوان ہیں: اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (۸: ۲۲) اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والے جانوروں میں سب سے بدتر حیوان وہ انسان

ہیں جو بہرے اور اندھے ہیں اور جنھیں عقل و فکر سے کام لینا نہیں آتا۔ انسان حیوانوں کی سطح سے بھی اس لیے گر جاتا ہے کہ فطری طور پر اُس میں عقل و فکر کا جوہر موجود رہتا ہے۔ لیکن اس کی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے وہی جوہر رذیل حرکات کی طرف مڑ جاتا ہے، اور اس پست معنی میں حیوان بھی اس سے پیچھے رہ جاتا ہے۔

احترامِ تعلیم کا تقاضا تھا کہ اسلام تعلیم کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و توسیع کے لیے خصوصی اقدامات کرتا۔ اسی اہم تقاضے کے حصول کے لیے تعلیم کو حکومتِ اسلامیہ کے بنیادی فرائض میں شامل کیا۔ خود قرآن نے اسلامی حکومت کے لیے جو بجٹ تیار کیا اس میں دوسرے مصارف کے ساتھ تعلیم (وفی سبیل اللہ) پر خرچ کو "فریضۃ من اللہ" (۹: ۶۰) اللہ کی طرف سے فریضہ قرار دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عوام پر حکومت کی طرف سے واجبات کی ادائیگی اللہ کی طرف سے فرض ہے اسی طرح واجبات کے حصول کے بعد حکومت پر یہ فرض ہے کہ وہ عوام کے حقِ تعلیم کی تکمیل کرے۔ شہری حکومت کے واجبات کی عدم ادائیگی کی صورت میں مجرم ہوں گے اور حکومت کو حق حاصل ہوگا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اپنے واجبات کی وصولی کرے۔ حکومت شہریوں سے واجبات کی وصولی کے بعد اُن کے حقِ تعلیم کی عدم تکمیل کی صورت میں مجرم ہوگی۔

اسلام کے نظامِ تعلیم پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں سب سے اعلا، ارفع اور محترم پیشہ معلمی ہے۔ معلمین اسلام کی سرفہرست پر خود ذاتِ خداوندی ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۤءَ كُلَّهَا (۲: ۳۱) وَعَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ اور عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ اس فہرست کے دوسرے نمبر پر تمام انبیاء و رُسل موجود ہیں۔ اور اس مبارک فہرست کی تکمیل سید الرسل کے نامِ نامی سے ہوتی ہے۔ آپؐ نے نزولِ وحی کے ساتھ ہی تبلیغِ وحی کا فریضہ انجام دیا۔ "بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ" اور تاحیات اس کام میں مصروف رہے: يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲: ۲) آپؐ فرمایا کرتے "بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" (ابن ماجہ باب فضل العلماء) مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ مکہ میں دارِ ارقم کو دنیا کی اولین اسلامی درس گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مدینہ میں مسجدِ نبوی میں جس عظیم الشان دانش گاہ کی بنیاد رکھی گئی سید سلیمان ندوی نے اُس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> "کہیں ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ جیسے فرماں روا زیرِ تعلیم ہیں۔ کہیں طلحہ، زبیر، معاذ، سعد بن معاذ و سعد بن جبیر جیسے اربابِ رائے و تدبیر ہیں۔ کہیں خالد، ابوعبیدہ، سعد بن ابی وقاص اور عمرو بن العاص جیسے سپہ سالار

ہیں۔ کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمراں، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنّن بنے، کہیں ان زہاد و عباد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی ہیں۔ کہیں ابوذر، سلمان و ابودرداء جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو "مسیح اسلام" کہلاتے تھے۔ کہیں صفّہ والے طالب علم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گزارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے۔ کہیں حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہ و محدّث تھے جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا۔"

احترامِ تعلیم کا یہ پہلو تاریخِ عالم میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ حضورؐ نے علم کی عظمت کے پیشِ نظر جنگِ بدر میں قید ہونے والے مشرکین کو معلّم کا مقام عطا فرمایا۔ اور اُن کا فدیہ یہ مقرر فرمایا کہ وہ مسلمان بچّوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔

دورِ جدید میں تعلیم کی اہمیت

دورِ جدید نے احترامِ تعلیم کے اس پہلو کی طرف متوجہ کیا ہے کہ تعلیم اب بنیادی ضروریاتِ زندگی میں سے ہے۔ جدید تقاضوں کے تحت زراعت و صنعت میں کامیابی سے ہم کنار ہونے کے لیے کسان اور مزدور کو بھی تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ محض معاشی نقطۂ نظر سے علوم و فنون میں برق رفتاری کا ساتھ نہ دینا خودکشی کے مترادف ہے۔ تعلیم قوم کی حیات ہے، جہالت اس کی موت ہے۔ جو معاشرہ اپنے افراد کو جاہل رکھتا ہے وہ اُن کے قتل کا ارتکاب کرتا ہے۔ قتل صرف یہ نہیں کہ باقاعدہ کسی آلے سے کسی شخص کا گلا کاٹ دیا جائے، بلکہ قتل یہ بھی ہے کہ ایسے اسباب پیدا کر دیے جائیں جو دوسروں کی موت کا سبب بنیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں تعمیری صلاحیتیں ودیعت کی ہیں لیکن اُن کا نشوونما، تعلیم و تربیت معاشرے کا کام ہے۔ لیکن اگر کوئی معاشرہ انسانیت کے جوہر کی تربیت نہیں کرتا تو وہ ناقابلِ معافی جُرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ قرآن نے جہنمیوں کی زبانی اس بات کا اقرار کروایا ہے: لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (۶۷ : ۱۰) اگر ہم سننے اور سمجھنے کی قوتوں کو استعمال میں لاتے تو آج ہم جہنمیوں سے نہ ہوتے۔ گویا ناکامی و نامرادی کی اصل جڑ سوچنے اور سمجھنے کی قوتوں سے کام نہ لینا ہے۔ اور جو معاشرہ اپنے افراد کی صلاحیتوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہیں کرتا وہ کسی صورت بھی خلقِ خدا کو جاہل رکھنے کے جُرم کے ارتکاب کی وجہ سے عذابِ جہنّم سے بچ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ صلاحیت کی موجودگی میں جاہل ہونا اتنا بڑا جرم نہیں جتنا بڑا جُرم

باصلاحیت انسان کو جاہل رکھنا ہے۔ تعلیم یافتہ ہو کر بے روزگار ہونا جرم نہیں تعلیم یافتہ کو بے روزگار رکھنا جرم ہے اسبابِ مرض کی موجودگی میں بیمار ہونا جرم نہیں اسبابِ مرض کو برقرار رکھنا جرم ہے۔

قومی دولت اور وسائلِ دولت کا ضیاع یقیناً بہت بڑا جرم ہے اور اُس کی روک تھام انتہائی مستحسن قدم۔ لیکن انسانی صلاحیتوں کا ضیاع سب سے بڑا جرم ہے۔ انسان کی ایک ایک صلاحیت کروڑوں اور اربوں رُپیے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ دورِ جدید میں سائنسی و تکنیکی ایجادات نے یہ بات عملاً ثابت کر دی ہے کہ ایک باصلاحیت انسان وہ کارہائے نمایاں انجام دے سکتا ہے جو اب تک پُوری انسانیت کے بس میں نہ تھے۔ لیکن وہ سماجی و معاشی نظام جو ایک انسان کی ایک صلاحیت نہیں، بلکہ قوم کے کروڑوں انسانوں کی صلاحیتوں کے قتل کا مرتکب ہو اُس کا جرم نہ اس دنیا میں قابلِ معافی ہے اور نہ آخرت میں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے چور غلاموں کے ہاتھ کاٹنے کے بجائے نادہندآقا سے کہا تھا کہ اگر آئندہ انھوں نے چوری کی تو اُن کے بجائے تمہارا ہاتھ کاٹوں گا۔

ترقی یافتہ ممالک نے اپنے افراد کی سمعی، بصری اور ادراکی قوتوں کا صحیح نشوونما کیا تو انھیں فضا میں معلق سیاروں کے حالات زمین پر بیٹھے نظر آنے لگے۔ اُنھوں نے تعلیم کو عام کیا تو اُن کی مجموعی بصارت میں زبردست اضافہ ہو گیا، باطنی صلاحیتوں کی تربیت کا یہ اثر ہوا کہ اُن کی مجموعی بصیرت میں ترقی ہوئی۔ بصارت و بصیرت کی اس ترقی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مسلمان قوم جسے کفار کو خائف رکھنے کا فریضہ سونپا گیا تھا: تُرھبون بہ عدو اللہ وعدوکم خود اپنے وجود و بقا اور حیات و امن کی بھیک مانگتی پھر رہی ہے۔ بصارت و بصیرت سے محروم ہو کر یہ قوم آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھی، کان رکھتے ہوئے بھی بہری اور دل و دماغ کے رکھتے ہوئے بھی عقل و فکر سے بے گانہ ہو گئی ہے۔ کیا قرآن کا یہ فیصلہ خود اس پر صادق نہیں آرہا: لھم قلوب لا یفقھون بھا (۷: ۱۷۹) اُن کے سینوں میں دل تو ہیں لیکن عقل و فکر کا کام لینے سے اُنھیں محروم کر دیا گیا ہے: "فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ (۲۲: ۴۶) وہ آنکھوں کے اندھے تو نہیں البتہ دل کے اندھے ضرور ہیں۔

علم سے بے اعتنائی برتنے کا یہ نتیجہ تو ہر قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ لیکن خدا کا غضب و قہر اُس وقت پُورے جوش میں آتا ہے جب مسلمان قوم جاہل ہو جائے۔ اِس قوم کی مقدس کتاب کا آغاز ہی "پڑھو" کے حکم سے ہوا تھا۔ اور پھر مسلسل پُرزور دلائل سے اس بات کی وضاحت

کی گئی کہ بغیر علم، نہ ایمان کی تکمیل ہوتی ہے اور نہ مقاصدِ اسلام کی حکمت کا پتہ چلتا ہے۔
جو ملک اور خصوصاً اسلامی ملک جہالت کو برقرار رکھتا ہے اُسے جان لینا چاہیئے کہ وہ علم، ایمان اور مقاصدِ اسلام کی دشمنی مول لے رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس ملک کے عوام کا شمار علماء میں ہونے لگے، وہ ایمان دار کہلائیں اور مقاصدِ اسلام بن پورے ہوں۔ ایسا معاشرہ خدا اور رسول کے خلاف برسرِ پیکار کہلائے گا۔ ایسے معاشرے کا وجود علم و ایمان کی تعطیل و تعدیم کے مترادف ہوگا۔ ان حالات میں وہ لوگ جو علم و ایمان اور مقاصدِ اسلام کی تعمیل و تنفیذ چاہتے ہیں اُن کا فرض ہوگا کہ وہ جہالت پر مبنی ایسے معاشرے کو بیخ و بُن سے اُکھاڑنے کے لیے عملاً جدوجہد کریں اور علم و ایمان کے نام پر جہالت کے خلاف جہاد کا اعلان کریں۔ جہالت چونکہ ہر فتنے کی ماں ہے، اس لیے اس وقت تک جہاد کرتے رہیں جب تک جہالت ختم نہ ہو جائے اور اُس کی جگہ علم و ایمان پر مبنی معاشرہ قایم نہ ہو جائے: "قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۔ (۲:۱۹۳) (کفر و جہالت کے ائمہ) کے خلاف اس حد تک لڑو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ ہی کا ہو جائے۔
اسلام کے اِنھی تقاضوں کے تحت صدرِ اسلام میں مسلمانوں نے تمام علوم حاصل کیے۔ دینِ اسلام کو ادیانِ عالم پر غالب کرنے کے لیے انھوں نے ان کا گہرا مطالعہ کیا اور تقابلِ ادیان کے امام پیدا کیے۔ قوانینِ عالم پر اسلامی اصولوں کی فوقیت ثابت کرنے کے لیے فقہائے اسلام نے عراق و روم اور شام و مصر کے قدیم قوانین پر ناقدانہ نظر ڈالی اور قوانین کی ان رفیع الشان عمارتوں کی رُوح کشید کر لی، اور عمارت کا ڈھانچہ فرسودگی کا شکار ہو کر ختم ہو گیا۔ یونان و ہند کی طب کا علمی تجزیہ کیا اور اُس کے کارآمد و مفید اجزا اسلام کے نظامِ طب میں سمو لیے اور بےکار عناصر کو چُن چُن کر الگ کر دیا۔ فلسفہ و حکمت کو اپنی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کا موضوع بنایا تو اپنی مجتہدانہ بصیرت سے مفید و مُضر نظریات کی تنقیح کی اور قرآن و سنت کے معیار پر اُترنے والے علمی و عقلی مباحث کو اسلامی فلسفے میں سمو لیا۔ ان مجتہدین میں اتنا عزم اور اتنا اعتماد تھا کہ وہ غیر اسلامی نظریات کو دعوتِ مبارزت دیتے۔ غیر ملکی نظریات کی کتب کو عربی زبان میں ترجمہ کرتے اور اُن کی بنیادوں کا مطالعہ کر کے اُن پر بھرپور وار کرتے، اس طرح کہ ان نظریات کے جان دار عناصر باقی رہ جاتے اور بےجان اور فرسودہ عناصر اپنی موت آپ مر جاتے۔ دورِ اول کے مسلمان قرآن حکیم کے اس حکم کی عملی تصویر پیش کرتے: وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷: ۸۱) آپ کہہ دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا اور باطل تو چیز ہی مٹ جانے والی ہے۔ اور: " كَذٰلِكَ

يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳ : ۱۷) اللہ تعالیٰ حق اور باطل کی اسی طرح کی مثال بیان کر رہا ہے، سو جو میل کچیل تھا وہ تو پھینک دیا جاتا ہے اور جو چیز عوام کے لیے کارآمد ہوتی ہے وہ دنیا میں باقی رہتی ہے۔

احترامِ تعلیم کے تقاضوں میں سے یہ بھی ایک اہم تقاضا ہے کہ مسلمان معاشرے میں بکثرت مجتہدین موجود ہوں جن کا فرض ہو کہ وہ غیر ملکی اور غیر اسلامی نظریات کو دعوتِ مبارزت دیں۔ اُن کا علمی و فکری انداز میں تجزیہ کریں۔ باطل و مضرت پر مبنی عناصر کا قلع قمع کریں اور کارآمد عناصر کو اپنے نظام میں سمو کر، اُن سے فائدہ اُٹھائیں۔ علم میں اسلامی اور غیر اسلامی حدود کا تعین مشکل ہے، اس کے مفید و غیر مفید اجزا پر تو بحث ہو سکتی ہے لیکن اس کی فی نفسہٖ نفی اسلام کے لیے اَنجانی بات ہے۔ اجتہاد، مسلمان معاشرے کی حیات ہے، اور تقلید اس کی موت۔ مُقلد معاشرہ ہر نئی چیز سے خائف رہتا ہے۔ اور ائمہ تقلید عوام کو جدید نظریات سے خائف رکھتے ہیں۔ مجتہد معاشرے سے ہر نیا نظریہ خائف رہتا ہے۔ اور ایسے معاشرے میں دلیل و بُرہان پر مبنی فکر ہی داخل ہو سکتی ہے۔ غیر علمی و غیر اسلامی فکر خود ہی اس کے قریب نہیں پھٹکتی اور اگر وہاں پہنچ جاتی ہے تو علمی دلائل کے مقابلے میں اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔

احترامِ تعلیم کے موضوع کی توضیح کی روشنی میں جب ہم اپنے موجودہ معاشرے پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے تقاضوں کے خلاف عمل پیرا ہیں۔ جہالت و تقلید ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ علم و اجتہاد سے ہمیں نفرت ہے۔ علم و ایمان اور مقاصدِ اسلام کا اہم ترین تقاضا ہے کہ ہم اپنی روش پر غور کریں۔ اسلام کی خاطر نہیں تو انسان کی خاطر ہی سہی، روحانیت و مادّیت میں توازن کی خاطر نہیں تو معاش کی خاطر ہی سہی۔ جہالت ام المسائل ہے۔ جب تک اس پر قابو نہیں پایا جاتا دورِ جدید کے کسی بھی مسئلے کے حل کی توقع خواب ہے اور پاکستان جیسے مسلمان معاشرے میں تعلیمی مسئلے کا حل، مقلدانہ انداز میں ہرگز ہاتھ نہیں آئے گا۔ اسے مجتہدانہ انداز میں حل کرنا ہوگا۔

قدیم و جدید نصابہائے تعلیم میں ہم آہنگی کی ضرورت

اس وقت ملک میں دو قسم کے نظامِ تعلیم رائج ہیں (۱) جدید نظامِ تعلیم، جسے حکومت نے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نافذ کر رکھا ہے (۲) قدیم مذہبی نظامِ تعلیم، جو عربی

مدارس میں رائج ہے۔ جدید نظامِ تعلیم کا مقصد ملک میں ایسے افراد پیدا کرنا ہے جو برطانوی سامراج و استعمار کے سچے جانشین کی حیثیت سے اپنے انگریز آقاؤں کی روایات کی سختی سے حفاظت و نگہداشت کر سکیں، ملکی اور اسلامی اقدار کے احیاء اور اُن کی مقبولیت کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو سکیں۔ البتہ بالواسطہ اس نظامِ تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ کو ان جدید معاشرتی اور سائنسی علوم سے روشناس کرائے جنھیں مغرب نے اپنے جدید مسائل حل کرنے کے لیے اپنے تعلیمی اداروں میں رائج کر رکھا ہے۔ قدیم مذہبی نظامِ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو زمانۂ وسطیٰ کے اس نصابِ تعلیم کو پڑھائیں جو زوالِ بغداد سے پہلے کے مسائل حل کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ سقوطِ بغداد سے اِن حالات کا تقریباً خاتمہ ہو گیا جو اِس سے قبل مسلمان ممالک میں تھے، اور تاریخی عوامل نے ماضی سے مختلف حالات پیدا کر دیے تھے۔ بدلے ہوئے حالات کا تقاضا تھا کہ نئے حالات کے پیشِ نظر نصابِ تعلیم کو نئے سرے سے مرتب کیا جاتا، لیکن چونکہ بدقسمتی سے مسلمانوں کے فکری انحطاط کی وجہ سے اُن کا سیاسی زوال وقوع پذیر ہوا تھا، اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مسئلے کی اہمیت کا پورا پورا شعور حاصل کرتے۔ چنانچہ وہ نصابِ تعلیم کو نئے تقاضوں کے مطابق ترتیب دینے میں ناکام رہے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ نصابِ تعلیم میں ایسے مضامین اور علوم کا اضافہ کیا جاتا جو بدلے ہوئے حالات سے مطابقت رکھتے، اور ان مضامین کو خارج کر دیا جاتا جو اپنی معنویت و افادیت کھو چکے تھے۔ یہی وہ تاریخی نقطہ ہے جہاں مسلمانوں کے فکری ارتقا میں جمود پیدا ہو گیا اور بہت سے وہ علوم مثلاً یونانی فلسفہ و منطق وغیرہ جنھیں سلف غیر اسلامی قرار دے چکے تھے اور بعد میں حالات کے دباؤ کی وجہ سے نصاب میں داخل کیے گئے تھے، اب عین اسلامی قرار پا گئے، اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اُن کے تقدس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن میں تبدیل و اضافہ خود اسلام میں تغیر و اضافہ سمجھا جانے لگا۔

اگرچہ تاریخی قوتوں نے مسلمانوں کے ذہنی و فکری ارتقا کو روک دیا اور اُن کا نصابِ تعلیم حالات کی مناسبت سے مکمل تعطل کا شکار ہو گیا، لیکن دوسری طرف حالات نت نئے مسائل پیدا کرتے چلے گئے اور مسلمانوں کا نصابِ تعلیم اسی تناسب سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ نت نئے تقاضوں کے مطابق جدت و ندرت پیدا ہونے کے بجائے قدامت اور رجعت بڑھتی چلی گئی۔ اسی دوران مغرب نے ایک نئے طرزِ حیات کی بنیاد رکھی، اور نئی طرزِ زندگی کے نئے حالات و مسائل حل کرنے کے لیے جدید افکار اُبھرے۔ مغرب اپنی سیاسی و اقتصادی برتری کے ساتھ اپنے مسائل اور اُن کے حل مسلمان ممالک میں لایا۔ اس طرح مغرب کے سیاسی و اقتصادی تسلط سے، اس کے مسائل اور

اُن کے حل، مسلمان ممالک پر مسلّط ہو گئے، اور مسلمانوں کا اپنا نصابِ تعلیم عملاً معطل ہو کر رہ گیا۔ مسلمانوں کا قدیم نصابِ تعلیم پس منظر میں چلا گیا اور حکومت کے بجائے پرائیویٹ معاملہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ ہمارا موجودہ دوہرا نظامِ تعلیم ان حالات کی پیداوار ہے۔
اس وقت یہ دونوں نظامِ تعلیم ہمارے ہاں رائج ہیں اور دونوں عوام کے سرمائے سے چل رہے ہیں۔ حکومت عوام سے انکم ٹیکس کے نام پر رقوم جمع کرتی ہے اور علمار زکوٰۃ (مذہبی ٹیکس) کے نام پر۔ عوام دونوں ٹیکس دینے پر مجبور ہیں۔ حکومت کی وصولی کے پیچھے پولیس اور فوج کی طاقت ہے جب کہ علمار کی وصولی کے پیچھے مذہب کی طاقت موجود ہے۔ تعلیم کے نام پر دوہرے ٹیکس کا نظام عوام الناس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے اور شاید مستقبل قریب میں اُن کے لیے دونوں ٹیکسوں کے ساتھ وفادار رہنا مشکل ہو جائے۔ اگر جلد ہی کوئی ایسا جامع نظامِ تعلیم مرتب نہ کیا گیا تو عامۃ المسلمین اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس دوہرے ٹیکس سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ خود ہی کوئی طریقہ ایجاد کر لیں۔
دونوں نظامہائے تعلیم اپنے اغراض و مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں نظامہائے تعلیم دو مختلف ذہن پیدا کر رہے ہیں۔ نقطۂ نظر کا یہ اختلاف ہمارے ہاں ذہنی، نفسیاتی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور قانونی انتشار، افتراق اور انارکی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ملک کی ترقی کے لیے یونیورسٹی کے فارغ التحصیل علمار کی طرف سے بنایا ہوا کوئی منصوبہ مدرسہ کے فارغ التحصیل علمار کے لیے لازماً تکلیف دہ ہوتا ہے۔ صوبائی اور قومی اسمبلی میں بننے والے ہر قانون کی مخالفت "مدرسہ" کا فرضِ اولین ہے۔ "یونیورسٹی" اور "مدرسہ" دو اسلحہ ساز فیکٹریوں کی طرح اپنی اپنی پیداوار میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ اسلحہ کی فراوانی کے باعث نظریاتی جنگ بلا انقطاع جاری ہے۔ دراصل اس تکلیف دہ اور افسوسناک صورتِ حال کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کوئی مستقل آئین بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اور ہمارے نظریاتی اختلافات کا سبب بھی یہی ہے، اور اسی وجہ سے ہم کسی متفقہ نظریۂ حیات اپنانے میں ناکام رہے ہیں۔
ان دو متضاد اور خود مختار نظامہائے تعلیم کی موجودگی میں کسی متحدہ قومی نقطۂ نظر کا ظہور پذیر ہونا ناممکن ہے اور ایسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا خود فریبی ہے۔ عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی بہت سے ایسے معاشرتی اور اقتصادی قوانین کی "مدرسہ" کی طرف سے شدید مذمت ہو چکی ہے اور مستقبل میں کسی بھی یک طرفہ قانون سازی کا یہی حشر ہوگا۔ اس لئے مدارس کی تعداد اور ان کی پیداوار کی مقدار کا سوال نہیں اصل مسئلہ اس روایتی مقام کا ہے جو انہیں معاشرے میں حاصل ہے اور جس کے زور پر وہ جب چاہتے ہیں حالات کو اپنی موافقت میں بدل لیتے ہیں اور زندگی کے

کسی بھی شعبے میں نافذ ہونے والی اصلاحات کے خلاف مہم چلا بیٹھتے ہیں۔
مسلسل نظریاتی اختلاف و تصادم نے قوم کو اخلاقی طور پر بالکل مفلوج کر دیا ہے۔ منافقت، دھوکے بازی اور بددیانتی وغیرہ کا جواز اسی صورت کا نتیجہ ہیں، کیونکہ ہر فریق اپنے مدِمقابل کے خلاف جنگ میں ہر اقدام روا رکھتا ہے، مثلاً ایک ڈاکٹر جو حکومت کی ملازمت کی وجہ سے حکومت کی طے کردہ خاندانی منصوبہ بندی پر دن رات عمل کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ مذہبی وابستگی کی بنا پر اس اسکیم سے نفرت کرتا ہے۔ کیونکہ ہر جمعے کے خطبے میں وہ خاندانی منصوبہ بندی کو اللہ کے خلاف بغاوت اور اُس کے دین سے غداری ہونے کا وعظ سنتا رہتا ہے۔ اسی طرح بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور دوسرے تجارتی و اقتصادی اداروں کے ملازمین کے دل و دماغ دو حصوں میں منقسم ہیں، ایک طرف وہ روٹی کے لیے ملازمت اور اُس کی ذمّے داریاں نباہتے ہیں، دوسری طرف اپنے دل ہی دل میں اپنی ملازمت سے نفرت کرتے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے معاشرے میں اضطراب و بے چینی کے سوا اور کسی چیز کو فروغ حاصل نہ ہوگا۔
ان وجوہ کی بنا پر بلا خوف لومۃ لائم ہمارا خیال ہے کہ دونوں نظام ہائے تعلیم کی موجودگی میں، یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں کوئی اصلاح، اساتذہ کے عہدے اور اُن کی فلاح کے لیے بہتر وعدے، تعلیمی پالیسیوں کی ترتیبِ نو، کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ جب تک دونوں نظاموں کے مکمل ادغام کی طرف توجہ نہیں دی جاتی نظریاتی اتحاد اور قومی نقطۂ نظر کا پیدا ہونا محال ہے۔ مدارس کو یونیورسٹی سے الگ رکھ کر دو نظاموں کی "پیداوار" کے ذہنوں میں ایک خلا پیدا کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے خائف رہتے ہیں۔ یونیورسٹی کی پیداوار کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ اُن کی ڈگریاں بالکل بے سود ہیں، کیونکہ اصل علم تو دین کا علم ہے جس سے وہ محروم ہیں اور مدرسے کی پیداوار کے دل میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ قدیم زمانے کے علوم پر دسترس حاصل کرنا بالکل بے سود ہے، کیونکہ اصل علوم تو وہ ہیں جو مغرب نے پیدا کیے اور جو ہمارے روزمرّہ کے حالات و مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔
یہ عام نظریہ کہ جدید تعلیم کے فروغ سے نظامِ مدرسہ خود اپنی موت مر جائے گا، حقیقت پر مبنی نہیں۔ ہمارے سامنے عہدِ حاضر کی دو مثالیں موجود ہیں۔ ایک یورپ و امریکا کی اور دوسرے کمیونسٹ ممالک کی۔ یورپ نے صدیاں لگانے کے بعد اس مسئلے کا حل یہ سوچا کہ حکومت اور مذہب کو الگ الگ کر دیا۔ کمیونسٹ دنیا نے سرے سے دین کو ختم کر کے اس مسئلے کا حل تلاش کیا۔ پاکستان عصرِ حاضر کی تیز رفتاری میں نہ تو یورپ کی طرح صدیوں انتظار کر سکتا ہے، نہ مدرسے اور مسجد کو چھوڑ سکتا ہے۔ ہمیں اپنے مخصوص حالات کی بنا پر اپنا مسئلہ آزادانہ اجتہاد سے خود ہی حل کرنا ہے

اور اُس کا بہترین حل یہ ہے کہ دونوں نظاموں میں مکمل ادغام کردیا جائے، دورنگی ختم کرکے یک رنگی پیدا کردی جائے۔

دونوں نظاموں کے ادغام کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دونوں نظاموں کا نچوڑ لے کر اس طرح ملا دیا جائے کہ وہ یک جان ہوجائیں۔ ہمارے خیال میں یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ہے کہ ایسا کرنے سے خواہ مخواہ طلبہ کو نصاب کے بوجھ تلے دبایا جائے گا، کیونکہ ادغام کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دونوں نظاموں کی ابتدا، ارتقا اور پوری تاریخ ایک دوسرے کے ساتھ رکھ دی جائے، بلکہ اس سے مراد یہ ہوگی کہ دونوں نظاموں کے علوم و مضامین کی جانچ پڑتال کی جائے، انہیں چھانٹا پھٹکا جائے اور پورے تجزیے کے بعد ایسے عناصر کو چُن چُن کر جمع کیا جائے جو مسائلِ حاضرہ اور مقتضیاتِ زمانہ سے پوری مطابقت اور ہمارے اقتصادی، معاشی، قانونی اور سیاسی مسائل کے ساتھ وابستگی رکھتے ہوں گے۔ ماضی اور حال کے علوم کی تاریخ ابتدا، ترقی وارتقا کو چھوڑ کر تصوّرات، خیالات اور نظریات و فلسفہ اپنا لیا جائے۔

موجودہ اختلاف و تصادم کا سب سے دل چسپ پہلو یہ ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں تو یہ بڑا متحرک اور جان دار ہے، لیکن بعض دوسرے شعبوں میں نہایت جامد اور بے جان۔ خوں ریز تصادم عموماً معاشرتی علوم میں ہورہا ہے اور طبعی علوم میں اس کا وجود بہت کم ہے۔ سائنسی علوم نصابِ مدرسہ میں داخل نہیں، غالباً اسی لیے مدرسے کی پیداوار نہ تو ان علوم کے اس ماضی سے پوری طرح آگاہ ہے جس میں مسلمان سائنس دانوں اور فلاسفہ نے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، اور نہ ہی اس کے حال سے بخوبی واقف ہے جس میں مغرب نے حیرت ناک ترقی کی ہے۔ مغرب نے تو صدرِ اسلام اور ازمنۂ وسطیٰ کے مسلم سائنس دانوں کے افکار و نظریات پہلے ہی اپنا لیے ہیں اور مغربی سائنس دانوں نے ان افکار و نظریات کو مزید ترقی دے کر اپنے تصوّرات و افکار میں جگہ دے دی ہے، لہٰذا اب زمانۂ قدیم کے سائنس دانوں کی تاریخِ پیدائش و وفات اور اُن کی فروعی تفصیلات بتانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ مدرسہ بھی اس حقیقت سے واقف ہوچکا ہے۔ چنانچہ ہمارے علماء سنجیدگی سے غور کررہے ہیں کہ یونانی فلسفہ و حکمت جو کبھی ضرورت کے تحت مسلمانوں نے اپنائے تھے، اگر اُن کی جگہ آج وہ مغربی علوم و افکار و تجربات لے لیں جو اسلام کے لیے قوت فراہم کریں تو یہ تبدیلی نہایت خوش آیند ہوگی۔

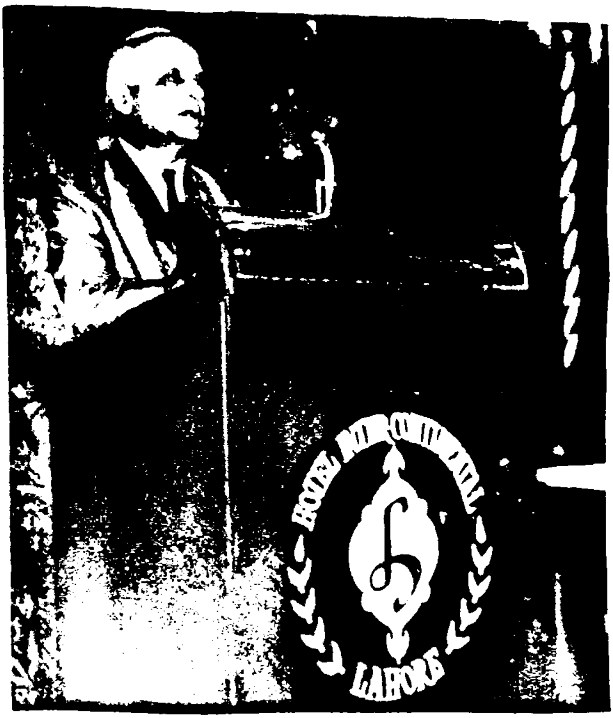
عملی ادغام کے دائرے کو محدود کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت صرف تین ایسے بنیادی موضوعات ہیں جن کا ادغام فوری طور پر نہایت ضروری ہے۔ ہم بقیہ علوم و موضوعات کی اہمیت کے منکر نہیں، تاہم اگر ان تین علوم و موضوعات کے بارے میں جو کچھ مواد نظامِ مدرسہ میں موجود ہے

اُسے انتہائی مہارت اور کامیابی کے ساتھ یونیورسٹی نصاب میں سمو لیا جائے تو نظام مدرسہ میں دینیات ہی باقی رہ جائے گی۔ یہ تین مضامین، قانون، معاشیات اور سیاسیات ہیں۔ قیامِ پاکستان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ "مسٹر" اور "مولوی" کی لڑائی عام طور پر ان ہی تین میدانوں میں ہوتی رہی ہے۔ عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی، بینکنگ، انشورنش، حاکمیتِ اعلا کا تصور وغیرہ مسائل اِنھی مضامین کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ انتہائی حکمت، حزم و مہارت اور محنت سے ان مضامین سے متعلق تفاصیل اسلامی علوم سے اس خوبی سے جمع کی جائیں کہ کوئی قابلِ اعتنا چیز باقی نہ رہ جائے، اور یہ انتخاب یونیورسٹی نصاب میں حسن و خوبی کے ساتھ سمو دیا جائے۔

طریقِ کار یہ ہو کہ قانون، معاشیات اور سیاسیات کو باقی تمام مضامین پر ترجیح دی جائے اور کالج کے بقیہ مضامین میں ان مضامین کو خصوصی اہمیت حاصل ہو۔ ان مضامین کے موجودہ نصاب کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ان میں اسلامی نقطۂ نظر کے لیے پوری گنجائش موجود ہو۔ ان مضامین کی تدریس کے لیے خاص طور پر اہتمام کیا جائے اور ملک کے ذہین اور ہونہار طلبہ کے لیے وظائف وغیرہ کی کافی کشش مہیا کی جائے۔ وہ طلبہ جو قانون، معاشیات اور سیاسیات میں تخصیص حاصل کرنا چاہیں اُن کے لیے لازمی ہو کہ وہ کالج کے پہلے سال ہی ان مضامین کو اپنا لیں اور بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کر کے ان میں مہارتِ تامہ حاصل کریں۔ اس طرح ہمارے مستقبل کے قانون داں، ماہرینِ معاشیات و سیاسیات اپنی نظیر آپ ہوں گے، وہ سب سے زیادہ قابل، اہل اور ثقہ ماہرین ہوں گے، اور سب سے زیادہ اہلیت رکھتے ہوں گے کہ اسلام کو دورِ جدید میں ایک متحرک اور قابلِ عمل دین کی حیثیت سے پیش کر سکیں۔ مستقبل کے یہ ماہرین اس مقام پر فائز ہوں گے کہ "مدرسہ اور یونیورسٹی" دونوں کے فاضلین ان کی بات پر توجہ دے سکیں۔ اس طرح پاکستان کو وہ بلند مقام حاصل ہوگا کہ نہ صرف مسلم دنیا بلکہ غیر اسلامی دنیا بھی پاکستان سے رہنمائی طلب کرنے کی ضرورت محسوس کرے گی۔



جسٹس سجاد احمد جان (مقرر)، جسٹس ایس۔اے۔رحمٰن



صدر مجلس
جسٹس ایس۔اے۔رحمٰن
خطاب کر رہے ہیں



دائیں طرف سے
حکیم محمد سعید
ڈاکٹر انور اقبال قریشی
جسٹس سجاد احمد جان

آغاز اجلاس سے قبل



دائیں طرف سے
جسٹس سجاد احمد جان
جسٹس ایس اے رحمٰن
حکیم محمد سعید

احترامِ حقوق العباد

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمد سعید

مقالہ : جناب محترم جسٹس سجاد احمد جان

کلماتِ صدارت : جناب محترم جسٹس ایس۔اے۔رحمٰن

شامِ ہمدرد، لاہور

۶۔اپریل ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

قرآنِ حکیم نے انسان کا مقصدِ زندگی یہ بتایا ہے

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ٥

یعنی " اور میں نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے سوا کسی اور مقصد کے لیے پیدا نہیں کیا"

اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ انسان کی پوری زندگی عبادت کے دائرے میں آتی ہے۔ صرف نماز روزہ ہی عبادت نہیں ہے بلکہ مسلمان کا ہر کام عبادت ہو سکتا ہے اگر وہ عبادت کی نیت سے کیا جائے اور حدود اللہ کے اندر رہ کر انجام دیا جائے۔ اور جذبۂ اطاعتِ الٰہی کے ساتھ انجام دیا جائے۔ اسلام میں عبادت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں حقوق اللہ ہی نہیں حقوق العباد بھی آجاتے ہیں اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے حقوق العباد کی پوچھ گچھ ہوگی۔ اسلام نے دین کا جو تصوّر ہمیں عطا کیا ہے اُس میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور کوئی مسلمان تارک الدُّنیا ہو کر اللہ کے حضور میں سُرخ رُو نہیں ہو سکتا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں رہو اور تمام دنیوی علائق کے باوجود اللہ سے رشتہ نہ توڑو، بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے اور اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرتے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلو۔ گوشہ نشین ہو کر بُرائیوں سے بچنے کے مقابلے میں فعّال زندگی گزار کر بدی سے محفوظ رہنا زیادہ مستحسن ہے۔ حقوق اللہ کے مقابلے حقوق العباد کی فہرست بہت طویل ہے۔ ماں باپ کے حقوق، اُستاد اور شاگرد کے حقوق، اجیر اور آجر کے حقوق، عزیزوں اور دوستوں کے حقوق، پڑوسیوں اور محلّے والوں کے حقوق، حاکم اور محکوم کے حقوق، بیوی بچّوں کے حقوق مسلمانوں اور غیر مسلموں کے حقوق، دشمنوں کے حقوق حتّیٰ کہ جانوروں کے حقوق۔ غرض یہ کہ اللہ کے بندوں کے حقوق کیفیت اور کمیّت دونوں کے لحاظ سے بہت زیادہ ہیں اور اُن کے صحیح احساس پر معاشرے کی فلاح و نجات کا انحصار ہے۔ حقوق العباد کی ادائی کے بغیر کسی معاشرے کی خوش حالی کا تصوّر محال ہے۔ جس معاشرے کے افراد دوسروں کے حقوق کا لحاظ نہ رکھتے ہوں اور اپنے حقوق ہر وقت یاد رکھتے ہوں وہ معاشرہ کبھی متوازن ارتقا کی توقع نہیں کر سکتا۔ دوسروں کے حقوق میرے فرائض ہیں اور میرے حقوق دوسروں کے فرائض۔ اس لیے ہر شخص اگر اپنا فرض ادا کرے تو ہر شخص کے حقوق محفوظ ہوں گے اور حقوق کی جنگ کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ حقوق کی جنگ صرف غیر متوازن معاشرے میں ہی ہو سکتی

ہے۔ آج ہم اسی عدم توازن کا شکار ہیں۔ حقوق اللہ کے ساتھ ہم نے حقوق العباد کا احترام بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ صرف اپنے حقوق کا احترام کرانا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے معاشرے سے احترام غائب ہوگیا ہے۔

ایک بار حضورؐ نے صحابہ سے دریافت فرمایا: تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟

صحابہ نے عرض کیا کہ وہ شخص جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو!

حضورؐ نے فرمایا کہ: نہیں، دراصل مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن خدا کے حضور بہت سی عبادتیں لے کر حاضر ہوگا، لیکن اُس کے ذمّے لوگوں کے حقوق ہوں گے، لوگ آئیں گے اور اُس سے اپنے حقوق طلب کریں گے اور اس شخص کی عبادتوں کا اجر اہلِ حقوق کو دے دیا جائے گا اور جب اس کی عبادتیں ختم ہو جائیں گی تو اہلِ حقوق کے گناہ اس کے سر پر منڈھ دیے جائیں گے اور اُسے جہنّم میں ڈال دیا جائے گا۔

کاش ہم حقوق العباد کا احترام کرنے کی عادت ڈالیں اور ایسی مفلسی سے اللہ کی پناہ مانگیں۔

احترامِ حقوق العباد پر کلام کرنے کے لیے آج "شامِ ہمدرد" میں عدلیۂ پاکستان کی دو عظیم و نام ور شخصیتیں ہیں۔

جناب جسٹس ایس۔ اے رحمٰن صاحب (سابق چیف جسٹس پاکستان) کا شمار پاکستان کی اُن عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے جو اصول، حق و انصاف اور قانون و عدل کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔ ان کے عمل و کردار نے اور ان کی روشِ حق نے پاکستان میں تعمیرِ اذہان کا اساسی کام کیا ہے جو اس دَور میں پاکستان کی سب سے بڑی حاجت ہے کہ جب غیر ملکی اور غیر اسلامی نظریات پاکستانی نظریات و ثقافت کو پامال کر رہے ہیں، جسٹس رحمٰن صاحب جیسی شخصیتیں روشنی کا مینار ہیں۔ ہم ان پر فخر کرتے ہیں اور ان کو رہنما تسلیم کرتے ہیں۔

آج شامِ ہمدرد کے مہمان مقرر پاکستان کی سپریم کورٹ کے فاضل و عادل جج جناب جسٹس سجاد احمد جان صاحب ہیں۔ اپنے اعلا کردار، علم و فضل، فہم و فراست اور عدل و انصاف کی وجہ سے پاکستان کی معروف شخصیت ہیں اور تعریف و تعارف سے بالاتر۔ پاکستان میں جو عظیم شخصیتیں غیر اسلامی شعار سے برسرِ پیکار ہیں اُن میں جسٹس سجاد احمد جان صاحب بھی ہیں۔ حقوق و فرائض کے درمیان توازن و تناسب پیدا کرنے کی جدوجہد میں جناب جسٹس سجاد احمد جان صاحب نے اہم کام کیا ہے۔ عدلیۂ پاکستان کے مرتبے کو بلند تر رکھنے میں اِن کا نام بڑے فخر سے لیا جاتا ہے۔

شامِ ہمدرد اِن دو وجودوں سے مفتخر و معزز ہے۔

جناب محترم جسٹس سجاد احمد جان

جج، سپریم کورٹ آف پاکستان

ایک اعلا اور مقتدر سطح پر شامِ ہمدرد کی محفلیں ہمارے معاشرے کے گوناگوں مسائل پر غور و فکر کا مرکز بن چکی ہیں۔ اس پلیٹ فارم سے کئی ایک ادبی معاشرتی اور اقتصادی موضوعات پر احساس رہنمائی، ہدایت اور بصیرت میسّر آئی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ آج شام آپ سے میری گفتگو اس محفل کے معیاری تقاضوں کو پورا کر سکے۔ موضوعِ گفتگو حقوق العباد ہے جو ذہنوں میں پیوست ہو کر ایک عام جذبہ بن جائے تو معاشرے میں از خود توازن اور سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر میری یہ کوشش اس جذبے کو اُجاگر کرتے ہوئے آپ کو دعوتِ فکر و عمل دے سکے تو میں اسے بار آور سمجھوں گا، لیکن اگر آپ مجھ سے کسی علمی اور تحقیقی مقالے کی توقع لے کر آئے ہیں تو مجھے متنبہ کر دینا چاہیے کہ آپ کو مایوسی ہو گی۔

کسی بھی مضمون پر تحقیق و تدقیق، تاریخ کی ورق گردانی اور فلسفیانہ بحث و تمحیص کسی مفید مقصد کی حامل ہو تو بڑی مستحسن بات ہے۔ ایک مقصد مقالہ نگار کے ذہنی اور ادبی ذوق کی تسکین ہو سکتا ہے، لیکن اس وقت ملّتِ پاکستانیہ بد قسمتی سے ایسے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے، ایک ایسے نقطۂ بحران پر پہنچ چکی ہے کہ محض ذہنی عیاشی کے لیے کوئی کام بھی غیر محل نظر آتا ہے۔ وقت کی ضرورت یہ ہے کہ قومی اور مجلسی زندگی کا ہر لمحہ نچوڑ کر اس کی مقدّم ضروریات کی تکمیل میں صرف کیا جائے تاکہ قوم کی صحیح منزل کی پہچان کے ساتھ اُسے اُس کے قریب تر لایا جا سکے۔

تاریخی اعتبار سے بنی نوع انسان نے حقوق العباد کے تعیّن اور حصول میں جو ارتقائی منازل طے کی ہیں وہ فی الحقیقت مختلف ادوار میں انسانی تہذیب و تمدّن کے ارتقا کی دل چسپ داستان ہے جس کا تفصیلی تذکرہ اس مختصر صحبت میں ممکن نہیں۔ ان حقوق میں کمی اور بیشی، قطع و برید ہر ملک اور معاشرے کے سیاسی اور معاشرتی حالات اور مجبوریوں پر مبنی رہی ہے لیکن کچھ حقوق ایسے ہیں جنھیں انسان کے فطری حقوق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ معاشرے کا اپنا وجود انسان کے انھی حقوق کے تحفظ کا رہینِ منّت ہے، اور یہ تحفظ معاشرے کا ایک مقدّس فریضہ ہے جس سے انحراف اور جس کی پامالی شرفِ انسانیت کی توہین ہے۔

معاشرتی نظام اور سیاسی ادارے اس بنیادی نظریے پر قائم ہیں کہ ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ آبرومندانہ زندگی بسر کرے، زندگی کی تگ و دو میں حصولِ شادمانی کے لیے اپنی جائز خواہشات

کی تکمیل کر سکے اور اس کے لیے اپنے ذرائع، محنت اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ ہر مہذب حکومت کا یہ اوّلین فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی جان و مال، عزّت اور آزادی کی حفاظت کرتے ہوئے اُن کے اس حق کے حصول میں حتی الامکان راہیں ہموار کرے۔

اس اہم فریضے کی ادائی میں قانون کی بالادستی معاشرے کے آئینی نظام میں ایک مثبت صورت اختیار کر لیتی ہے۔ افراد کی حکومت نہیں بلکہ صرف قانون کی حکومت ہی اس امر کی ضامن ہو سکتی ہے کہ کسی بھی سطح پر بغیر کسی قانونی مصلحت یا جواز کے شہریوں کے نجی اور سماجی حقوق میں مداخلت نہ ہونے پائے۔ قانون کے درست اور واضح احکام کے بغیر کسی بھی فرد کی شخصی آزادی اور جان و مال کو گزند نہ لگنے پائے۔ یہ حقوق کسی ایک فرد یا گروہ کی جانب سے کسی دوسرے فرد یا گروہ کے لیے عطیہ یا ہدیہ نہیں ہیں بلکہ یہ خالقِ کائنات کی جانب سے انسانی تخلیق کا لازمی نتیجہ اور اُس کا ثمر ہیں۔

بنیادی حقوق

ایک مشہور مفکر ٹام پین نے ۱۷۹۵ء میں اپنی کتاب First Principles of Government (حکومت کے اوّلین اصول) میں لکھا ہے:

"انسانی حقوق انسان کے لیے کسی دوسرے انسان کا عطیہ نہیں قرار دیے جا سکتے۔ انسان کو اپنی تخلیق کے سوا ان حقوق کا کوئی اور منبع یا ماخذ بھی معلوم نہیں ہو سکا اس لیے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انسان کی اپنی تخلیق ہی ان حقوق کی موجد ہے اس لیے ہر ایک انسان ان حقوق میں برابر کا حق دار ہے۔"

حقوق میں مساوات کا یہ اصول جو ٹام پین نے بیان کیا ہے بالکل سادہ اور واضح ہے اور جو آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ ایک انسان اپنے حقوق کو درست طور پر سمجھ لینے کے بعد ہی اپنے فرائض کی بھی پہچان کر سکتا ہے۔ اگر سب انسانوں کے حقوق برابر ہیں تو ہر انسان کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس کے حقوق کی نگہداشت کی بہترین ضمانت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کی سختی سے حفاظت کرے۔

انسان کے فطری حقوق کو جب ملکی آئین کی کفالت حاصل ہو جائے تو انھیں قانونی اصطلاح میں بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کہا جاتا ہے، کیوں کہ وہ ملک کے اعلا ترین قانون یعنی آئین کی رُو سے انتظامیہ اور قانون ساز اداروں کی دستبرد سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان حقوق کا تعطل یا ان میں ترمیم آئین میں مندرج طریق کار سے ہو سکتی ہے۔ اگرچہ ترقی پسند قانونی حلقوں میں ان حقوق کے ہمہ گیر تقدّس کے باعث یہ اثر غالب ہوتا جا رہا ہے کہ یہ بنیادی حقوق ایسے بنیادی ہیں کہ آئین ساز ادارے بھی ان میں ترمیم یا ردّ و بدل کے مجاز نہیں۔

آئین میں ایک مدرسۂ فکر یہ بھی ہے کہ انسان کے فطری حقوق کو کسی آئینی کفالت کی ضرورت نہیں اس لیے کہ وہ بھی قانون کی دسترس سے بالاتر ہیں۔ پھول کو پھول کہنے سے اس کی صفات کی نشاندہی ہو جاتی ہے، لیکن اسے پھول نہ بھی کہا جائے یا کسی اور نام سے پکارا جائے تو اس کی صفات میں کمی پیدا نہیں ہوتی۔ جذباتی اعتبار سے یہ خیال شاید درست ہو لیکن بنیادی حقوق کو اگر صراحت کے ساتھ آئین میں درج نہ کیا جائے تو اُن کے بارے میں ایک الجھن اور غیر یقینی پیدا ہو سکتی ہے۔ جس کو سلجھانے کے لیے عدلیہ کو مشکلات پیش آسکتی ہیں۔

ایک امریکن جج مسٹر جسٹس جیفرسن نے ان حقوق کو آئینی کفالت میں لینے کی ضرورت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"بنیادی حقوق کو آئین کی حفاظت میں لینے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ ان حقوق کو سیاسی کشمکش سے آزاد رکھا جائے، انھیں اکثریت اور اقلیت کی سیاسی پارٹی بازی سے مامون کر دیا جائے اور انتظامیہ اور قانون سازاداروں کی زد سے بچایا جائے تاکہ عدلیہ اطمینان کے ساتھ انھیں آئین کے مسلّمہ اصول تسلیم کرتے ہوئے ان پر عمل کرنے اور عمل کرانے کی مجاز ہو سکے۔"

انسان کے یہ فطری حقوق ایسے ہیں جنھیں ووٹوں کا محتاج نہیں بنایا جاسکتا اور نہ ہی اس کا انحصار انتخابی نتائج پر رکھا جاسکتا ہے۔ مسٹر جسٹس جیفرسن کا یہ بیان ایک عام کلیہ اور اصول کی وضاحت کرتا ہے، لیکن یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ملکی سلامتی اور قومی بہبود کے لیے کسی بھی ہوشمند ملک میں قومی ضرورتوں اور مجبوریوں کے پیشِ نظر ان حقوق پر خوشی سے جائز پابندیاں قبول کر لی جاتی ہیں۔ افراد کے نجی مفادات ملک کی سلامتی اور قومی مفادات کے ساتھ اس طرح سے منسلک ہیں کہ انھیں الگ سمجھ کر محض ان کی حفاظت اور بچاؤ کی کوشش کوتاہ بینی ہے۔ کسی کے لیے بھی یہ خیال کرنا غلط اندیشی ہے کہ سیلاب سبھی کچھ بہا کر لے جائے ممکن ہیں اور میری پونجی اس کی زد سے محفوظ رہیں گے۔ علامہ اقبال کے حکیمانہ ارشاد کے مطابق

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

قوموں میں انقلابات آتے ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ کسی قوم کی بنیادی اور اساسی قدروں کی پامالی ایک مجرمانہ غفلت اور خیانت ہے۔ والٹر لپمین (WALTER LIPMAN) جو امریکا کے مشہور صحافی اور دانشور ہیں، انھوں نے ان اقدار کو غیر متبدل قرار دیتے ہوئے ایک بڑی اچھوتی دلیل پیش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی بھی مملکت میں ایسی اقدار صرف اس کے موجودہ

باشندوں کا ورثہ نہیں ہیں کہ وہ ان میں اپنی مرضی یا ہوا کے رُخ کے مطابق ردّ و بدل کرتے رہیں۔ یہ سیاسی اقدار سابقہ، موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کی مشترکہ امانت ہیں جنھیں ملک کے سیاسی وجود سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مملکتِ خداداد پاکستان کا وجود نظریاتی اقدار کا مرہونِ منت ہے جہاں خداوند برتر کی اعلا حاکمیت کے زیرِ تسلط اس کے تمام باشندوں کو اپنے منتخب شدہ نمائندوں کی وساطت سے منصبِ خلافت سونپا گیا ہے تاکہ وہ نظامِ سلطنت اور نظامِ زندگی خداوند تعالیٰ کے احکام کے مطابق مرتب کر سکیں، جس میں حقوق اللہ ضروری ہیں، لیکن حقوق العباد اُن سے بھی زیادہ ضروری ہیں اور جن کا احترام اس نظام کا ایک بنیادی اصول ہے۔ والٹر لیمین کا مندرجہ بالا قول خصوصی طور پر قابلِ پذیرائی ہے، لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ حقوق کے اس درجہ فطری اور بنیادی ہونے کے باوجود یہ طوفانوں کی لپیٹ سے محفوظ نہیں رہے ہیں۔ انھیں ہمیشہ سلطانی جبروت، آمرانہ استبداد اور بسا اوقات غیر منصفانہ اور غیر متوازن معاشرے کی چیرہ دستیوں کا شکار ہونا پڑا ہے، لیکن تاریخِ عالم سے یہ سبق ملتا ہے کہ ان حقوق میں قدرتی طور پر ایک ایسی لچک اور قوتِ مدافعت موجود ہے کہ انھیں جتنے زور سے دبایا جائے وہ دباؤ سے نکل کر اتنے ہی زور سے اُبھر آتے ہیں۔ ان حقوق کی تحقیر اور اُن کا استرداد معاشرے کا سکون اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ اس کے برعکس اُن کا احترام معاشرے میں طمانیت اور توازن قائم رکھنے کا سب سے بڑا موجب ہے۔

منشورِ اقوامِ متحدہ

۱۹۴۸ء میں انسانی فکر نے صدیوں کی ذہنی آویزش اور سیاسی کشمکش کے بعد اقوامِ متحدہ کی وساطت سے ایک نسخۂ ہوش مرتب کیا تھا جسے بنیادی حقوق کے منشور کا نام دیا گیا ہے۔ موجودہ وقت میں یہ منشور نہ صرف انسانی اقدار کا چارٹر ہے بلکہ بین الاقوامی قوانین کی دستاویزی اساس اور انسانیت کے ضمیر کی آواز سمجھا جاتا ہے۔ اس منشور میں جو انسانی حقوق درج ہیں ان کی فہرست خاصی طویل ہے، لیکن ان میں سے بیشتر جنھیں انسانیت کی مشترکہ اقدار کہنا چاہیے تقریباً ہر مہذب ملک کے آئینی دستور کا جزو بن چکی ہیں، زندہ رہنے کا حق انسان کا افضل ترین حق ہے جس کی حرمت صرف طبعی یا حادثاتی موت کی تابع ہے۔ لیکن محض زندہ رہنے اور جینے میں بہت فرق ہے۔ اس لیے جینے کا حق ان تمام دیگر بنیادی حقوق سے مربوط ہے جو انسانی زندگی کو صحیح اقدار سے مزین کر کے اُسے بامقصد اور پُرکشش بنا دیتی ہیں، چنانچہ اقوامِ متحدہ کے منشور کی دفعہ اوّل میں زندگی کے اس بلند شعور کی ترجمانی اس طور پر کی گئی ہے۔ تمام انسان آزاد پیدا کیے گئے ہیں، وہ بلاتفریق نسل خون و رنگ انسانی شرف اور حقوق میں بالکل برابر ہیں۔ انھیں قدرت نے ضمیر اور عقل عطا فرمائی ہے تاکہ وہ جذبۂ اخوت اور ہمدردی کے ساتھ آپس میں برتاؤ کریں۔ منشور کی اس شق میں انسانی

زندگی کے جس سب سے بڑے جوہر کی نشاندہی کی گئی ہے وہ انسان کا شخصی وقار اور اُس کی عزتِ نفس ہے۔ وہ عالمی ورثہ حقوق میں سب کے ساتھ برابر کا شریک اور حصّہ دار ہے۔ لیکن جہاں حقوق کا مطالبہ جائز ہے، وہاں متوازی فرائض سے غفلت اور بے اعتنائی اس استحقاق کو ضائع کر دیتی ہے۔ میں اپنے معاشرے سے جینے کا حق طلب کرتا ہوں تو معاشرے کے ہر فرد کے لیے مجھے ایسا ہی حق تسلیم کرنا پڑے گا۔ حقوق اور فرائض زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ دونوں کی ہم آہنگی اور متوازن چال ہی اس گاڑی کی سلامتی اور روانی کی ضمانت دے سکتی ہے۔ اگر معاشرے کے افراد اپنے حقوق کے ساتھ اپنے فرائض سے آگاہ ہوں اور طلبی حقوق میں فرائض کی ادائی سے غفلت نہ برتیں تو معاشرے میں قیامِ امن بہت آسان ہو جاتا، مناقشت اور چپقلش کے اسباب کم ہو جاتے ہیں۔ یورپ کے ایک عظیم مفکّر ہابز کے قول کے مطابق قیامِ امن انسان کا ایک ایسا واحد بنیادی حق ہے جس کے لیے وہ اپنے تمام حقوق معاشرے کی بہبود کے تابع بنا دیتا ہے۔ قانون اور امن شکنی کا لازمی نتیجہ سماجی بے اطمینانی ہے۔ بدامنی اور بے یقینی کے ماحول میں زندگی اور اُس کی جاذبیت پھیکی اور بے کیف ہو جاتی ہے۔

امن کو برباد کر کے قانون شکنی کے سہارے کسی حق کا مطالبہ یا اُس کے حصول کی کوشش خود اپنا مقصد ضائع کر دیتی ہے۔ کوئی بھی مطالبہ اگر قانون اور نظم و نسق کی دیواریں پھاند کر منوانے کی کوشش کی جائے یا اہل یا مفروضہ حق کو زبردستی چھین لیا جائے تو اس عمل سے اس کے واپس چھین جانے کا امکان ہوتا ہے اور ایک مفسدانہ چکّر چل پڑتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس معاشرے کا وطیرہ بن کر اُس کے امن اور اُس کی خوش حالی کو تباہ کر دیتا ہے۔

مجھے ایک فلسفی بزرگ کا واقعہ یاد آ رہا ہے جس نے حقوق کے ہنگامی اور بے لگام مطالبے کی خطرناک منطق کو ایک نوجوان کے ساتھ اپنے مکالمے کے دوران ایک جُملے میں بیان کر دیا تھا۔ یہ نوجوان ہاتھ میں چھڑی گھماتا سڑک پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ بالمقابل ان فلسفی کا گزر ہوا اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ اس نوجوان کی چھڑی کی ضرب سے بال بال بچ گئے۔ انھوں نے ذرا کرخت لہجے میں کہا "برخوردار ہوش سے چلو اور اس بے نیازی سے اپنی چھڑی نہ گھماؤ"۔ نوجوان برہم ہو گیا اور سرمستی میں بولا: کیا مجھے سڑک پر چلنے اور اپنی چھڑی گھمانے کا حق حاصل نہیں ہے"۔ فلسفی بزرگ نے بڑے نرم انداز میں جواب دیا: "ہاں ضرور ہے لیکن اس حد تک جہاں میری ناک اس حق کے استعمال کی زد میں نہیں آتی"۔ غنیمت ہے کہ یہ بات نوجوان کی سمجھ میں آ گئی۔ اور وہ مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔

میں گزارش کر چکا ہوں کہ اقوامِ متحدہ کے منشور میں مندرج انسانی حقوق کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اس کے عنوانات دہرانے سے ہی ان کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حفاظتِ جان کا حق

شخصی آزادی، حقِ جائیداد، قانون کے تحت یکساں سلوک اور حفاظت کا حق، غلامی کی ممانعت، نقل و حرکت کی آزادی، خط و کتابت میں عدم مداخلت کا حق، قومیت اور شادی کا حق، جب تک الزام ثابت نہ ہو ملزم کو بے قصور تصوّر کرنے کا حق، ضمیر اور مذہب کی آزادی، اظہارِ خیال اور اجتماعات میں شرکت کی آزادی۔ اس میں سے کسی ایک پر تفصیلی بحث ایک ضخیم کتاب کی صورت اختیار کر سکتی ہے، لیکن شخصی آزادی اور اس کے ذیلی حقوق کے بارے میں پریشانئ خیالات کو سلجھانے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک بیّن حد اس فلسفی بزرگ کے اس بے ساختہ جملے سے واضح ہوتی ہے جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شخصی آزادی، آزادئ افکار و گفتار اور آزادئ عمل انسان کا بنیادی حق ہے، لیکن کسی بھی شائستہ اور منظم معاشرے میں یہ آزادی مکمل اور مطلق کیفیت اختیار نہیں کر سکتی۔ سوسائٹی کے کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں، نہ ہی وہ اس بات کی مجاز ہے کہ اپنی آزادی کے زعم میں وہ سوسائٹی کی تخریب اور بربادی کا موجب بن جائے۔ سوسائٹی کو برباد کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ جیسے ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا ہوا آدمی اس درخت کا تنا کاٹنا شروع کر دے۔ درخت اور وہ خود دھڑام سے نیچے گر جائیں گے۔ آزادئ نقل و حرکت کی یہ منشا نہیں کہ انسان ایک شترِ بے مہار کی طرح جہاں چاہے مداخلتِ بے جا کا مرتکب ہو جائے۔ آزادئ ضمیر کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کو بے ضمیر سمجھتے ہوئے ان کی عزت اور ناموس پر کیچڑ پھینکا جائے۔ حق اجتماع سے یہ حق نہیں پہنچتا کہ جمع ہو کر بلوہ اور ہنگامہ آرائی کی جائے۔ آزادئ اظہارِ خیال سے یہ مراد نہیں کہ فحش گوئی کا ارتکاب کیا جائے۔

کسی بھی انسان کی شخصی آزادی کو جُرم کی پاداش کے بغیر سلب نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن موجودہ دور کی ہر ریاست نے مخصوص حالات کی مجبوری کے تحت قانون نظر بندی، امتناعی حراست (Law of Preventive Detention) کو تسلیم کر رکھا ہے۔ اس حق کے جواز سے قطع نظر اس کا طریقۂ استعمال بسا اوقات معاشرے میں کھچاؤ اور عدم تحفظ کے احساس کا باعث بن جاتا ہے۔

انگلستان میں صدیوں سے ایک عدالتی طریقِ کار قائم ہے کہ اگر کسی شخص کے حبسِ بے جا کے خلاف عدالتِ عالیہ میں مرافعہ دائر کیا جائے اور وکیل سائل اسے پیش کرتے وقت متعلقہ جج کو یہ بتا دے کہ یہ درخواست کسی فرد کی آزادی سے متعلق ہے تو جج پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ تمام دیگر کام چھوڑ کر اس درخواست کی سماعت کرے۔ اگر ایک فاضل جج اس درخواست کو مسترد کر دے تو اس کا اعادہ بار بار دوسرے فاضل ججوں کے پاس کیا جا سکتا ہے، لیکن شخصی آزادی کی اتنی بڑی اہمیت کے باوجود

وہاں کبھی قانونِ نظر بندی کا عمل جزوِ قانون ہے تاہم اس کے لیے معقول وجوہ کا ہونا لازمی ہے۔ اس سلسلے میں ایک متنازعہ سوال ہے کہ وجوہ کی معقولیت کا جائزہ کس کے احاطۂ اختیار میں ہے؟ کیا یہ جائزہ نظر بندی کے احکام صادر کرنے والے انتظامی افسروں کا کام ہے یا عدالتِ عالیہ کا جہاں ان وجوہ کی معقولیت کو چیلنج کیا جاتا ہے؟ اول الذکر طریقہ کار کے حق میں جتنے بھی وقیع دلائل پیش کیے جائیں ایک آدمی کا ذہن اس شعر کے گنگنانے پر مائل ہوتا ہے۔

وہی قاتل وہی شاہد وہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں قتل کا دعوا کس پر

حقیقت یہ ہے کہ قانون کی حکومت کی بالادستی اور قدرتی اصولوں کی پابندی کے بغیر کسی بھی ملک میں انسانی حقوق کھوکھلے اور بے حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی کے لیے منتخب شدہ قانون ساز ادارے اور پاکیزہ اور آزاد عدلیہ ناگزیر عناصر ہیں۔ قدرتی انصاف کے اصول کے دو اہم جزو ہیں: ایک یہ کہ کوئی شخص اپنے معاملے میں منصف نہیں بن سکتا اور دوم یہ کہ کسی شخص کو بھی حق سماعت اور صفائی کے بغیر موردِ الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ حق شنوائی، جو ایک لاطینی جملہ Audi Alteram Paltram کے نام سے ہمارے نظامِ قانون کا جزو بن چکا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے اخراجِ جنت کے وقت سے تسلیم شدہ چلا آتا ہے خداوند تعالےٰ نے بھی حضرت آدم علیہ السلام کو خلدت چلے جانے کے حکم سے پیشتر صفائی پیش کرنے کا موقع دیا تھا۔ ایک مشہور ... یہ قانون کے لیے

Justice must not only be done but seen to have been done

(صرف یہ کافی نہیں کہ انصاف کیا جائے بلکہ یہ دکھانا بھی ضروری ہے کہ انصاف کیا گیا ہے۔) انسانی حقوق کی ادائی اور تکمیل کی ذمے داری اولاً حکومتِ وقت پر عائد ہوتی ہے لیکن معاشرے کے افراد خود بھی ان حقوق کی نگہبانی کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ حکومت اور رعایا کے درمیان یہ بنیادی حقوق ایک حفاظتی دیوار ہیں جس کا استحکام سوسائٹی اور حکومت کا اپنا استحکام ہے۔ اگر اس دیوار کو کمزور یا منہدم کرنے کی کوشش کی جائے تو اسی تناسب سے حکومت اور رعایا کے درمیان تصادم اور بیگانگی کے امکانات قوی تر ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے اقوام متحدہ کے بنیادی حقوق کے منشور کا ذکر کیا ہے۔ اس کے تیس دفعات میں شخصی وقار اور آزادی اور انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے کئی ایک نیک خواہشات درج ہیں لیکن ان پر عمل درآمد کے لیے یا انھیں بروئے کار لانے کے لیے کوئی بھی موثر آلۂ کار موجود نہیں۔ ہمارے حالیہ سیاہ ترین قومی المیہ میں جس سے ہمارے ملک کا ایک حصہ جنگی جارحیت کی نذر ہو گیا۔ دنیا کے ایک سو چار ممالک کی ہمنوائی کے باوجود ہماری فریاد

صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ہمارے ایک لاکھ جنگی قیدی قطعی جارحیت اور وحشت کے نتیجے میں بھارت کے جیلوں کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ عالمی ضمیر میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی۔ اقوام متحدہ کے منشور اور جنیوا کنونیشنز کی حیثیت ردی کے کاغذوں سے زیادہ نہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ غاصب اور ظالم دشمن کے پنجۂ استبداد سے آسانی کے ساتھ چھٹکارا حاصل نہیں ہو سکتا۔ اخلاقی اصولوں کے واسطے سے اُن کے آہنی ہاتھ نرم نہیں پڑ سکتے۔

بھارت کا رویہ عالمی برادری کے بنیادی حقوق کے منشور کی المناک اور امن سوز تضحیک ہے۔ بنیادی حقوق کا احترام کسی قوم پر اخلاقی پند و نصائح سے ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ یہ ہمیشہ اُس قوم کے اپنے نظری کردار اور اخلاقی اقدار کی پیداوار ہوتا ہے۔

منشورِ محمدؐ

اس عالمی منشور کے مقابلے میں تیرہ سو سال پیشتر کے اُس منشور پر نظر ڈالیے جو ہادیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے عرفات کے میدان سے حجۃ الوداع کے موقع پر چھٹی صدی عیسوی میں نشر کیا تھا جب کہ بنیادی حقوق اور انسانی شرف و فضیلت نامانوس اور نامعلوم تصوّرات تھے اور جب کہ ساری دُنیا جہالت اور اخلاقی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس تاریخی موقع پر ایک لاکھ کے مجمع سے مخاطب ہوتے ہوئے آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اے میرے لوگو! سنو، تم سے یہ میرا آخری خطاب ہے۔ پیدائشی لحاظ سے تم سب ایک جیسے ہو۔ خالق نے تمہیں مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں اس لیے بانٹ دیا کہ تمہاری ایک دوسرے سے پہچان ہو سکے۔ صرف نیکی اور تقویٰ ہی تمہارے درمیان وجۂ امتیاز ہو سکتا ہے۔ خون، رنگ، قبیلہ اور نسل کی کوئی تمیز نہیں، اس لیے عربی کو عجمی پر اور سفید کو سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ تمہارے غلام ویسی ہی خوراک اور پوشاک کے مستحق ہیں جیسے تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ تاقیامت تم ایک دوسرے کی جان و مال کی حفاظت کے ذمّے دار ہو۔ کسی کے مال میں خیانت نہ کرو نہ اس پر ناجائز تصرّف حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ یاد رکھو تمہیں ایک دن اپنے خالق کے حضور حاضر ہونا ہے جہاں تمہارے اعمال کی پرسش ہوگی۔

حقِ وراثت کا تعین، عورتوں کے حقوق اور دیگر عام معاملاتِ زندگی پر تلقین کے بعد ارشاد ہوتا ہے: میں تمہارے لیے ایک کتاب چھوڑ کر جا رہا ہوں جس کی مضبوطی سے پیروی کرنا۔ یاد رکھو میرے بعد گمراہ ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار نہ ہو جانا۔

انسانی حقوق کا اس سے جامع اور پُراثر منشور ذہن میں آنا مشکل ہے۔ اس میں وہ تمام بلند انسانی اقدار درج ہیں جن کے اپنانے سے ایک انسان شرفِ انسانیت سے آراستہ ہو کر زندگی کا صحیح مقصد

اور اپنا صحیح مقام ڈھونڈ لینا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے منشور کے برعکس سرورِ کائناتؐ کا یہ منشور محض مقدّس اعلانات کا مجموعہ نہیں ہے، اس کی پشت پر عمل درآمد کے لیے ایک بے پناہ قوت کارفرما ہے۔ وہ یہ یقین ہے کہ ہر انسان کو آخر میں اپنے خالقِ حقیقی کے سامنے اپنے اعمال کی پُرسش کے لیے حاضر ہونا ہے۔ وہ خالق حقیقی جو حاضر و ناظر ہے، جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ پُرسشِ اعمال اور جواب دہی کا یہ عقیدہ اگر معاشرے کے رگ و ریشے میں سرایت کر جائے تو حقوق العباد میں کسی رخنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ سرورِ دو عالمؐ کے منشور کے مطابق حقوق العباد کا احترام صرف لوگوں کا آپس میں پیمان نہیں بلکہ اس میں ایک تیسرا فریق بھی شامل ہے اور وہ خداوند بزرگ و برتر کی ذات ہے جس کے ساتھ پیمان شکنی وہی بدبخت اور کور باطن کر سکتے ہیں جن کی آنکھیں اس کی جبروتی طاقتوں سے غافل ہو کر حرص و آز کے لپیٹ میں اندھی ہو جاتی ہیں۔ سرورِ دو جہاںؐ نے عالمی برادری کو ایک کنبہ، ایک خاندان قرار دیا ہے اور دنیا کو پہلی بار انسانی اخوّت، مساوات اور ہمدردی کے سبق سکھائے ہیں۔ انھوں نے حقوق العباد کی تکمیل میں اپنی عملی زندگی کے ہر پہلو سے افضل ترین مثالیں پیش کی ہیں۔ اپنے آپ کو ایک بشر کی حیثیت سے پیش کیا، لیکن اپنے کردار اور فضائل سے اس بشریت کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں فرشتوں کو بھی سربسجود ہونا پڑا۔ زندگی کا کوئی گوشہ اُن کے کردار کے اعلا نمونوں سے خالی نہیں ہے۔ بہ حیثیت ایک شہری، ایک حکمراں، والد، خاوند، ہمسایہ، دشمن، جنگی جرنیل غرض کہ ہر ایک حیثیت میں انھوں نے حقوق العباد کے احترام اور تکریم کا مجسّمہ بن کر ایک انسانِ کامل کا درجہ حاصل کر لیا۔

ضمیر پاک، نگاہ بلند، مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

حقوق العباد کے احترام کو سرورِ کائناتؐ نے اپنے قول و عمل سے جس معراج پر پہنچایا ہے اس کا اندازہ ان کے حسبِ ذیل ارشاد سے ہوتا ہے۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبُّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

غور کیجیے معاشرے میں توازن عدل و انصاف اور قیامِ امن کے لیے کتنا پیارا اور جادو اثر نسخہ تجویز فرمایا ہے۔ جب فریقین کے حقوق میں تصادم پیدا ہو جائے اگر ہر فریق اپنی پوزیشن بدل کر مخالف فریق کے نقطۂ نظر سے متنازعہ حق کا جائزہ لینے کی کوشش کرے اور یہ معلوم کرے کہ اس صورت میں اس کا اپنا ردِّ عمل کیا ہوگا۔ اگر وہ ردِّ عمل جائز ہو اور اسے قبول کر لے تو حقوق پر

جھگڑوں اور مناقشت کا آسانی سے خاتمہ ہو سکتا ہے۔ حُسنِ سلوک سے حُسنِ سلوک ملتا ہے۔ بد سلوکی سے بدسلوکی۔ مکافاتِ عمل سے غفلت ایک بُھول ہے، بہت بڑی بُھول۔

زندگی میں یہ سلامت روی قانون کی جبری طاقت سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ معاشرے کی شقاوت اور بے ضمیری قانونی گرفت کو ڈھیلا کر دیتی ہے۔ سخت سے سخت قوانین کے اجرا کے باوجود جرائم میں کمی نہیں ہوتی، مقدمے بازی کی لعنت کا دائرہ پھیلتا رہتا ہے۔

قانون شکنی اور امن سوزی کا سدِّباب اس صورت میں ممکن ہے کہ حقوق العباد کا احترام معاشرے کی طبع ثانی بن جائے، لاقانونیت سے جذبۂ نفرت پیدا ہو جائے۔ قانون کا دلی احترام زندہ قوموں کی خوش بختی اور عظمت کا سب سے بڑا نشان ہے۔ اس کی ایک مثال چند ماہ ہوئے میں نے ایک انگریزی جریدے میں پڑھی تھی۔

ملکہ الزبتھ ثانی اور اُن کے شوہر ڈیوک آف ایڈنبرا ایک شب کسی دوست کے ہاں دعوت پر مدعو تھے۔ قواعد وضوابط کے مطابق بکنگھم پیلس کے بیرونی دروازے ایک مقررہ وقت پر بند کر دیے جاتے ہیں۔ پہرے دار پہرے کے لیے متعین ہوتے ہیں۔ ملکۂ عالیہ مقررہ وقت سے کچھ دیر بعد بکنگھم پیلس واپس پہنچیں۔ بیرونی گیٹ بند ہو چکا تھا۔ جب اُن کی گاڑی گیٹ کے بالمقابل رُکی تو اے۔ ڈی۔ سی نیچے اُترا اور پہرے دار سے مخاطب ہو کر کہا کہ ملکۂ معظمہ تشریف لے آئی ہیں، دروازہ کھول دو۔ پہرے دار نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔ کیا ملکہ یہ توقع رکھتی ہیں کہ میں اُن کی موجودگی میں ان کے قواعد کی خلاف ورزی کروں؟ میں ایسا نہیں کروں گا۔ چنانچہ ملکہ اور اُن کی پارٹی کے افراد گھوم کر عقبی دروازے سے محل میں داخل ہو گئے۔ ایسی روشن مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندہ قومیں کس طرح قانون کے احترام کو اپنی زندگی کا جزو بنا لیتی ہیں۔

احترامِ حقوق العباد زندگی کی ایک ایسی حسین خوبی ہے جو زندگی میں شادابی پیدا کر دیتی ہے۔ ایک انسان کو مختلف حیثیتوں میں روزمرہ کے معمولات اور مشاغل میں حقوق العباد سے واسطہ پڑتا ہے۔ زندگی تلخ اور شیریں یادوں کا مجموعہ ہے۔ اگر کبھی کبھار ایک انسان خود سے یہ سوال پوچھے کہ کیا میں نے اپنے مشاغل اور فرائض کی تکمیل میں کوئی ایسی میٹھی یاد چھوڑی ہے جو باقی رہے گی تو زندگی میں حُسن اور خوبصورتی کے لیے ایک اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ صرف اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے مفید کاموں کی میٹھی یاد ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ اگر معاشرے کا ہر فرد اپنے دن کا آغاز اس خیال سے کرے کہ شاید اُس کی فانی زندگی کا یہ آخری دن ہو تو پھر زندگی میں حسن اور نیکی کو سمیٹنے کے لیے عجلت کے ساتھ اُن کا تعاقب کرنا پڑے گا۔ یہ تعاقب بنکوں، صنعتی اداروں اور دولت کے دوسرے مراکز میں نہیں بلکہ صرف حقوق العباد کی رُوح پرور تجربہ گاہ میں ہی سود مند

ثابت ہو سکتا ہے جہاں ہر روز انسان کے کردار کا امتحان ہوتا ہے۔

مجھے احساس ہے کہ اپنی مصروفیتوں کے باعث میں اس مضمون کے عمیق سمندر سے آپ کے لیے کوئی گوہر تلاش نہیں کر سکا جو گہرے غور و فکر ہی سے میسر آ سکتا تھا۔ میں اس سمندر سے چند قطرے آپ کی خدمت میں پیش کر سکا ہوں جو آپ کی پیاس بجھانے کے لیے کافی نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ میں آپ کو تشنہ لب چھوڑ رہا ہوں، لیکن میری اس کاوش سے اگر آپ اپنی پیاس بجھانے کے لیے کتاب لا ریب فیہ کے سرچشمۂ حیات کی جانب رجوع کر لیں تو میں سمجھوں گا کہ میری معروضات عبث ثابت نہیں ہوں گی۔

جناب محترم جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن
سابق چیف جسٹس، پاکستان

جناب جسٹس سجاد احمد جان صاحب نے نہایت شگفتہ و شستہ انداز میں "احترام حقوق العباد" کے موضوع پر اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ انھوں نے اس اہم موضوع کے قانونی، سیاسی، سماجی، اخلاقی اور دینی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور حق یہ ہے کہ انھوں نے بلند علمی سطح پر مضمون سے مکمل انصاف کیا ہے۔ ان تمام پہلوؤں پر تبصرہ جن پر یہ مضمون حاوی ہے، تحصیل حاصل ہوگا۔ البتہ میں چند ایک گزارشات صرف اس حصۂ بحث سے متعلق پیش کرنے کی جسارت کروں گا جس کی طرف فاضل مقرر نے اپنے مقالے کے آخری حصے میں اور جناب حکیم محمد سعید صاحب نے اپنی تعارفی تقریر میں اشارہ فرمایا تھا۔

احترامِ آدم کی عمارت ارشاداتِ خداوندی کی محکم اساس پر قائم ہے۔ قرآنی تعلیمات کا نقطۂ ماسکہ توحیدِ الٰہی ہے اور اللہ کی وحدانیت سے مساواتِ انسانی کا اثبات ہوتا ہے۔ اگر انسان اور انسان میں امتیاز ہو سکتا ہے تو محض اخلاقی قدروں کی بنیاد پر۔ رنگ، نسل، جسمانی طاقت، جغرافیائی حدود یا زر و مال کا تفاوت درحقیقت اس مسئلہ میں غیر متعلق عناصر ہیں۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقَاکُمْ۔ اسلامی قانون کی نظر میں سب انسان بحیثیت انسان برابر ہیں اور مساوی طور پر احترام کے لائق۔ تفوق صرف ذاتی سیرت کی خوبیوں پر منحصر ہے۔

قرآن کریم کی سورۂ "المؤمن" اور سورۂ "التغابن" میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے "صوّرکم فاحسن صورکم"۔ پھر سورۂ "التین" میں "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" گویا انسان کو مبداِ فیض سے صورتِ زیبا بخشی گئی اور اسے حسین سانچے میں ڈھالا گیا۔ ساتھ ہی تنبیہ ہوئی کہ تم اپنے اعمال سے انسانی سطح سے گر کر اسفل سافلین میں بھی شامل ہو سکتے ہو۔ تخلیق آدم کی قرآنی تمثیل میں واضح کیا گیا ہے کہ انسان کو علمِ اسما دیا گیا تو وہ مسجودِ ملائک ٹھہرا اور اسے خلافتِ ارضی اور تسخیرِ کائنات کی صلاحیتوں سے نوازا گیا۔ اسے ایک آزاد شخصیت کی امانت بھی سپرد کی گئی، جسے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں نے قبول کرنے سے گریز کیا تھا۔ پھر سورۂ ق میں اللہ تعالیٰ انسان کے متعلق فرماتے ہیں "نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِي"۔ گویا ہر انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ روحِ الٰہی سے بہرہ ور ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیۂ مبارکہ "لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ .... وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا" سے اسی حقیقت کی تائید

ہوتی ہے۔

انسانی عظمت کے اس بلند مقام سے دیکھا جائے تو احترامِ انسان یا احترام حقوق العباد کے دو پہلو سامنے آتے ہیں، ایک انفرادی اور ایک اجتماعی۔ انفرادی نقطۂ نظر سے لازم آتا ہے کہ ہر انسان ذاتی طہارت، لباس کی صفائی، ماحول کی پاکیزگی اور جسم وجان دونوں کی بہبود و فلاح کو ملحوظ رکھے کہ شرفِ انسانیت کا یہی تقاضا ہے۔ وہ کسی ایسے فعل کا مرتکب نہ ہو جو خلیفۃ اللہ فی الارض کی شان کے منافی ہو۔ فرد کو سوال کی ممانعت اسی ضمن میں آتی ہے۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ ساتھ ہی سائل کو جھڑکنے سے بھی منع کیا گیا کہ اس سے انسانی وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْھَر۔ جنگ میں مُثلہ کرنے کی ممانعت کو بھی اسی اُصول کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

شرفِ انسانی کی اجتماعی حیثیت ان احکام سے واضح ہے جو معاشرے کو نقصان پہنچانے والے یا فتنہ و فساد پیدا کرنے والے اقدامات کی مذمت یا تنقیص کرتے ہیں۔ جھوٹ، چوری، غصب، دست درازی، قتل وغیرہ کی ممانعت کا منبع یہی شرفِ انسانیت ہے۔ ایک حدیث کے مطابق مخلوقِ خدا "عیال اللہ" ہے۔ ایک اور حدیث میں بیان ہوا ہے "خیر الناس من ینفع الناس" بہترین انسان وہ ہے جس سے دوسرے انسان کو فائدہ پہنچے۔ سورۂ المائدہ میں کہا گیا ہے مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَمَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا۔ اللہ اللہ۔ گویا ایک آدمی کی جان پر بغیر استحقاق کے حملہ تمام بنی نوعِ انسان پر حملہ کے مترادف ہے اور ایک انسان کی جان بچا لینا، تمام نسلِ انسانی کی حفاظت کے مساوی ہے۔ یہ انسانی اخوت کے احترام کی انتہائیں ہیں۔ شرفِ انسانی کے احساس کی بنیاد ہی پر تہذیبِ انسانی کی رفیع عمارت کھڑی ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔ ع

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اسی اصل کی ایک فرع انسانی معاملات میں رواداری کا اصول ہے۔ اختلافِ رائے کا حق انسان کا فطری حق ہے اور اسی کی شناخت سے قانون کی بالادستی قائم ہوتی ہے۔



ڈاکٹر حافظ محمد الیاس، جناب رئیس امروہوی، جناب زیڈ۔اے۔بخاری (صدر مجلس)



جناب رئیس امروہوی (مقرر)، جناب زیڈ۔اے۔بخاری، ڈاکٹر حافظ محمد الیاس



جناب زیڈ۔اے۔بخاری، ڈاکٹر حافظ محمد الیاس، جناب رئیس امروہوی۔



سامعین

احترامِ کتاب و قلم

کلماتِ ابتدائیہ ... ... ڈاکٹر محمد الیاس

مقالہ ... ... جناب محترم رئیس امروہوی

کلماتِ صدارت ... ... جناب محترم ذوالفقار علی بخاری

شامِ ہمدرد، کراچی

۲۰-اپریل ۱۹۷۲ء

ڈاکٹر محمد الیاس

جیسا کہ آپ سب کو علم ہے آج شامِ ہمدرد کی تقریر کا موضوع "احترام کتاب و قلم" ہے اور مقرر ہیں آپ کی جانی پہچانی شخصیت جناب رئیس امروہوی صاحب۔ جن کا تعلق کتاب و قلم سے بڑا گہرا اور بہت پرانا ہے۔ رئیس امروہوی صاحب دورِ حاضر کے ممتاز شاعر ہیں۔ وہ تمام اصنافِ سخن میں قادرالکلام ہیں۔ پُرگو ہیں، حاضر طبع ہیں، زود گو ہیں۔ فکر میں قدرت ہے، طرزِ ادا میں جدّت ہے۔ زبان میں فصاحت ہے، بیان میں سلاست ہے۔ نظر میں وسعت ہے۔ غزل ہو یا نظم، قطعات ہوں یا رُباعیاں، ادب ہو یا فلسفہ، سنجیدہ مضامین ہوں یا طنز و مزاح، وہ ہر میدان کے مرد ہیں جس موضوع پر لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں۔ بقول خود رئیس صاحب کے شعر سے اُن کا رشتہ اکتسابی نہیں موروثی ہے۔ اُنھوں نے آنکھیں کھولیں تو گردوپیش شاعری اور شعر کو جلوہ گر پایا۔ گھر میں علمی اور شاعرانہ ماحول ملا۔ شرافت و نجابت نے اُن کی شخصیت کو وقار بھی بخشا اور جلال و جمال بھی۔ ان محاسن نے اُن کی شخصیت اور اُن کے کلام دونوں کو حددرجہ محبوب بنا دیا۔ انسانی سیرت کے گوناگوں پہلوؤں کا انھوں نے جس غائر انداز میں مطالعہ کیا ہے اس پر ان کی تحریریں شاہد ہیں۔

جناب رئیس امروہوی صاحب گزشتہ بیس بائیس برس سے روزانہ ایک قطعہ لکھ رہے ہیں۔ یہ اردو شاعری کی تاریخ کا ایک بالکل منفرد واقعہ ہے۔ جناب رئیس امروہوی صاحب کے یہ قطعات مختلف سیاسی، سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کی تاریخ ہیں۔ چار مصرعوں میں نکتہ پیدا کرنا، بات نکالنا، طنز کرجانا، مسکراکر نشتر چبھونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رئیس امروہوی صاحب سے بڑھ کر بدیہہ گو، نکتہ سنج اور طناز شاعر کوئی نہیں۔ رئیس امروہوی صاحب نے کتاب و قلم کا عملاً احترام ضرور کیا ہوگا۔ آج وہ اِس احترام کی اہمیت و حقیقت کا اپنی آواز اور اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے اظہار کریں گے۔

دراصل ذرائعِ اظہارِ خیال دو ہیں: ایک آواز دوسرے نقوش۔ نقوش جس چیز پر بنائے جائیں وہ کتاب ہے اور جس چیز سے بنائے جائیں وہ قلم ہے کتاب و قلم ذریعہ بنتے ہیں حصولِ علم کا۔ کتاب و قلم ذریعہ ہیں حصولِ علم کا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

یعنی قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی اور انسان کو وہ علم عطا کیا جو اس کو حاصل نہ تھا۔ چونکہ علم بذاتِ خود محترم ہے جس کی وجہ سے انسانوں کو فرشتوں پر فوقیت حاصل ہوئی ہے اور عظیم کردار کی تشکیل کی طرف رہنمائی ہوتی ہے اس لیے قلم وکتاب بھی محترم ہوئے۔ دراصل ذرائع کی اپنی قیمت مقصد کی قیمت سے متعین ہوتی ہے۔ اگر مقصد محترم ہے تو ذرائع بھی محترم ہیں ورنہ ذرائع کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ کتاب وقلم جو انسانوں کی پست ذہنی، باہمی اختلاف وفساد، جبر وتشدد اور فحاشی وغیرہ کا سبب بنیں یقیناً قابلِ احترام نہیں۔

کبھی تو کتاب وقلم کی قیمت متعین ہوتی ہے صاحبِ کتاب کی عظمت سے جیسے کتاب اللہ اور کتبِ حدیث۔ اور کبھی صاحبِ کتاب کی قیمت متعین ہوتی ہے کتاب کے مندرجات ومضامین سے۔ گویا کتاب وقلم آئینہ ہوئے اس شخصیت کا جس نے ان سے کام لیا۔ احترام کتاب وقلم کے صرف یہ معنی ہرگز نہیں کہ غلاف در غلاف چڑھا کر اس کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور کبھی کبھی ہاتھ میں لے کر چوم لیا جائے اور سینے اور آنکھوں سے لگا لیا جائے جیسا کہ آج اکثر گھرانوں میں کتاب اللہ کا احترام اسی انداز سے کیا جاتا ہے۔ کتاب وقلم کا احترام دراصل یہ ہے کہ دل میں اُن کی اہمیت وعظمت کا احساس ہو اور اُن سے وہ مقصد حاصل کیا جائے جس کے لیے اُن کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔

کتاب وقلم کا احترام انسان نے صحیح معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد سیکھا۔ آپؐ نے اپنے بارے میں فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ بہترین اخلاق کی تکمیل کردوں۔ قرآن کریم نے آپ کی بعثت کے مقاصد اس طرح بتائے:

> اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا جب کہ انھیں میں سے رسول بھیجا
> جو اُن کو اس کی آیات سُناتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور اُن کو
> کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس طرح علم کی فضیلت بتا کر اور اہلِ علم کے بلند مقام کی نشان دہی کرکے اور مسلسل تحصیلِ علم اور اور اشاعتِ علم کی تاکید فرما کر مسلمانوں کے دلوں میں کتاب وقلم کی اہمیت اور احترام قائم کردیا۔ قرآن کریم میں مشاہدہ کائنات اور کائنات میں ہونے والے طبعی اعمال کے مطالعے کی جس شدومد سے تاکید کی گئی ہے اُس کے زیرِ اثر مسلمانوں نے کائنات کو بھی ایک کھلی کتاب سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت وعظمت کے نقوش کا مطالعہ کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے نتیجے میں دُنیا نے دیکھا کہ ایک عظیم علمی تحریک تمام عالمِ اسلام میں پھیلی اور بے شمار ایسے اہلِ علم پیدا ہوئے جنھوں نے قلم ہاتھ میں لے کر ایک دو نہیں سینکڑوں کے حساب سے کتابیں تحریر کیں۔ یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں آج بھی ایشیا اور

یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ کتاب و قلم کا احترام مسلمانوں نے کیسے کیا اور اُن کی اہمیت کو کیسے پہچانا اس کی شہادت مسلمانوں نے تو دی ہی ہے ایک غیر مسلم عیسائی محقق ڈاکٹر رابرٹ بری فالٹ کی زبانی بھی سن لیجئے۔ لکھتے ہیں کہ اس امر کی نہ کوئی مثال پہلے موجود تھی اور نہ اب تک ہے کہ کسی وسیع سلطنت کے طول و عرض میں حکمران طبقے حصولِ علم کی مجنونانہ خواہش سے سرشار ہو گئے ہوں۔ خلفا و امرا اپنے محلات سے اُٹھ کر کتب خانوں اور رصدگاہوں میں جا گھستے تھے۔ اہلِ علم کے خطبات کو سننے اور اُن سے مسائلِ ریاضی کے متعلق مذاکرات کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرتے۔ مسودات، مخطوطات اور نباتاتی نمونوں سے لدے ہوئے کارواں بخارا اور دجلہ سے رواں دواں رہتے۔ کتابوں اور معلموں کے حصول کی خاطر قسطنطنیہ اور ہندستان کو خاص سفیر بھیجے جاتے تھے۔ کسی سلطنت سے تاوانِ جنگ وصول کرنے کے سلسلے میں یونانی مصنفین یا کسی ممتاز ریاضی داں کی تصنیف حاصل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ملحق ہوتا تھا۔ وزرائے سلطنت کتب خانوں کے قیام۔ مدارس کے لئے اوقاف کے انتظام اور غریب طلبہ کے لیے وظائف کے اہتمام میں اپنے آقاؤں سے بھی بڑھ جانا چاہتے تھے۔ اہلِ علم کو بلا امتیازِ نسل و مذہب دوسرے تمام لوگوں پر فوقیت دی جاتی تھی۔ اُن پر دولت و ثروت اور اعزازات کی بارش کر دی جاتی تھی۔ انھیں اہم اور قابلِ عزت و احترام منصب دیے جاتے تھے۔ جب خلفا کسی سفر یا مہم پر روانہ ہوتے تو اہلِ علم کا ایک گروہ اور کتابوں سے لدے ہوئے اونٹوں کی ایک قطار ہمراہ ہوتی تھی۔

یہ علمی تحریک بارہویں صدی میں زیادہ تر مسلم اسپین کے ذریعہ سے یورپ میں جہاں کہ کتاب و قلم خانقاہوں کے صرف چند افراد تک محدود تھا اور جہاں تعلیم کے بارے میں گریگوری پادری جیسے شخص کا یہ خیال تھا کہ جہالت پارسائی کی بنیاد ہے، پھیلنا شروع ہوئی اور یہی علمی تحریک اور اس کے نتیجے میں احترام کتاب و قلم کا جذبہ سولہویں صدی میں یورپ کے نشاۃ ثانیہ کا سبب بنا۔

افسوس کہ کتاب و قلم کا احترام کرنے والی اور دنیا کو یہ احترام سکھانے والی مسلم قوم آج اس احترام سے خود ناآشنا ہے۔

جناب محترم رئیس امروہوی

آج کا موضوع بیان ہے : احترام کتاب و قلم ۔ اس موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے بھی میں کتاب و قلم ہی کا ممنونِ احسان ہوں، کیونکہ اگر کتاب کا وجود نہ ہوتا تو کاتب تحریر اس مضمون کی کتابت ہی نہ کر سکتا تھا اور قلم کے بغیر رقم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ میں اپنی معروضات کی ابتدا اُم الکتاب کی ایک آیتِ مبارکہ سے کرنا چاہتا ہوں ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ ھدًی للمتقین

اس آیتِ مبارکہ کے بیان کی توفیق بھی قلم ہی کی بدولت نصیب ہوئی ۔ زبانِ قدرت نے ن والقلم وما یسطرون کہہ کر جس کی قسم کھائی ہے اور علّم بالقلم کے ذریعہ سے علم و قلم کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی ہے ۔

قلم و کتاب کا احترام ہو یا منبر و محراب کا ، یہ صرف ادب سے پیدا ہوتا ہے ۔ ہر قسم کے احترام اور ہر چیز کی حرمت کا محرک ادب اور صرف پاسِ ادب ہے ۔ قلم کا ادب و ادبیات سے جو تعلق ہے اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں اور کتاب کی عظمت کا انحصار ہی اُس کے ادبی معیار پر ہے ۔ ادب و احترام لازم و ملزوم ہیں ۔ ادب کے بارے میں ہمارے پیر و مرشد مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

از خدا خواہیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد
بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد
ہر چہ آید بر تو از ظلماتِ غم
آں ز بے باکی و گستاخیست ہم
از ادب پُرنور گشت است ایں فلک
از ادب معصوم و پاک آمد ملک

کتاب و قلم کا احترام اس کارخانۂ عالم کی سرشت میں ہے ۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ یہ پُورا کارخانہ ہی لوح و قلم کے سہارے چل رہا ہے ۔ کتاب و قلم کا تعلق عبارت سے ہے ۔ عبارت کلمات پر

مشتمل ہوتی ہے اور یہ پوری کائنات ایک کلمے سے ہی پیدا کی گئی ہے۔ کُن فیکون۔ یہ دونوں کلمے تھے جب قلمِ قدرت نے انہیں تحریر کیا تو یہ دبستانِ آفرینش وجود میں آگیا۔ اس کائنات کی تمام مخلوق اشیا، چاند، سورج سے لے کر ذرّوں تک اور ایٹمی برق پاروں سے لے کر کہکشاؤں تک انسان اور حیوان سے یکساں تعلق رکھتی ہیں۔ ہوا، پانی، زمین، آگ! ان عناصر سے حیوان بھی فائدہ اٹھاتا ہے اور انسان بھی مستفیض ہوتا ہے۔ البتہ تمام مخلوقات میں صرف کتاب و قلم کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کا تعلق انسان اور صرف انسان سے ہے۔ گویا کتاب و قلم انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی واحد علامتیں ہیں۔ جب انسان مرتبۂ حیوانیت سے گذر کر درجۂ انسانیت میں قدم رکھتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ہاتھ میں قلم ہے اور وہ کچھ لکھ رہا ہے۔ درحقیقت کتابِ بشریت کی تزئین و تدوین صرف قلم ہی سے ہوئی ہے۔ خواہ وہ مصوّر کا موقلم ہو یا شاعر کی صریرِ خامہ!

لکھ لکھ کے اشک و خوں سے حکایاتِ زندگی
آرائشِ کتابِ بشر کر رہے ہیں ہم

کتاب و قلم کا موضوع زیرِ بحث ہو اور تحریر و تقریر کا ذکر نہ آئے یہ کس طرح ممکن ہے! بے شک تقریر کو تحریر پر فوقیت حاصل ہے۔ پہلے انسان کی زبان پر الفاظ آئے۔ یعنی نطق نے اپنا اظہار کیا۔ اس کے بعد قلم جنبش میں آیا اور اس نے الفاظ یعنی تقریر کو تحریر کے روپ میں ڈھال دیا۔ نطق صرف بولنے کو نہیں کہتے۔ بولتے تو پرندے بھی ہیں۔ میر انیس فرماتے ہیں کہ

چٹکی کلی تو رہ گئے پر تولتے ہوئے
پتی ہلی تو مل کے اُڑے بولتے ہوئے

منھ سے آوازیں نکالنے کی صلاحیت ہر اس جاندار میں ہے جسے زبان، حلق اور نرخرہ دیا گیا ہے حیوانات کی بولیوں سے ہم واقف نہیں۔ خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے "منطق الطیر" لکھ کر پرندوں کے مکالمات کو مدوّن کیا ہے، لیکن منطق الطیر کے اسرار تک پہنچنا ہر عامی کے بس کی بات نہیں۔ ممکن ہے آج سے چند لاکھ سال قبل کا انسان بے لفظ آوازوں سے تبادلۂ خیال کا کام لیتا ہو۔ بے لفظ آوازوں سے تبادلِ خیال کا کام آج بھی لیا جاتا ہے۔ اگر آپ کسی ایسے علاقے میں چلے جائیں جس کی زبان سے آپ واقف نہ ہوں تو آوازوں کے ذریعہ سے ہی عرضِ حال پر مجبور رہیں گے۔ تاہم بہت جلد یہ بے لفظ آوازیں بامعنی الفاظ میں تبدیل ہوگئیں اور نفسِ ناطقہ نے اپنا جلوہ دکھانا شروع کر دیا۔ نطق بامعنی گفتگو کو کہتے ہیں جو منطق اور عقل کی روشنی میں کی جائے۔ اسے منطق وجود میں آئی۔ منطق کے بطن سے فلسفہ پیدا ہوا اور فلسفے کی کوکھ سے سائنس نے جنم لیا۔

نطق کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ سائنس اس بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتی۔ ارشادِ قرآنی ہے کہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ۔ آدم کو نام سکھائے گئے۔ یہ کس کے نام تھے۔ اسمائے حسنہ یا اشیائے کائنات کے نام۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ عرض کرنا صرف یہ ہے کہ نطق کی ابتدا اسی تعلیم اسما سے ہوئی۔ لیکن نطق اس وقت تک بادِ ہوا ہے جب تک نطق کو قلم کے ذریعے کتاب کی شکل میں مدوّن نہ کیا جائے۔ نطق کو عبارت کی شکل نہ دی جائے تو وہ نفسِ آواز بن کر رہ جائے گا۔

کہاں ہم اختتامِ نغمہ کے بعد
اگر ہوں گے تو صرف آواز ہوں گے

انسانی فکر و دانش کا ارتقا صرف اس طرح عمل میں آیا کہ نطق تحریر کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اور آواز نے لکھے ہوئے الفاظ یعنی کتاب کی صورت اختیار کر لی۔ ابتدا کہاں سے ہوئی یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ آج سے اسی ہزار برس کے لکھے ہوئے کتبے وادیٔ دجلہ و فرات سے برآمد ہوئے ہیں۔ اسپین، فرانس اور بعض دوسرے علاقوں سے بھی عہدِ قدیم کے کتبے نکالے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے کتبوں پر تصویری حروف میں عبارتیں کندہ ہیں۔ مثلاً جہاں لفظ بیت لکھنا چاہیے وہاں خیمے کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ خیمے کی تصویر غائب ہو گئی۔ اور حرف "ب" باقی رہ گیا۔ علم آثارِ قدیمہ کے ماہرین جانتے ہیں کہ دنیا میں کتابت کی ابتدا کتبے سے ہوئی اور کتبات کے بطن سے کتابوں نے جنم لیا۔ ابتدا میں مصوری، کتابت، مجسمہ طرازی اور سنگ تراشی ان سب کا ایک سرچشمہ تھا۔ پتھروں کو تراش کر مجسمہ بنایا جاتا تھا۔ مجسمے پر تصویریں کھودی جاتی تھیں اور اسی تصویر سازی کو کتابت کہتے تھے یعنی کندہ گری۔ میں نے عرض کیا تھا کہ حیوانِ مطلق اور حیوانِ ناطق یعنی چوپائے اور آدمی کے مدارج میں نقطۂ امتیاز اور وجہ شرف وہ انسان کا نفسِ ناطقہ ہے۔ نفسِ ناطقہ کا مظہر نطق ہے اور نطق کو محفوظ کرنے کے لیے قلم و کتاب کا درجہ ضروری ہے۔ انسانی وجدان نے ہمیشہ قلم و کتاب کو آیاتِ الٰہی اور عطیۂ ربانی تسلیم کیا ہے۔ قدیم ترین قوموں میں قلم کاری اور کتاب دانی کے حقوق صرف مذہبی طبقے کے لیے مخصوص تھے۔ مصر، بابل، آشور، کریٹ، شام، تبت، چین، ہندستان اور دوسرے قدیم ترین ملکوں میں قلم و کتابت کے اجارہ دار صرف مندروں اور معبدوں کے محافظ اور روحانی رہنما ہوا کرتے تھے۔ عوام کو نوشت و خواند کی اجازت نہ تھی۔ قلم و کتاب کے اس مبالغہ آمیز احترام نے نوعِ انسانی کی اکثریت کے لیے لکھنا پڑھنا حرام قرار دیا تھا۔ لیکن چوں کہ یہ پابندی قوانینِ فطرت کے خلاف تھی اور ہر انسان تقریر کی طرح تحریر پر بھی قادر ہونا چاہتا تھا اور یہ ایسا قدرتی حق ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا پادریوں، پروہتوں، بادشاہوں اور برہمنوں کی مرضی کے خلاف نوشت و

خواندگی کا فن عوام میں پھیلنے لگا اور اس طرح قلم و کتاب رفتہ رفتہ عام لوگوں کی دسترس میں آگئے۔ کتاب و قلم کے نیز ان عام کا یہ عمل زمینی ہی نہ تھا بلکہ آسمانی بھی تھا۔ نوعِ انسان کا کوئی پیغمبر یا اوتار ایسا نہیں جو کسی نہ کسی صحیفے کے ساتھ مبعوث نہ ہوا ہو۔ دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد صحائفِ سماوی یعنی آسمان سے نازل ہونے والی کتابوں پر ہے۔ وید ہو یا اوستا۔ زند ہو یا پازند، مہاتما بدھ کے مکتوبی ملفوظات ہوں یا کنفیوشس کے مقالات، انجیل ہو یا توریت، زبور ہو یا قرآن، صحیفۂ آدم ہو یا صحیفۂ نوح، دنیا کی کوئی قوم اور قبیلہ ایسا نہیں جس کی تاریخ و تہذیب کی ابتدا کسی مقدس کتاب سے نہ ہوئی ہو۔ ان کتابوں کی عظمت محتاجِ بیان نہیں۔ لوگ ان کا جس طرح احترام کرتے ہیں، اُن کے حرف حرف کو جس طرح مقدس سمجھتے ہیں اس کا اندازہ ہر شخص بجائے خود کر سکتا ہے۔ سامی مذاہب کا مسلّمہ اور مشترکہ عقیدہ یہ ہے کہ تحریر کا فن انسان کا ایجاد کردہ نہیں ہے بلکہ قدرت نے براہِ راست انبیا و مرسلین کو لکھنا سکھایا اور انھیں قلم و کتاب کا شرف بخشا۔ بنی اسرائیل حضرت ادریس علیہ السّلام کو کتابت کا بانی سمجھتے ہیں منظم مذاہب کی عمر، خواہ اُن کا تعلق مشرقِ وسطےٰ سے ہو یا شمالی مشرقی ایشیا سے، پانچ ہزار سال سے زائد نہیں ہے۔ یوں سمجھیے کہ پانچ ہزار سال سے نوعِ انسانی کی عقیدتوں اور حرمتوں کا مرکز چند کتابیں اور چند صحیفے رہے ہیں۔ صدہا سال تک یہ کتابیں محدود حلقوں میں محفوظ ہاتھوں کی گرفت میں رہیں۔ رفتہ رفتہ چھاپے کا فن ایجاد ہوا اور دفعتاً کتاب نوعِ انسانی کی عمومی دستاویز بن گئی اور اس پر کسی ایک طبقے کا اجارہ نہ رہا۔ راقم الحروف کی تعلیم کی ابتدا مکتب سے ہوئی ہے اور آج میں نہایت اطمینان و سکون سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس ابتدا یعنی مکتبی تعلیم پر فخر ہے

سبق آموزِ درسِ بےخودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ گلستاں پر

ہمیں مکتب میں کتاب و قلم کے احترام کے جو درس دیے گئے تھے وہ آج تک لوحِ حافظہ پر کندہ ہیں۔ کیا مجال تھی کہ سرِ راہ کوئی ورق گرا پڑا ملے اور ہم اُسے اُٹھا کر آنکھوں سے نہ لگائیں۔ ہم سینٹے کے قلم یعنی "کلک" سے تختی لکھا کرتے تھے اور قلم کے تراشے یعنی قلم کو تراشنے کے بعد جو ریزے جمع ہو جاتے تھے انھیں کمال احترام کے ساتھ کہیں رکھ دیتے تھے۔ قلم کے بارے میں خلیفہ جی نے یہ شعر محفوظ کرا دیا تھا۔ ؎

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

قلم کا دعوا ہے کہ میں شاہِ جہاں ہوں اور لکھنے والے کو اعلا درجے پر فائز کر دیتا ہوں۔

چھاپے کے فن کی ارزانی اور عمومیت کے سبب اگرچہ کتاب وقلم کی حُرمت میں کمی ہوئی ہے لیکن اُن کی فیض رسانی ہمہ گیر ہو گئی ہے۔ فنِ طباعت کی تکمیل سے قبل علم اور تعلیم محض چند اصحاب تک محدود تھی۔ لیکن جب سے کتابیں چھپنے لگی ہیں یہ قدرتی دولت پانی، ہوا، دھوپ اور چاند کی طرح عام ہوتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں نے اپنے عہدِ عروج میں کتاب اور فن کتابیات کو جو ترقی دی اُس کی مثال پیش کرنے سے اُن کی پیش رو قومیں قاصر ہیں۔ خلافتِ عباسیہ کے حکمرانوں میں ہارون الرشید اور مامون الرشید کتابوں کے عاشق تھے۔ ریاضی، ہندسہ، منطق، فلسفہ، ہیئت، نجوم، جغرافیہ، تاریخ، رمل، جفر، حدیث، فقہ اور تفسیر غرض وہ کون سا گوشۂ علم ایسا تھا جو اُن کے فیض توجہ سے محروم رہا ہو۔ ان دونوں خلفا کے دربار میں مصنفوں کی طرح کاتبوں اور صحافیوں کی بھی بڑی تعداد موجود رہتی تھی اور اُن کا کام صرف اتنا تھا کہ تیزی کے ساتھ تصنیف شدہ کتابوں کی نقول تیار کرتے رہیں۔ ہارون و مامون تصنیف شدہ کتابوں کے وزن کی برابر سونا انعام میں دیا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ اہلِ علم اور اہلِ قلم کے بیش قرار مشاہرے مقرر تھے اور اُن کا کام ہی یہ تھا کہ کتابیں لکھے جائیں اور لکھوائے جائیں۔ بغداد، دمشق، مدینہ منورہ، کوفہ، بصرہ، قاہرہ اور اُندلس وغیرہ میں مسلمانوں نے جو کتب خانے قائم کیے تھے اگر میں اُن کا تذکرہ چھیڑ دوں تو ایک دوسری شامِ ہمدرد کی منعقد کرنی پڑے گی۔ مسلمانوں کے قلم وکتاب کا احترام اُن کے دین کی اساس اور ایمان کی اصل ہے، کیونکہ ہمارے دین و ایمان کا سرچشمہ "ام الکتاب" ہے جس کے بارے میں ارشادِ الٰہی یہ ہے کہ اسے مطہرون یعنی پاک لوگوں کے علاوہ کوئی چُھو بھی نہیں سکتا۔ قرآن مجید کی نسبت مسلمانوں کے قلوب میں ادب و احترام کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اُسے ہر شخص اپنے تجربے سے معلوم کر سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ دنیا میں کسی مکمل کتاب کے اتنے حافظ پائے جائیں جتنے حافظینِ قرآن پائے جاتے ہیں۔ گو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ دنیا میں سب سے زیادہ چھاپی جانے والی کتاب عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید یعنی انجیلِ مقدس ہے۔

اسلام نے احترامِ کتاب وقلم کو من جملہ شعائرِ مذہبی قرار دیا ہے اور عالم کے قلم کی روشنائی کو شہدائے راہِ حق کے خون پر فضیلت بخشی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو بار بار فنِ تحریر کی رغبت دلاتے تھے اور حضورؐ کی نگرانی میں بہت سے اصحابِ کرام نے لکھنے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ حالانکہ خود آں حضرتؐ کا خطاب رسولِ امیؐ تھا۔

نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط ننوشت
بہ غمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کتابوں کی اس عمومیت اور دوات وقلم کی اس کسادبازاری کے باوجود

آج بھی انسان کو تقریر سے زیادہ تحریر پر اعتماد ہے۔ آج بھی یہ عقیدہ لاشعور میں پیوست ہے کہ

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا اُمید

اگرچہ کتاب چھاپنے کی جدید تیکنیک کا سہرا جرمن موجد گوٹن برگ فوسٹ اور پیٹر شوئفر کے سر ہے جنھوں نے ۱۴۵۴ء میں انجیل کا ایک نسخہ ٹائپ میں چھاپا تھا۔ مگر اس فن شریف کے موجد درحقیقت چینی ہیں۔ کاغذ سازی اور فن طباعت کی ایجاد کا سہرا بھی انہیں کے سر بندھنا چاہیئے۔ قدیم مطبوعہ کتابوں کے جو نسخے دریافت ہوئے ہیں ان میں سب سے قدیم نسخہ ایک چینی کتاب کا ہے جو ۸۶۸ء سے پہلے کی چھپی ہوئی ہے۔ یہ کتاب شہر تن ہوانگ کے نواح میں ایک غار سے ملی ہے۔ یہ ایک لپیٹنے والا دفتر ہے جو ریشم کے مضبوط بنے ہوئے کاغذ سے تیار کیا گیا ہے۔ دنیا کی یہ سب سے پہلی مطبوعہ کتاب جو اب تک دستیاب ہوئی ہے سولہ فیٹ لمبی ایک فٹ چوڑی ہے۔ چھپائی ریشمی کاغذ کے دونوں طرف کی گئی ہے اور اس کے آخر میں چینی سال اور مہینے کی تاریخ درج ہے جو مغربی تقویم سے ۱۱؍مئی ۸۶۸ء ہوتی ہے، لیکن چینی علما، تحریر کا بیان ہے کہ چین میں ۸۶۸ء سے قبل بھی کتابوں کی طباعت کا رواج تھا۔ اس سلسلے میں وہ ایک کتابچے "ملفوظات مہاتما بدھ" کا نام لیتے ہیں جو چین و کوریا میں متداول تھی۔ مگر اب اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔ چھپائی کا فن برابر چین میں ترقی کرتا رہا اور ۹۳۴ء میں وہاں حکومت کے زیر اہتمام "ادبیاتِ قدیمہ" نامی ایک انسائیکلوپیڈیا نما کتاب کی طباعت شروع ہوئی جس کی ایک سو تیس جلدیں اکتیس سال میں چھاپی گئیں۔

مسلمانوں نے چین سے کاغذ سازی کا فن ضرور سیکھا لیکن طباعت کی حد تک وہ مُہر د توقیع پر قانع رہے یعنی کاغذ پر مہر چھاپنا! مسلمانوں نے طباعت کا جدید فن یورپ سے حاصل کیا ہے۔ اس برّ کوچک میں سب سے پہلا چھاپہ خانہ آج سے تقریبًا تین سو سال پہلے عیسائی مبلّغوں نے قائم کیا اور رفتہ رفتہ برّ کوچک کی تمام زبانوں کے چھاپے خانے وجود میں آگئے!

ہمارے اسلاف کے قلوب میں قلم و کتاب کا احترام کس درجہ تھا (اس پر بحث کرنی مناسب نہ ہوگی) اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ برِّ کوچک کے سلسلۂ سلاطین میں ناصرالدین قباچہ اور اورنگ زیب عالمگیر قرآن مجید کی کتابت سے اپنے ذاتی مصارف پورے کرتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے وصایا میں لکھا ہے کہ

"سہ صد و پنج روپیہ از وجۂ کتابت قرآن باقیست۔ اورا در کفن دفنِ این بے چارہ صرف نمایند۔"

۳۰۵ روپے کتابتِ قرآن کی اُجرت موجود ہے۔ اسے اس بے چارے کے دفن وکفن میں صرف کریں۔
یہ وہی عالم گیر ہے جس کے متعلق علامہ شبلی نے کہا ہے کہ

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالم گیر ہندو کُش تھا ظالم تھا ستم گر تھا

عہدِ شاہ جہاں و عالم گیر میں مغل شہنشاہی (بشمول ہندستان و افغانستان) کے سالانہ محاصل اسّی کروڑ رُپے تھے — لیکن شہنشاہِ وقت کے ذاتی مصارف کتابتِ قرآن سے پُورے ہوتے تھے۔" احترامِ کتاب وقلم" کی اس سے درخشاں تر مثال کہاں ملے گی؟ آج تو نہیں لیکن آج سے نصف صدی قبل خوش خطی شرفا کا طرۂ امتیاز تھا اور خطاطی و خوش نویسی کی تعلیم اسی طرح داخلِ درس تھی جس طرح آج ٹائپ سیکھے بغیر تعلیم کو ایک حد تک نامکمل کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے خطاطی کے فن میں جو کمالات پیدا کیے اور خطوط کی ضمنی قسمیں ایجاد کیں مثلاً خطِ کوفی، خطِ نسخ، خطِ نستعلیق، خطِ گلزار، خطِ شفیعہ، خطِ غبار، خطِ ماہی وغیرہ وہ سب احترامِ کتاب وقلم کے سلسلۂ زرّیں ہی کی کڑیاں ہیں۔ پہلے ابلاغ کا ذریعہ صرف کتاب تھی یا زبانی گفتگو۔ اب ٹی۔وی، ریڈیو، فلم اور تھیٹر اہم ترین ذرائعِ ابلاغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ آج بھی ان سب کا سرچشمہ قلم وکتاب ہی ہے۔ لوگ پڑھی ہوئی چیزوں پر آج بھی سُنی ہوئی باتوں سے زیادہ اعتماد رکھتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی۔وی سے جو خبریں سُنائی جاتی ہیں وہ اس وقت تک مطمئن نہیں کرتیں جب تک ہم انھیں حروف و الفاظ کی شکل میں نہ دیکھ لیں۔ آج بھی وہی معاہدے قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہیں، اُنھی دستاویزوں پر بھروسا کیا جاتا ہے جو کتابی شکل میں ہوتی ہیں۔

جس طرح نطق و فکر انسان کی فضیلت ہے اسی طرح قلم وکتاب بھی اس کی خصوصیت ہے، بلکہ نطق و فکر کا مادہ ابتدائی شکل میں بے ہنگم طور پر حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن کتاب وقلم صرف انسان اور صرف انسان سے مخصوص ہے۔ کوئی جانور صاحبِ کتاب نہیں اور نہ کسی حیوان کو اہلِ قلم کہہ سکتے ہیں۔ کتاب وقلم جہاں بھی ملیں گے وہیں انسان پایا جائے گا اور جہاں انسانیت موجود ہوگی وہاں قلم و کتاب کی موجودگی ناگزیر ہے۔ میں نے اس مضمون کی ابتدا میں عرض کیا تھا کہ احترام کا سرچشمہ ادب ہے

گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

اور اس حفظِ مراتب میں پہلا مرتبہ احترامِ کتاب وقلم ہے۔ یہ شعر لسان الغیب حافظ شیرازیؒ نے آج سے چھ سو سال قبل کہا تھا۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیٔ مئے ناب و سفینۂ غزل است

آپ صراحیٔ مئے ناب کو مسترد کر سکتے ہیں لیکن سفینۂ غزل سے بھلا کون دست بردار ہو سکتا ہے ۔

کتابے و فراغتے و گوشۂ چمنے

میری نظر میں سوائے چک بک کے ہر کتاب محترم ہے ۔ چک بک کو اپنے ساتھ تو رکھنا چاہیئے مگر اس کا احترام نہیں کرنا چاہیئے کہ سارے مصائب و آلام کی جڑ صرف کاغذ زر ہے ۔

بذوق و شوق ہمیں انتخاب ہستی کن
قلم بیار و کتابے بگیر و مستی کن

جناب محترم ذوالفقار علی بخاری

حکیم محمد سعید صاحب کو خدا خوش رکھے، اُن کو بڑے بڑے گُر یاد ہیں۔ سب سے بڑا گر اُن کو یہ یاد ہے کہ جہاں رئیس امروہوی صاحب اور دیگر مشاہیر سے ہم کو متعارف کراتے ہیں وہاں مجھ ایسے گُم نام کو بھی کُنجِ عزلت سے باہر کھینچ نکالتے ہیں۔ حکیم صاحب بڑے نباض ہیں اُن کو ہماری دُکھتی ہوئی رگ معلوم ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ بخاری ہر چند گوشہ نشین بلکہ پردہ نشین ہے۔ گاہے گاہے بشری کمزوری اِس پر غالب آجاتی ہے اور یہ شامِ ہمدرد کے گوشۂ بساط پر دامانِ باغبان اور کفِ گل فروش سے تمتع حاصل کرنے دبے پاؤں گھس آتا ہے۔

میں نے ایک مرتبہ قبل بھی اسی چبوترے سے اُردو میں تقریر کی تھی۔ میری اُردو تقریر کا انگریزی ترجمہ فرمایا گیا اُس سے انگریزی زبان کی کوتاہ دامنی بلکہ تہی دامنی کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے میں ان لوگوں سے گزارش کرتا ہوں جو میری تقریر کا ترجمہ کرنے کے لیے فونٹن پن تیز کررہے ہیں از راہِ کرم انگریزی زبان کی دھجیاں نہ بکھیریں۔ انگریزی زبان کا تاروپود پہلے ہی اس ملک میں بکھر چکا ہے۔ اب اُس کو دُھننے سے کیا فائدہ! اگر کوئی ہماری اُردو نہیں سمجھتا تو نہ سمجھے اور انگریزی کے ذریعہ سے سمجھنا چاہتا ہے تو خدا کرے بالکل ہی نہ سمجھے۔

حکیم صاحب کے ہاں صدرِ مجلس پر یہ فرض بھی عائد کردیا گیا ہے کہ وہ موضوع شام پر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ ہر چند کہ صاحبِ شام یعنی مقالہ نگار اپنے مقالے میں اپنے خیالات کا اظہار نہایت فصاحت اور بلاغت سے کرچکا ہو۔

آج کا موضوع ہے احترامِ قلم وکتاب اور اس موضوع پر جو کچھ محب عزیز رئیس امروہوی صاحب ارشاد فرما چکے ہیں اُس پر اضافہ کرنا ضیاعِ قرطاس وسواد ہے بلکہ ضیاعِ آواز و آہنگ ہے۔

آہنگ وعاچنگ ونے وعود نخواہد

ابریشم ایں ساز کنم نالِ قلم را

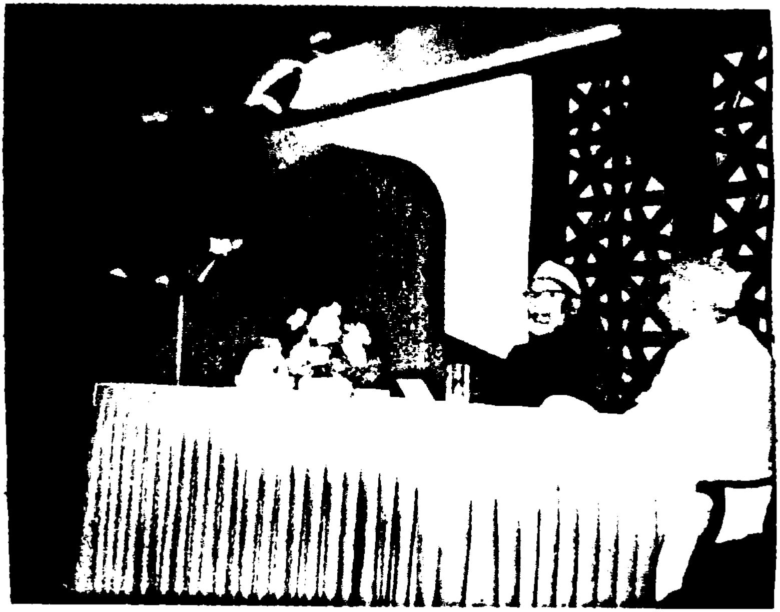
لاریب کہ ہم کو قلم اور کتاب کا احترام کرنا ہے لیکن یہ بھی دیکھنا ہوگا کہیں وہ قلم جس کا ہم احترام کررہے ہیں لنگڑا تو نہیں! کہیں وہ کتاب جس کو ہم محترم و معزز سمجھتے ہیں ایسی تو نہیں جسے پڑھ کر بچے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں!

کتاب کا احترام کرنے کے لیے وہ کتب خانے تلاش کرنے ہوں گے جہاں قابلِ احترام کتابیں

رکھی جاتی ہیں۔ قلم کا احترام کرنے کے لیے اُن نیستانوں میں مارے مارے پھرنا ہوگا جہاں کی نے کے قلم کا ریشہ یا نال اُس ساز کے تاروں کے لیے ابریشم کا کام دیں جن پر مضراب کی ایک ضرب سے دلوں کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ یعنی وہ قلم جو ایسا ن لکھیں کہ قلم اور سطور کی عصمت کی قسم کھانی پڑے اور پھر بین السطور میں ایسی جگہ چھوڑ جائیں کہ اُن پر حاشیہ لکھتے وقت خامے کو خوف ہو کہ زبان پھر قلم نہ ہو۔

ہر چند کہ سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے، لیکن صاحب لوح و قلم کی قسم کہ آج کل کی اکثر و بیشتر کتابیں ایسی ہیں جن کا لکھنا آسان ہے لیکن جن کو پڑھنا مشکل ہے۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ خاقانی کے قصائد کی طرح ادق ہیں یا اُن کو سمجھنے کے لیے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اکتسابِ علم کرنا پڑتا ہے بلکہ اُن کے مضامین ہی ایسے ہوتے ہیں جو نہ دماغ پر چڑھیں نہ دل میں اُتریں۔ ہم احترامِ قلم و کتاب کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اہلِ قلم کو بھی لازم ہے کہ دیکھ لیں کہ اُن کی نوشت کے قلم کو ٹیڑھا قط تو نہیں لگا اور اُن کی کتاب ایسی تو نہیں جس کو پڑھ کر مارشل لا پھر سے عائد کرنا پڑے۔ آج کل بعض کتابیں تو ایسی نکلتی ہیں جو مفت یافتہ ہوتی ہیں یا انعام یافتہ۔ اِن کتابوں میں زیادہ تر تقریظیں تقریبیں تعارف مقدمے مثلیں گواہیاں اور شہادتیں ہوتی ہیں۔ مراد یہ کہ کتاب کا جلوس نکالا جاتا ہے کہ فلوس حاصل ہوں۔

یہ ایسی کتابیں ہیں جن کا احترام نہ رئیس صاحب کرتے ہیں نہ حکیم سعید صاحب کر سکتے ہیں، اِن سب کتابوں کو میں قابلِ ضبطی سمجھتا ہوں۔ اللہ اور آج کل کے پڑھنے والے مجھے معاف فرمائیں۔



بریگیڈیر گلزار احمد، مولانا عبدالقدوس ہاشمی (صدر مجلس)، ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی (مقرر)

احترامِ شعائراللہ

کلماتِ ابتدائیہ	:	جناب محترم بریگیڈیر گلزار احمد
مقالہ	:	جناب محترم ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی
کلماتِ صدارت	:	جناب محترم مولانا عبدالقدوس ہاشمی

شامِ ہمدرد، راولپنڈی
۲ مئی ۱۹۷۲ء

جناب محترم بریگیڈیر گلزار احمد

یاَیُّھا الَّذِینَ اٰمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللہِ
اے ایمان والو خدا (کی پرستش) کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو
(۲:۵)

ہر فلسفۂ حیات کی چند امتیازی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر مکتبِ فکر کے لیے بعض مقامات سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ ہر انسانی گروہ ایسے واقعات کے ساتھ وابستگی رکھتا ہے جو اس کی تاریخ میں اہم مقام کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ امتیازی خصوصیات، یہ مقدس مقامات اور یہ قلب و ذہن کو گرمانے والے واقعات اپنے اپنے مذاہب، اپنے مکتبِ فکر اور اپنے فلسفۂ حیات پر ایمان رکھنے والوں کے لیے نشانیوں کا مقام رکھتے ہیں۔ دینِ اسلام کے مطابق اسی کو کتاب اللہ میں شعائر اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ انگریزی لفظ (Symbol) شعائر کے قریب ترین معانی کا حامل ہے۔ شعائر، نشانیاں، سمبل، آپ نام کچھ ہی کیوں نہ دیں مکتبِ فکر اور فلسفۂ حیات کے اندر وحدتِ فکری اور ذہنی انضباط کا مقام رکھتے ہیں۔

وحدتِ فکری اور ذہنی انضباط کی اہمیت پر بحث لاحاصل ہے۔ اس لیے کہ جس انسانی گروہ میں ذہنی و فکری مرکزیت نہ ہو اس انسانی گروہ کا باہم زندگی گزارنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ وحدتِ فکری ہی کسی قوم و ملت کو یکجا رکھ سکتی ہے اور جب قومی فکر پریشان ہو جائے تو قوم کی پریشانی و انتشار میں دیر نہیں لگتی۔

اللہ کی نشانیاں یعنی دینِ اسلام کے وہ اہم مقامات، اس کی اہم عبادات اور اس کے اہم واقعات جب ذہن کے سامنے آتے ہیں تو اُن کی تہہ میں جو فلسفہ ہوتا ہے اُس پر ایمان و یقین ہی ہمیں یکجا اور متحد رکھنے کا موجب بنتا ہے۔

مولانا محمد صغیر حسن معصومی ۱۹۱۸ء میں پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ تحصیلِ علم کا آغاز مکتب سے ہوا اور آکسفرڈ میں جاکر ختم ہوا۔ البتہ اوائل عمر کی تعلیم اپنے والد ماجد جناب مولانا مفتی امیر حسن بہاری صاحب سے حاصل کی۔ مرکزی تعلیمی بورڈ کلکتہ کے عالم و فاضل کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں مولانا اعزاز علی مرحوم کے اسباق میں شرکت کی۔ بعد میں حکیم عبدالعلیم سے لکھنؤ میں علم طب کی تحصیل بھی کی۔

بعدازاں مدرسہ حمادیہ ڈھاکہ میں بطور مدرس مقرر ہوئے۔ آپ یہاں طالب علم بھی رہ چکے تھے ڈھاکہ میں انگریزی سے بھی دسترس پیدا کی اور بی۔ اے آنرز کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۹۴۶ء میں اسلامک اسٹڈیز میں ایم۔ اے کرنے کے بعد ڈھاکہ میں لکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک اوکسفرڈ میں اور وہاں ابن باجہ کے علم النفس پر مقالہ لکھنے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ انگریزی مقالہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی شائع کرچکی ہے۔ عربی کا حصہ مع حواشی و تعلیقات مجمع علمی عربی دمشق سے شائع ہوا جس پر شام کی حکومت سے اعزاز ملا۔

۱۹۶۰ء کے اواخر میں سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے صدر مقرر ہوئے۔ دو سال بعد جب محکمۂ اوقاف نے ائمہ مساجد کی تربیت کے لیے اکیڈمی علوم اسلامیہ کو قائم کیا تو آپ وہاں تشریف لے گئے۔ جب اکیڈمی جامعہ اسلامیہ بن کر بھاولپور منتقل ہوئی تو آپ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے اور آج اس کے صدر الصدور ہیں۔ آپ نے اُردو، انگریزی اور عربی میں تحقیقی مقالات لکھے ہیں جو علمی حلقوں میں مقبول ہوئے ہیں۔ تفسیر، حدیث، فلسفہ، فقہ، تاریخ پر گہری اور عمیق نظر رکھتے ہیں۔ قدیم مخطوطات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ عربی کتابوں کی ترتیب کامیابی سے کی ہے۔

جناب محترم ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی

میں سب سے پہلے شکریہ ادا کرتا ہوں اس بات کا کہ مجھے یہ موقع عطا کیا گیا ہے کہ آپ کے سامنے شعائر اللہ کے احترام کے متعلق کچھ اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ سب سے پہلے تمہیدی طور پر اس نکتے کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جس معاشرے سے ہمارا تعلق ہے وہ خدائے بزرگ و برتر پر ایمان رکھتا ہے، 'لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ' کا قائل ہے اور اس لیے اسلام کا علم بردار ہے۔ جب ہم اللہ تعالیٰ کو اپنا مسجود و معبود متعین کر لیتے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ رب العالمین کا رسول و پیغمبر مانتے ہیں تو ہم اللہ کے بیان کردہ حدود و شعائر پر ایمان رکھنے کی تصدیق کرتے ہیں اور احکام قرآنی اور اسوۂ رسول پر عمل پیرا ہونے کا دعوا۔ یہی عقیدہ اور یہی ایمان ہماری نجات اُخروی اور فلاحِ دارین کا ضامن ہے۔ یہی عقیدہ ہمارے اسلاف کا تھا، یہی عقیدہ آج بھی ہم سارے مسلمانوں کا ہے اور یہی عقیدہ ہمارے نقشِ قدم پر چلنے والی، اسلام کا دعوا رکھنے والی نسلوں کا ہوگا بنا بریں قرآنی آیات کے مطابق عمل کرنے والے معاشرے میں کسی طرح کی خلیج اور کوئی طبقاتی درجہ بندی متصور نہیں ہو سکتی۔ ہاں! اگر ہمارا معاشرہ اپنی تہذیب، اپنی روایات اور قرآن حکیم کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت کو خیرباد کہہ دے تو ایسا معاشرہ ہر قسم کے تغیرات، نت نئے حوادثات اور انقلابات کا شکار بن سکتا ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں اسلامی تہذیب و روایات کا فقدان ہو، اور جو معاشرہ غیر اسلامی تہذیب و ثقافت کا حامل ہو، کیونکر اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے؟ ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سیاسی، سماجی اور اقتصادی اور ثقافتی امور و مسائل میں اسلامی اصول یعنی قرآنی احکام اور پیغمبر اسلام کے بیان کردہ اوامر و نواہی کی جگہ لادینی اصول و ضوابط اور مغربی افکار و نظریات سے کام لیا جائے اور اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، رہن سہن، لباس و عادات، معاملات و عبادات، افعال و کردار میں جن میں ہمارے مسلمان اسلاف غیر مسلموں سے بلا شک و شبہ ممتاز تھے اور جن کی وجہ سے بہ یک نظر مسلم و غیر مسلم میں فرق و امتیاز کیا جا سکتا تھا، اگر آج ہم اپنے مسلّمہ اسلامی طریقوں کو چھوڑ کر غیر مسلموں میں گھل مل جائیں اور اپنا امتیاز کھو بیٹھیں تو پھر ہمارے مسلمان کہلانے یا بظاہر دوسروں کی نقالی سے ہم میں چار چاند لگ گئے یا لگ جائیں گے؟ لفظ 'نقالی' سے اردو کی مشہور کہاوت یاد آگئی: 'کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی

سمجھوں گیا۔

بنا بریں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ گزشتہ ربع صدی سے یہاں کے معاشرے میں مغربی تمدن و ثقافت کی نقالی روز افزوں ہے اور مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک میں مغربی ثقافت کی ریل پیل ہے مگر ہر جگہ مسلمانوں میں نکبت و ادبار کی صورت اور گرانی و استحصال کی نحوست بر روز بڑھتی ہی جاتی ہے کہنے کو معیار زندگی کی بلندی کا دعوا آج ہر کہ و مہ کی زبان پر ہے۔ گھر گھر ریڈیو اور ٹیلے وژن کی عادت لوگوں کو پڑتی جاتی ہے۔ اور ہر برسراقتدار حکومت اس کی ترقی میں نئے نئے انداز سے اضافے کی کوششیں کرتی ہے مگر نتیجے میں ہمیں قومی انحطاط اور بداخلاقیوں کی ترقی کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ روز روز کے اغوا، قتل و خون کے واقعات کے ہم اتنے خوگر ہو چکے ہیں کہ ان کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اور جب ہاکس بے جیسا ایک غیر معمولی واقعہ پیش آجاتا ہے تو ہم سب شرم و ندامت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ بعض غیور طبیعتیں اس کی صداقت کا انکار تک کرنے لگی ہیں اور بعض سنجیدہ لوگ تعلیمی نظام میں کیڑے نکالنے لگے ہیں۔ رات دن کی تخریبی سرگرمیاں بھلا چند گھنٹوں کی تعمیری کوششوں کو کیونکر پھولنے پھلنے کا موقع دے سکتی ہیں۔ گھر کا ماحول، ٹولے محلے کا ماحول، اسکول کالجوں کی فضا، کھیل کود کے میدانوں کے نقشے، جلسے، جلوس، مذاکرے، لائبریریاں، آفس و عدالت گاہیں، تھانے اور کچہریاں، بازار، پارک، غرض کہاں کے طور طریقے دین داری، صداقت و ایمان داری، دیانت داری و پرہیزگاری، تقویٰ و طہارت، خلوص و محبت، پاکی و پاکبازی کے مظاہرے کرتے ہیں کہ ہمارے اخلاق اعلا سے اعلا ہو جاتے۔ اور جب ہم اخلاق فاضلہ سے معرا و مبرا ہیں تو صرف ظاہری باتوں میں نقالی کر کے ان اقوام کا مقابلہ کیونکر کر سکتے ہیں جو اگرچہ اخلاق فاضلہ کے حامل نہیں مگر ایثار و قربانی اور محنت و مشقت کے عادی و خوگر ہیں! اور اس لئے ہر شعبۂ حیات میں ترقی کے منازل طے کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں!

یہ باتیں اگرچہ تمہیدی تھیں، مگر ان حقائق زندگی کی نشاندہی کے بغیر شعائر اللہ کے احترام کا ذکر بے سود ہوتا۔ قرآن پاک میں "شعائر اللہ" کا ذکر حج کے تفصیلی احکام کے بیان سے متعلق ہے۔ ایک جگہ سعی بین الصفا والمروۃ یعنی طواف خانۂ کعبہ کے بعد صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان دوڑنے کی اہمیت کا اس طرح اظہار کیا گیا ہے: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ "بیشک صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہے۔" یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو نشانِ امتیاز قرار دیا ہے اور اس لیے اس کے حکم سے سرتابی نہیں کی جا سکتی۔ گو بظاہر ان دونوں علامتوں کے درمیان دوڑنے سے ہمیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، ہم یہاں بیان نہیں کر سکتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ مناسک حج میں البتہ سعی ما بین صفا و مروہ کی اہمیت ہے اور وہ بھی حکم خداوندی کی وجہ سے۔ دوسری جگہ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے،" ذٰلك ومن يُعظّم شعائر الله فانها من تقوى القلوب (الحج : ۳۲)
یہ بات ہو چکی، اور جو کوئی دینِ خدا کی یادگاروں کا ادب رکھے گا، سو یہ ادب دلوں کی پرہیزگاری
میں سے ہے؛ شعائر، شعیرۃ یا شعارۃ کی جمع ہے۔ اسی لفظ سے اصطلاح میں شعار القوم
مستعمل ہے، جس کا مفہوم ہے "جنگ میں قوم کی علامت اور نشانی"۔ اللہ تعالیٰ کے "شعائر" سے
مراد اللہ تعالیٰ کے دین کے عَلَم، نشانیاں اور علامات ہیں جو ہر قوم اور ہر شخص کے لئے بطور امتیاز
مخصوص ہوتے ہیں۔ بنا بریں اللہ تعالیٰ کے شعائر اس کے وہ عبادات کے خاص، دستور،
ہیں جو اُس نے فرماں بردار قوم کے امتیاز کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔ اُن کی پابندی دلی پرہیزگاری
ہے۔ قومی اور ملکی نشانوں کو ہلکا جان کر ترک کرنا ایک طرح کا فسق اور بدکاری ہے۔ اس لیے کہ اُن کے
ترک کرنے سے قوم قوم نہیں رہتی، قومی شیرازہ قائم نہیں رہتا۔ آج کی طرح، اُس وقت بھی، بعض
بے باک طبایع دینی علامات اور قومی شعار کو فضول جانتی تھیں اور کہتی تھیں کہ دل میں خدا پرستی
ہونی چاہیئے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ یہ بھی دلی پرہیزگاری سے متعلق ہے، اس کے منافی
نہیں۔ اس آیتِ پاک میں شعائر سے مراد احکامِ حج ہیں، قربانی کرنا، طواف کرنا، احرام باندھنا اور
احرام میں شکار نہ کھیلنا، سر منڈانا وغیرہ وغیرہ۔ حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں: شعائر اللہ چھ ہیں:
صفا، مروہ، قربانی کے جانور، جمار (کنکری مارنا)، مسجد حرام، عرفہ، رکن یمانی اور اُن کی تعظیم حج کے
اتمام کے لیے ضروری ہیں۔ حضرت ابن عمر، حسن، مالک اور زید فرماتے ہیں کہ شعائر حج کے سارے
مواضع منیٰ، عرفہ، مزدلفہ، صفا، مروہ اور خانۂ کعبہ وغیرہ سب شامل ہیں۔ بعض کہتے ہیں شعائر اللہ
دینِ خداوندی کی شریعتیں ہیں، اور اُن کی تعظیم کا مفہوم ہے اُن پر سختی سے کاربند رہنا، اور اللہ تعالیٰ
کے حکموں کو کوتاہی و سستی کے بغیر بجالانا۔

آئیے اس آیتِ پاک سے قبل کی آیت پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں۔ ارشاد ہے: ذٰلك، ومن يُعظّم
حُرمٰتِ الله فهو خيرٌ له عند ربه ، و اُحِلّت لكمُ الانعامُ اِلّا ما يُتلىٰ عليكم
فاجتنبوا الرّجسَ مِنَ الاوثانِ وَاجتنبوا قول الزّورۃ حُنَفَاء لِلّٰهِ غير مشركين
به ، ومن يُشرك بالله فكانّما خرّ من السّماء فتخطفه الطير او تهوى
به الرّيح فى مكانٍ سحيق ۞ " (۲۲: ۳۰ تا ۳۳)

"بات یہ ہے، اور جو کوئی بھی اللہ کے محترم احکام کا ادب کرے گا، سو یہ اُس کے
حق میں اُس کے پروردگار کے پاس بہتر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حلال کر دیے ہیں
تمہارے لیے چوپائے بجز اُن کے کہ جو تم کو پڑھ کر سُنا دیے گئے۔ سو تم بچے رہو
بُتوں کی گندگی سے اور بچے رہو جھوٹی بات سے، جھکے رہو اللہ تعالیٰ کی طرف،

اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرکے۔ اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے
تو جیسے وہ گر پڑا آسمان سے پھر پرندوں نے اُسے نوچ ڈالا، یا ہوا نے اُس کو
دُور دراز جگہ جا پھینکا۔"

حرمات اللہ یعنی احکام مخصوص کا بیان تو ہو چکا۔ اب ایک کلیہ یہ بیان ہوتا ہے کہ جو بھی احکام الٰہی سُنے، جو کوئی اُن کا ادب و لحاظ علماً رکھے گا اس طرح کہ انھیں حاصل کرے اور عملاً اس طرح کہ اُن کی خلاف ورزی نہ کرے، سو یہ احکامِ الٰہی کا ادب و احترام اسی کے کام آئے گا۔ اور سبب بن جائے گا بلندی درجات کا، عفو سیئات کا، حصول خیر و برکات کا۔ حرمات اللہ میں وہ ساری چیزیں جو محبّت و تقرب سے اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب ہیں داخل ہیں۔ مثلاً احکام الٰہی، کتبِ دین، شعائر اللہ، مقاماتِ مقدسہ، اوقاتِ متبرکہ، بندگانِ مقرب (ملائکہ، انبیاء، صلحاء) آثار کاملین وغیرہ۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ تشبیہ میں شکاری پرندوں سے مراد نفس کے اوہام اور وسوسے ہیں اور ہوا کے جھکڑ سے مُراد شیطان کا حملہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ 'شعائر اللہ' سے آیتِ پاک میں خاص طور پر قربانیاں مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کی عام تعظیم واحترام کا کلیہ تو بیان ہو چکا۔ اب تاکیدی حکم قربانیوں کے باب میں دیا جا رہا ہے (آج کل اقتصادی وجوہ کی بنا پر بعض لوگ قربانی کے حکمِ خداوندی کو، نعوذ باللہ، فضول سمجھتے ہیں)۔ قبل کی آیتوں میں شرک کی مذمت بار بار ہو چکی تھی، اس آیت نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ شرک بُری چیز ہے، لیکن غیر اللہ کی تعظیم بُری نہیں، بلکہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب و منتسب ہیں اُن کی تعظیم و تکریم تو عین جزو دین ہے۔ فقہائے کرام کا استنباط اسی آیت پر مبنی ہے کہ تعظیم غیر اللہ مستقلاً ممنوع اور ناجائز ہے، لیکن بہ لحاظ نسبت و تقربِ ذاتِ الوہیت جائز و مشروع ہے۔ بعض عارفوں نے یہاں سے دو مسئلے نکالے ہیں: ایک یہ کہ تقویٰ کا اصل محل قلب ہے۔ دوسرے یہ کہ شعائر دین کی، جس کے اندر انبیاء و اولیاء کے آثار بھی شامل ہیں، تعظیم حدودِ شرعی کے اندر خود مشروع ہے۔ تقویٰ کے مفہوم میں آج کل بعض حضرات تاویلیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا مطلب خوفِ الٰہی نہیں، کانٹوں کو بظاہر یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے، مگر کانٹوں سے بچ کر چلنا، مکروہات سے احتراز کرنا، ظاہر ہے خوف اور ڈر کے مفہوم کو مستلزم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام یعنی اوامر و نواہی کے بجا لانے کا خیال تو اسی لیے پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی اور عصیان کا نتیجہ عذاب ہے جس کے خوف سے انسان کے اوسان خطا ہوتے ہیں، غرض نتیجے کے لحاظ سے تقویٰ کا مفہوم خوفِ خداوندی ہی پر منتہی ہوتا ہے۔

اب کہ جب 'شعائر اللہ' کے مفہوم کی وضاحت اس مختصر سے وقت میں کسی قدر کی جا چکی ہے

اور آیتِ پاک کی تفسیر بھی واضح ہو چکی ہے، بے جا نہ ہوگا اگر ہم شعائر اللہ کے مفہوم کی تحدید و تعیین کی کوشش اس طرح کریں کہ آسمان و زمین، کائناتِ عالم اور ساری موجودات جن میں سے بعض کا مشاہدہ ہم کرتے ہیں اور بعض کا بلکہ بہتوں کا مشاہدہ نہیں کر پاتے، سب اللہ تعالیٰ کے شعائر ہیں سب اپنے خالق اور رب العالمین کی امتیازی خصوصیتیں ہیں جن کی تعظیم و تکریم ہم پر لازم ہے۔ یہ مفہوم ظاہر ہے آفاقی اور کائناتی ہے۔ جب ہم اپنی نگاہ سارے عالم سے ہٹا کر انسان پر مرکوز کرتے ہیں تو اُس کی زندگی کے دو پہلو ہمارے پیشِ نظر ہوتے ہیں: انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی، اور یہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا فطری عوامل کے اثر و نفوذ سے انکار کرنا ہوگا۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے دونوں طرح زندگیوں کے لحاظ سے احکام و حدود کی توضیح کی ہے۔ ان سارے احکام و حدود کو ہم جیسا کہ پہلے کہہ چکے ہیں شعائر اللہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور قرآن حکیم کے بتائے ہوئے ان کی شعائر کی عملی تعبیر اسوۂ رسول اور پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خُلقِ عظیم ہیں جن کی اسلامی صورتیں آثارِ صحابہ، روایاتِ تابعین اور اعمال سلف صالحین کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہیں، اور جن کی قلمی توضیحات احادیثِ نبوی کے مجموعوں، قرآن حکیم کی تفسیروں اور اسلامی قوانین کے دفاتر میں محفوظ اس عہد تک آپہنچی ہیں، اور رُوئے زمین کے مسلمان اُن کے مطابق شرائعِ دین کی ادائی کی جد و جہد کرتے ہیں۔

یہ وہ شعائر اللہ ہیں جن کو ادا کرنے کی وجہ سے فرزندانِ اسلام نے سرزمینِ عرب سے نکل کر دُنیا کی مہذب ترین اقوام کو اپنی ایمانی اور اخلاقی قوتوں سے مفتوح کیا۔ دشمنوں کی کثیر تعداد اور مادّی وسائل کی بہتات ان بے سرو سامان، سادہ لوح، سادہ دل، سادہ زندگی کے دلدادے فرزندانِ اسلام کے آگے کچھ کام نہ آئی۔ رومیوں اور ایرانیوں کی فوجی تنظیمات، جنگی تجربے، حربی صلاحیتیں بیش قیمت اسلحے، جنگی گھوڑے اور جنگی ہاتھیوں کی قطار سب کچھ چند ہزار مسلمانوں کے آگے ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ یہ مسلمان وہی عرب تھے جن کو قیصر و کسریٰ اور اُن کی رعایا بادیہ نشین، تہذیب و تمدن سے عاری، کم زور و ناتوان سمجھتے تھے، جن کو کبھی کسی معرکے میں اجنبیوں کے آگے کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی وہی بادیہ نشین رسولِ عربیؐ پر ایمان لاکر شعائر اللہ کو سینے سے لگا کر اس رُوحانی طاقت کے حامل ہو گئے کہ بیک وقت دُنیا کی ان دو بڑی سلطنتوں پر غالب آگئے۔ اور اُن کے فتوحات کا سلسلہ اعلائے کلمۃ الحق کی غرض سے دیکھتے دیکھتے بحرِ اوقیانوس (اتلانتک) کے ساحلوں اور بحرِ ہند نیز بحرِ الکاہل (پیسفک) کے کناروں تک جا پہنچا۔

آج کیا وجہ ہے کہ مسلمان تعداد کی اس قدر کثرت، علمی و سیاسی سرگرمیوں، مغربی تہذیب و تمدن میں اس قدر مہارت اور خوبی حاصل کرنے کے باوجود دنیا کی دوسری عظیم طاقتوں کے دست نگر ہیں، نیز

بعض اسلامی ریاستیں دولت و ثروت اور بعض دوسری مخزونوں سے مالا مال ہونے کے باوجود خود اپنی ہستی کے لیے ہر طرح محتاج ہیں، اور اُن کی ہستی، اُن کا وجود دوسری اقوام کے رحم و کرم پر ہے؟ سب سے الگ ہو کر باوقار زندگی گزارنے کے ہم قابل ہیں نہ اپنی حفاظت اور دفاع کی سکت رکھتے ہیں۔ ہماری عالم گیر تنظیمیں کس کام کی؟ اگر ان میں امدادی خون دوڑائے بغیر حیات کے آثار نظر نہ آئیں۔ آج بظاہر ہم آزاد کہلاتے ہیں، مگر جب اپنے کو دیکھتے ہیں تو اپنی ساری چیزیں قرض، امداد اور عطایا کی حاصل کردہ اور مستعار نظر آتی ہیں۔ دوا، غذا، جدید رسوم و عادات، اشیاء تفریح اور علمی کتابیں، غرض کونسی چیز ہے جو خود ہماری محنت کی پیداوار ہے اور جس کے حصول میں ہم دوسروں کے دست نگر نہیں! حد یہ ہے کہ ہماری وابستگی اپنے دین کے ساتھ بھی مستشرقین کی رہینِ منت ہے اور ہمارے اکثر دانشور قرآن و سنت کو بھی سمجھنا چاہتے ہیں تو بیسویں صدی کی غیر اسلامی تعبیروں اور لادینی تفسیروں کی وساطت سے، اور اسلامی تعلیمات و عقائد سے جو کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہ بھی انگریزی زبان اور انگریزی کتابوں کے وسیلے سے۔

اسلام، بہرکیف، مایوسی اور قنوطیت سے منع کرتا ہے، اور ہر وقت اپنے فرزندوں کے امن و تحفظ کی ضمانت کا وعدہ کرتا ہے۔ آیئے ایک بار پھر ہم جائزہ لیں کہ کن عوامل کو اپنانے سے ہم ترقی اور فلاح و بہبود کی راہ پر گام زن ہو سکتے ہیں، انگریزی زبان سیکھنا کسی طرح حرام نہیں کہ علوم جدیدہ اور سائنس کے مختلف شعبوں میں مہارت پیدا کرنے کے لئے یہ زبان بین الاقوامی حیثیت کی حامل ہے۔ تجربی علوم میں نیز ہر طرح کے فنون میں جن پر ہماری بقا و ترقی کا دارومدار ہے کمال حاصل کرنا دینی فرائض میں داخل ہے، ہماری نکبت و افلاس کی اصل وجہ اس بات کے احساس کا فقدان ہے کہ ہم مسلمان ہیں، وہ مسلمان جس کو اخلاقِ فاضلہ کا مجموعہ ہونا چاہیئے، جس کو ایثار و قربانی، اخلاص و محبت کا پتلا ہونا چاہیئے، جس کا نام اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ یہ عزم کا سچا اور قول کا پکا ہے، یہ اعتماد کے لائق ہے اور وعدہ خلافی کبھی نہیں کر سکتا۔ اگر آج بھی ہم یہ عہد کر لیں کہ امن و امان سے خود رہیں، اور اپنے مسلمان بھائیوں اور دوسری رعایا کو امن کے ساتھ رہنے دیں، ریا، استحصال، جھوٹ، فریب سے احتراز کریں اور دنیا کی محبت کو ایک سچے مسلمان کی طرح ترک کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ شکست خوردہ قوم پھر سر بلند نہ ہو جائے اور ہماری خوبیاں دوسروں کے لیے مشعلِ راہ نہ بن جائیں۔

پس شعائر اللہ کے احترام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے کو پہچانیں، اپنی دینی قومی روایات و خصائص کا تحفظ کریں کہ اس طرح ہمارے دنیاوی مسائل بڑی آسانی سے حل ہو سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایلوپیتھک کے ساتھ ساتھ ہومیو پیتھک اور طبِ یونانی ہمارے ملک کے علاج و معالجے کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیتے رہے ہیں، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یونانی طریقۂ علاج صدیوں تک نوع انسان کی خدمت کرتا رہا ہے اور آج بھی ایلوپیتھک دوائیں دیسی دواؤں، عقاقیر اور جڑی بوٹیوں ہی سے بنتی ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جہاں ڈاکٹروں کی رسائی نہیں وہاں معمولی طبّی دواؤں سے آج بھی کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم اپنی تہذیب و ثقافت کو از سرِ نو اپنے کردار سے جلا بخشیں تو پھر ایک بار ساری دُنیا کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں، اور کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔

جناب محترم مولانا عبدالقدوس ہاشمی

میں جناب حکیم محمد سعید صاحب اور اُن کے رفقائے کرام کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اہلِ علم و فضل اور اربابِ دانش و بینش کے اس منتخب اور بہترین اجتماع میں مجھے صدارت کی عزت عطا کی۔ میں اپنی اہلیت و صلاحیت کو اچھی طرح جانتا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس بارے میں کسی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ من آنم کہ من دانم۔ بہرحال یہ عزت مجھے عطا کی گئی ہے تو یہ میرا فریضہ ہے کہ دو چار لفظ آپ کے سامنے بیان کروں۔

آج کی شام کے فاضل مقالہ نگار جناب ڈاکٹر صغیر حسن معصومی صاحب ڈائرکٹر ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد نے آج کے موضوع گفتگو یعنی احترام شعائراللہ سے متعلق وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو اس سلسلے میں کہا جانا چاہیے تھا، اس لیے میں یہ نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی اضافہ کروں۔ انھوں نے جو کچھ بیان کرنا تھا، اچھی طرح بیان کر دیا ہے۔ ہاں، میرے پاس جو دو چار منٹ موجود ہیں۔ اصل موضوع کی توجیہات و توضیحات پیش کرنے کے لیے اُن سے فائدہ اُٹھاؤں آپ یہ سُن چکے ہیں کہ شعائر عربی کا لفظ اور جمع کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی ہیں قابلِ دید اور محسوس نشانات جو کوئی نہ کوئی خصوصیت رکھتے ہوں۔ اب شعائراللہ کے معنی ہوئے ایسے واضح، محسوس اور مخصوص نشانات جن سے خالقِ کائنات کی یاد آجائے۔ اور جنھیں دیکھ کر ایک آدمی غفلت سے چونک جائے۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری غفلت ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ انسان کا سب سے سنگین گناہ غفلت۔ اور گناہوں کی سزا تو مرنے کے بعد ملے گی، لیکن غفلت وہ گناہ ہے جس کی سزا ہمیں دنیا ہی بلکہ اکثر صورتوں میں فوراً ہی مل جاتی ہے۔ اگر آدمی دروازے سے نکلتے ہوئے غافل ہو جائے تو شدید چوٹ کھانے سے نہیں بچے گا اور اگر راستے کی کیفیت سے کوئی چلنے والا غافل ہو جائے تو اُسے مختلف تکالیف سے دوچار ہونا ہی پڑے گا۔ اگر آدمی کو بار بار ایسے شعائراللہ کو دیکھنے کا موقع میسر آئے اور وہ اُن کی عظمت کا اثر لے سکے تو یہ صورت اُس کو غفلت میں پڑ کر حدود و تقویٰ سے متجاوز ہونے میں مانع ہوگی۔ اور نتیجتاً اس شخص میں تقویٰ کی کیفیت پہلے قلبی اور بعد کو عملی صورت اختیار کر لے گی۔ قرآن مجید میں شعائراللہ کا لفظ چار جگہ آیا ہے۔

سورۂ بقرہ آیت ۱۵۸۔ سورۂ مائدہ آیت ۲۔ سورۃ الحج آیت ۳۲ و ۳۶

ایک پانچویں جگہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۸ میں اسی معنی کے لیے المعشر الحرام کا لفظ آیا ہے۔
ان پانچوں مقامات پر شعائر اللہ یا المعشر الحرام کا لفظ بہ سلسلۂ حج قربانی اور مقاماتِ حج آیا ہے۔ ان میں سے سورۃ الحج کی آیت ۳۲ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب"
احترام شعائر اللہ کا دنیاوی فائدہ حصولِ تقویٰ ہے اور اُخروی فائدے کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ اگرچہ قرآن مجید میں شعائر اللہ یا المعشر الحرام کا لفظ صرف حج اور متعلقات حج کے سلسلے میں آیا ہے، لیکن اس سے یہ مفہوم مستفاد ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز یا نشان خاص جس سے خدائے بزرگ و برتر کی رحمت و رأفت یا جلال و جبروت کی یاد قلبِ انسانی میں تازہ ہو کر اسے غفلت سے چونکا دے شعائر اللہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اور یہ ایک فطری امر ہے۔ ایک بچہ دریا کے جس گھاٹ پر ایک بار ڈوبتے ڈوبتے بچ گیا ہو وہ اپنی ساری عمر میں جب کبھی وہاں سے گزرے گا اور اس گھاٹ کو دیکھے گا اُس کو اپنے ڈوبنے کا واقعہ یاد آ جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح گھر میں کوئی عورت اپنی شادی کے وقت میں مقیم رہی ہو، وہ بڑھاپے تک جب اس گھر کے پاس سے گزرے گی یا اُس کا ذکر سنے گی اسے اپنی شادی کی خوشی یاد آ جائے گی۔
اب ذرا سوچیے کس قدر غافل اور کتنا احمق ہے وہ شخص جو مسجد کا احترام نہ کرے اور اسے مسجد دیکھ کر بھی خدا کی یاد نہ آئے اور کتنا بے حس و سنگ دل ہے وہ شخص جسے قبر دیکھ کر بھی کلّ من علیہا فان ؕ و یبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام کی صداقت کا یقین نہ ہو۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ایسی ہر علامت کا احترام کریں جو ہم میں خدا کی یاد پیدا کرتی اور ہمیں تقویٰ کی طرف متوجہ کرتی ہو تاکہ ہم اچھے افراد اور ہمارا معاشرہ ایک اچھا معاشرہ بن سکے۔ ہم اگر توجہ کریں تو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ والسّلام



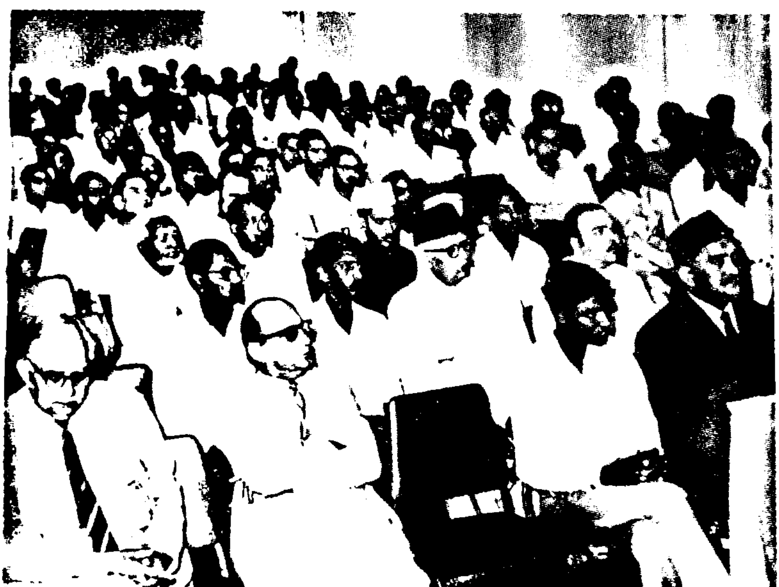
کلمات ابتدائیہ
ڈاکٹر حافظ محمد الیاس



دائیں طرف سے
جناب سید ہاشم رضا
جناب جی۔الانا (مقرر)
ڈاکٹر حافظ محمد الیاس



صدرِ مجلس
جناب سیّد ہاشم رضا
خطاب کر رہے ہیں



سامعین

عِزّت، احترام اور انحراف

کلماتِ ابتدائیہ : ڈاکٹر محمدؐ الیاس

مقالہ : جناب محترم جی۔ الآنا

شامِ ہمدرد، کراچی

١٨۔ مئی ١٩٧٢ء

ڈاکٹر محمد الیاس

آج شامِ ہمدرد میں آپ سب کا خیر مقدم کرتے ہوئے مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے، آج شام کا موضوع بھی احترام ہے۔ اس سال سارے ملک میں شامِ ہمدرد کا یہی موضوع ہے۔ موجودہ اخلاقی انحطاط و پستی کے دور میں آج احترام کے بارے میں بات کرنا بظاہر بے کار معلوم ہوتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ہمارا معاشرہ آج کل بے شمار بُرائیوں میں گھرا ہوا ہے۔ انسانی زندگی رفتہ رفتہ ایسی اخلاقی پستی میں مبتلا ہوتی جا رہی ہے کہ انسانی تعلقات میں رُوحانی ادراک کا فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ان باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ راستی، صداقت، انصاف اور محبت کی خوبیاں اب بھی غیر فانی ہیں۔

عزّت، احترام اور انحراف یہ تین الفاظ ایسے ہیں جن کا اطلاق انسانی زندگی کے تین مختلف عناصر پر ہوتا ہے: (۱) انسان اور اُس کی ذات (۲) انسان اور خدا (۳) انسان اور معاشرہ۔ انسان کی زندگی میں دو قوتیں ازل سے کارفرما ہیں یعنی نیکی کی قوت اور بدی کی قوت۔ ایک تعمیری ہے اور دوسری تخریبی اور یہ دونوں ایک دوسرے کے باہمی حریف ہیں۔ انسان کی اس چھوٹی سی دنیا میں یہ دونوں قوتیں مسلسل برسرِ کار ہیں۔ چنانچہ زندگی کی اسی نہ ختم ہونے والی کارروائی کا نتیجہ انسانی تمدّن میں منعکس ہوتا ہے۔

کسی تمدّن کا اندازہ اس بات سے نہیں لگانا چاہیئے کہ اس نے کتنی طاقت حاصل کر لی بلکہ یہ کہ اُس نے بنی نوعِ انسان کی خدمت میں کس طرح نشو و نما حاصل کیا اور کس طرح اس نے اپنے قوانین اور اِداروں کے ذریعہ سے انسان دوستی کا مُظاہرہ کیا۔

جب کبھی کسی تہذیب کو زوال آیا ہے اور وہ نیست و نابود ہو گئی ہے تو اس کی وجہ وہ اسباب تھے جن کی بدولت لوگ سنگ دل ہو گئے تھے اور انسانی اطوار میں تفریق پیدا ہو گئی تھی یعنی انسان سے انسان جُدا ہو گیا تھا اور ہر وہ چیز جس سے آزادی اور عظمت قائم تھی کھوکھلے نعروں اور سرکشی کے سیلاب میں غرق ہو گئی تھی۔ کوئی بھی تہذیب محض کھوکھلے نعروں پر قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ قرآنِ پاک نے وھٰذا صراط ربک مستقیما کہہ کر ہمیں ایک ایسے راستے پر چلنے کی ہدایت کی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے ہم جو تہذیب چھوڑ جائیں وہ اخلاقی اقدار پر قائم ہو۔ آج ہمارے مہمانِ مقرر ہیں جناب جی۔ الّانا صاحب جن کی شخصیت اتنی مشہور و معروف ہے کہ مجھ

ے کسی حصّے میں انھیں متعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ خود اُن کے ذاتی کارناموں سے ایک اچھی خاصی تقریر تیار ہو سکتی ہے، لیکن میں اس سے گریز کروں گا، کیونکہ ہم اور آپ سب موصوف سے "عزت، احترام اور انحراف" کے موضوع پر سننے کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ موصوف کے طبعی رجحان، قابلیت اور تجربے کی بنا پر اور اس حقیقی لگاؤ کی بنا پر جو موصوف کو حال اور مستقبل سے ہے، آج شام ان کی تقریر نہایت دل چسپ اور بصیرت افروز ہوگی۔

جناب مخزم جی ۔ اَلّانا

میرا ارادہ ہے کہ عزت، احترام اور انحراف جیسے اہم مسائل کے بارے میں آپ کو اپنے ذاتی تاثرات سے رُوشناس کراؤں ۔ میرے یہ تاثرات میری رُوح کی سرگوشیوں کی مانند ہیں ۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کی صدائے بازگشت آپ کے کانوں تک پہنچ جائے اور اگر ممکن ہو تو آپ کا فیصلہ میری ذہنی تحریک کی مطابقت میں ہو۔

میں نہ تو مروّجہ خیالات کو منہدم کرنا چاہتا ہوں اور نہ اُن عقائد پر اعتراض کرنا چاہتا ہوں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، کیونکہ ہماری المناک صدی عرصۂ دراز سے اسی تباہی کا شکار ہوتی چلی آ رہی ہے ۔ میں تو صرف زندگی کے چند دائمی مسائل پر غور کرنا چاہتا ہوں تاکہ دوسروں کو بھی اپنی جگہ پر غور کرنے کی ترغیب ہو ۔ ممکن ہے بعض اوقات آپ کے اور میرے خیالات متفق ہوں ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی ہمارے اور آپ کے خیالات بالکل مختلف ہوں ۔ روزِ ازل سے انسانی ترقی صرف اسی حالت میں ممکن ہو سکی ہے کہ جب مفکّرین نے آزادی سے ایک دوسرے کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا ہے ۔

مجھے اس قدر اہم موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنی خامیوں کا اچھی طرح علم ہے ۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کا تعلق اخلاقیات، مذہب، فلسفہ اور مابعدالطبیعات سے ہے ۔ کاش مجھ سے بہتر کسی شخص کو اس موضوع پر بولنے کے لیے بلایا گیا ہوتا ۔ بہرحال میں حتی المقدور کوشش کروں گا ۔

اس کرۂ ارض پر انسان کی آمد سے پیشتر فطرت کا چکر مادی زیادتی کے طور پر گردش کرتا رہتا تھا لیکن انسان کے آنے کے بعد حالات بالکل بدل گئے ۔ انسان اپنی روح اور عقل کی بدولت مادی بداخلاقیوں کے حیوانی رجحانات سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے ایک نہایت لطیف و کامل آزادی کی جانب قدم بڑھانا شروع کر دیا ۔ اِس اِرتقائی کارروائی کی وجہ سے انسان اس راہ پر گامزن ہو گیا ہے جہاں پر اُسے غیر محدود طاقت حاصل ہو گئی ہے ۔ چمڑے کی جلد اور اس کے اندر جو صفحات ہوتے ہیں وہ درحقیقت اس چیز کے اَجزا ہوتے ہیں جسے ہم کتاب کہتے ہیں ۔ اسی طرح سے ہمارے حواسِ خمسہ، ہماری زندگی کے تجربات اور ہمارے ذہن کا ادراک یہ تمام چیزیں اس شے کے ہم آہنگ اَجزا ہیں جسے ہم انسان کے نام سے پہچانتے ہیں ۔

نیکی کا قبول کرنا اور بدی سے بچنا انسان کے ذہن میں محض کسی فلسفیانہ دلیل کی بنا پر نہیں بیٹھ گیا

بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کی صداقت انسان کے شعور میں اس طرح رفتہ رفتہ نمودار ہونے لگی کہ جیسے براہِ راست کچھ دکھائی دے رہا ہو۔ زندگی کی ظاہری سطح پر تو ہم فرد کے بدلتے ہوئے اَدوار دیکھتے ہیں لیکن اس سطح کے نیچے انسانی اتحاد کا دائمی رشتہ قائم رہتا ہے جس کا شروع میں پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ یہی وہ سرچشمہ ہے جس کی بدولت انسان بڑی سے بڑی قربانی پیش کرسکتا ہے اور اس کے ساتھی اُس کے بارے میں اچھی رائے قائم کرسکتے ہیں۔ جب کسی شخص کے بارے میں اچھی رائے دل میں قائم ہو جاتی ہے تو پھر اُس کی عزت کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

جو لوگ دوسری عالم گیر جنگ کے اختتام پر جوان ہوئے انھیں ہر وقت طرح طرح کی تباہیوں کا خوف طاری رہا۔ انھیں ہر وقت ایک بھیانک خواب دکھائی دیتا رہا اور یہی اندیشہ کھائے جاتا رہا کہ کہیں یہی بھیانک خواب ایک حقیقت نہ بن جائے۔

لہذا انسان تذبذب کے بھیانک صحرا کی جانب بھٹکتا نظر آیا اور بین الاقوامی سوسائٹی بے بسی اور پریشانی کے عالم میں دیکھتی رہ گئی۔ جب وحشت انگیز پیچیدگیوں کا اندیشہ درپیش ہوتا ہے تو اس سے ایک ایسا مرض پیدا ہو جاتا ہے جو دن بھر تو سوتا رہتا ہے لیکن رات کو کھڑاؤں پہن کر چلتا رہتا ہے۔ لہذا ان قوموں کی صدائے بازگشت رات بھر انسانی ذہن کو پریشان کرتی رہتی ہے۔

گزشتہ پچاس برسوں میں دوبار ایسی عالم گیر جنگ ہوئی کہ جیسی اب تک ہوئی ہی نہ تھی۔ تقریباً سات کروڑ انسان تباہ و برباد ہوئے یا مار ڈالے گئے۔ یہ کرۂ ارض انسانی خون سے سُرخ ہو گیا۔ انسان کو ایسی ناقابلِ برداشت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ جیتے جی جہنم میں پہنچ گیا۔ انسان بالکل شیطان کی طرح خود اپنے ایجاد کردہ ان مہلک ہتھیاروں کے انبار کے درمیان فاتحانہ انداز میں کھڑا ہو گیا جو چشم زدن میں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار سکتے ہیں۔ جس نوجوان نے دوسری عالم گیر جنگ کے بعد ہوش سنبھالا اُسے ایک ایسی بھیانک حقیقت کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ چکرا کر رہ گیا۔ اُسے صرف دو ہی صورتیں دکھائی دیں: ایک تو یہ کہ نہایت معصومیت کے ساتھ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سے اپنے پرخچے اڑوالے اور دوسرے یہ کہ ان میزائلوں سے اپنے آپ کو تباہ کروا ڈالے جو صرف ایک بٹن دبانے سے موت کا پروانہ بن جاتے ہیں۔ یہ منظر نوجوان نسل کے لیے اور ان نسلوں کے لیے جو ابھی پیدا نہیں ہوئی ہیں نہایت خوفناک اور نفرت انگیز تھا۔ چنانچہ انھوں نے بطور احتجاج اپنے دل میں یہ سوچنا شروع کر دیا کہ زندگی اور اس کے لطیف و نازک پہلوؤں پر غور کرنا بے کار ہے، ہم تو دنیا میں پیدا ہی محض اس لیے ہوتے ہیں کہ ہمارے پرخچے اُڑا دیئے جائیں۔

دوسری جانب والدین کے سامنے اپنی اولاد کے لیے ایثار کا سوال بھی درپیش تھا مگر ایثار کی افادیت مشتبہ تھی۔ اس پریشان کن منظر کے پیشِ نظر انسان ایک ایسے خطرناک مقام کی جانب گامزن ہوگیا جس کے آگے والدین اور نوجوان دونوں کے لیے مستقبل بالکل تاریک اور مایوس کن معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایسا معلوم ہونے لگا کہ والدین اور اولاد کی راہیں بالکل جدا جدا ہوئی جا رہی ہیں۔ کون سی بات صحیح ہے اور کون سی غلط۔ نیکی کسے کہتے ہیں اور بدی کون سی چیز ہے۔ ان باتوں پر لوگ زمانۂ قدیم سے اختلاف کرتے چلے آئے ہیں۔ حالانکہ تفصیلات اور باریک پہلوؤں پر شکوک و شبہات کا اظہار ہوتا رہا اور ان پر بحث مباحثہ بھی ہوتا رہا پھر بھی نیکی اور بدی کی بنیاد پر کبھی شک و شبہ نہیں کیا گیا۔ لیکن ہمارے موجودہ دور میں صحیح اور غلط، نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی کی وقعت ان دقیانوسی توہمات سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے جن کی وجہ سے انسان کا ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ چوں کہ اس خاص طرزِ زندگی کی بنیاد ہی متزلزل ہوگئی ہے جو کہ عقائد کی بنا پر قائم تھی لہٰذا دورِ جدید کا انسان یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ وہ کن واضح اصولوں کے مطابق اپنی زندگی کو مرتب کرے۔ جنگ کے بعد یہ رجحانات بڑی تیزی سے بڑھتے گئے۔ چنانچہ نئی نسل نے ایک ایسا ہی سماجی رویہ اختیار کیا اور اس طرح کے معاشرتی تعلقات قائم کیے جو اس سے پہلے کسی دور میں نہیں ہوئے۔ ان غیر متوازن حالات میں نئی نسل کے بُت شکنوں نے روایتی اور معقول اقدار کو پاش پاش کر دیا ہے اور اس کی جگہ پر انھوں نے گستاخی، للکار، عدول حکمی اور بغاوت کے دہشتناک اور خونخوار دیوتا کو لاکر بٹھا دیا ہے۔

عزت و احترام کا اظہار کرنا دراصل ایک ذہنی کیفیت ہے۔ چوں کہ حرص و ہوس نے اس دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے اور وبائی بے چینی نے اس کی جڑیں تک ہلا ڈالی ہیں اس لیے اس وقت خداشناسی کی شدید ضرورت ہے۔ اور سکون و چین حاصل کرنے کے لیے دنیا کے ضمیر پر مذہب کا مرہم لگانا نہایت ضروری ہے۔ صرف اسی صورت میں عزت و احترام جیسی قدیمی اقدار انسانی معاشرے میں اپنا روایتی مقام حاصل کر سکیں گی۔ ہم ایک ایسے دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں پیار کے معنی و مفہوم بھی مفقود ہوگئے ہیں اور خواہشِ نفسانی کے بھوت نے محبت کے دیوتا کو معزول کر دیا ہے۔ زندگی کے اس جدید جنگل میں قدیمی حُسنِ عمل ہی انسانی ہستی میں ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے۔ یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ تاریخ کے ہر دور میں تخلیق کی حیران کن تجلیاں صرف اسی وقت ظہور میں آسکتی ہیں کہ جب فرد نے اپنے آپ کو مقصدِ کائنات کے حوالے کر دیا ہو۔ انسان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایک ایسی شے ہے جو فی الحقیقت اپنی ذات سے بھی زیادہ افضل ہے۔ اُسے اپنی زندگی کا سفر میخانۂ ہستی سے لے کر میخانۂ خداوندی تک مستی و بیخودی

کے عالم میں طے کرنا چاہیے۔ اسے ان صداؤں کو سننے کے لیے اپنے کان کھول لینے چاہئیں جو اس کے دل کی گہرائیوں سے بلند ہوتی رہتی ہیں۔ ارتقا نے بشر کو ادنیٰ حیوانی حلقے سے نکال کر انسانی شرافت اور سربلندی عطا کی ہے۔

انسان جب ہر وقت اپنی روزی کمانے میں مصروف رہتا ہے تو پھر اسے سکون کے لمحات قطعی میسّر نہیں ہوتے۔ چنانچہ اسے اپنے رازِ ہستی کا پردہ اُٹھانے کی سعی کرنے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔ اس نشۂ انہماک میں وہ اپنی شخصیت کی حقیقت کی طرف سے بھی غافل رہتا ہے۔ دَورِ جدید کے انسان نے خود انسان کو اپنا معبود بنا لیا ہے تاکہ اُس کی پرستش کر سکے۔ عزّت و احترام کو تغافل کے تاریک سمندر میں غرق کر دیا گیا ہے افسوس! مقصدِ حیات کی کتنی غلط تعبیر نکالی گئی ہے۔

انسانی زندگی کی آخری منزل خدا کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہٰذا خدا سے رشتۂ اتحاد قائم کرنے کے لیے خود اپنی ذات کو انسانیت سے منسلک کرنا ضروری ہے۔ انسان کو اپنی تخلیقی ذہانت کی بدولت اپنے ماحول کو خود اپنی ہی ذات کا ایک عظیم عکس تصوّر کرنا چاہیے۔ اور بنی نوع انسان کی خدمت کو خدا کی محبّت کی نشانی سمجھنا چاہیے۔ جو فعل صرف اپنے فائدے کی غرض سے کیا جاتا ہے اس سے انسان کی بصارت رُوحانی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ جاتی ہے، لیکن جو کام خود سپردگی کے عالم میں کیا جاتا ہے تاکہ دوسروں کو فیض ہو اس سے انسانی عظمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور یہی عظمت دائمی اور سچی مسرّت ہے۔

خواہ اس کا کوئی بھی نام رکھ دیا جائے اِنسانی اتحاد اس وقت ایک ذی جان قوت بن جاتا ہے جب انسان دوسروں کی ذات میں خود اپنے آپ کو دیکھنے لگتا ہے۔ یعنی بہ الفاظِ دیگر جب انسان دوسروں کی عزّت کرنے لگتا ہے۔ میرے خیال میں محبّت کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی۔ جوہرِ عشق کا مسکن چوں کہ رُوحِ انسانی کی مملکتِ لامحدود میں واقع ہے لہٰذا اس کی بدولت ہمیں اس زنداں سے رہائی حاصل ہوتی ہے جو ہماری ذات کو کائنات سے جُدا کیے ہوئے ہے۔ خدا جو کہ نفسِ کائنات ہے اسی نے انسان کو ظہور کی خصوصیات عطا کی ہیں۔ شکل و صورت سے سرفراز کیا ہے۔ حرکت کرنے کی طاقت بخشی ہے اور دانائی کے ذریعہ سے دل میں احساس پیدا کیا ہے۔ اس طرح خدا نے اِنسان کو ان نعمتوں سے مالامال کر کے اس لائق بنا دیا ہے کہ وہ "نغمۂ بے گانہ" کو سمجھ سکے۔ جس طرح تمدّن و تہذیب علم و ادراک کی مملکت کو وسیع کرنے کی ایک مسلسل جدوجہد ہے اسی طرح اس "عظمتِ بے گانہ" کی جانب ایک فرد کا سفرِ زیارت ایک اعلا و برتر ذات کے حاصل کرنے کی دائمی جستجو ہے۔

جو طرزِ زندگی محض عادات کی بنا پر اختیار کیا جاتا ہے وہ پائیدار نہیں ہوتا، لیکن وہ طرزِ حیات

جسے عقل و یقین کی کسوٹی پر پرکھ لیا جاتا ہے وہ زیادہ عرصے تک قائم رہتا ہے۔ ایسی بنیادی باتیں صرف اسی صورت میں ہمیشہ قبول کی جا سکتی ہیں کہ جب انھیں خوب اچھی طرح محسوس کیا جائے اور ان پر اتنا پکا اعتقاد ہو کہ خواب میں بھی وہی حاوی رہیں۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل بڑوں کی عزت کرنا برائے نام رہ گیا ہے۔ خواہ وہ والدین ہوں یا اور کوئی۔ یہی وجہ ہے جو دورِ جدید کی معمولی سی ہنگامہ خیزی بھی جذبۂ احترام کو فنا کر دیتی ہے اور نوجوانی ہی میں لوگ اس سے بے گانہ ہو جاتے ہیں۔

انسانی فطرت ہزاروں سال سے تصادم کے نقوش چھوڑتی چلی آ رہی ہے۔ ان لڑائیوں میں کچھ لوگ فاتح ہوتے ہیں اور کچھ مفتوح۔ یہ لڑائیاں مختلف طور پر ہوتی ہیں۔ کبھی انسان اور فطرت کے درمیان تصادم ہوا ہے۔ کبھی انسان دوسرے انسان سے لڑ پڑا ہے اور کبھی انسان اور اس کی اندرونی ذات کے درمیان جنگ ہوئی ہے۔ انسان اور فطرت کی جنگ کی بدولت سائنس اور سائنٹفک ٹکنالوجی نے جنم لیا ہے۔ مندرجہ بالا دوسرے تصادم کی وجہ سے سیاسی جھگڑے اور جنگیں ہوئی ہیں اور تیسری نوعیت کے تصادم کا تعلق انسان کی روح یا مذہب سے ہے۔ ان تینوں حالتوں میں عزت، احترام یا انحراف کی شبیہہ کسی نہ کسی شکل میں برابر موجود رہی ہے۔

جس شخص کو اپنے سماجی ماحول میں چین نصیب نہیں ہے وہ واقعی ایک بدنصیب اور غم زدہ انسان ہے۔ مسرت اور مسرت کے ذرائع کا انحصار ہوتا ہے ہماری اس صلاحیت پر جس کی بدولت ہم دوسروں کے ساتھ پُرسکون زندگی گزارتے ہیں اور اپنے سماجی ماحول سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ انحراف سے تصادم پیدا ہوتا ہے۔ لہذا انحراف سماجی ہم آہنگی کے بالکل برعکس ہے۔ انسان جتنا جتنا اپنے ماحول پر قابو حاصل کرتا گیا اتنی ہی اس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان مسائل کی اہمیت بڑھتی گئی۔ بہ الفاظِ دیگر جتنی جتنی سائنٹفک تحقیقات و انکشافات میں کامیابی ہوتی گئی اتنے ہی تعلقات پیچیدہ ہوتے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسرارِ فطرت پر قابو حاصل کرنے کے سلسلے میں سماجی گروہ ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو قومیت کا امتیاز بھی ختم ہو جاتا ہے اور کبھی بین الاقوامی سطح پر انسانی علم اور وسائل کو اکٹھا کر لیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک اوسط درجے کے آدمی کے لئے روزی کمانا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ بات کبھی کبھی نہایت تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ انسان کو جب فرصت زیادہ ملنے لگتی ہے تو وہ اس عرصے میں مزید مہلک ہتھیار ایجاد کرنے لگتا ہے۔

دورِ جدید کی تہذیب و تمدن کی بدولت مختلف اقوام ایک دوسرے پر اس قدر انحصار کرنے لگی ہیں کہ مقابلے کی جگہ مفاہمت نے لے لی ہے۔ اس ارتقائی دور میں کم از کم سطحی طور پر اس

تصادم میں تخفیف ہونی چاہیئے تھی جو کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ہوتا رہتا ہے، اور انسان کو خود اپنے اندرونی تصادم سے نجات حاصل کرنے میں مشغول ہو جانا چاہیئے تھا۔ یا کم از کم اس مسئلے کو فوقیت حاصل ہونی چاہیئے تھی۔ اِس دور میں انسان کی اندرونی زندگی کو روز افزوں غلبہ حاصل ہونا چاہیئے اور انسان کے دل میں یہ شوق کارفرما ہونا چاہیئے کہ جس شے کو عام طور پر "گناہ" کہا جاتا ہے یا جن باتوں کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے اُن کو مرعوب و مغلوب کیا جائے۔ جب انسان کو خود اپنے آپ امن و سکون حاصل نہ ہوگا تو پھر وہ دوسروں کے ساتھ بھلا کس طرح سکھ چین سے زندگی گزار سکے گا۔ چنانچہ ہمارے موجودہ دور میں تمام روایتی اقدار مثلاً عزت و احترام وغیرہ غفلت شعاری کا شکار ہو کر نیست و نابود ہوئی جا رہی ہیں اور اس دور کی موزونیت و مناسبت کے باوجود انسان اور اُس کے سماجی ماحول کے درمیان تصادم بڑھتا جا رہا ہے۔

ایک بچے کو دو چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت رہتی ہے۔ ظاہری اعتبار سے یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ ایک بچے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے فطری رجحان کے مطابق آزادی سے پروان چڑھے اور اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نشو و نما کے دوران ایک نرم و نازک پودے کی طرح اُسے تحفظ بھی حاصل ہو۔ والدین کا مشورہ بھی اکثر غلط فہمی کی بنا پر بچے کو مداخلت معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر والدین لاپرواہی سے کام لیتے ہیں تو بچہ اپنی ناسمجھی کی بنا پر اس بات کو بعد میں سرکشی اور بغاوت کا بہانہ بنا لیتا ہے اور ایک وحشی حیوان بن جاتا ہے۔ لہٰذا والدین کو اس زمانے کے بچوں کی پرورش میں بے حد احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ بچے کی ابتدائی زندگی کے دوران اگر کوئی غلطی ہوگئی تو پھر وہ زندگی بھر گمراہی کا شکار رہتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ والدین اپنے بچوں کی زندگی میں اس وقت تک مداخلت کرتے چلے جائیں کہ جب وہ نوجوان ہو چکے ہوں۔ بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے تو پھر وہ خود اپنے طریقے پر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ والدین کی بیساکھیوں کو ہٹا دینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بالکل آزادی سے زندگی بسر کرے۔ اور اس بات کا تو اُسے حق بھی حاصل ہے۔ اگر والدین اسی طرح سے پریشان ہوتے رہے کہ جب بچے چھوٹے تھے اور بچوں پر اپنا تسلط جمائے رہے تو پھر وہ اپنے بچوں کے لیے ایک وبالِ جان بن جائیں گے اور بچے اُن سے ناراض ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر وہ ہر قسم کی خارجی مداخلت کو ہمیشہ رد کرتے رہیں گے، خواہ وہ خاندانی مداخلت ہو یا مذہبی اور سماجی مداخلت۔

اپنے سے بہتر لوگوں کی عزت و احترام کرنا ہی وہ پیمانہ ہے جس میں کسی قوم کی ثقافتی عظمت کو تولا جاتا ہے۔ ہر معاشرے میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی فہم و فراست اور اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے

عام لوگوں سے بلند و برتر ہوتے ہیں۔ اور عوام اُن کی عزت و احترام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تاریخ شاہد ہے کہ محض علم کی بدولت لوگوں کی تعظیم نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ کردار نے ہمیشہ بنی نوع انسان کو فرحت بخشی ہے اور تازہ دم کر دیا ہے۔

ایک اور بات بھی دیکھنے میں آئی ہے۔ وہ یہ کہ جن لوگوں کی عوام عزت کرتے ہیں وہ سب امیر اور رئیس ہی نہیں ہوتے بلکہ عموماً غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ولیم شیکسپیر کے خاندان کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اور اُس کا باپ نہایت معمولی پیشے اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہ پیشے کس قسم کے تھے اس پر لوگوں میں اختلاف رائے ہے۔ بہر حال اس بات پر سب متفق ہیں کہ شیکسپیر ایک غریب خاندان کا فرد تھا۔ اس کے باوجود آج کوئی مائی کا لعل ایسا نہیں جو احترام سے شیکسپیر کے آگے سر تسلیم خم نہ کرتا ہو۔

جو شخص دوسروں کی عزت نہیں کرتا وہ دراصل خود اپنی عزت گنوا بیٹھتا ہے۔ جس شخص کی عزت کی جاتی ہے اُسے تو خیر خوشی حاصل ہوتی ہی ہے۔ سوسائٹی میں ادب و اخلاق سے پیش آنا چیخنے چلانے یا بدتمیزی اور طاقت کا مظاہرہ کرنے سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ دوسروں کا احترام کرنا انسان کی اعلا تربیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح احترام کا فقدان ہر اُس کوشش کو ناکام بنا دیتا ہے جو انسان اپنے کردار کو اچھا ظاہر کرنے کے لیے کرتا ہے۔ اگر انسان خود اپنی عزت کرتا ہے تو پھر دوسروں کی عزت کرنا اُس کے لیے لازمی ہے۔ احترام دراصل انسان پر سایۂ رحمت ہے۔ دوسروں کا احترام کرنا اور جہاں پر تعظیم کی ضرورت ہو وہاں تعظیم کرنا انسان میں خود خدا کے عکس کی غمازی کرتا ہے۔

جو شخص دوسروں کے ساتھ شرافت اور ادب سے پیش نہیں آتا اُس میں ایک بھلے آدمی کی اوّلین خوبی کا فقدان ہے۔

گبن نے لکھا ہے کہ "ہر شخص دو طرح کی تعلیم حاصل کرتا ہے: ایک تو وہ جو وہ دوسروں سے حاصل کرتا ہے اور دوسری وہ جو وہ خود اپنے آپ کو دیتا ہے۔ یہ دوسرے قسم کی تعلیم زیادہ اہم ہے۔" چنانچہ انسان کو چاہیئے کہ وہ خود اپنے آپ کو دوسروں کا احترام کرنا سکھائے۔ اسی قسم کے لوگوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ صاحبِ کردار ہیں۔

دنیا کی نظروں میں ایک ملک کی عزت کس بات کی بنا پر بڑھتی ہے؟

وہ کون سی شے ہے جس کی بدولت کسی ملک کو طاقت حاصل ہوتی ہے؟

کسی ملک اور اُس کے باشندوں کا وقار کس چیز کی وجہ سے دو بالا ہوتا ہے؟

ایک قوم کس شے کی بدولت طاقت ور بن جاتی ہے؟

وہ کون سی شے ہے جس سے کسی قوم کا اخلاقی وقار قائم ہوتا ہے؟
وہ کون سی بات ہے جس کی بدولت دوسروں کے دلوں میں کسی قوم کے لئے گھر بنتا ہے؟
مندرجہ بالا سوالات کا جواب نہ برتری ہے اور نہ ذہانت۔
یہ تو ایک قوم کا اخلاقی کردار ہوتا ہے جو دوسری قوموں کو اپنے آگے سرنگوں کروالیتا ہے۔ کردار ایک قوم کا ضمیر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر لارڈ رسل نے ایک بار کہا تھا کہ "انگلستان کی سیاسی جماعتیں ذہین آدمیوں سے مدد تو مانگتی ہیں لیکن وہ صرف صاحبِ کردار اشخاص کی رہنمائی قبول کرتی ہیں"
جان اسٹوورٹ نے لکھا ہے کہ "ایک ریاست کی قدر و قیمت وہی ہوتی ہے جو کہ اس ریاست کے افراد کی ہوتی ہے؟"
جس طرح روشنی کی کرنیں ایک چھوٹے سے سوراخ میں سے گزر سکتی ہیں اسی طرح انسان جو چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا ہے ان سے اس کے کردار کا پتہ چلتا ہے۔ آدمی رحم دل ہے یا سنگ دل، با ادب ہے یا معقول پسند، یہ باتیں اور اسی طرح کی دوسری خصوصیات چھوٹی چھوٹی باتوں سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔
تاریخِ عالم اگر حادثات اور تباہیوں کی شاہد نہ ہوتی تو پھر کام کو فرد کے نشو ونما اور سماجی ترقی میں وہ مقام ہرگز حاصل نہ ہوتا کہ جو آج اسے حاصل ہے۔ اور کام کے بغیر زندگی غیر دلچسپ ویران اور حیران ہو جاتی۔
جی ہاں طوفان پھولوں کو تباہ کر سکتا ہے لیکن کیا اس سے بیج بھی برباد ہو سکتے ہیں؟ جی نہیں ہرگز نہیں۔
جان اسٹارلنگ نے کہا ہے کہ "بچوں کے گلے تو گھونٹے جا سکتے ہیں مگر کارناموں کو نہیں مٹایا جا سکتا کیونکہ وہ غیر فانی ہیں"
دوسروں کے خیالات و رسومات کو حقارت کی نظر سے دیکھنا بالکل فطری بات ہے۔ اس جذبے کی بدولت معاشرے میں مخالفت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی بنا پر جو غیر رواداری کارفرما ہوتی ہے وہ ایک مہذب نظریے کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ جب اس قسم کے لوگ نفرت کے جذبات سے مشتعل ہو جاتے ہیں تو پھر وہ ایک گروہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اجتماعی ہسٹیریا کی شکل میں اپنے جذبات کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کے رجحان کو موجودہ معاشرے میں اس بنا پر تقویت حاصل ہے کہ آج کل کی دنیا میں ایک فرد کے لیے سوسائٹی میں مقام حاصل کرنا بڑا مشکل ہے۔ لہٰذا افراد احتجاج شروع کر دیتے ہیں جنھیں ہمارے زمانے کے ناراض نوجوان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
یہ وہ لوگ ہیں جو قائم شدہ معاشرے اور اس کے مانے ہوئے معیار کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔

یہ ہنگامہ خیزی تتانت کے پھلنے پھولنے کے لیے نہایت مُضر ہے۔

انسان کو فطرت نے بہرا نہیں بنایا ہے، مگر وہ دنیا کے غل غپاڑے اور اپنی خود غرضی اور بازار کی چیخ و پکار کی وجہ سے بہرا ہو گیا ہے، لیکن جو شخص روحانی نشو و نما کی بدولت زندگی کے ایک بلند مقام پر پہنچ گیا ہے وہ اپنا سر دنیا کے شور و غوغا سے بلند رکھتا ہے اور ستاروں کی سرگم اور جھرنوں کی جل ترنگ سنتا رہتا ہے۔

عالم حیوانات نے نقشۂ وقت پر صرف اپنی خامیاں چھوڑی ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی نسلی افزائش کے علاوہ اور کچھ کیا ہی نہیں، لیکن انسان رُوحانی ترقی کی بدولت وقت کی قید و بند سے بھی آزاد ہو گیا ہے کیونکہ اُس نے تاریخِ عالم میں اپنی عقل و شعور اور فہم و فراست کے بے شمار تاج محل تعمیر کر دیے ہیں۔

انسان جتنا جتنا اپنے قدیمی بزرگوں کے علم و حکمت سے استفادہ کرتا جاتا ہے اتنا ہی اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ تاریخ نے ان ہی لوگوں کو حیاتِ جاودانی بخشی ہے جن کے روحانی نغمے آنے والی نسلوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت بنے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے عظیم کامرانیاں حاصل کیں پھر بھی اُن کے دل ہمیشہ مضطرب رہے اور خدا کے حضور انھوں نے جو بھی نغمہ پیش کیا اس میں ہمیشہ عجز و انکساری کا اظہار کیا۔

لہٰذا میں بھی اکثر یہ گیت گاتا رہتا ہوں

ارے۔ میں کیا ہوں۔ سوائے اس کے کہ
بھٹکتی ہوئی انسانیت کے پریشان حال انبوہ میں
ایک حقیر ذرّۂ خاک۔

تاہم تیری محبت نے مجھے حیاتِ جاودانی بخش دی ہے
تیرا سانس میرے قلم کو حرکت دیتا ہے۔
تو میں اپنے گیت لکھتا ہوں

اور تیرے قدموں پر عجز و انکساری سے تعظیم کے پھول چڑھاتا ہوں۔
میں اپنی ناداری پر کس قدر شرمسار ہوں
مگر تو کتنی شفقت سے انھیں قبول کرتا ہے
گویا وہ ایسے انمول موتی ہیں
جو ابد تک اپنی آب و تاب برقرار رکھیں گے۔

Ah, what am I, but an insignificant speck,
In a miserable mass of wandering humanity;
And, yet, Your love has imprinted on me immortality;
Your breath moves my pen, and I write my songs,
Laying my humble homage at Your feet.
How ashamed am I of my poverty,
How graciously You accept them,
As if they were priceless treasures,
Meant to keep company for all Eternity.

سائنٹفک صداقتیں استدلال کی تجزیاتی کارروائی کی بدولت حاصل ہوتی ہیں اور ثبوت کے لیے ان کا انحصار ہوتا ہے مادّی حقائق پر۔ لیکن رُوحانی صداقت دل کی انجانی گہرائیوں سے ظہور میں آتی ہے۔ چناں چہ جب کسی کو یہ تجربہ حاصل ہوجاتا ہے تو پھر وہ صحیح معنوں میں "ذاتِ یگانہ" سے ہم کلام ہوجاتا ہے۔ انسان جب معلومات اور واقعات کا انبار اپنی ذات میں اکٹھا کرلیتا ہے تو وہ خود کو فریب دیتا ہے اور یہ معلومات اُسے طاقت کے نشے میں مدہوش کردیتی ہے۔ دراصل اس طاقت کا وسیلہ انسان کی خارجی ذات کی محض آرائش ہوتا ہے۔ خوشی کا مسکن اندرونی ہم آہنگی میں ہے، بیرونی مطابقت میں نہیں، اور اسی جگہ وہ شے بھی رہتی ہے جسے دنیا کی عظیم ہستیوں نے رُوحانی مسرت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

میں اب آپ کی خدمت میں اپنی (انگریزی) نظم کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

Unasked, into this imperfect world was I ushered,
And found myself caught in a sleepless sleep of forgetting
I tried to tear terrifying masks of haunted dreams,
And to seek there tracks that to the Great Beyond would lead me,
My efforts were entombed in the fathomless grave of human hopes,
I surrendered myself to you in the scented chamber of my Soul
And in a wild delirium I saw a Heavenly Light
all things make clear.

مجھ سے پوچھے بغیر مجھے اس نامکمل دنیا میں پہنچا دیا گیا
(چنانچہ) میں نے خود کو فراموشی کے بیدار خواب میں مبتلا پایا
میں نے ان بھیانک خوابوں کا نقاب چاک کرنے کی کوشش کی
اور وہ راہ تلاش کرنا چاہی جو مجھے سب سے اعلا منزل کی جانب لے چلے
میری کوششیں انسانی اُمیدوں کی عمیق قبر میں دفن ہوگئیں
(لہذا) میں نے خود کو اپنی رُوح کے معطر حجرے میں تیرے سپرد کر دیا۔
اور ایک مجنونانہ عالم وجد میں مجھے ایک قدوسی روشنی نظر آئی
جس نے ہر شے کو منور کر دیا۔

نوجوانی واقعی زندگی کا سب سے زیادہ پسندیدہ حصہ ہے۔ اگر ہمارا بس چلے تو ہم اسے مرتے دم تک اپنے ساتھ رکھیں۔ چنانچہ جب نوجوانی کے رخصت ہونے کا وقت آتا ہے تو ہم اسے زبردستی روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب نوجوانی کی آگ بجھنے لگتی ہے تو ہم اس میں مصنوعی ایندھن جھونکنا چاہتے ہیں تاکہ وہ کچھ دیر تک اور قائم رہے۔ جب ہمارے حواس خمسہ کم زور ہو جاتے ہیں اور اُن کا بہترین دَور ختم ہو جاتا ہے تو ہم انھیں برقرار رکھنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ جب بڑھاپے کی وجہ سے ہمارے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں اور ہر چیز ہمارے قابو سے نکلنے لگتی ہے تب بھی ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا قبضہ قائم رہے۔ بات یہ ہے کہ ہم وہ صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں جس کی بدولت ایک اٹل بات کو قبول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وقت ہم کو ایک فاتح کا نقاب چڑھائے نظر آتا ہے اور جب وہ موت کو ہمارے حجرۂ حیات میں پہنچا دیتا ہے تو ہم اس کا خیر مقدم کرنے کے بجائے اس سے دست و گریباں ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ساحلِ ہستی کے آگے بھی بڑے حسین حسین بندرگاہ ہیں۔ لہذا ہمیں چاہیئے کہ زائرین کی طرح خوشی خوشی اُن پُرفضا مقامات کی جانب اپنی کشتی کا رُخ موڑ دیں۔

ہمارے دَور کی نئی نسل بلا سوچے سمجھے بغاوت کے جنون میں مبتلا معلوم ہوتی ہے۔ ایمیلی برونٹے (EMILY BRONTE) کے ناول 'وذرنگ ہائٹس (WUTHERING HEIGHTS)' میں ناول کا ایک کردار ہیتھ کلِف دنیا کے ہر شخص کو مار ڈالنا چاہتا ہے تاکہ اسے کیتھی نامی لڑکی حاصل ہو جائے، لیکن وہ کبھی نہیں کہتا کہ قتل کرنا معقول، نادرست ہے۔ اُس کی ہوسِ تباہ کاری کا نتیجہ بس اتنی جگہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ "کیوں"، اور "کس لیے"

کے چکّر میں نہیں پڑتا۔ ہمارے زمانے کا نوجوان بھی اسی طرح ہر پُرانی بات کو مٹا دینا چاہتا ہے اور موجودہ نظام کو تباہ کر ڈالنا چاہتا ہے، مگر اس کے پاس کوئی بہتر سبیل موجود نہیں جو دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ ناراض نوجوانوں میں یہ رجحان پہلی عالم گیر جنگ کے بعد شروع ہوا اور اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد یہی نئی نسل کا نظامِ حیات بن جائے گا۔

ہمارے زمانے میں نئی نسل کے جرائم معصومیت کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں اور اس کو حق بجانب قرار دینے کے لیے اسی شے کو للکارتے ہیں جسے ہم معصومیت کے نام سے پہچانتے ہیں۔ سالہا سال کی سرکشی جس کی جڑیں معاشرتی اور تاریخی اسباب میں پیوست ہیں ہماری توجہ کی طالب ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں دنیا نے سات کروڑ انسانوں کی تباہی و بربادی اور قتلِ عام دیکھا۔ اس کے باوجود انسان دنیا میں خدا کا خلیفہ بننے سے انکار کر رہا ہے جو کہ اس کی اصلیت ہے۔ اس انکار کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ دوسروں کو تباہ کر ڈالے گا۔ اسی وجہ سے ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اگر ایک بغاوت کامیاب ہوتی ہے تو اُس کی بنا پر ساری دنیا کا قتلِ عام جائز قرار دے دیا جاتا ہے۔

باغی کون ہے؟ باغی کی ٹکسالی تعریف یہ ہے کہ جو شخص کسی مخصوص نظام کو جاری رکھنے کے سلسلے میں "نہیں" کہے وہ باغی ہے۔ اس کی "نہیں" کا مفہوم یہ ہے کہ "اب تک تو میں اطاعت کرتا رہا لیکن اب نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ اس طرزِ عمل میں تھوڑا بہت استدلال و استقامت ہے، لیکن ہمارے دور میں باغی کی یہ ٹکسالی تعریف تبدیل ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کا ہر نوجوان اپنے ہاتھ میں ڈنڈا لیے معاشرے کی ہر پرانی ہوئی بات پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ اس بنا پر یہ رویّہ نہیں اختیار کرتا کہ اسے اپنی بغاوت کے حق بجانب ہونے پر یقین ہے۔ اگر نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو بغاوت کا اس وقت تک وجود ہی نہیں ہو سکتا جب تک انسان کو کسی نہ کسی طرح یہ احساس نہ ہو کہ وہ احتجاج کرنے یا بغاوت کرنے میں حق بجانب ہے۔ اسی طرح سے انسان صرف اسی حالت میں بغاوت کرتا ہے جب اسے یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ اس کے حقوق پامال کیے گئے ہیں، لیکن ہمارے موجودہ سماجی منظر کو دیکھنے والا یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو نوجوان اس زمانے میں بغاوت کر رہے ہیں، وہ اس قسم کے خیالات کی بنا پر سرگرمِ عمل نہیں ہیں۔ یہ لوگ تو صرف بغاوت کی وبا میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ یا پھر یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بغاوت کا علم بلند کرنا بھی ایک فیشن ہے۔

باغی کے ٹکسالی تصور کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے البرٹ کیمس (ALBERT CAMUS) نے لکھا ہے: "ضمیر کی بیداری بغاوت کے ہر فعل سے پیدا ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی پریشان کن کیوں

نہ ہو۔ اور وہ ظاہر ہوتی ہے اس ناگہانی احساس سے کہ ایسی کوئی چیز وجود میں ہے جس کی بدولت باغی اپنے آپ کو شناخت کر سکتا ہے خواہ یہ کیفیت ایک ہی لمحے کے لیے کیوں نہ ہو" آج کل کے نوجوانوں میں بغاوت کا جو رجحان پایا جاتا ہے اُس میں اس قسم کی دلیل یا معقولیت قطعی نہیں ملتی۔ ایک باغی مروّجہ اقدار کے احساس میں تبدیلی پیدا کرنے کی ابتدا کر سکتا ہے اور اس سے ایک نئے سماجی عقیدے کو اپنا لینے کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ لالینڈے (LALANDE) کا خیال ہے کہ "اقدار عموماً اس عبوری دور کو ظاہر کرتی ہیں جو واقعات اور صداقتوں کے درمیان واقع ہوتا ہے یعنی کس چیز کی خواہش ہے اور کس چیز کی خواہش کرنی چاہیئے۔ ان دونوں باتوں کے درمیان جو فاصلہ ہے اگر اس دور کا نوجوان واضح طور پر یہ سمجھتا ہوتا کہ وہ موجودہ حالات کو تبدیل کر کے اپنی خواہش کے مطابق کچھ کرنا چاہتا ہے تب بھی اس بغاوت کو کسی حد تک حق بجانب مانا جا سکتا تھا لیکن محض موجودہ حالات کو تباہ کر دینا کہ جب اس کی جگہ کوئی دوسری چیز پیش نہیں کر سکتے یا کسی احساس اقدار کو اس کا نعم البدل پیش کیے بغیر فنا کر دینا صرف تباہی و بربادی لانا ہے۔ نوع انسان کے محسن وہ لوگ نہیں جو تباہ کرتے ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو تعمیر کرتے ہیں۔ شیلر (SCHELER) نے کہا ہے: "آزردگی ایک خود کار قسم کی بدمستی ہے" ایک باغی اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی عزت نہیں کرتا بلکہ خود اپنی عزت کا خواہاں رہتا ہے۔ یہی ہمارے دور کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دور کا انسان دن بہ دن انسانیت سے دُور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انسان اور انسانیت کے بارے میں یا اسی طرح کی کسی دوسری صداقت کے بارے میں اگر تذکرہ کیا جاتا ہے تو ہماری نئی نسل ہمیں فرسودہ اور دقیانوسی تصوّر کرتی ہے۔ اُن کی دنیا خود اُن ہی کے خیالات اور نظریوں سے گھری ہوئی ہے اور وہ اسی پُرفریب جنت میں بغیر کسی مداخلت کے زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے افراد دراصل آزاد نہیں ہیں بلکہ غلامی میں مبتلا ہیں۔ ناراض نوجوانوں کے اسی طبقے میں سے ایک گروہ ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو واقعی زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے۔

باغی اپنی زندگی کو مروّجہ مذہب و اخلاق کی نفی کے لیے وقف کر دینا چاہتے ہیں۔ چناں چہ زندگی کی تمام اثباتی و اخلاقی اقدار جمود کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے ہمارا یہ دور لڑائیوں اور جنگوں کی وجہ سے تصادم اور تباہی کا دور بن گیا ہے۔ باغی نیکی سے دست بردار ہو جاتا ہے اور بدی کو جنم دیتا ہے۔ نافرمانی اور سرکشی کے آئینے کے سامنے زندگی گزارنا باغی کا معمول بن جاتا ہے۔ باغی اپنے ذاتی قانون کے علاوہ کسی قانون کو نہیں مانتا۔

جو شخص سماج سے سرکشی کرتا ہے اُسے سماج میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح جو

شخص مملکت مابعد الطبیعات کا باغی ہوتا ہے، وہ اخلاقی فیصلے کے نظریے کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ وہ خود خدا کی برتری کے بارے میں کبھی جرح کرتا ہے۔ جس بات کو وہ خود انصاف سمجھتا ہے اس کی بنا پر وہ خدا کا کبھی منکر ہو جاتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کے مقدس انصاف پر یقین کیے بغیر انصاف کے بارے میں کچھ سمجھا جا سکتا ہے؟

اگر بغاوت کے حق کو نجاب ہونا ہے تو پھر عزت و احترام کے حق کو جسے رسم و رواج نے مقدس بنا رکھا ہے، پامال کر دینا ہوگا۔ باغی جب عزت و احترام کو تباہ کرتے ہیں تو وہ اس شے کو برباد کرتے ہیں جو خود انھیں اپنے چھوٹوں سے حاصل ہونی چاہیئے۔

صداقت کا مسکن کسی ایک مقام پر متعین نہیں ہوتا۔ وہ اپنی سیاحت کے دوران ساری دنیا میں نقش قدم چھوڑتی چلی جاتی ہے تاکہ جو لوگ چشم بینا رکھتے ہیں اور جنھیں اس کے حصول کی خواہش ہے وہ اسے تلاش کر سکیں۔ آپ کو زمانۂ حال ہی میں صداقت سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ آپ سفر کر کے مستقبل میں اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ صداقت بقائے دوام کا جوہر ہے۔ جو شخص صداقت کو تلاش کرنا چاہتا ہے اسے انعام حاصل کرنے کا ہرگز خیال نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ صداقت کا بہترین صلہ خود صداقت ہے۔

مذہب ایک ایسا شعور پیدا کر دیتا ہے جس کی بدولت انسان کے دل میں صداقت کا شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ مذہب اپنے عقائد اور پابندیوں کی بدولت اور اس اُمید کی بدولت کہ مرنے کے بعد ایک پُرمسرت زندگی نصیب ہوگی انسانوں کو راست بازی اور پاکبازی کی ترغیب دیتا ہے اور اخوت و محبت کا سبق سکھاتا ہے۔ دنیا میں آج بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جو اس قسم کے مذہبی احکامات کے مطابق عمل کرتے ہیں اور صحیح معنوں میں ہر موقع پر دوسروں کی عزت کرتے ہیں خواہ اُن سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو مذہب کے احکامات کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی اور اس کے مسائل سے نمٹنے کے لیے خود اپنا ذاتی اقتدار قائم کرتے ہیں۔ یہ لوگ جو خود اپنی حکمرانی قائم کرتے ہیں اس میں خود اُن کی ذات ایک حاکم مطلق کی سی ہوتی ہے۔ وہ تمام مانے ہوئے طور وطریقوں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول سے بھی جنگ کرتے رہتے ہیں لہذا وہ خود اپنی ذات سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

دورِ جدید کا نوجوان زندگی کے دوراہے پر آگیا ہے۔ اب انتخاب کرنا خود اس کا کام ہے۔ خواہ وہ اس راہ پر گامزن ہو جس پر "عزت و احترام" لکھا ہوا ہے یا پھر اس سڑک پر چل پڑے جس پر "انحراف" لکھا ہوا ہے۔ لیکن یہاں پر میں اتنا متنبہ کیے دیتا ہوں کہ دورِ جدید کے نوجوان کا جو کچھ بھی فیصلہ ہوگا اُس کا دنیا کی تاریخ پر بڑا گہرا اثر پڑے گا۔

(انگریزی سے ترجمہ: جناب محترم سید علی اسد)



ابتدائیہ : کرنل محمد خاں



صدارتی کلمات : ڈاکٹر صغیر حسن معصومی



سامعين

احترامِ اکابر

کلماتِ ابتدائیہ : جناب محترم کرنل محمدّ خاں
مقالہ : جناب محترم مولانا سیّد عبدالقدّوس ہاشمی
کلماتِ صدارت : جناب محترم ڈاکٹر صغیر حسن معصومی

شامِ ہمدرد، راولپنڈی
۳۰ مئی ۱۹۷۲ء

جنابِ محترم کرنل محمّد خاں

صاحب صدر، خواتین وحضرات۔ یہ بڑی زیادتی ہے کہ ایک مایۂ ناز عالم دین اور ممتاز دانشور کے تعارف کا فریضہ ایک ہیچ مداں سپاہی اور کم علم دنیا دار کو سونپا جائے۔ یہ نہیں کہ یہ اعزاز میرے لیے باعث فخر نہیں۔ بے شک ہے لیکن کچھ اسی طرح جیسے آپ ایک راہ جاتے کو پکڑ کر امام بنالیں۔ پکڑا ہوا راہی فخر تو کرسکے گا لیکن امامت نہ کرسکے گا۔
مولانا کی تقریر کے موضوع پر یعنی احترام اکابر پر کچھ کہنا گستاخی سمجھتا ہوں کہ ان کے سامنے ان ہی کے موضوع پر شیخی بگھارنا بچکانہ سا فعل لگتا ہے۔ بہرحال۔
کا حق صاحب صدر کے لیے مخصوص ہے اور خوش قسمتی سے آج کے صدر اپنی بزرگی، علم اور مرتبے کے لحاظ سے اس کام کے کما حقّہٗ اہل ہیں۔
ابتدائی کلمات اصولاً مقرر کے ذاتی تعارف تک محدود ہونے چاہئیں اور یہی میرے کلمات کا مضمون ہے۔
مولانا سیّد عبدالقدّوس ہاشمی کے والد بزرگوار کا نام مولانا سیّد اوسط حسین صاحب محدّث بہاری تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور عالم اور علم حدیث وادب عربی کے مسلّم الثبوت فاضل تھے۔ علاوہ ازیں آپ ایک نامی اُستاد بھی تھے۔
مولانا سیّد عبدالقدّوس ہاشمی صاحب ۱۹۱۱ء میں بمقام مخدوم پور صوبۂ بہار میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مرحوم سے حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں والد کا سایہ اُٹھ گیا۔ ان کی والدہ محترمہ نے جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑی دین دار خاتون ہیں، ان کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور وہاں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی خصوصی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ندوہ سے انھوں نے آخری امتحانِ فاضل بڑے امتیاز کے ساتھ بدرجۂ اوّل پاس کیا۔ بنارس مہاودیالہ سے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کی، پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی کے امتحانات اور فارسی کا اعلیٰ امتحان پاس کیا۔ عبرانی اور ترکی زبان اپنے شوق سے سیکھی۔
آپ بہت سی زبانوں سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ اور تقابلی مطالعۂ مذہب کے بڑے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ایشیا، افریقہ اور یورپ کی بہت سی درس گاہوں اور جامعات

میں ان دونوں فنون پر توسیعی لیکچر دیے ہیں۔ اور اس کے لیے چین سے لے کر فن لینڈ تک بہت سے ممالک کا سفر کیا ہے۔ حجاز، مصر اور عراق اور دیگر ممالک میں بھی انھوں نے عربی زبان میں بہت سے لکچر دیے ہیں۔ متعدد سامی، تورانی اور عربی زبانوں سے واقفیت کے علاوہ عربی و فارسی کے مخطوطات پر مبصّرانہ نظر کے مالک ہیں اور دنیا کے مشہور کتب خانوں میں رہ کر طویل مطالعہ کیا ہے اور اس حیثیت سے ان کو بہت سے ممالک میں شہرت حاصل ہے۔
مولانا ایک بڑی مدت تک حیدر آباد دکن بھی رہے اور وہاں کی علمی مجالس میں شرکت کی ہے دائرۃ المعارف اور کتب خانۂ آصفیہ نے ان کی خدمات سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔
مولانا ہاشمی نے عربی رسالہ القائد، اردو رسالہ ندیم، ہفتہ وار البلاغ اور روزنامہ اتحاد کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے عربی، اردو، ہندی اور انگریزی میں بے شمار مضامین و مقالات لکھے ہیں جو مصر، ہند اور پاکستان کے اخبارات و جرائد میں شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔
مولانا ہاشمی نے اردو، عربی اور انگریزی میں اب تک تیس کتابیں تالیف و ترجمہ کی ہیں جو سب شائع ہو چکی ہیں اور بعض تو کئی کئی مرتبہ چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں۔ ان کی بعض بہت ہی مقبول کتابوں کے نام یہ ہیں۔
(۱) کتاب زندگی (۲) یقین و عمل (۳) معاشیات پاکستان (۴) تقویم تاریخی (۵) روزنامچۂ سفر چین (۶) فیصلۂ ہندستان (۷) مسلمس اِن دی ورلڈ (انگریزی) (۸) تشریحاتِ پاکستان (۹) ہمارا رسم الخط وغیرہ۔
شام ہمدرد میں ۱۹۶۹ء میں انھوں نے ایک مقالہ بعنوان "مستشرقین اور اسلامی تحقیقات" پڑھا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ مختلف اداروں نے اسے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا اور بمبئی میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی چھپا۔ اور عربی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو کر عربی جرائد میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔
مولانا ہاشمی آج کل ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد میں مہتمم کتب خانہ کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔
مولانا نے ان علمی خدمات کے علاوہ بہت سی رفاہی خدمات بھی انجام دی ہیں اور آج بھی مختلف رفاہی اور علمی اداروں کے صدر، سکریٹری اور رکن ہیں۔ جن کے تفصیلی تذکرے کا یہ موقع نہیں ہے۔
حاضرین۔ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی صاحب کی اکسٹھ سال کی بھرپور زندگی کا پانچ منٹوں میں احاطہ کرنا سعی لاحاصل ہے۔ مولانا کی زندگی ایک دریا ہے اور آج جو فرض مجھے سونپا گیا

ہے وہ دریا کو کوزے میں نہیں، کیپسول میں بند کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نازک کام کوئی صاحب حکمت ہی کر سکتا ہے، لیکن اگر میں ایسا نہیں کر سکا تو یہ میری نیت کا نہیں، اہلیت کا فتور ہے۔ بہر حال امید ہے کہ مولانا اپنی تقریر میں میری کوتاہی کی تلافی بھی کر دیں گے۔ اور اب جتنا جلد ہو سکے مجھے ان کے لیے اسٹیج خالی کر دینا چاہیے۔

جناب محترم مولانا سیّد عبدالقدوس ہاشمی

ادارہ تحقیقات اسلامی - اسلام آباد

احترام اکابر یعنی اپنے سے بڑے کا احترام اور اُن کے ساتھ عزت واکرام کا برتاؤ ایک فطری جذبہ ہے جو ہر قوم اور ہر فرد میں پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ارادی طور پر اسے دبا نہ دے تو یہ خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے اور نسلِ انسانی کے ارتقا میں تاریخی تسلسل کو استوار کر کے ایک معتدل اور بہتر معاشرے کو وجود میں لانے میں ممد و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر تغافل، غلط تربیت اور کوتاہ اندیشی کی بنا پر کسی معاشرے میں یہ جذبہ دبا دیا جاتا ہے یا دب جاتا ہے تو اُس کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اکابر کی تحقیر کی جاتی ہے، اعمال میں بے اعتدالی اور بے راہ روی پیدا ہو کر شدید قسم کی خود غرضی اور خود فراموشی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاخ اپنی جڑ سے بے تعلق ہو کر نظامِ زندگی میں اختلال و پریشانی سے دوچار ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس جذبے کو اعتدال اور میانہ روی کے ذریعہ سے اپنا کام کرنے دیا جائے تو یہ اجتماع نوعِ انسانی کے ارتقا اور سرسبزی و بارآوری میں عظیم ترین عامل کا کام انجام دیتا ہے۔ ہر نسل کو اپنے ماقبل کی نسل سے بہترین اور مفید تجربات کے حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ انسانی زندگی کے تسلسل اور جدید تجرباتِ زندگی کو پیدا کرنے کا کام جاری رکھتا ہے۔ اس طرح زندگی کا کاروان مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے۔ معاشرے میں فکری ہم آہنگی اور تعاونِ عمل قائم رہتا ہے اور بے جا و بے ضرورت و غیر مفید کشمکش سے انسانی معاشرہ محفوظ رہتا ہے۔

جذبہ کوئی سا ہو، اگر اُسے بے اعتدالی کے ساتھ بروئے کار لایا جائے تو فرد اور اجتماع دونوں کے لیے عذابِ جان بن جاتا ہے۔ مثال کے لیے ان چار بڑے جذبات، خوف، اشتہا، محبت اور شجاعت کو لیجیے۔ یہ جذبات آدمی تو کیا ہر ذی حیات میں موجود ہیں۔ اور ان ہی کے اعتدال سے زندگی خوش گوار اور کار آمد بنتی ہے۔ انسانی زندگی اور اس کا تمدن ان ہی جذبات کے ماتحت افکار و اعمال سے بنتا اور بگڑتا ہے۔ ہمارے اعمال میں یہی جذبات کارفرما ہیں لیکن ذرا غور تو کیجیے کہ ان میں اعتدال اگر باقی نہ رہے تو کیا ہو، ان میں افراط و تفریط سے کیسی کیسی خرابیاں پیدا ہو جائیں، اور زندگی کیسی اجیرن ہو جائے۔

فرض کر لیجیے کہ ایک شخص میں جذبۂ خوف، جو سب سے قوی جذبہ ہے، حد سے زیادہ پیدا ہو جائے

تو وہ آدمی کتنا بزدل، ناکارہ، وہمی اور کاہل ہو کر رہ جائے گا۔ ہر کام میں ضیاعِ جان، ضیاعِ مال، ضیاعِ آبرو کا خوف اور نہ جانے کتنے قسم کے اوہام اُس کے گلے پڑ جائیں گے وہ کسی کام کا باقی نہیں رہے گا۔ اور اگر یہی جذبۂ خوف اُس میں مفقود ہو جائے یا مناسب حد سے کم ہو جائے تو کیا ہو گا۔ بے رحم، سفاک، لٹیرا، بدکار اور اجتماعی زندگی کے لیے حد درجہ خطرناک آدمی ہو جائے گا۔ اُس کی سفاکیوں سے معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرنی پڑیں گی بلکہ اکثر حالتوں میں اُسے مار کر ختم کر دینا ضروری ہو گا۔ اسی طرح اگر جذبۂ اشتہا میں حد سے زیادہ افراط پیدا ہو جائے تو سود خوری، خود غرضی، نفع اندوزی، ذخیرہ سازی، حرص، طمع، لوٹ کھسوٹ، بدکاری و بداعمالی اور دوسری ہزاروں قسم کی برائیاں پیدا ہو جائیں گی اور اگر اس میں حد سے کمی پیدا ہو جائے گی تو کاہلی، بے کاری و تن آسانی پیدا ہو کر ساری معاشی و عمرانی جدوجہد کو معطل کر دے گی۔ اور ایسے ہی محبت و شجاعت کی افراط و تفریط سے جنون، بے رحمی، تہوّر و بزدلی کی طرح کے مہلک امراض افراد و اجتماعِ انسانی میں پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے فرد کی زندگی خود اپنے لیے اور پورے معاشرے کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔

احترامِ اکابر بھی اور دیگر فطری جذبات کی طرح انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اس کی ابتدا ماں کے احترام سے ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ حیاتِ انسانی کے ساتھ اُس کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ پوری انسانیت تک پھیل کر آدمی کو اپنے کنبے کا، اپنے خاندان کا، اپنی قوم کا اور پوری دنیائے انسانیت کا ایک بہترین فرد بنا دیتا ہے۔ اگر اس فطری جذبے کو اعتدال کے ساتھ پھیلنے سے روکا گیا اور اُس کے دائرے کو اوّلین مرحلے ہی تک محدود کر دینے کی سعی کی گئی تو اس سے شرک، آبا پرستی اور توہم پیدا ہو جاتا ہے اور اپنی افراط کی وجہ سے یہ ترقی میں حائل ہونے لگتا ہے۔

تاریخ ادیان کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جذبۂ احترامِ اکابر کی افراط اور اس کے دائرے کی تحدید نے مادر پرستی، آبا پرستی اور بُت پرستی کے روگ پیدا کر دیے اور لوگوں کو اپنے خاندان اور اپنے گھرانے کا اس قدر شیدائی بنا دیا کہ وہ سارے جہان سے غافل ہو گئے۔ گھروں میں مورثِ اعلا کے بُت رکھ دیے گئے اور ہر صبح اُن کی پرستش ہونے لگی۔ پھر کیا ہوا، آدمی پُرانی لکیروں کا فقیر بن گیا۔ حق و باطل کی تمیز ختم ہو گئی، حیاتِ انسانی جمود کا شکار ہو گئی۔ اب تک ہمیں جو کچھ تاریخ، افسانوں اور حفریات سے مل سکی ہے وہ بتاتی ہے کہ سب سے پہلا بت دنیا میں ماں کا بنایا گیا، اس کے بعد باپ کا اور اس کے بعد مختلف قوتوں اور مظاہرِ فطرت کا۔

چین، یونان، مصر، عراق اور ہندستان کی دیو مالائیں اس پر شاہد ہیں کہ ہر جگہ ماں کے خصوصی احترام نے عمومی ماں کی شکل پیدا کی اور اُس کی پُوجا ہونے لگی۔ اس کے بعد کہیں اس کا نام ماترِ بھومی ہوا، دُرگا دیوی ہوا اور کہیں اس تصوّر نے ابوالہول مصری کی صورت پائی۔ یہاں تک کہ موجودہ دور کی سیاسی وطنیت بھی درحقیقت اسی مادر پرستی اور بُت پرستی کی ایک ترقی یافتہ شکل سے کچھ زیادہ نہیں۔

بہرحال جیسے تمام جذبات انسانی میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ حدِ اعتدال تک بہترین محرکِ اعمال اور تمدّن آفرین ثابت ہوتے ہیں اور حدِّ اعتدال سے باہر افراط ہو یا تفریط بھی جذبات نقصان رساں اور آدم کش بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جذبۂ احترام اکابر کا حال ہے: اگر اس میں افراط و تفریط نہ ہو تو بہترین صفات انسانی میں اسے شمار کیا جاتا ہے۔ اور اگر تنگ نظری کے ساتھ اُس میں افراط پیدا ہو جائے تو شرک، بُت پرستی اور مادر پرستی تک پہنچا دیتا ہے، اور اگر کسی قوم میں احترام اکابر کا جذبہ کم ہو جائے تو وہ قوم زندگی کی استواری سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایک نسل کا رشتہ پچھلی نسل سے منقطع ہو جاتا ہے۔ نئی نسل پُرانے ناموس اور اپنی روایات قومی سے بے بہرہ ہو جاتی ہے۔ زندگی کی سوتیں سوکھ جاتی ہیں۔ حکیم الاُمّۃ علّامہ اقبال نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

زندہ فرد از ارتباط جان و تن
زندہ قوم از حفظِ ناموس کہن

بعض کم نظر یہ سمجھتے ہیں کہ قدیم و جدید کے مابین کوئی تخالف و تضاد ہوتا ہے۔ ایسا سمجھنا محض کم نظری اور فکر کی نارسائی ہے۔ قدیم و جدید محض اضافی تعبیرات ہیں۔ یہ کوئی حقیقت ثابتہ نہیں ہے۔ ہر قدیم چند یوم پہلے جدید تھا، اور ہر جدید چند دنوں کے بعد قدیم ہو جائے گا۔ نہ قدیم ہمیشہ سے قدیم تھا اور نہ جدید ہمیشہ جدید رہے گا۔ کبھی اتنی گھٹیا درجے کی بات کو ذہن میں نہ آنے دیجیے۔ اچھائی اور بُرائی کا قدامت یا جدّت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بھلائی اور برائی، افادیت و مضرت حقائق ثابتہ ہیں اور قدامت و جدّت محض اضافی تعبیرات۔ اضافی تعبیرات سے حقائق ثابتہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوا کرتی ہے۔ قدامت و جدّت ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ انھیں الگ نہیں کیا جاتا۔

زمانہ اسی طرح چلتا رہا ہے
دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے

بہرحال! جب یہ ثابت شدہ بات ہے کہ احترامِ اکابر کا جذبہ بھی دوسرے فطری جذبات کی

طرح ایک فطری جذبہ ہے جو انسانی قلب کی گہرائیوں میں ودیعت کیا گیا ہے تو ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اس جذبے کو افراط و تفریط سے محفوظ رکھنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کہاں سے ہم اس کے اعتدال کے حدود کا علم حاصل کریں، اور کس طرح ہم یہ جانیں کہ اس جذبے کے عملی مظاہر کا صحیح اور معتدل مقام کیا ہے۔

یاد رکھیے کہ انسانی سیرت و کردار کی تکمیل کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور اسی راستے کی نشاندہی اور اس پر چل کر فلاحِ دین و دنیا کے حصول کی تعلیم و تفہیم کے لیے انبیاء علیہم السّلام کو مبعوث کیا گیا ہے۔ اور سب سے آخری نبی حضرت محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنی بعثت کے مقاصد میں یہ فرمایا ہے کہ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (مجھے اس لیے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں اخلاق کے اچھے اُمور کی تکمیل کر دوں) اخلاق کے یہ اچھے امور کیا ہیں، اس کے لیے کسی دوسری جگہ کوئی روشنی نہیں مل سکتی۔ صرف انبیاء علیہم السّلام کی سیرۃ طیّبہ ہی سے صحیح اور معتدل نمونے میسّر آ سکتے ہیں۔ اس لیے احترامِ اکابر کا نمونہ بھی ہمیں صرف انبیاء علیہم السلام ہی کے پاس ملے گا۔

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ احترامِ اکابر کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے، دنیا کے ہر مذہب نے اس کی تاکید کی ہے، دنیا کی ہر قوم میں اس جذبے کے عملی نمونے بھی ملتے ہیں لیکن جب اہلِ فکر نے انبیاء کے نمونوں کو چھوڑ کر اپنی عقل و دانش سے اس جذبے کے اظہار کی صورتیں پیدا کیں تو اس میں افراط و تفریط کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ کہیں یہ جذبہ دب کر معاشرے میں اخلاقی انتشار اور نزاع کا سبب بن گیا۔ اور کہیں بڑھ کر آبا پرستی، مادر پرستی اور اعاظم پرستی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ کہیں یہ جذبہ اس قدر محدود ہو گیا کہ نسلی تعصّب، مفاخرت اور قدامت پرستی بن گیا۔ اور نسلی تفوق کا ناپاک تصوّر پیدا کرنے کا موجب ہوا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ چاورن بن گئے۔ ہندوؤں، یونانیوں اور رومیوں کی تاریخوں میں اس بے اعتدالی کے افسانوں کا ایک انبار ہمیں نظر آتا ہے۔ ظلم، تعدی، نسل کشی اور ناانصافیوں سے ساری تاریخ رنگین ہے۔ اور کہیں یہ اس قدر پھیلا کہ احترامِ مادر سے عمومی مادریت کے تصوّرات نے جنم لیا۔ پھر کیا تھا۔ گائے بھی ماں، زمین بھی ماں، ماترِ بھومی، پاربتی، درگا دیوی، نفرتیتی، ابوالہول اور ہزاروں شکلیں پیدا ہوئیں۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانے کی سیاسی وطنیت اور وطن پرستی پیدا ہوئی، اور یہ خونخوار دیوی آج بھی اپنے بچّوں کے خون پیتی رہتی ہے۔ ساری تاریخ اس کی جفاکاریوں سے رنگین ہے۔

یہ سب کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ فکرِ انسانی فطری جذبۂ احترامِ اکابر کے اظہار میں

انبیاء علیہم السّلام کی سیرتِ طیبہ سے اعتدال کے نمونے حاصل کرنے کے بجائے خود اپنی دانش مندی سے اس کی صورتیں پیدا کرلیں ۔ اور اس کے دردناک نتائج کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا ۔ درنہ احترام کے حدود اور اکابر کی تعیین اگر انبیاء علیہم السّلام کی سیرت سے کی جاتی تو یہی جذبۂ احترام اکابر افراد و اجتماع دونوں کے لیے رحمت ثابت ہوتا۔ انسانی عقل کوئی بے کار سی چیز نہیں ہے، یہ سب سے زیادہ مفید اور کارآمد قوت ہے جو خالق کائنات نے انسان کو عطا فرمائی ہے ۔ اسی کی وجہ سے انسان انسان ہے، تمام حیوانات سے ممتاز ہے اور مخلوقاتِ ارضی میں تاجِ سروری کا حق دار ہے لیکن اس کا کام یہ ہے کہ معلومات کو ترتیب دے کر نامعلوم کو معلوم کرے ۔ جزئیات سے کلیات مرتب کرکے صحیح راہِ عمل متعین کرے، اور جد و جہد کے لیے راہِ عمل متعین کرکے آدمی کو دنیا کی ہر چیز سے بیش از بیش استفادے کے لیے تیار کرے ۔ اس کا یہ کام نہیں ہے کہ نفسِ انسانی کا تزکیہ کرے، خالقِ کائنات کی مرضی معلوم کرے اور انسانی زندگی کے شرف اور سربلندی کے لیے یا ایک صالح معاشرے کو پیدا کرنے کے لیے کوئی ضابطۂ حیات مرتب کرسکے ۔ اس کے لیے فلسفیوں اور مفکرین کے نغمہ ہائے بےصوت کارآمد نہیں ہوتے بلکہ انبیاء علیہم السّلام کی سیرتِ طیبہ کارآمد ہوتی ہے۔

اس لیے آیئے دیکھیں کہ انبیائے کرام کی سیرتوں میں ہمیں کیا ہدایت ملتی ہے ۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء آئے، اُن کے حالات ہم تک نہیں پہنچے، کچھ تھوڑے سے حالات قصہ کہانیوں میں ملتے ہیں ۔ اور چند انبیائے کرام کا حال وہ بھی بہت تھوڑا ہمیں قرآن مجید میں ملتا ہے۔ اسی طرح بعض چیدہ چیدہ واقعات کتابِ مقدس میں مل جاتے ہیں ۔ البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ مکمل اور کافی تفصیلات کے ساتھ ہمیں مل جاتی ہے ۔ ان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ احترام اکابر کا عمل سارے انبیاءً کی زندگیوں میں موجود ہے لیکن اس اعتدال کے ساتھ کہ اس احترام میں خدا کے احکام کی نافرمانی نہ ہو اور کسی صورت میں تعبد کی شکل نہ پیدا ہونے پائے ۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ طیبہ میں یہ چیز ایک سے زائد مواقع پر دکھائی دیتی ہے کہ آپ بڑے بوڑھوں کا خاص احترام فرماتے ہیں، حتیٰ کہ ایک کافر مگر بوڑھا آدمی جب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو آپؐ اُس کا بھی پوری طرح احترام فرماتے ہیں ۔ بوڑھی عورتوں کی تعظیم و تکریم فرماتے ہیں ۔ شیخ قبیلہ کو عزت و احترام کا مقام عطا فرماتے ہیں ۔ اس حد تک کہ فرمایا ۔ من لم یکرم کبیرنا و لم یرحم صغیرنا فلیس منا (جس نے بڑے کا احترام نہیں اور چھوٹے

پر شفقت و رحمت نہیں کی، وہ ہماری جماعت، یعنی مسلمانوں میں سے نہیں ہے) گویا یہ دونوں عادتیں مسلمان کے لیے ضروری ہیں۔ صحابہ کو یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے اور بہت سی صورتوں میں نماز کی امامت میں، محفل میں گفتگو کی ابتدا کرنے میں اپنے سے بڑی عمر والے کو ترجیح دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں بڑوں سے بڑھ کر چھوٹوں کی گفتگو کو ناپسند کیا جاتا تھا۔ جب کوئی وفد آتا تو حکم ہوتا کہ لیتکلم کبیرھم، ان میں سے بڑا آدمی بات کرے۔ اس طرح ہر موقع پر اور ہر بات میں اکابر کا احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ اس طرح ایک صالح معاشرہ پیدا کیا گیا جس میں احترام اکابر بدرجۂ کمال موجود تھا، لیکن آبا پرستی نہ تھی۔ اُن کو یہ تو یقین تھا کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ مگر انھیں یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ اُس کی اطاعت اور اس کا اعزاز و احترام اللہ کے بتائے ہوئے حدود کے اندر ہی ہوگا۔ ماں کا درجہ خدا اور رسول کے بعد ہے۔ اس لیے ایک سعادت مند بیٹے کے احساسات کو خدا و رسول کے بتائے ہوئے حدود سے متجاوز نہیں ہونا چاہیئے اور جب ماں کے احترام میں حق و باطل کا امتیاز مٹنے نہیں دیا جا سکتا تو کسی اور کے احترام میں اس امتیاز کو کیسے مٹنے دیا جائے گا۔

صحابۂ کرام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ طیبہ اور اُن کی مقدس تعلیمات نے یہ صورت پیدا کر دی تھی کہ بڑا چھوٹوں سے شفقت رکھتا تھا اور چھوٹے بڑوں کا احترام کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ صحابہ میں اختلافات نہ تھے یا مشاجرات بلکہ لڑائیاں نہیں ہوتی تھیں، انسانی آبادی کبھی کہیں اور کسی دور میں مشاجرات و محاربات سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ صحابۂ کرام کی آبادی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھی، مگر یہ حقیقت و واقعہ ہے کہ اس عدیم المثال معاشرے میں بھلائیوں کو بھلائیاں اور برائیوں کو برائیاں ہی سمجھا جاتا تھا۔ اور لوگ شفقت و جذبات سے عاری نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان بزرگوں کو باوجود مخالفتوں کے دوسرے ہی لمحے پورے جذبات احترام و شفقت کے ساتھ ملتے جلتے اور شیر و شکر بھی دیکھتے ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے موجودہ معاشرے میں ہم آہنگی اور محبت و احترام کے جذبات کارفرما نظر آئیں تو اس مقصد کے لیے سب سے پہلے خود اپنے آپ کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اگر قوم کے بڑھے بوڑھے شفقت و محبت کو اپنا شعار بنالیں اور اپنے جذباتِ نفرت و حقارت پر کوشش و سعی کے ذریعہ سے قابو پالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے چھوٹوں اور نوجوانوں میں دبے ہوئے فطری جذباتِ احترام اکابر کو بیدار نہ کر سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ

یہ ایک مشکل کام ہے۔ جن بچوں کو اسکولوں اور کالجوں میں ہم رُوحانی سکینت اور اجتماعی اخلاق کے اسباق سے دُور رکھیں گے انھیں احترام اکابر کے لیے تیار کرنا یقیناً کوئی آسان کام نہیں ہوسکتا، مگر یہ کام مشکل ہونے کے باوجود محال ہرگز نہیں ہے۔ ہم سن رسیدہ لوگ اپنے آپ کو بدلیں۔ ہمارے اساتذہ اپنے طلبہ سے شفقت کا برتاؤ کریں۔ انھیں اپنا دوست نہ بنائیں بلکہ اپنی اولاد کی طرح اُن پر مہربان اور شفیق ہوجائیں۔ اُن میں ڈسپلن قائم کرنے کے بجائے اُن کے جذبۂ احترامِ اکابر کو بیدار کریں۔ اُن سے گفتگو میں اور اُن کے ساتھ برتاؤ میں فوجی افسروں کا انداز نہ اختیار کریں بلکہ شفیق باپ اور چچا بن جائیں۔ اپنے اخلاق سے اُن پر یہ ثابت کر دیں کہ بھلے آدمی ایسے ہوتے ہیں اور یہ ہرگز نہ ہونے دیں کہ طلبہ اُن کو اپنا بے تکلف دوست اور ہم سن یار سمجھنے لگیں۔ یا اُن سے ایسی بے اعتنائی نہ برتیں کہ وہ انھیں صرف ایک تنخواہ یاب ملازم سمجھنے پر مجبور ہوجائیں — یہ دونوں صورتیں انتہائی مضرت رساں ہیں، اُن کی وجہ سے طلبہ میں وہ جذبہ ہی ختم ہوجائے گا جو انھیں اپنے اساتذہ سے خوبیوں کے اخذ کرنے پر تیار کرتا ہے۔ حاضر کا رشتہ ماضی سے منقطع ہوکر انھیں شعارِ اغیار کا شیدائی بنا دے گا۔ اور نتیجۃً سارا معاشرہ ذہنی انتشار کا شکار ہوجائے گا۔

یوں تو ہم میں سے ہر شخص کو اپنا وطیرہ بدل دینا چاہیئے تاکہ ہماری اولاد اور ہمارے چھوٹے احترامِ اکابر کے پابند ہوسکیں، لیکن سب سے زیادہ یہ کام درس گاہوں کے اساتذہ کر سکتے ہیں۔ اگر اساتذہ اپنے آپ کو بدل ڈالیں تو طلبہ ضرور اُن کی اقتدا کریں گے۔ مثل مشہور ہے کہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ بدلتا ہے۔

حضرات! میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں، اور آپ نے جس توجہ کے ساتھ میری باتیں سماعت فرمائیں اُن کے لیے دل سے شکر گزار ہوں۔ اور آخر میں میں شکر گزار ہوں ہمدرد فاؤنڈیشن کے صدر اور دیگر ارکان و منتظمین کا کہ انھوں نے مجھے آپ سے ملنے اور چند باتیں یاد دلانے کا موقع عطا فرمایا۔ میری باتیں اگرچہ کوئی عجیب اور جدید باتیں نہیں ہیں۔ یہ وہی باتیں ہیں جن سے خود آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں، لیکن موجودہ حالات میں ہمیں ان کے یاد رکھنے، ان پر غور و فکر کرنے اور ان پر پوری توجہ کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ:

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

جناب محترم ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی

مکرّم و محترم نمائندگان قوم!
خادم ملک و ملت مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب کی تقریر دل پذیر آپ حضرات جس توجہ اور التفات سے سماعت فرماتے رہے، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ قوم میں اخذ و عمل کی تڑپ باقی ہے اور یہ احساس کارفرما ہے کہ اکابر کا احترام لازم ہے، کہ انسان کی اپنی عزّت اور شرافتِ نفس اسی میں مضمر ہے۔ رہا یہ سوال کہ کن اکابر کا احترام واجب الالتزام ہے؟ تو ظاہر ہے کہ حفظِ مراتب کے انسانی اصول کے ماتحت "اکابر" کی تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ عمر، علم، عمل، عقل، عبادت، عرفان، عہد، عقیدت، عزم، علوہمّت، عبدیت جس عنوان سے جس کسی کی بزرگی اور بڑائی ثابت ہوگی اُس کا احترام صرف انسانی ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ ہے۔
اکابر کی وضاحت آپ سُن چکے کہ والدین، اساتذہ، اُستانیاں، مقتدایانِ دین، پیشوایانِ مذاہب، منتظمینِ حکومت، اربابِ حل و عقد، خدّامِ دین، فدایانِ علم و حکمت، دانشورانِ ملک و ملّت، گزرے ہوئے آبا و اجداد وغیرہ وغیرہ سب اکابر میں داخل ہیں۔
جذبۂ احترام درحقیقت کسی کے ساتھ والہانہ عقیدت، دلی تعلق اور خلوص و محبّت کے اظہار کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اسلام نے ایمان کے اندازہ کہ عمل میں افراط و تفریط سے ہمیشہ بچنے کی تلقین کی ہے کہ عملی مظاہرے میں کمی بیشی سے بسا اوقات انسان بے خبر اور غافل ہو جاتا ہے اور رشتۂ اعتدال اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بے اعتدالی بڑے مہلک نتائج کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے ہر ہر گام پر انسان کو ہشیار رہنے کی تاکید کی ہے، اور ہر آن صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی دُعا کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اور ان لوگوں کی راہ اختیار کرنے سے باز رہنے کی تلقین کی ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے راندۂ درگاہ بنایا اور جن پر اُس کا غضب نازل ہوا۔ ضلال و غضب کے ہدف بننے کی وجہ قرآن حکیم کی آیات سے یہی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے ذی احترام ہستیوں اور اپنے اکابر پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے، انھیں قتل کیا، انھیں اذیتیں پہنچائیں۔ احترام کی بجائے اُن کی تذلیل و توہین میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ یہ الزامات قرآن پاک کی شہادتوں سے یہود پر منطبق ہوتے ہیں۔ اکابر کے احترام میں حد سے تجاوز کرنے میں نصاریٰ پیش پیش

رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے اولیا اور مقدس ہستیوں کو الوہیت تک کا درجہ دے دیا۔ خدا کے ساتھ شریک وسہیم بنانے کے ساتھ اُن کے آگے، اُن کی تصویروں کے آگے رکوع وسجدہ سے کبھی باز نہ آئے۔ اور ضلال وگمراہی کے مورد ٹھہرے۔

احترام اکابر میں افراط وتفریط کی اُن مثالوں کی وضاحت کے بعد آیئے ہم اپنے اپنے گریبان میں منھ ڈال کر اپنا محاسبہ کریں۔ آپ کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ آج کا مسلم معاشرہ اگر ایک طرف " ہیرو ورشپ " کے جذبے سے سرشار نظر آتا ہے تو دوسری طرف ایسے جواں سالوں کی کمی معاشرے میں نہیں جو' احترام اکابر' تو دور کی بات ہے ہر موقع پر اُن کی توہین سے گریز نہیں کرتے۔ یہ ضرور ہے کہ بحمداللہ اب بھی ہمارے معاشرے میں ایسے حضرات کی کمی نہیں جو جادۂ اعتدال پر قائم ہیں اور اُنھی کے ہم رہینِ منت ہیں کہ آزادی کے ساتھ ہم اپنی آواز آپ تک پہنچا سکتے ہیں۔ شکر گزار ہونا چاہیئے خالقِ پروردگار کا کہ اب بھی اپنی رحمت سے ہماری حکومت کو یہ توفیق بخشی ہے کہ زرعی، معاشرتی، تعلیمی، طبی نیز قانونی اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے میں شب وروز کوشاں ہے اور اب بھی ہمارے معاشرے میں ایسی مقتدر ہستیاں موجود ہیں جو عوام کی خدمت میں سرگرم ہیں اور لوگوں میں نیک خیالات کے پیش کرنے اور سننے کے مواقع فراہم کرتی رہتی ہیں۔ فجزاھم اللہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم معاشرے کے لیے' احترام اکابر' طرۂ امتیاز ہے۔ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ہمارا ایمان ہے۔ اور سارے اگلے نبیوں، رسولوں، ملائکہ اور مقدس آسمانی کتابوں پر ہمارا عقیدہ ہے۔ امہات المؤمنین صحابہ وصحابیات، نیز ائمہ مجتہدین، اولیا واکابرِ دین، سلفِ صالحین، علما وفقہا، عباد وزہاد، صوفیائے کرام، اولیائے عظام اور خواتین وائمہ دین کے احترام ومحبت میں ہم سب کے سب برابر کے شریک وسہیم ہیں، البتہ اس پُر آشوب زمانے میں جب کہ حوادثِ روزگار کے پے بہ پے صدموں سے ہم جاں بر بھی نہ ہو پائے ہیں، بزرگانِ دین سے عقیدت مندی کے اظہار میں بے جا اسراف وتبذیر سے احتراز پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا عین حکم ہے اور فرمانِ نبویؐ سے تغافل ہمیشہ واجب التعزیر سمجھا گیا ہے۔ اے کاش! ارشاداتِ ربانی کے مطابق عمل کرنے کی ہم سبھوں کو مزید توفیق ہوتی! اور فرموداتِ نبویؐ کے احترام کا جذبۂ صادق ہمارے دلوں میں مزید موجزن ہوتا، کہ ہم میں ہر ذی مرتبت اور صاحبِ اقتدار ہستی اپنی اپنی دلی تمناؤں کی خواہشِ تکمیل اور اپنی ناروا کمزوریوں پر پردہ پوشی کی کوششوں کو اپنے ہم جنسوں، فقراء ومساکین، بیواؤں اور یتیموں، ناداروں اور بے کسوں کی حاجت

براری اور اُن کی بنیادی ضرورتوں کو پوری کرنے پر قربان کر دیتا ؛ تاکہ بیش بہا عطایا اور اوقاف و وصایا کی بے دریغ رقمیں انسانی ذی حیات افراد کے احترام و وقار کو برقرار رکھنے میں کام آتیں۔ اور اپنے آں جہانی اکابر کے احترام کے جذبات کے اظہار میں تعلیماتِ نبوی سے سرموا نحراف کرنے، اور بے جا نام و نمود، اسراف و فضول خرچی کے الزامات سے ہم سب بے داغ محفوظ ہو پاتے۔

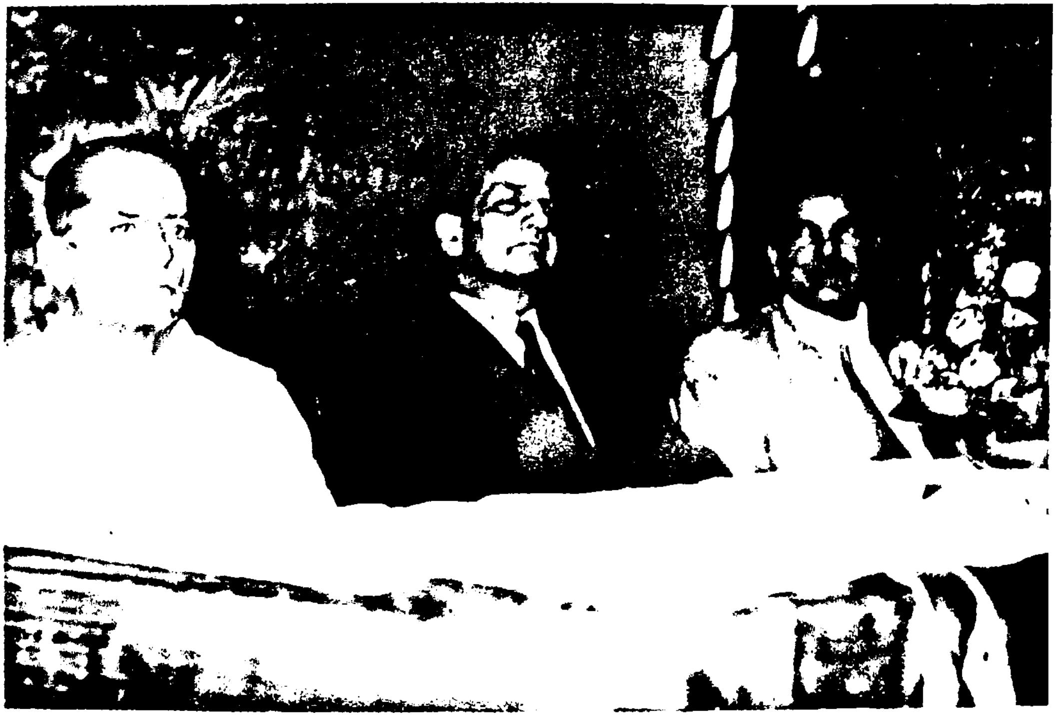
اللّٰھم ارزقنا باحترام اکابرنا ومحبتۃ اصاغرنا ووفقنا لاطاعتک واطاعۃ رسولک وارحمنا واغفرلنا انت مولانا وانصرنا علی القوم الکافرین۔



کلماتِ ابتدائیہ : پروفیسر حمید احمد خاں



صدارتی کلمات : جسٹس ذکی الدین پال



(دائیں سے) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، جسٹس ذکی الدین پال ، پروفیسر حمید احمد خاں

احترامِ ثقافت

کلماتِ ابتدائیہ : جنابِ محترم پروفیسر حمید احمد خاں
مقالہ : جنابِ محترم ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
کلماتِ صدارت : جنابِ محترم جسٹس ذکی الدین پال

شامِ ہمدرد، لاہور
یکم جون ۱۹۷۲ء

جناب محترم پروفیسر حمید احمد خاں

ہمارے وطن عزیز کے استقلال کا ایک بڑا مقصد مسلمانانِ برعظیم کی مخصوص قومی ثقافت کا تحفظ تھا۔ اس لحاظ سے ہماری ثقافت ہماری بلند ترین اقدار میں ایک قابلِ احترام حیثیت رکھتی ہے۔ آج شام میرے فاضل دوست ڈاکٹر نصیر احمد ناصر قومی زندگی کی اس اہم اصطلاح کی نہ صرف توضیح و تعریف کریں گے بلکہ یہ بھی بیان فرمائیں گے کہ ثقافت کا احترام کس طرح ہماری قومی ہستی کے ثبات و احترام کا سرچشمہ ہے۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ کے معتمد اور فکر اسلامی پر متعدد معروف کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہمارے لیے اس حقیقت کی حکیمانہ تشریح کریں جو نہ صرف ہمارے قومی وجود کی ضامن ہے بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کی سعی و عمل کے لیے ایک نصب العین بھی مہیا کرتی ہے۔ ثقافت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھنا ہماری قوم کا فرض بھی ہے اور حق بھی، کیونکہ اس کو صحیح طور پر سمجھے بغیر ہمارا معاشرہ اپنے ماضی سے بیگانہ رہتا ہے اور ہم اپنی منزلِ مقصود کی طرف ترقی و اقبال مندی کے قدم نہیں بڑھا سکتے۔

خوش قسمتی سے آج کے جلسے کی صدارت کے لیے میرے محبِ مکرم جسٹس ذکی الدین پال تشریف لائے ہیں۔ جسٹس ذکی الدین پال ملک کے مستند ماہرِ قانون اور پنجاب ہائی کورٹ کے فاضل جج ہیں۔ جہاں قومی ثقافت جیسے بغایت اہم مسئلے کے اصطلاحی مفہوم کی تعریف و تحدید ہو رہی ہو وہاں جسٹس ذکی الدین پال کا شمول اور صدارت دونوں صدگونہ مسرت کا باعث ہیں۔

جیسا آپ کو معلوم ہے آج کے جلسے کا موضوعِ گفتگو "احترام ثقافت" ہے۔ ہماری زبان میں اس وقت تین لفظ مستعمل ہیں: تہذیب، تمدن، ثقافت، جو بظاہر تقریباً ہم معنی معلوم ہوتے ہیں، مگر دراصل ان میں سے ہر ایک لفظ اپنے اندر مخصوص معنی رکھتا ہے اور کسی دوسرے لفظ کا متبادل نہیں ہے۔ میں آپ کو ان الفاظ کے مخصوص لغوی مفہوم پر غور فرمانے کی دعوت دیتا ہوں۔ ان میں سے ہر لفظ کے لغوی مفہوم کا اس کے مروّج اصطلاحی مفہوم سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔

تہذیب ذہنی قوتوں کی تربیت اور جِلا کا نام ہے۔

تمدن انسان کے یا انسانوں کی کسی جماعت کے شہر میں آباد ہو جانے کی کیفیت اور شہری

بود و باش کے طریقے اختیار کر لینے کا نام ہے۔
ثقافت سے بہ لحاظ معنی دانش و ہنرمندی مراد ہے۔ ثقافت اردو میں ایک نسبتہً نیا لفظ ہے جو شائستہ ہونے کی ذہنی اور مادی دونوں کیفیتوں پر حاوی خیال کیا جاتا ہے۔

گویا "احترام ثقافت" کا موضوع پرانے محاورے میں تہذیب و تمدن دونوں کے احترام پر مشتمل ہے۔

آپ کو اتفاق ہوگا کہ تہذیب ایک ذہنی کیفیت ہونے کے لحاظ سے کسی نہ کسی نظریۂ حیات سے وابستہ ہوتی ہے۔ تہذیب پاکستان کی ہو یا بھارت کی، چین کی ہو یا روس کی، اس کی عمارت کسی نہ کسی نظریاتی اساس پر ضرور قائم ہوتی ہے۔ ہماری پاکستانی تہذیب کا سرچشمہ دینِ اسلام ہے جو ایک خدائے واحد کو مانتا ہے، ایک ایسے خدا کو جو مادی وجود نہیں رکھتا مگر ساتھ ہی اس بظاہر بے پایاں مادی کائنات کی پیدائش کی علتِ اولیٰ ہے۔ خدا کا یہ تصور ہمیں بھارت کی دیومالا، روس کے الحاد اور چین کی لاادریت کے ماورا لے جاتا ہے۔ اگر ہمارا خدا ایک ہے تو ہماری کائنات بھی ایک ہے۔ ہم روحانی اور مادی زندگی میں سادھوؤں اور راہبوں کی طرح تفریق نہیں کرتے۔ مادہ بھی اسی طرح ایک حقیقت ہے جس طرح روح، اس لیے کہ روح اور مادہ دونوں کا خالق خدا ہے۔ دنیا کے رہبانی مذاہب کی طرح ہم نے مادی دنیا کو کبھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ جہاں ہم روحانی طور پر پاکیزہ زندگی کے طلب گار ہیں وہاں ہمیں مادی دنیا کی نعمتوں کی بھی قدر ہے۔ رہبانیت کی زندگی گزارنے کے بجائے ہم خدا کی نعمتوں کی شکرگزاری میں پُرمسرت اور صحت مندانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح اگر ہمارے لیے خدا ایک ہے اور اُس کی پیدا کی ہوئی کائنات ایک ہے تو بنی نوع انسان بھی ایک جماعت ہیں، جن میں ذات پات اور رنگ و نسل کی کوئی تمیز جائز نہیں ہے۔ توحید اور مساواتِ انسانی ہمارے عقیدے کے رکنِ رکین ہیں۔ اِن کی روشنی میں ہماری پوری زندگی کا اندازِ کار مقرر ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں نہ کوئی ورن آشرم ہے اور نہ ذات پات کی ہزار ہا سالہ علیحدگی جو پشت ہا پشت گزر جانے پر بھی کروڑوں بدنصیبوں کے ماتھے سے کلنک کے وہ پرانے داغ نہیں دھو سکی جو آریاؤں نے ساڑھے تین ہزار برس ہوئے لگائے تھے۔

میں نے ابھی تک پاکستان کی اسلامی ثقافت کا ذکر کیا ہے، لیکن پاکستان دراصل عالمِ اسلام کی عمومی ثقافت کے ساتھ کئی رشتوں کے ذریعہ سے بندھا ہوا ہے۔ پاکستان کے لیے ایشیا اور افریقہ کے دیگر مسلمان ممالک بڑی حد تک ہم ثقافت ملک ہیں، کیونکہ سب کے

درمیان اسلام ایک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے تُرک بھائیوں نے اس صدی میں غیر دینی حکومت قائم کرلی مگر یاد رکھیے کہ تُرک قوم کی رگ و پے میں اسلام اور اسلام کا نافذ کیا ہوا تمدن، مثلاً مساواتِ اسلامی کا عقیدہ، آج بھی اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح صدیوں پہلے تھا۔ میں نے ۱۹۶۷ء میں حکومتِ ترکیہ کی دعوت پر چند روز کے لیے انقرہ، قونیہ، ازمیر اور استنبول وغیرہ کی سیر کی۔ ایک دن انقرہ کے باہر ایک پُر فضا مقام پر سرکاری "مہمان دار" نے (جو ترکیہ کی وزارتِ خارجہ کے ایک نوجوان افسر اور ایک انگریزی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسان تھے) مجھے کھانے کی میز پر بٹھایا اور ساتھ ہی پوچھا، "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں ڈرائیور کو بلالوں کہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالے؟" میں نے فی الفور کہا "مرحبا! آپ کا یہ شعار سچّے مسلمانوں کا شعار ہے"

پاکستانی قومیت اور پاکستانی ثقافت دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ آج سے ۲۹ برس پہلے ایک انگریز اہلِ قلم نے قائدِ اعظم سے دریافت کیا تھا کہ آخر تحریکِ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟ قائدِ اعظم نے صرف چار لفظوں میں اس کا مطلب سمجھا دیا: "مسلمان ایک قوم ہیں!" جب قائدِ اعظم نے یہ فرمایا تو گویا اس حقیقت کا اثبات کیا کہ مسلمان قوم ایک مستقل ثقافت کی مالک ہے۔ اس ثقافت میں ہمارے دینی عقائد، ہماری تاریخ، ہمارے نامور اکابر رجال، ہماری تعمیرات، ہماری موسیقی، ہمارے فنونِ لطیفہ، ہمارے قوانین، ہمارے اصولِ فقہ سب شامل ہیں۔ ہمارے نام، ہمارا لباس، ہماری خوراک، ہماری اقتصادی زندگی، ہمارا تعلیمی نصب العین، ہمارے معاشرے میں عورت کا مقام، حیوانات کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر، یہ سب بابائے قوم کے نزدیک ہمیں ایک علیحدہ اور آزاد ثقافت کا وارث بناتے ہیں۔ ان رسوم و عادات کو سامنے رکھیے اور پھر اندازہ کیجیے کہ جس پونجی کو دامن میں باندھ کر ہم پاکستان کی منزل کی طرف روانہ ہوئے تھے اس میں ہم نے اب تک کیا اضافہ کیا؟ کہاں کہاں ہم نے اپنی دولت کو تلف کر دیا اور کب کب اُس نصب العین سے دُور ہوتے گئے جس کو سامنے رکھ کر ہم نے جہادِ حریت شروع کیا تھا؟

بہت عرصہ ہوا، شاید ۴۰ برس گزرے کہ میں نے اور میرے بعض احباب نے ایک دفعہ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ پوچھا تھا کہ "تہذیب اور تمدن کے درمیان کیا فرق ہے؟" علامہ مرحوم نے فرمایا تھا کہ تہذیب ذہنی کیفیات کا مجموعہ ہے اور تمدن ان کیفیات کے بیرونی ظہور کا نام — لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے اندازِ خاص میں ہنس کر یہ بھی فرمایا تھا کہ کیا تہذیب اور کیا تمدن اس کا اصل رنگ کھانے کے دسترخوان پر کھلتا ہے۔ قوموں کی ثقافت کا میعار ان کے

کھانے پینے کے طریقے ہیں۔ اقبال کے لیے دنیا کی تمام مسلمان اقوام کے ثقافتی اشتراک کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ مراکش سے ترکیہ اور ایران و افغانستان سے پاکستان اور انڈونیشیا تک جہاں جہاں مسلمان ہیں وہاں پلاؤ بھی ہے اور کباب بھی۔ اسی لیے پلاؤ اور کباب کو اقبال مزاحًا کبھی کبھی "اسلامی غذا" کا نام بھی دیتے تھے۔

لیکن مزاح سے قطع نظر آپ کو یاد ہے کہ کسی زمانے میں یہاں ہندو پانی اور مسلمان پانی، ہندو رسوئی اور مسلمان باورچی خانہ، ہندو دھوتی اور مسلمان تہبند، ہندو پیتل کے برتن اور مسلمان تانبے کے قلعی کیے ہوئے برتن، کس شدت سے اپنی علیحدگی پر مصر تھے۔ یہ جزئیات کے فرق قومی ثقافت کے امتیازات تھے۔ مگر یہ امتیازات صرف چھوٹی چھوٹی باتوں میں نہیں، بہت بڑی بڑی باتوں میں بھی قائم تھے اور اب تک نہایت استحکام سے قائم ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جس قوم کے پاس اپنی مخصوص ثقافت نہیں ہے اسے آزاد رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

میں نے آج کے موضوعِ تقریر کے تعارف کے طور پر یہ چند ہلکی پھلکی باتیں آپ کے گوش گزار کیں۔ ڈاکٹر نعیر احمد ناصر زیادہ اہم اور زیادہ سنجیدہ مسائل پر اپنا مقالہ اس جلسے میں پیش فرمائیں گے۔

جناب محترم ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

میں اپنے دوست حکیم محمّد سعید صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے آج کی شامِ ہمدرد میں آپ ایسے اہلِ علم و دانش سے خطاب کرنے کا موقع دیا، لیکن مجھے اُن سے ایک گونہ شکوہ بھی ہے کہ انھوں نے میرے لیے جو عنوان تجویز کیا وہ اس اعتبار سے مشکل اور پیچیدہ اور مختلف فیہ ہے کہ اس کے حدود وسعت متعیّن ہیں نہ حدود معانی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ثقافت کا لفظ کثرتِ استعمال کے باوجود ابھی تک شرمندۂ معانی نہیں ہوا۔

ثقافت کی اصطلاح ہماری زبان میں انگریزی کی مصطلحہ کلچر کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور ہر پڑھا لکھا شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کے مفہوم سے آشنا ہے لیکن اس کے معانی و مفہوم کی تعیین دوسروں سے مختلف کرتا ہے۔ اگر یہ امر واقعی ہے اور یقیناً ہے تو پھر آپ کو مجھے بھی اس اصطلاح کی تعریف اپنی صوابدید کے مطابق کرنے کا حق دینا ہوگا۔

اس سے پہلے کہ میں ثقافت کی تعریف کروں، آج کے موضوع احترامِ ثقافت سے متعلق اس اہم سوال کا جواب دینا ضروری ہے کہ ہم کس ثقافت کا احترام کریں؟ اُس ثقافت کا جو اپنی رُوحِ حیات اور حُسن سے محروم ہو چکی ہے یا اُس ثقافت کا احترام کریں جس کی داغ بیل پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم نے حجاز کی مقدّس سرزمین میں ڈالی تھی؟ ہمارے ملک میں بعض دانشور ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہماری ثقافت پاکستانی ہونی چاہیئے، اور پاکستانی ثقافت سے اُن کی مراد موئنجوڈرو، ہڑپا، ٹیکسلا وغیرہ کی قدیم مقہور و مغضوب اور مشرک و بُت پرست اقوام کی مردہ ثقافت ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم مسلمان حق پرست اور موحد و بت شکن ہیں۔ لہٰذا ہماری ثقافت مشرک و بت پرست اقوام کی ثقافت ہو سکتی ہے نہ دہریت و شیطنت پرست اقوام کی۔ ہماری ثقافت یہ بھی نہیں کہ جو ہمیں انگریزی کی غلامی کے صدقے میں ملی ہے۔ ہماری ثقافت تو وہ ہے جس کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے اور جس کی بنیاد آخری پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مسجد نبویؐ میں رکھی تھی، اور جو حجاز کی مقدّس سرزمین میں پروان چڑھی اور توحید و رسالت، حسن و صداقت اور علم و حکمت کی انقلاب انگیز تحریک بن کر فضائے عالم میں پھیل گئی۔

کسی قوم کے دینی معتقدات اس کی ثقافت کا منبع ہوتے ہیں اور ثقافت اس قوم کے جمالیاتی شعور کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ چنانچہ ہماری ثقافت کا مبدا بھی ہمارا دینِ اسلام ہے جو فطرت

انسانی کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے دینِ فطرت کہلاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام ایک ثقافتی تحریک ہے جو کل زندگی کو محیط ہے۔ یہ ایک جامع و مانع ضابطۂ حیات ہے جو افرادِ نسلِ انسانی کو زندگی کے ہر شعبے اور ہر زمان و مکان میں ارتقائے مسلسل کے حقیقی مقامِ محمود کی حسین راہ کی نشان دہی اور اس کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔ جمالیاتی یا ثقافتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو تحریکِ اسلام کا مقصد "حسن آفرینی" ہے، فکر و عمل کے ہر گوشے میں، تاکہ انسان کے معروضی و موضوعی دونوں قسم کے ماحول حسن و سرور انگیزی میں جنت بن جائیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کی یہ تحریک عرب کے اس خطے سے اٹھی جو ثقافت کے لحاظ سے روم، چین، مصر و فارس اور یونان و ہند سے بلاشبہ بہت پیچھے تھا، لیکن اس تحریک کی بدولت چند ہی برسوں میں اسلام دنیا بھر کے لیے حُسنِ ثقافت کا مشعل بردار بن گیا۔

تصوّر زندہ و حرکی ہو تو اس کی تفسیر و تعبیر میں ارتقائی بوقلمونی کا ہونا ضروری ہے اور یہ ارتقائی بوقلمونی ہی اس تصوّر کے حسن حرکی اور بقائے دوام کی ضامن ہوتی ہے۔ ثقافت چونکہ اپنی حقیقت میں حسنِ حرکی کا اظہار ہے اس لیے اس کی تعبیر بھی رنگا رنگ بوقلمونی سے مزیّن ہے۔ ثقافت کا تعلق جمالیات سے ہے اور جمالیات فلسفہ ہے حسن و فن کا، اور فلسفہ رفن متقاضی ہوتا ہے رمز و کنایہ کا، کیونکہ وہ حرفِ برہنہ کا متحمل نہیں ہو سکتا، جیساکہ علامہ اقبال نے فرمایا ہے:

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
اک حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

میری تمنا تو یہی ہے کہ میں فلسفۂ ثقافت کو آپ کے سامنے بڑے ہی سادہ اور واضح انداز میں بیان کروں، لیکن اگر مجھے استعارہ و کنایہ کا سہارا لینا پڑا تو اُسے موضوع کی فطری مجبوری سمجھیے، کیونکہ بقول مرزا غالبؔ:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اب میں ثقافت کے مفہوم کی تعیین کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن اس سے پہلے بڑی معذرت کے ساتھ آپ کی خدمت میں ایک گزارش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ یہ مبالغہ نہیں اظہارِ واقعیت ہے کہ یہ مقالہ میری برسوں کی فکرِ مسلسل اور مطالعے کا ماحصل ہے۔ فلسفۂ ثقافت پر غور و فکر کرتے کرتے ایک عمر گزر گئی ہے۔ زندگی کے رومان پرور ایام تک، جو بلاشبہ بڑے ہی حسین و نشاط انگیز ہوتے ہیں، اس طلب و جستجو میں گزر گئے کہ زندگی اور حسن کی حقیقت کیا ہے؟ لہٰذا اس مقالے کا ہر جملہ اور جملے کا ہر لفظ اپنا ایک مقامِ معنویت رکھتا ہے، اس لیے وہ آپ کے التفاتِ خصوصی کا طلب گار ہے

ثقافت کی تعریف بیان کرنے سے پہلے میں آپ کی توجہ اس ازبس اہم نکتے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ثقافت بھی ہر زندہ چیز کی طرح حرکی و تغیر پذیر ہے، اور اسے کسی حال میں کبھی ثبات نہیں۔ زندگی کے ہر مظہر کی طرح وہ یا تو ارتقائی حالت میں ہوگی یا رُو بہ تنزل ہوگی، اس کا کسی ایک مقام یا حالت پر رہنا محال ہے، کیونکہ

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

حیاتِ انسانی کے ارتقا کا حاصل کیا ہے؟ اس ازبس اہم سوال کا جواب ایک لفظ میں یہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ ثقافت ہے۔ اب میں ثقافت کی تعریف کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

زندگی کی حقیقت حُسن، اُس کی فطرت آرزوئے حُسن اور اُس کا تقاضا اظہارِ حُسن ہے، اور زندگی جب اپنے اس فطری تقاضے کی تشفی حسین و شعوری انداز میں کرتی ہے تو اسے ثقافت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ثقافت کل حیاتِ انسانی کو محیط ہے اور جمالیات سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

یہ اجمال تفصیل کا متقاضی ہے۔ میں نے ثقافت کی تعریف میں یہ مقدمہ قائم کیا ہے کہ زندگی کی حقیقت حُسن، اُس کی فطرت آرزوئے حُسن اور اُس کا تقاضا اظہارِ حسن ہے۔ اگر آپ اس عالم رنگ و بو کو حُسنِ نظر سے دیکھیں تو آپ کو اس کی ہر چیز حسین نظر آئے گی۔ شمس و قمر ہوں یا زہرہ و عطارد، آسمان کی نیلگوں فضا ہو یا تاروں بھری رات، برف پوش پہاڑوں کی رفعت و عظمت ہو دریائے ناپیدا کنار کی وسعت و شوکت، آبشاروں کی تندی و تیزی ہو یا نہروں کا خرامِ ناز، جنگلات کے روپوش نظارے ہوں یا صحراؤں کے برہنہ مناظر، مرغزاروں کی بہاریں ہوں یا باغ و چمن کی شادابیاں، یہ سب ہی تو جمیل و جلیل اور دلکش و نظر افروز ہیں۔ یہ کیوں ہے کہ طیور بوقلموں اور ان کی چہچہاہٹ سر کا سحر ہے، یہ کیوں ہے کہ لیل و نہار کے اختلاف اور رنگوں کی بوقلمونی میں جاذبیت و نظر افروزی ہے؟ یہ کیوں ہے کہ جو چیز بھی قدرت منصۂ شہود پر لاتی ہے، پیکرِ موزونی و جمال ہوتا ہے، ان تمام سوالوں کا ایک ہی جواب ہے اور یہ ہے کہ "اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَ یُحِبُّ الْجَمَالَ" یعنی اللہ تعالیٰ حسین ہے اور حسن کو بہت پسند کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ (السجدۃ ۳۲ : ۷) وہی خدائے رحیم ہے جس نے جو چیز تخلیق کی اُسے بہت ہی حسین بنایا۔ اپنی حُسن پسندی کے باعث ہی اُس نے انسان کی صورت و سرشت کو بھی حسین بنایا: وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ (التغابن ۶۴ : ۳) اور تمہاری صورت گری کی تو کیا ہی حسین تمہاری صورتیں بنائیں۔ نیز لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ٥ (التین ۹۵ : ۴) : ہم نے انسان کو حسین سرشت یا فطرت پر پیدا کیا۔

اللہ تعالیٰ چونکہ خود حسین ہے : وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (الاعراف ۷ : ۱۸۰) ، اس لیے اُس نے انسان کو بھی اپنی حسین فطرت پر بنایا ہے :-

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ٥ (الروم ۳۰ : ۳۰)

یہ اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے جس پر اُس نے انسانوں کی فطرت کو بنایا۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی چیز ہرگز بدلتی نہیں ، یہی دینِ قیم ہے ، لیکن اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے۔

یہ اُس کا حُسنِ فطرت ہے جس کی وجہ سے حیاتِ انسانی کو آرزوئے حُسن بھی ہے اور حسن آفرینی کی طلب و آرزو بھی ، جسے میں نے جمالیات کی رعایت سے "اظہارِ حسن" سے تعبیر کیا ہے ۔ غرض کہ یہ حسن آفرینی کی یہ آرزو ہی ان تمام مظاہر کی تخلیق کرتی ہے جن کے نظام کو ثقافت سے تعبیر کرتے ہیں ۔ یہ تمام مظاہرِ حسن ، جو نظامِ ثقافت کی تشکیل کرتے ہیں ، بہ لحاظ تعداد کثیر ہیں ، لیکن جہاں تک اسلامی یا مثالی ثقافت کا تعلق ہے اُن میں سات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ یہ ہیں : (۱) توحید (۲) رسالت (۳) حسن (۴) اجتہاد (۵) صداقت (۶) فن اور (۷) علم و حکمت ۔

اب ان عناصرِ ثقافت سے فرداً فرداً بحث کی جاتی ہے جیسا کہ آپ خود محسوس کرتے ہوں گے یہ موضوع تفصیل و اطناب کا مقتضی ہے ، لیکن یہ موقع تفصیل کا نہیں اجمال کا ہے ، اطناب کا نہیں اختصار کا ہے ، لہٰذا میں نے اجمال و اختصار ہی کو مقدم رکھا ہے :

(۱) **توحید** : یہ "حسنِ حقیقی" کی ستائش و ثنا کا فطری و اضطراری اظہار اور اُس کی الوہیت و ربوبیت کا شعوری اقرار ہے ۔ خودی کے اس فطری اظہار و اقرار کی حسین ترین صورت خودی کے وہ سات فطری و سرمدی اور حسین و روح پرور بول ہیں جو "سبع مثانی" کہلاتے ہیں ۔ اس کا پہلا بول ہے : اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ : دیکھیے اس دو لفظی حسین بول میں ، جو ایجازِ بلاغت کی بہترین مثال ہے ، زندگی ، حُسن ، خودی اور الوہیت کے دریائے معانی کو سمو دیا گیا ہے ۔ اس بول میں خودی نے یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ صرف اللہ ہی حقیقی حمد و ثنا کا سزاوار ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حُسنِ حقیقی ہے ، اس لیے وہ اس کا معبود و مطلوب اور محبوب و مقصود ہے ۔ چوں کہ اس کے سوا کوئی وجود حقیقی نہیں ، اس لیے تنہا وہی حمد و ستائش کا حق دار ہے ، تنہا وہی معبود و مقصود اور مطلوب و محبوب ہے ۔ اگر یہ حقیقت تسلیم کر لی جائے اور تسلیم نہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں ، اور پھر اسے اساس بنا کر فلسفے خصوصاً نفسیات و جمالیات کی تعمیر نو کی جائے تو یہ علم و حکمت اور ثقافت و دین کی بیش بہا خدمت ہوگی ۔

توحید ایک حسین تصوّر ، دین کا بنیادی عقیدہ اور اسلامی ثقافت کی رُوح ہے اور جب اس عقیدے

کا عملاً اظہار ہوتا ہے تو یہ ثقافت کا اہم ترین عنصر بنتا ہے۔ توحید کا حسین ترین مظہر "الصلوٰۃ" یا نماز ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی تکمیل خودی کے ان فطری و حسین پہلوؤں کے بغیر نہیں ہوتی جنھیں "سبع مثانی" کہتے ہیں۔ نماز خودی کے اعترافِ عبودیت اور اقرارِ معبودیت کی بڑی ہی موزوں شکل ہے۔ یہ دونوں مقام بہ لحاظ حسن و موزونی بے مثال ہیں۔ مقام معبودیت اس لیے جمال و جلال میں بے مثال ہے کہ وہ حسنِ حقیقی کی جلوہ گاہ ہے، اور مقامِ عبودیت اس لیے حسن میں بے نظیر ہے کہ وہ بندے کے لیے موزوں ترین مقام ہے۔ یہ دونوں مقامات اسلامی ثقافت میں ازبس اہمیت رکھتے ہیں اور ان دونوں کے احترام ہی میں ایمان کی حقیقت مضمر ہے۔ ایمان چوں کہ خودی کی زندہ و حرکی قوتِ تسخیر ہے اس لیے افرادِ نسلِ انسانی کی بقا اور ترقی کا انحصار اس پر ہوتا ہے۔ ایمان نہ ہو تو خودی مردہ اور ایمان ضعیف ہو تو وہ بھی ناتوان ہوتی ہے۔ اس کا اطلاق قوم پر بھی ہوتا ہے۔

اس جگہ میں ایک لطیف و اہم نکتے کی صراحت کر دینا چاہتا ہوں۔ ایمان دراصل یقینِ محکم کو کہتے ہیں اور یقین دو قسم کا ہوتا ہے۔ حسین اور قبیح۔ یقین اگر حسن کا ہو تو وہ حسین ہوتا ہے، اور یہ حسنِ یقین ہی ایمان سے عبارت ہے۔ حُسن کا سرچشمہ چوں کہ ذاتِ الٰہی ہے اس لیے اصطلاحًا اور حقیقتًا مومن وہ ہوگا جسے حسنِ ذات الٰہی اور اُس کی حسین صفات کا یقینِ کامل ہو، نیز اُسے حسنِ حقیقی کے حُسنِ کلام، اور اُس کے لانے اور اس کی حسین ترین مخلوق کو پہنچانے والے پیکرانِ حسن و صدق یعنی انبیا علیہم السّلام پر، ملائک پر اور آخرت کے حسنِ مآب پر یقین کامل ہو، جو "حسن دوست" کی جلوہ گاہ اور اہلِ حسن کے ذوقِ نظر کی تسکین کا سامانِ لازوال ہے۔ ایمان کی دوسری قسم وہ یقین ہے جو حُسنِ حقیقی کے تصوّرات سے معرّا ہوتا ہے اور اس کا نفظ تو ابیسِ فطرت پر تکیہ ہوتا ہے، اس لیے میں اسے اس عقیدے سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس عقیدے میں بھی حرکی قوت تسخیر ہوتی ہے جس کی بدولت وہ کائنات کی تسخیر کرتا اور معاشرے میں نظم و ضبط قائم رکھتا ہے، لیکن ایسا عقیدہ دل کو حسن و نور عطا کرتا ہے نہ طمانیت و مسرّت، بلکہ وہ خودی کی مرگِ مسلسل ہے۔

یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ توحید اسلامی ثقافت کا بنیادی عنصر ہے۔ اس کے دو مقام ہیں: مقامِ معبودیت اور مقامِ عبودیت، اور ان دونوں کے احترام میں ایمان کی حقیقت مضمر ہے، لہٰذا ان دونوں مقامات کا احترام ہر اُس شخص پر فرض ہے جو اسلامی معاشرے کا فرد ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس موقع پر قدرے توقف کرنا ہوگا تاکہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ "احترام" کا

مفہوم کیا ہے ؟ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اپنے والدین یا اساتذہ کا احترام کرو تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ہم ان کے حقوق کی قدر کریں، جیساکہ قدر کرنے کا حق ہے، اور قدر کرنے کا مطلب ہے کہ ہم اُن کے حقوق کو عملاً تسلیم کریں، اُن کا ادب و لحاظ کریں اور ان کی اطاعت و فرماں برداری کریں۔ اسی طرح احترامِ ثقافت سے مراد یہ ہے کہ ہم ثقافت کے تمام عناصر کا پورا پورا پاس کریں، لحاظ رکھیں، اور اُن کی قدر کریں جیساکہ قدر کرنے کا حق ہے۔ ثقافت چوں کہ زندگی کی طرح حرکی ہے اس لیے اس کے احترام کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی روایات کو متاعِ عزیز سمجھ کر اپنائے رکھنا ہم پر واجب ہے، لیکن اس کی اصل کو، جو اصل شجر کی طرح ہے، پھلنے پھولنے اور برگ و بار لانے میں مدد دینی چاہیے، اور پھر اصل کی فروع اور برگ و بار کو اپنی ثقافت ہی کا ثمرہ سمجھ کر ان کا احترام کرنا چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انتہا پسند لغزش کھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان میں سے ایک دبستانِ فکر، جسے قدامت پسند کہتے ہیں، ثقافت کی فقط اصل روایات ہی کو واجب الاحترام سمجھتے ہیں، اور اس کی فروع اور برگ و بار کو بدعت سمجھ کر اپنانے پر آمادہ نہیں ہوتے اور وہ انھیں واجب الاحترام ہی سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے مکتبِ فکر کا موقف یہ ہے کہ وہ زندگی کی طرح ثقافت کو بھی ہمیشہ تغیر پذیر رہنا چاہیے، اور اصل کے بجائے اس کی فروع اور برگ و بار واجب الاحترام ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اصل وقت کے ساتھ فرسودہ اور جوشِ حیات سے محروم ہو جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حقیقت ان دونوں نظریات کی افراط و تفریط کے درمیان ہے۔ دوسرے لفظوں میں ثقافت کی اصل اور فروع سبھی واجب الاحترام ہیں۔ اس جگہ ایک التباسِ ذہنی کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے لہٰذا حفظ ماتقدم کے طور پر یہ جتا دینا ضروری ہے کہ وہی فروع اور برگ و بار قابلِ احترام ہوتے ہیں جو اپنی ثقافت کی کوکھ سے پھوٹے ہوں، اور جو غیر اسلامی ثقافت کے برگ و بار ہوں، اور ان کا پیوند اپنی ثقافت میں لگا بھی دیا جائے تو وہ پھر بھی قابلِ احترام نہیں ہوں گے، بجز ان کے جو اسلامی ثقافت کے برگ و بار جیسے ہوں۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شجرِ ثقافت کی اصل اور فروع کو زندہ و شاداب اور بار آور رکھنے اور اس کے فطری ارتقا کو قائم رکھنے اور اس طرح اسے اس قابلِ احترام بنانے کی انقلاب انگیز کوشش کو "اجتہاد" سے تعبیر کرتے ہیں، جس پر بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ توحید جیساکہ میں عرض کر چکا ہوں "حسنِ حقیقی" کی یکتائی و وحدانیت کا حسن اعتراف و اظہار ہے، جس کا حسین ترین مظہر مسجد ہے۔ مسجد، جیساکہ تاریخ سے ثابت ہے، ہماری ثقافت کا سرچشمہ ہے۔ اسلامی ثقافت کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ مسجد میں پیدا ہوئی، مسجد میں پھلی پھولی اور جوان ہوئی، مسجد ہی اس کی حسین و تخلیقی سرگرمیوں کی جولان گاہ تھی، مسجد ہی میں ثقافت

کے لیے، ہم مطالعہ کریں تو "پیامِ دوست" کا، جسے قرآن مجید کہتے ہیں، ہماری فکر کا مرکز ہو تو حسنِ کتاب، جو علم و حکمت بھی ہے اور آیاتِ الٰہی بھی، لوحِ محفوظ بھی ہے اور قلبِ انسانی بھی۔

احترامِ عیدالفطر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم عید کی خوشی اس حسین طریقے سے منائیں جس طرح "آخری پیکرِ حسن و رسالت" اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ مناتے تھے۔ وہ اپنی مسرتوں کو لامحدود کرنے کے لیے ان میں تمام افرادِ معاشرہ کو شریک کرتے تھے، پھر اپنے حسن و مطہر قلوب کی طرح اپنے جسم و لباس کو بھی پاک و صاف کرتے، خوشبو میں بساتے، آبادی کی تنگناؤں سے نکل کر کھلی فضا میں اپنے معبودِ حقیقی اور ربِ رحیم کے حضور سربسجود ہو جاتے۔ روزوں کی حلاوت و سعادت کے ساتھ جب انھیں عید کی اجتماعی مسرت اور "حضوری عام" کی لذت نصیب ہوتی تو وہ وفورِ جذبات سے ایک دوسرے کو گلے لگاتے، مصافحہ کرتے اور عید مبارک کے دعائیہ نغموں سے فضا معمور ہو جاتی، جشنِ مسرت کے اس حسین و روح پرور نظاروں کو دیکھ کر فطرت بھی جھوم جھوم جاتی۔ ملائکہ ان اہلِ حسن و سرور پر سلام و درود بھیجتے اور حریم ذات سے ان حسین دلوں پر حسن و نور کی بارش ہونے لگتی۔

یہ ہے احترامِ عیدالفطر اور اس احترام کا ثمرِ بے نظیر۔

اسی طرح عیدِ قرباں کے احترام کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں حج کی غیر معمولی اہمیت کا احساس و شعور ہو۔ اور جو خوش نصیب زادِ راہ رکھتے ہیں وہ دیارِ حبیب میں حج کرنے جائیں، "جلوہ گاہِ حسن" کا جسے کعبہ کہتے ہیں والہانہ طواف کریں، اور وہ لذتِ جنوں پائیں جو انسان کو صاحبِ سرور و جنون بناتی ہے۔ یہ جنون ہی اصل عشق ہے، جس میں ایمان کی حقیقت مضمر ہے۔ لہذا

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو، تو مردِ مسلمان بھی کافر و زندیق

(بالِ جبریل، ص ۵۴)

اسی لیے "دانائے راز" یہ دعا مانگا کرتے تھے:

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ "لایحزنون" کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

(بالِ جبریل، ص ۴۲)

یہی "جنون" ہے جو "قُلِ العَفو" کی عملی تعبیر بنتا ہے، جو انسان کو مومن اور مومن کو محسن و مجاہد بناتا ہے، جو "دوست" کی راہ میں مال و دولت تو کیا اپنی جان تک قربان کرنے

کے بعد بھی یہ کہتا ہے:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
(دیوانِ غالب)

یہی جنون ہے جو آبِ چشم اور خونِ جگر سے لوح و قلم کی پرورش کرتا اور علم و حکمت کی ثروت میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی جنون نے تحقیق و تجربے کے خلوت خانے آباد کر رکھے ہیں، یہ دستِ جنون ہے جو ہر دم کائنات ہستی کی آراستگی و تزئین کرتا رہتا ہے۔ اسی جنون نے سائنس کی دنیا میں محیر العقول ایجادات و اختراعات کر کے انسان کو کائنات کی تسخیر کرنے کے قابل بنایا ہے۔ یہ جنون ہی ہے جو بڑے بڑے اہل علم و دانش، اہلِ مال و دولت، اہلِ حل و عقد، اور بڑے بڑے سلاطین کو ننگے سر، برہنہ پا، کفن بدوش کشاں کشاں دیارِ دوست کے اس حسین و منور ریگ زار میں لے جاتا ہے جسے "میدانِ عرفات" کہتے ہیں، اور وہ والہانہ انداز میں یہ کہتے پھرتے ہیں:

لَبَّيْكَ، اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ (الحدیث):

اے اللہ تعالیٰ ہم تیرے حضور حاضر ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں، بلاشبہ حمد و ثنا اور نعمت تیرے لیے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کلمۂ لبیک ہی اصل توحید ہے، جس سے شجرِ ایمان کی شاخیں پھوٹتی اور کل عرصۂ حیات کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہیں۔ لبیک و لا شریک کا یہ کلمۂ طیب و حسین دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے تو انسان کو عظمت و رفعت کا وہ "مقامِ محمود" عطا ہوتا ہے جو معراجِ انسانیت سے عبارت ہے۔ معراجِ انسانیت کیا ہے؟ اجتماعی لحاظ سے ثقافت کا منتہائے کمال اور انفرادی اعتبار سے مقام قرب و حضوری ہے۔

اس جنون کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ وہ "دوست" کی خوشنودی کے لیے سنتِ ابراہیمی کو زندہ رکھتا ہے اور اپنے ہاتھ سے دوست کا نام لے کر قربانی کے جانور کی گردن پر چھری چلا دیتا ہے۔ یہ منظر قدرت اور اہلِ جنون کے لیے عید نظارہ ہے۔ یہ اس منظر کی یاد دلاتا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے رویائے صادقہ کی تعبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حضرت اسماعیل علیہ السلام ایسے صالح و مثالی فرزند کو اوندھے منہ لٹا کر اپنے ہاتھ سے اُن کی گردن پر چھری چلا دی تھی۔ دوست کے اشارے پر حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا اپنے لختِ جگر کی گردن پر چھری چلانے کا منظر اور اس لمحے آپ کی کیفیات قلبی کا نظارہ بلاشبہ

لمحاتی وآنی تھا، لیکن عبودیت کے اس حسین و مثالی منظر کو معبودِ حقیقی نے اسی جنون کے ذریعہ سے رنگِ دوام سے مزین کر دیا۔

اس اندازِ جنون کو قائم رکھنا بھی احترامِ ثقافت ہے۔

(۲) رسالت: ثقافت کا دوسرا عنصر رسالت ہے۔ اس کا مطلب ہے افراد نسلِ انسانی کو اُن کے "إِلٰہ" یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کا بلاواسطہ پیغام پہنچانا۔ اس کے معانی و مفہوم سے انھیں آگاہ کرنا، اس کی عملی تفسیر کرنا اور ہر گوشۂ حیات میں ان کی رہ نمائی کرنا۔ ادھر عقلِ انسانی وحی و تنزیل کی روشنی اور رشد و ہدایت اور رسالت کی تربیت و رہ نمائی کی بدولت پختہ و رسا ہو چکی تھی، ادھر رسالتِ آخر رحمۃ للعالمین بن کر آئی، اور اپنے ساتھ دوست کا آخری زندۂ جاوید پیغام لائی اور اس نے اس پیغامِ ابدی کی عملی تفسیر کا ایسا مثالی نمونہ پیش کیا جو سراپا موزونی و تعدیل، حسن و حق اور رحمت و محبت ہونے کی بنا پر زمان و مکان کی قیود سے ماورا تھا۔ اس اعتبار سے یہ ایسا عملی نمونہ تھا، جس سے عقلِ انسانی ہر زمانے اور ہر خطۂ زمین میں قیامت تک مستفید ہو سکتی تھی۔ چوں کہ ایسے عالم گیر و ہمہ گیر اور ابدی و مثالی نمونے کے ہوتے ہوئے کسی اور نمونے کی کسی اعتبار سے بھی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی، لہٰذا ربِ علیم و حکیم نے رسالت و نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا، اور رسالت کی ذمّے داریاں اب ایک فردِ بشر کے بجائے کل عقلِ انسانی یا علم و حکمت کو تفویض کر دیں۔ اس اعتبار سے رسالت کی ذمّے داریوں کے وارث اہلِ علم و دانش یعنی علما ہوئے۔

نبوّت و رسالت کا دروازہ بند کر دینے میں دوسری حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے چوں کہ اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو علم و حکمت کی ایک حسین و منوّر اور زندۂ جاوید کتاب دے کر بھیجا تھا، اس لیے اس کی موجودگی مدام میں مزید وحی و تنزیل کی ضرورت تھی نہ رسالت کی۔

بہرحال رسالت ہماری ثقافت کا ایک بنیادی عنصر ہے، اس لیے اس کا احترام ہم پر فرض ہے۔ احترامِ رسالت کی متعدد شرائط میں سے چند ایک یہ ہیں:

اوّلاً: رسالت کو بنی نوعِ انسان کے لیے رشد و ہدایت اور فلاح و نجات کا ناگزیر ذریعہ سمجھنا۔

ثانیاً: رسالت کو مہبطِ وحی و تنزیل سمجھ کر اسے اپنا مرشد و رہ نما بنانا اور اس کی پیروی کرنا۔

ثالثاً: عقل و رسالت کے تابع سمجھنا اور رکھنا، یعنی عقل کا وحی و تنزیل کی روشنی اور رسول علیہ السّلام کی سنّتِ حسنہ کے مطابق عمل کرنا، اور اس طرح فکری اور عملی طور سے لادینی عقلیت یعنی Secular Rationalism دہریت اور عقیدۂ انکارِ رسالت

یعنی کا بطلان کرنا۔

رابعاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت رحمۃ للعالمینی پر ایمان لانا اور اسے سلسلہ رسالت کی آخری کڑی سمجھنا، یعنی ختم نبوت پر ایمان رکھنا۔

رسالتِ آخر تحریک رحمۃ للعالمینی ہے، نوعِ انسانی بلکہ کل مخلوقات کے لیے ہمدردی و رحمت اور شفقت و محبت کا پیام ہے۔ یہ تحریک رحمۃ للعالمینی اسلامی ثقافت کی رُوح ہے، ظاہر ہے جس طرح روح کے بغیر ہستی مردہ و بے جان ہے۔ بالکل اسی طرح روحِ رحمۃ للعالمینی کے بغیر ثقافت مُردہ و بے جان ہوتی ہے۔ ہماری ثقافت کی مرگِ مسلسل کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ وہ رُوحِ رحمۃ للعالمینی سے محروم ہے۔ لہذا احترام ثقافت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو زندہ کریں اور اسے حرکی وا تقائی بنائیں۔

(۳) حسن: ثقافت کا تیسرا عنصر حسن ہے۔ حسن ثقافت کی روح بھی ہے اور جسم بھی۔ عربی کے ائمہ لغت نے حسن کے جو معانی لکھے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر سرور انگیز اور پسندیدہ چیز کو حسن کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے حُسن میں جمال وجلال کے علاوہ طہارت، حیا، تقدس، پاکیزگی، نیکی، حق و صداقت اور احسان وحسنہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ حسن ثقافت کا عنصر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری ثقافت جمال وجلال، طہارت پاکیزگی، حیا و تقدس، حق و صداقت اور احسان وحسنہ کے مظاہر کی آئینہ دار ہونی چاہیئے۔

ایک حدیثِ طیبہ کی رُو سے حسن کے تین بہترین نمونے یہ ہیں: عورت، خوشبو اور نماز۔ حسنِ مجسم پیغمبر آخر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: مجھے تمہاری دنیا کی تین چیزیں پسند ہیں: عورت، خوشبو اور نماز، جو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ علمائے جمالیات، اہلِ ذوق اور اہلِ صدق و صفا اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ یہ تینوں جمالیاتی اشیا یا Objects of Beauty جمالیاتی حِس اور جمالیاتی ذوق کی تسکین کا بہترین سامان ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان تینوں جمالیاتی اشیا کی اسلامی ثقافت میں بڑی اہمیت رہی ہے۔

اسلام کی نظر میں صنفِ نازک مرد کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان ہے۔ اور اسی کی بدولت اسے طمانیت و محبت ملتی ہے۔ غور سے دیکھیں تو یہ طمانیت دل ہے جو انسان کو فحاشی اور سیاہ کاریوں سے بچاتی اور معاشرے میں امن و سلامتی کی وجۂ حقیقی ہے۔ اسی طرح یہ محبت ہے جو انسان کو سوز و ساز عطا کر کے اسے سرگرم عمل رکھتی ہے۔ یہ محبت بھرے دل ہی ہیں جن میں احسان و رحمت کے سوتے پھوٹتے اور گلستان ثقافت کو سرسبز و شاداب رکھتے ہیں۔

اس جگہ یک لطیف نکتے کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ طمانیتِ دل تمام اہلِ

جنّت کا ورثہ ہے، اور محبّت ان اہلِ جنّت کا ورثہ ہے جنھیں قرآن کریم صالحین، شہدا، صدیقین اور انبیا کہتا ہے۔

بہرحال عورت، مرد کے لیے حسن و محبّت کا کامل نمونہ اور اُس کی ہستی کا حسین و نظر افروز لباس بھی ہے۔ اس اعتبار سے عورت ہماری ثقافت کا حسن بھی ہے اور جانِ آرزو بھی، لیکن اسلام کی نظر میں وہی عورت حسنِ ثقافت ہے جس کا حُسن رنگِ نسوانیت سے مزیّن ہوگا، اور نسوانیت کو ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ "حیا" ہے۔ حیا کیا ہے؟ یہ عورت کی عفّت و عصمت اور طہارت و پاکیزگی کا حسین مظہر ہے۔ اسی بنا پر محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے حیا کو نصف ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری ثقافت میں عورت محبّت و طمانیت، شرم و حیا، عفّت و طہارت اور عصمت و خودداری کی ایک زندہ علامت ہے۔ اصل یہ ہے کہ عورت حُسنِ ثقافت بھی ہے اور حُسن آفریں بھی۔ یہ ثقافت گر بھی ہے اور جانِ ثقافت بھی۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ بانیٔ ثقافتِ اسلامی، پیغمبرِ آخر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرما کر کہ "عورت محبوب خدا، محسن اعظم، حاملِ خلق عظیم اور مثالی و کامل انسان کو پسند ہے۔" اسلامی ثقافت میں اس کی غیر معمولی اہمیت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

حاصل کلام یہ کہ احترامِ ثقافت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک طرف مرد کو عورت کی نسوانیت کی حفاظت کرنا ہوگی اور اُسے ثقافت کو حسین سے حسین تر بنانے کا موقع دینا ہوگا اور دوسری جانب خود عورت کو رنگِ حیا سے اپنی نسوانیت کو حسین و پاکیزہ اور دلکش و نظر افروز بنانا ہوگا۔ عورت کی نسوانیت پھول کی پتّی سے بھی زیادہ نازک و پاکیزہ ہے، اسے آواز و نظر کی آلودگیوں سے محفوظ رکھنے ہی میں احترامِ نسوانیت کا راز مضمر ہے۔ یہ ہے فلسفۂ حجاب کا ماحصل۔ اس سے اہلِ نظر پر یہ راز کھل جائے گا کہ اسلامی ثقافت میں کیوں حجاب و نقاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔

خوشبو بھی ہماری ثقافت میں بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ خوشبو کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جمالیاتی ذوق کی تسکین اور جمالیاتی ذوق پیدا بھی کرتی ہے۔ یہ جمالیاتی حِس کو زندہ و بیدار کرتی ہے اور آرزوئے حُسن بھی پیدا کرتی ہے۔ یہ جنسی جذبات کو تحریک دیتی اور اُن کی تصعید بھی کرتی ہے۔ خوشبو جمالیاتی ذوق میں لطافت و بوقلمونی اور وسعت و گہرائی پیدا کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ خوشبو باطنی ماحول کی طرح ظاہری ماحول کو بھی پاکیزہ، مسرّت انگیز، روح افزا اور لذّت آفریں بناتی ہے۔

اس جگہ اہلِ ذوق و فن کے لیے ایک ازبس اہم نکتے کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ مختلف قسم کی خوشبوؤں کے استعمال سے انسان میں رنگوں، خطوط اور سُروں میں

امتیاز کرنے کی صلاحیت زندہ و بیدار رہتی ہے۔ اس اعتبار سے فنونِ لطیفہ اور خوشبو کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

جہاں تک اہلِ ذوق و صفا کا تعلق ہے وہ خوشبو کا استعمال اس کے دیگر فوائد کے علاوہ اس لیے بھی کرتے رہے ہیں کہ اس سے ان کی جمالیاتی حس میں مختلف قسم کے انوار و تجلّیات میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نشوونما پاتی رہتی ہے۔ خوشبوؤں کے استعمال سے افکار و تصورات میں بوقلمونی و لطافت اور موزونی و حسن پیدا ہوتا ہے۔ غرض خوشبو سے محبت اور اس کا استعمال احترامِ سنّتِ نبویؐ بھی ہے اور احترامِ ثقافت بھی۔

(۳) نماز: ثقافت کا تیسرا مظہر نماز ہے، جس کے متعلق نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "وہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے" اس ارشادِ حکیمانہ میں ایک بڑا ہی لطیف و اہم نکتہ مضمر ہے۔ محبوبِ خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ "نماز قلب کی ٹھنڈک ہے"، بلکہ فرمایا آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نماز میں "دوست کی دید" میسر آتی ہے، اور نظر حسنِ دوست کے نظارے سے ہمہ تن حسن و سرور بن جاتی ہے، اس کیفیت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "قُرۃُ عینی" یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک سے تعبیر فرمایا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ "دیدِ دوست" مقصودِ حیات بھی ہے اور حاصلِ زندگانی بھی۔ اسی میں "احسان" کی حقیقت مضمر ہے۔ یہ ہے فلسفہ حیات کا ماحصل، جسے مولانا روم نے اس طرح بیان کیا ہے:

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است
جملہ تن را در گداز اندر بصر
در نظر رو، در نظر رو، در نظر! (مثنوی معنوی)

وقت خاصا گذر چکا ہے، لیکن داستانِ ثقافت ابھی باقی ہے۔ وقت، اور آپ کے دل کا احترام کرتا ہوں تو یہ داستانِ شوق ادھوری رہ جاتی ہے، اور اگر موضوع کا احترام کرتا ہوں تو اندیشہ ہے کہ آپ کو نہ تابِ شنید رہے گی نہ یارئ شکیب۔ لہٰذا مضمون ادھورا رہ جائے یا اہلِ ذوق تشنہ کام رہیں، بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ آپ اُکتا جائیں۔ اس مصلحت کے پیشِ نظر میں ثقافت کے باقی ماندہ عناصر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر مضمون کو جلد ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

(۴) اجتہاد: ثقافت کا چوتھا اہم عنصر اجتہاد ہے جو ثقافت کو جمود و تعطل اور انحطاط و تنزل سے بچانے اور اسے حرکی و ارتقائی رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اس سے اجتہاد کی غیر معمولی

اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ علم و فن میں بالخصوص اجتہاد کے بغیر کمال نہیں حاصل ہو سکتا، اور کمال کسی ایسے نقطۂ عروج کا نام نہیں جو منتہیٰ ہو، بلکہ کمال حرکی و ارتقائی ہوتا ہے، کیونکہ ہر کمال کے بعد ایک نیا کمال ہوتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ آیتِ قرآنی كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۝ (الرحمٰن ۵۵: ۲۹)، اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ وائٹ ہیڈ نے یونانی، بزنطی اور چینی ایسی عظیم الشان ثقافتوں کے عروج و زوال پر محققانہ نظر ڈال کر یہ ثابت کیا ہے کہ رائے کی ناآہنگی یا اختلاف حرکی و ارتقائی کمال کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ حکیمانہ نکتہ جسے وائٹ ہیڈ نے چودھویں صدی ہجری میں بیان کیا ہے، پیغمبر اعظم و آخر نے ساتویں صدی عیسوی میں فرمایا تھا۔ آپؐ کی حدیثِ طیبہ ہے: اِختلافُ اُمّتِی رحمة (البیہقی) اسکی دلیل یہ ہے کہ اگر اختلاف رائے نہ ہو تو ہر ثقافت کمال پر پہنچ کر ارفع کمالات کی آرزو یا جذبۂ اجتہاد سے محروم ہو جاتی ہے، جس کے سبب اس میں انحطاط و تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ثقافت جامد نہیں رہ سکتی، کیونکہ وہ یا تو کمال کی طرف ترقی کرے گی یا اس کا زوال کی طرف ہبوط ہو گا۔ لہٰذا حسنِ ثقافت کی بقا و دوام کے لیے اجتہاد یا نو بنو کمال کی طلب و جستجو ناگزیر ہے، اور نو بنو کمال کی طلب و جستجو کے عمل پیہم ہی میں احترام اجتہاد و ثقافت کا راز مضمر ہے۔

(۵) صداقت: صداقت بھی ثقافت کا عنصر ہے اور حق کی طرح ایک قسم کا حسن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حق کا اظہار، جو حسین ہوتا ہے، صداقت کہلاتا ہے۔ صدق اور حسن ایک دوسرے کو لازم و ملزوم ہیں۔ صدق ہو تو انسان حسن و حق کی تصدیق کرتا ہے اور صدیق کہلاتا ہے، اور صدیق کا مقام جیسا کہ آپ جانتے ہیں انبیاء علیہم السّلام کے بعد ارفع ترین مقام ہے۔ ثقافت کا کوئی گوشہ ہو صداقت کے بھرپور اظہار ہی سے اس کے حسن و کمال میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس باطل بُرا ہے، کیونکہ یہ حسن کو مضمحل و برباد کر دیتا ہے۔ یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ صداقت اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے جس قوت کی حاجت مند ہوتی ہے اسے وہ اپنی ان خدمات سے حاصل کرتی ہے جنھیں وہ حسن کی افزائش کے لیے سرانجام دیتی ہے۔
حاصل کلام یہ کہ حسن ثقافت کی ترقی اور صداقت کا آپس میں چولی دامن کا تعلق ہے۔ لہٰذا کوئی گوشۂ حیات ہو صداقت ہمارا اشعار ہونا چاہیئے، اسی میں احترامِ ثقافت کا راز مضمر ہے۔

(۶) فن: فن بھی ثقافت کا عنصر ہے۔ لوگ عام طور پر ثقافت کو غلطی سے فنی سرگرمیوں ہی تک محدود سمجھتے ہیں۔ فن اتنا وسیع موضوع ہے کہ اس پر کچھ کہنے کے لیے ایک شامِ ہمدردی نہیں ایسی کئی شاموں کی ضرورت ہے، لہٰذا اس کے متعلق صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہو گا کہ انسان کی

فنی تخلیق کو احسن الخالقین یعنی اللہ تعالیٰ کی فنی تخلیق کی طرح حسین اور تخلیق بالحق ہونا چاہیئے۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق حسین ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے: اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (السجدہ ۳۲ : ۷) یعنی وہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے جو چیز پیدا کی ہے اُسے حسین بنایا۔ دوسری جگہ فرمایا: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ (التغابن ۶۴ : ۳) یعنی ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تمہاری صورت گری کی تو کیا ہی حسین تمہاری صورت بنائی اور اسی کی طرف سب کو رجوع کرنا ہے۔

تخلیق بالحق یا حق کے ساتھ پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تخلیقی فعلیت میں صداقت اور افادی مقصدیت ہونی چاہیئے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ افادیت و مقصدیت سے مراد محض مادی فائدہ نہیں ہے، چناں چہ فنی تخلیق جو جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتی، انسانی ہنر کی عظمت اور فطرت کے جمال و جلال کا احساس و شعور پیدا کرتی ہے، افادیت و مقصدیت رکھتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ہمارا فن حسن، جذبۂ صداقت، افادیت اور مقصدیت کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔

(۷) **علم و حکمت**: آخر میں مجھے ثقافت کے ازبس اہم عنصر علم و حکمت کے متعلق صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ علم کا سرچشمہ وحی و تنزیل ہے، خصوصاً آخری وحی و تنزیل، جسے قرآن مجید کہتے ہیں۔ لہذا ہماری عقل و فکر کا مرشد اول و آخر زندہ خدا کی یہ زندہ کتاب ہے جو زندگی کے ہر شعبے اور ہر زمان و مکان میں انسان کے لیے نور و ہدایت ہے۔ علم چوں کہ خلقتِ کائنات کے تمام ظاہری و باطنی پہلوؤں کو محیط ہے لہذا اس میں دینی اور دنیوی تقسیم ناجائز، ناروا اور غیر فطری ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب سے ہم نے علم کو دین اور دنیا میں تقسیم کیا ہے، ہماری ثقافت علم کی قوت، جسے قرآن حکیم "سلطان" سے تعبیر کرتا ہے، محروم ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ثقافت کی پس ماندگی و حسن و قوت سے محرومی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے کلیسا کی طرح علم کو دینی اور دنیوی شعبوں میں تقسیم کر رکھا ہے، حالاں کہ ہمارا عقیدہ اور ایمان ہے کہ دین کل زندگی کو محیط ہے، اور اس میں تفریق کرنا حرام ہے۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ثقافت میں "لھو الحدیث" کی کوئی گنجائش نہیں "لھو الحدیث" قرآنی اصطلاح ہے جس سے مراد ایسا لٹریچر ہے جو حسن و صداقت سے عاری اور گمراہ کن ہو۔ چناں چہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (لقمٰن ۳۱ : ۶)

"اور ایک وہ لوگ ہیں جو بے مقصد، لایعنی اور گمراہ کن لٹریچر خریدتے ہیں تاکہ بغیر جانے بوجھے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے گمراہ کریں اور اس (یعنی علم و حکمت کے سرچشمے قرآن حکیم) کا مذاق اڑائیں، ایسے ہی لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔"

اگر میں یہ کہوں کہ ایسے ہی گمراہ کن لٹریچر نے ہم میں تشتت و افتراق پیدا کر کے ہماری قومیت کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے، اور ہماری نژادِ نو کو بالخصوص اسلامی معتقدات و تصورات اور روایات و اقدار اور نظریۂ پاکستان سے بے گانہ کر دیا ہے، نیز مشرقی پاکستان کو ہم سے جدا کر کے سارے پاکستان ہی کو غارِ ہلاکت و بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے تو یہ مبالغہ نہیں حقیقت کا اعتراف ہوگا۔ لہٰذا احترامِ ثقافت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حسین و پاکیزہ اور نافع و با مقصد لٹریچر سے اپنی ثقافت کے حسن، قوت اور سطوت میں اضافہ کریں، اور اسے لہو الحدیث سے محفوظ رکھیں۔

وقت کم اور داستانِ ثقافت طولانی تھی، اس لیے تشنہ و ناتمام رہی، گو تشنگی میں کبھی ایک لذت افزا کیفیت ہوتی ہے۔ بہر حال میں آپ کا بے حد ممنون و متشکر ہوں کہ آپ نے میری باتوں کو بڑی توجہ سے سُنا۔ اصل یہ ہے کہ سننا اور دیکھنا بھی ایک فن ہے، جسے ثقافتِ اسلامی میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھ اور قلب کو قابلِ مواخذہ قرار دیا ہے:

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (الاسراء ۱۷: ۳۶)

بلاشبہ کان، آنکھ اور دل سب سے سوال کیا جائے گا۔

لہٰذا علامہ اقبال اس فلسفۂ دید و شنید کے منکر سے فرماتے ہیں:

کافرا دل آوارہ دگر بارہ باو بند   بر خویش کشا دیدہ و از غیر فرو بند
دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز

دم چیست؟ پیام است، شنیدی، نشنیدی   در خاک تو یک جلوۂ عام است ندیدی
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز

(زبورِ عجم، ص ۱۱۴)

جناب محترم جسٹس ذکی الدّین پال

میرے فاضل دوست جناب ڈاکٹر نصیر احمد ناصر صاحب کے عالمانہ اور بصیرت افروز مقالے کے بعد میرے لیے کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ ڈاکٹر صاحب نے ثقافت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور ہر وہ بات کہی ہے جو کہی چاہیے تھی اور ہر بات سننے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنے ہی دل کی بات ہے۔

بات دل سے نکلے تو یہ دل ہی کی بات ہوتی ہے اور دل کی بات اثر رکھتی ہے، اور جب حسن و حق سے نا آشنا دل اس "اثر کلام" کے حریف نہیں ہو سکتے تو عقل عیار اسے "سحر" کہتی ہے۔ ہر اہلِ اثر کے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے۔

بہر حال مجھے بھی اہل علم و دانش کی اس محفلِ ہمدرد میں کچھ کہنا ہے، کیونکہ جناب حکیم محمد سعید صاحب کا یہ ارشاد ہے، لیکن

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

اسلامی ثقافت کیا ہے؟ اس کے اساسی عناصر کیا اور اس کی امتیازی خوبیاں کیا ہیں؟ یہ ساری باتیں آپ نے فاضل مقالہ نگار جناب ڈاکٹر نصیر احمد ناصر سے سُن لی ہیں۔ مجھے تو دو ٹوک یہ کہنا ہے کہ اسلامی ثقافت کے حُسن تصوّر کو جسے انگریزی میں آپ آئیڈیالوجی Ideology کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں، ہم نے عملی جامہ پہنانے کے لیے پاکستان حاصل کیا تھا۔ تحریکِ پاکستان کا بنیادی مقصد ہی یہ تھا کہ ہم اسلامی ثقافت کا احیا کریں اور اسے ایک آزاد سرزمین میں آزادی سے پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کریں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تحریکِ پاکستان دراصل احترامِ ثقافتِ اسلامی کی تحریک تھی۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی ثقافت کا احترام نہ کیا تو ہماری مملکت کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور آدھا ملک ہاتھ سے نکل کر اُس قوم کے چنگل میں پھنس گیا جس کے چنگل سے نکل کر ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں، اعترافِ حقیقت ہے کہ اگر ہم اپنی ثقافت کا احترام کرتے تو ہم ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتا نہ دیکھتے۔ مشرقی پاکستان تو بنگلہ دیش بنا، جہاں ایسی ثقافت پروان چڑھ رہی ہے جسے کسی عنوان بھی "اسلامی" نہیں کہہ سکتے۔ رہا ہمارا مغربی پاکستان تو یہاں بھی احترامِ ثقافتِ اسلامی کا فقدان جس کا نتیجہ یہ ہے کہ صوبائی اور علاقائی عصبیت طوفان بن کر مملکت اور اسلامی تصوّرِ قومیت

سے ٹکرا رہی ہے، اور دونوں کو پاش پاش کرنے کے جتن کر رہی ہے۔ کبھی یہ اغیار کا دعوا تھا کہ ہندو اور مسلم ایک قوم ہیں، مگر انھیں علامہ اقبال کے انکار و براہین اور قائدِ اعظم کے تدبر و مساعی کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے، لیکن اب اپنوں کا یہ موقف ہے کہ ہندو مسلم تو ایک قوم ہیں، لیکن بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان پانچ اقوام ہیں۔ یہ دعویٰ اس حقیقت کا غماز ہے کہ ہم میں قومیت کا احساس و شعور ہے نہ ثقافتِ اسلامی کا پاس و احترام۔ یہی وجہ ہے کہ ہم افتراق کا شکار ہیں۔ ہم میں وہ توانائی نہیں رہی جو زندہ عقیدوں کی بدولت قوموں میں پیدا ہوتی اور انھیں زندہ رکھتی ہے۔ لہٰذا وقت کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ ہم عقیدۂ توحید و رسالت کو اپنے اندر زندہ و بیدار کریں تاکہ ہمیں اس حقیقت کا ایقان ہو جائے کہ جس طرح حق و باطل اور نور و ظلمات ایک ہیں اور نہ ہو ہی سکتے ہیں۔ اسی طرح اسلام و کفر اور مسلمان و کفار بھی ایک ہیں نہ ہو ہی سکتے ہیں جس طرح اسلام عالمگیر دین ہے اسی طرح امتِ مسلمہ بھی عالمگیر ہے، لہٰذا وہ جغرافیائی حدود میں نہیں سما سکتی، اس لیے اس کی بنیاد جغرافیہ نہیں ہو سکتی۔ چناں چہ اسی حقیقت پر علامہ اقبال اور قائدِ اعظم نے دو قومی نظریے کی اساس استوار کی تھی۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہاں اسلامی معاشرہ قائم کریں، جس میں اللہ تعالیٰ کا آئین نافذ ہو اور اس آئین کے مطابق نظامِ ربوبیت قائم ہو، اخوت و محبت ہمارا شعار اور اتحاد و یک جہتی ہمارا دستورِ حیات ہو اور ہماری ثقافت رنگِ الٰہی سے مزین ہو۔ ہم یہاں بھائیوں بھائیوں کی طرح رہیں۔ ہم میں کوئی طبقاتی تفریق و کشمکش نہ ہو، کوئی علاقائی، یا ذات پات کا امتیاز نہ ہو، تقویٰ ہمارا معیارِ عزت اور تکریمِ انسانی ہمارا دستورِ زندگی ہو۔

افسوس تو یہ ہے کہ ہم نے پاکستان بنایا اور اس کے لیے بے شمار قربانیاں دیں، لیکن جب اس کی تعمیر کا وقت آیا تو ہم خواہشوں کی تکمیل میں لگ گئے اور اس کی تخریب کے درپے ہو گئے۔ رہبر گمراہ ہو گئے تو کاروانِ ملت بھی راہ و منزل سے بھٹک گیا۔ یہ دیکھ کر اغیار نے دامِ تزویر بچھائے اور قوم کی نصف سے زائد آبادی کو اس میں پھنسا لیا۔ یہ دام اب پھر بچھائے جا رہے ہیں، یہ دامِ تزویر بھی ہیں اور دامِ ہم رنگِ زمین بھی۔ ان میں آب و دانہ بھی ہے، کچھ لوگ آب و دانہ کی خاطر ان میں پھنسنے کے لیے مچل بھی رہے ہیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہ گرفتاری انھیں اتنی مہنگی پڑے گی کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

میرے لیے سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ ہم میں بہ حیثیت قوم کے زندہ رہنے کی

آرزو بڑی ہی نحیف و زار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں اسمگلنگ، چور بازاری، کنز المال، رشوت خوری، اشیائے خوردنی میں آمیزش، فحاشی و قمار بازی، کذب دشمنی اور ریاکاری و بدعہدی، غرض کہ ہر قسم کی بُرائی کا بازار گرم ہے۔ یہ زندہ رہنے کا چلن نہیں۔ دشمن شب و روز اسلحہ بنانے اور اپنی عسکری قوت مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں مصروف ہے، تاکہ پاکستان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے اور ہمیں محکوم و غلام بنالے، لیکن ہم ہیں کہ خوابِ غفلت میں پڑے ہیں۔ ہمیں صرف اپنے لیے دولت حاصل کرنے کی فکر ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کو بھلا بیٹھے ہیں، ہمیں آخرت کا خوف ہے نہ غم۔ ہمیں تعمیرِ ملک و ملت کا احساس ہے، نہ زیانِ قومی کا شعور۔ یہ صورتِ حال بڑی تشویش انگیز اور عبرت ناک ہے۔ ہمیں جینا ہے تو جاگنا بھی ہوگا اور جاگ کر تعمیرِ ملک و ملت کا کام بھی کرنا ہوگا۔ ہمیں وقت کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ ہمیں صداقت و دیانت اور خلوص و محبت کو اپنا شعار بنانا ہوگا۔ ہمیں محبِ وطن پاکستانی کی طرح اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ مختصر یہ کہ وقت کا تقاضا اور منشائے قدرت یہ ہے کہ ہم اپنے اندر جینے کی تمنا پیدا کریں اور ایک محب وطن پاکستانی کی طرح رہنے کا عزم بالجزم کریں۔

کلمات ابتدائیہ :

ڈاکٹر حافظ محمد الیاس





جناب ایم۔ اے۔ منعم (مقرر)، ڈاکٹر محمد الیاس، جناب سید ہاشم رضا



صدارتی کلمات : جناب سید ہاشم رضا



سامعین

احترامِ محنت

کلماتِ ابتدائیہ : ڈاکٹر محمد الیاس

مقالہ : جناب محترم محمد عبدالمنعم

شامِ ہمدرد، کراچی

۱۵ جون ۱۹۷۲ء

جناب محترم محمّد عبدالمنعم

اگر تاریخ پر گہری نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ احترام محنت ہمیشہ تہذیب و تمدن کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ ہر دور کی تہذیب کا اندازہ اسی بات سے لگایا گیا ہے کہ اس دور میں لوگوں نے محنت کا کتنا احترام کیا۔ پرانے زمانے کے بیشتر غیر مہذب معاشرے انسانی عظمت کے فقدان کا شکار رہے اور انھوں نے انسانی اقدار کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھا جب کہ قرآنِ حکیم کہتا ہے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ہ یعنی ہم نے تم کو بہترین مخلوق سے پیدا کیا۔ جن تہذیبوں نے انسانی عظمت کا اعتراف کیا اور محنت کا احترام کیا انھوں نے دنیا کی ترقی میں گراں قدر اضافہ کیا۔ آج دنیا میں ہر طرف جو ترقی ہم دیکھ رہے ہیں وہ دراصل عوام کی مسلسل محنت اور کوشش ہی کا نتیجہ ہے۔ امریکا، روس، چین اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ممالک نے جو معاشرتی برتری، فنی کامرانی اور سائنٹفک ترقی حاصل کی ہے وہ سب ان ممالک کے عوام کی شدید محنت و مشقت اور احترامِ محنت کے نظریے کو قبول کرنے کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ زندگی ایک فتح نہیں بلکہ ایک مسلسل جنگ ہے۔ جو شخص محنت و مشقت کرتا ہے اسی کے سر پر فتح کا سہرا باندھا جاتا ہے۔ دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ زندگی میں کامیابی قسمت یا حسنِ اتفاق سے حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بغیر شدید محنت کیے بھی وہ فتح و کامرانی حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی میں کامیابی کی راہ مشکلات اور نشیب و فراز سے بھری ہوئی ہے۔ صرف محنت و مشقت ہی کے ذریعہ سے انسان اِن مشکلات پر قابو حاصل کر سکتا ہے اور برتری حاصل کر سکتا ہے۔ زندگی کے ہر راستے کے لیے محنت لازمی ہے۔ محنت اور مشقت ہی وہ شے ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے ملک اور قوم کے مستقبل کو روشن بنا سکتے ہیں۔ مسلسل محنت کی بدولت ہم اپنی مخفی صلاحیتوں کا نشوونما کر سکتے ہیں اور اپنے ذہن اور اپنی صحت کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے کہا ہے۔

Man is not born to scorn delight
and to live laborious days.

یعنی انسان پیدا ہی اسی لیے ہوا ہے کہ وہ عیش و عشرت سے نفرت کرے اور جفاکشی کی زندگی بسر کرے۔

زندگی کے بارے میں ہر شخص مختلف انداز میں سوچتا ہے۔ کچھ لوگ اس خیال کے ہوتے ہیں کہ خوب کھاؤ، پیو اور عیش کرو، کیونکہ آخر کار کل مرجانا ہے۔ بعض لوگ دنیا کے ہر آرام اور خوشی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہر طرح کی ہنگامہ خیزی کو پسند کرتے ہیں۔ ایک سپاہی کے لیے جنگ کا تصور بے حد حسین ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک پہاڑ پر چڑھنے والے کے لیے زندگی ایک مستقل مہم جوئی ہوتی ہے اور ایک شاعر کے لیے زندگی محض ایک خواب و خیال ہوتی ہے۔ اِس کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہوسِ اقتدار میں مبتلا رہتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو گوشۂ تنہائی میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب لوگ زندگی کے صرف ایک ہی گوشے میں مسرّت محسوس کرتے ہیں، چنانچہ اُن کی اِس ظاہری خوشی میں اندرونی مسرّت ذرّہ برابر کبھی نہیں ہوتی۔ زندگی کی اس کھوکھلی نمائش میں اصل خوشی اور مسرّت کا فقدان ہوتا ہے۔ سچی مسرت اسی حالت میں نصیب ہوتی ہے کہ جب انسان اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس قسم کی کامرانی و مسرّت کی بنیاد صرف محنت اور مشقت ہے جس کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔

انسان جب محنت کرتا ہے تو اس سے کچھ پیدا ہوتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر محنت کا ماحصل ہے تخلیق۔ لہٰذا محنت انسان میں خدائی صفات کی عکاسی کرتی ہے۔ محنت کا احترام کرنا اور اس کی حمایت کرنا ان خدائی صفات کی تعظیم کرنے کے مترادف ہے جو خدا نے انسان کو عطا کی ہیں۔ میں اس سلسلے میں لارڈ ٹینیسن کی ایک نظم کا ایک حصّہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

We are not here to play, to dream, to drift;
We have work to do and load to lift
Shun not struggle that is God's gift.

(Tennyson)

یعنی یہ کہ ہم یہاں دل بہلانے یا خیالی پلاؤ پکانے اور رواں دواں ہونے کے لیے نہیں ہیں بلکہ ہمیں کام کرنا ہے اور بوجھ اُٹھانا ہے (لہٰذا) جدوجہد سے گریز نہ کرو، کیونکہ یہ خدا کا عطیہ ہے۔

انسانی عظمت اور انسانی کردار کی خوبی ہر مذہب اور اصولِ اخلاق کے لیے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دنیا کے تقریباً ہر مذہبی نظام نے سب سے پہلے انسانی عظمت کو قبول کیا ہے اور اس کے بعد اور باتیں بتائی ہیں۔ اسلام کے جتنے بھی نبی اور پیغمبر آئے انھوں نے نہ صرف محنت کا احترام کیا بلکہ اپنے دعوے کی تصدیق اور تقویت کے لیے محنت و مشقت کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیڑوں کی گلّہ بانی کو اپنا پیشہ بنایا اور تجارت کے ذریعہ

سے اپنی روزی کمائی۔ بہت سی احادیث ایسی موجود ہیں جن میں رسول پاکؐ نے اپنے ماننے والوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ اپنی روزی عزت سے کماؤ اور خیرات پر زندگی نہ گزارو۔ آں حضرتؐ کی زندگی میں احترامِ محنت کی سب سے نمایاں مثال اُس واقعے سے ملتی ہے کہ جب ایک غریب آدمی فاقوں سے بچنے کے لیے حضورؐ کے پاس مالی امداد مانگنے آیا۔ رسول پاکؐ نے اپنے اُن صحابیوں سے کچھ رقم جمع کی جو اُس وقت وہاں موجود تھے، اور وہ رقم اُس غریب آدمی کو دے دی اور اسی کے ساتھ اس آدمی کو یہ مشورہ بھی دیا کہ اس رقم سے ایک کلہاڑی خرید لے تاکہ اُس سے لکڑی کاٹ کر لایا کرے اور اس کو بیچ کر اپنی روزی کمائے۔ اس مثال سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے رسولؐ کی نظر میں احترامِ محنت کی کتنی اہمیت تھی۔

اس کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں جن سے اسلام میں احترامِ محنت کے نظریے کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے۔

"مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پیشتر اُس کی اُجرت اُسے ادا کر دو۔" (بخاری اور مسلم)

طبرانی میں لکھا ہے کہ

"خدا اس آدمی کو پسند کرتا ہے جو اپنی روزی خود کماتا ہے اور جو مومن ہے۔"

حاکم میں ایک حدیث اور ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

"میرے بہترین اُمتی وہ ہیں جو خراب حالات میں بھی محنت کرتے ہیں۔"

ابن عساکر میں درج ہے کہ ایک بار ایک آدمی آں حضرتؐ کے پاس آیا اور طبیب کے بارے میں پوچھنے لگا۔ آں حضرتؐ نے جواب دیا کہ طبیب کے پاس جانے سے بھی بہتر یہ ہے کہ انسان اپنے دونوں ہاتھوں سے محنت و مشقت کرے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کام بذاتِ خود ایک ایسی ترکیب ہے جس کے ذریعہ سے جسم بھی صحت مند ہو سکتا ہے اور ذہن بھی پاکیزہ ہو سکتا ہے۔

کام کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر لوگوں کے پاس کافی مال و دولت موجود ہو اور انھیں کام کرنے کی ضرورت نہ ہو تو وہ اپنے اس فطری تقاضے کو پورا کرنے کے لیے کوئی تفریحی مشغلہ اختیار کر لیں گے یا کسی دوسری سرگرمی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ لہٰذا محنت کا احترام کرنا ایک فطری بات ہے۔ جب بھی ایمان داری سے محنت کی گئی ہے تو وہ کبھی رائیگاں نہیں گئی ہے۔ لہٰذا محنتی لوگوں کی سعی جلد یا بہ دیر یقیناً کامرانی سے ہم کنار ہوگی۔

تمام عظیم انسان جو تاریخ میں شہاب ثاقب کی طرح تیزی سے جگمگاتے ہوئے گزر گئے اُن سب نے بڑی بھرپور طور طوفانی زندگی گزاری اور اُن لوگوں کو عروج اسی وقت حاصل ہوا کہ جب انھوں نے

اپنے کام کے سلسلے میں ہر طرح کی تکلیف برداشت کی۔ انگلستان کے ایک عظیم شاعر ای۔ ہنلی (E. HENLEY) کہتے ہیں:

Heights by greatmen reached and kept
Were not allowed by sudden flight;
For they, while their companians slept
Were toiling hard upward in the night.

یعنی یہ کہ عظیم لوگ جن بلندیوں تک پہنچے اور اُن پر قائم رہے اُنھیں کسی اچانک پرواز کی بدولت نہیں سر کرلیا گیا بلکہ جب رات کے وقت اُن کے ساتھی آرام سے سو رہے تھے اُس وقت یہ عظیم لوگ سخت محنت کرتے رہے اور اسی کی بدولت یہ ان بلندیوں تک پہنچ گئے۔

اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے دنیاوی زندگی کی شان و شوکت اور عیش عشرت کو اپنی نجات پر ترجیح دے رکھی ہے۔ یہ لوگ اپنی بے تکی اور باغیانہ خواہشات کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ ان ہی خواہشات کی حمایت کرتے ہیں اور ان ہی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ ناکام ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ

"بے تکی خواہشات سے چھٹکارا حاصل کرلینا سب سے بڑی دولت حاصل کرنا ہے، لیکن جو شخص حد سے زیادہ توقّعات میں مبتلا رہتا ہے اُس کے کام کا معیار پست ہوجاتا ہے۔"

دوسروں پر بھروسا کرنے سے خود اپنی طاقت کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوجاتی ہے اور اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کاہلی اور بے کاری کا شکار ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اس سے انسان کے کردار پر نہایت خراب اثر پڑتا ہے۔ جس شخص میں خود اعتمادی ہوتی ہے وہ دوسروں کی مدد پر بھروسا نہیں کرتا، وہ اپنی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے خود اپنی طاقت اور عقل استعمال کرتا ہے۔ ذاتی اعتماد ایک ایسی اعلا خوبی ہے جس کی بدولت انسان نہ تو ناکامیوں سے پست ہمت ہوتا ہے اور نہ پریشانیوں سے پژمُردہ۔ یہی وہ نادر صفت ہے جس کے سہارے انسان روزانہ زندگی کی جدوجہد کا مقابلہ کرتا ہے۔ کامیابی حاصل کرنے میں بھی اس سے بڑی مدد ملتی ہے اور آرزوؤں اور تمنّاؤں کی تکمیل بھی اسی کی بدولت ہوتی ہے۔

پاکستان میں بدقسمتی سے ہماری سوسائٹی کا سارا تانا بانا مختلف پیشوں، عقیدوں اور فرقوں کی بنیاد پر منتشر ہوگیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض پیشوں کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھ،

جاتا ہے اور جو لوگ ان پیشوں کو اختیار کیے ہوئے ہیں انھیں معاشرے میں نہ تو کوئی مقام حاصل ہے اور نہ عزت۔ اسی نفرت کی بنا پر لوگ بعض پیشوں سے منسلک ہوتے ہوئے شرماتے ہیں۔ یہ طبقاتی امتیاز بالکل غیر اسلامی ہے اور اس کی وجہ سے ہماری قوم کی سماجی زندگی نہایت بُری طرح متاثر ہوگئی ہے۔ اگر ہم ایک قوم کی حیثیت سے قائم رہنا چاہتے ہیں اور ترقی کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایک صحت مند معاشرے کا نشو و نما ہو تو پھر ہمیں جلد از جلد اس بدنامی کے داغ کو دھو ڈالنا چاہیئے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ ہم سب مل جل کر اپنے بچّوں اور عوام کو احترامِ محنت کی اہمیت سمجھائیں اور انھیں بتائیں کہ ہمارے معاشرے اور ہماری پوری قوم پر اس کا کتنا گہرا اثر ہے۔

آخر میں مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں انسانی وسائل کا صحیح استعمال اور محنت کا احترام ایک سماجی چیلنج ہونے کے ساتھ ایک معاشیاتی حاجت بھی ہے۔ زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے محنت کا بارآور ہونا اور تمام معاشیاتی سرگرمیوں میں کارکردگی کا بہتر ہونا ایک بنیادی ضرورت ہے، لہٰذا احترامِ محنت کے ذریعہ سے پیداوار میں اضافہ کرنا حکومت، صنعت کار اور عوام سب کا فرض ہے اور ہم سب کو اس کام کی انجام دہی میں سنجیدگی سے مشغول ہو جانا چاہیئے۔

احترامِ محنت کا فقدان ہمیشہ ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان تنازع کا باعث ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کی موجودہ بے چینی اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ مزدوروں کو مزید کچھ رقم دے کر یا طریقۂ کار میں کچھ تبدیلیاں کر کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوششیں بے کار ہیں۔ ان باتوں کی اپنی جگہ پر اہمیت تو ہے لیکن سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ احترامِ محنت اور انسانی عظمت کی بنیاد پر مزدوروں اور منتظمین کے درمیان ہم آہنگی ہو۔

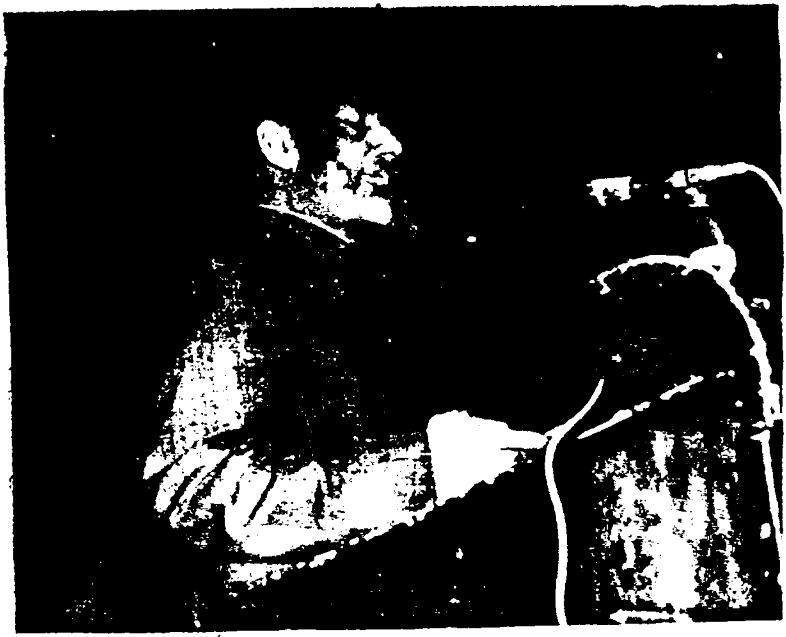
مزدوروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ انھیں اپنے مقصد اور منزل کا احساس قائم رہے، کیونکہ محنت مقصد کے بغیر بالکل بے معنی ہے۔ اس سے دل اور دماغ دونوں کی حاجت روائی ہونی چاہیے، لہٰذا محنت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انسانی اقدار کو برقرار رکھتے اور قوم کی روحانی خواہشات سے محروم نہ ہو۔ صرف اسی صورت میں محنت کو زندگی کا اعلا ترین مقام حاصل ہو سکے گا۔

ہمارے موجودہ معاشرے میں جہاں ہر قدم پر معاشی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا ہے۔ ہمارے بیشتر مسائل محض اس بنا پر پیدا ہو رہے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کا خیال نہیں رکھتے۔ ہر شخص اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہے اور راندۂ درگاہ سمجھ رہا ہے۔ آج ہمارے سامنے یہ سوال درپیش ہوگیا ہے کہ اگر ہماری تہذیب و تمدّن کو برقرار رہنا ہے تو پھر ہمیں دوسروں سے تعلقات استوار کرنے

کا طریقہ اور فن سیکھنا چاہیے تاکہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں اور سکون واطمینان کے ساتھ انسانی عظمت اور احترامِ محنت کی اہمیت، کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ کام کرسکیں۔



صدارتی کلمات: حافظ محمد یعقوب ہاشمی



کلمات ابتدائیہ: علامہ شبیر احمد بخاری

احترامِ روایت

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمد سعید

مقالہ : جناب مسیح الزماں

شامِ ہمدرد، لاہور

۶ جولائی ۱۹۷۲ء

حکیم محمدؐ سعید

خواتین و حضرات!

شامِ ہمدرد کی تقریبات بہ سلسلۂ " احترام " کے ضمن میں آج کی نشست "احترامِ روایت" کے موضوع پر اظہارِ خیالات کے لئے مخصوص ہے جس کے لئے جناب مسیح الزّماں کو دعوت دی گئی ہے۔ آپ یقیناً میرے ہم خیال ہوں گے کہ اس موضوع پر مذاکرے کے لئے جناب موصوف نہایت مناسب و موزوں ہیں کیونکہ معاشرتی، ثقافتی اور عمرانی علوم سے اُن کا قریبی تعلق رہا ہے۔ اُن کی شخصیت محتاجِ تعارف بھی نہیں ہے، شامِ ہمدرد میں شرکت کرنے والے اُن سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کا موضوع مفید ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ ہم اپنی روایات سے پہلوتہی نہیں کر سکتے۔

آپ کو معلوم ہے کہ قوموں کی زندگی میں ملکی روایات کو بلند مرتبہ حاصل ہے۔ انھیں قانون سے بھی زیادہ فوقیت دی جا سکتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے قدرت کو تمام فنون سے بالاتر کہا جاتا ہے۔ روایات قوانین سے زیادہ موثر بھی ثابت ہوتی ہیں۔ بہت سی روایات دائرۂ تحریر میں نہیں آتیں بلکہ سینہ بہ سینہ نسلاً بعدِ نسلٍ چلتی اور منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے وہ افرادِ قوم کے ذہنوں میں رس بس جاتی ہیں۔ روایات کو بے بنیاد بھی نہیں کہا جا سکتا اور جن روایات کی کوئی بنیاد نہ ہو، انھیں ماضی کی غلطیوں کا مجموعہ کہا جاتا ہے۔

تاہم ہر ملک، ہر قوم، ہر مذہب، ہر قبیلے اور ہر فرقے کی روایات مختلف ہوتی ہیں۔ اُن کو بین الاقوامیت کی نظر سے نہیں پرکھا جا سکتا۔ اسی لئے ہر مذہب و ملت کی روایات مختلف النّوع ہوتی ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تضاد تک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اُن کو ایک عینک سے نہ دیکھا جائے۔ البتہ عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ روایات قابلِ قدر ہوتی ہیں جو اخلاقیات کے معیار پر پوری اُتریں۔ اگر یہ نہ ہو تو روایات فیض پہنچانے کے بجائے نقصان تک پہنچا سکتی ہیں۔

بعض جدت پسند افراد روایات کو ایک ایسا پُرانا لباس سمجھتے ہیں جسے ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ جس طرح ہر موسمِ خزاں میں درختوں، پودوں اور بیلوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور موسمِ بہار کے آتے ہی نئی کونپلیں نکل آتی ہیں، اسی طرح پُرانی روایات کو ایک حد تک یا خاص

خاص موقعوں کے لئے روا رکھا جائے۔ اور حالات بدلنے کے ساتھ نئی روایات کو اپنا لیا جائے، لیکن یہ اُن کی غلطی بلکہ کج فہمی ہے۔ دنیا کے عہدِ عتیق کی بلکہ زمانۂ تاریخ سے کبھی پہلے کی بعض روایات آج تک رائج ہیں اور بدستور قابلِ احترام سمجھی جاتی ہیں۔

یہ حقیقت بھی تسلیم شدہ ہے کہ ایک ملک کی روایات غیر سرزمین پر پروان نہیں چڑھتیں۔ اسی لئے "ہر ملکے و ہر رسمے" کا جملہ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ روایات کی پابندی ہماری مسرتوں اور شادمانیوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس اپنا خیال یہ ہے کہ روایات کی پابندی ہماری خوشیوں کو زیادہ مربوط رکھتی ہے۔ روایات ہی کے ذریعے انسان اور حیوان میں امتیاز قائم کیا جا سکتا ہے۔ حیوان، وہ چوپائے ہوں یا پرندے یا حشرات الارض، کسی روایت کے پابند نہیں ہوتے کیونکہ اُن میں اصولِ مجلسی کا فقدان ہوتا ہے۔ انسان اجتماعی زندگی کے بغیر اپنی صحیح منزل کو نہیں پا سکتا۔ یہ فرق بالکل واضح ہے۔

اِنسان کی زندگی میں روایات ہنگورے میں ایک جھونٹے سے شروع ہوتی ہیں اور لحد کے پرسکون گوشے تک ہمارا ساتھ دیتی ہیں۔ ہمارے لئے اُن سے فرار مشکل ہے۔ روایات ہی ہمیں ماضی سے باخبر، حال سے آشنا اور مستقبل کے لئے پُرامید رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے روایات کا اثر و نفوذ دیرپا اور عمیق ہوتا ہے۔ روایات کی پابندی ہماری بہت سی مشکلات کو آسان کر دیتی ہے لیکن

خواتین و حضرات!

یہ ایک دلچسپ موضوع ہے جس پر جناب مسیح الزماں کو تفصیلات کے ساتھ اظہارِ خیال کرنا ہے۔ اس لئے میں اُن کے اور آپ کے درمیان حائل ہونا نہیں چاہتا۔ لہٰذا ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے منتظر سامعین سے خطاب فرمائیں۔ جناب مسیح الزماں۔

جناب مسیح الزّماں

ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں اُس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ وہ تنہا ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں ہے اور محمدؐ اُس کے بندے اور رسول ہیں۔

خواتین و حضرات! السّلام علیکم!

میں شکر گزار ہوں ہمدرد فاؤنڈیشن کا جس نے آپ کو اور مجھے اکٹھا کرنے کی سبیل نکالی اور مجھے تبادلۂ خیال کا موقع عطا کیا۔ میں آپ کی تشریف آوری کا شکر گزار ہوں اور آپ سے تعاون اور مدد کا متمنّی اور ملتجی ہوں۔

میرا جی بہت چاہتا ہے کہ میں اس محفل میں نفسِ روایت پر گفتگو کروں اور پھر اپنی روایت کا تجزیہ کروں اور قوموں کی شخصیت، کردار، اور فضائل و شمائل کی تعمیر میں روایت کا جو مقام ہے اس پر اپنے ناچیز خیالات آپ کی خدمت میں پیش کروں، لیکن وقت تھوڑا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جو باتیں کہنی ہیں، اگرچہ موضوع کی فرع سے تعلق رکھتی ہیں لیکن انتہائی اہم ہیں کیونکہ اس پہلو پر ابھی تک کہیں کھُل کے بات نہیں ہوئی ہے۔

اس لیے مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنی گفتگو اس مفروضہ سے شروع کروں کہ ہمارا آپ کا روایت کی تعریف پر اتفاق ہے اور یہ کہ اس پر بھی اتفاق ہے کہ یہ روایات کیا ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ مفروضے خود بھی محلِ نظر ہیں لیکن میں نے عرض کیا کہ اس وقت میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ جس طرح بڑے بڑے تناور درخت اپنی شادمانی کے لیے ان جڑوں کے رہینِ منت ہیں جو زیرِ زمین آب کشیدگی میں مصروف ہیں، اسی طرح بڑے افراد اور بڑی قومیں اپنے اخلاق کی تعمیر، زندگی کے نصب العین، اپنے کردار کی نشو و نما اور اعتمادِ نفس کے خصوص میں ان روایات سے اکتسابِ محض کرتی ہیں جو تاریخ کے اوراق اور افراد کے سینوں میں محفوظ ہوتی ہیں۔ روایات انسان کو حوصلہ عطا کرتی ہیں، زندگی کا سلیقہ سکھاتی ہیں اور انسان کا مقام ماضی اور استقبال کے سنگم پر متعین کرتی ہیں۔

دنیا میں کسی ایسی قوم نے ترقی نہیں کی جو جذبے اور اُمنگ سے عاری ہو، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دنیا کی ہر بڑی تہذیب کا نقطۂ آغاز ایک یقین یا اقبال کی اصطلاح میں ایک عشق اور ایک

جنون رہا ہے۔ اور اس عشق میں جتنی وسعت اور ہمہ گیری رہی ہے، اُس میں افراد کی عظمت کا جتنا پاس رہا ہے، اُس میں مستقبل کا جتنا خوش آیند تصوّر رہا ہے اور عاشقوں کے کردار و اعمال میں جتنا خلوص رہا ہے، اتنا ہی اس تہذیب کو فروغ اور پائیداری ملی ہے جو اس کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ آجکل جب ہمارے معاشرے کے بعض دانشور حقیقت پسندی کی بات کرتے ہیں تو وہ ایک بڑی حقیقت کی طرف سے آنکھ موند لیتے ہیں کہ تاریخیں حقیقت پسندی کی تلاش میں ترتیب نہیں پاتیں، بلکہ خوابوں کی تعبیر کی جستجو میں تخلیق ہوتی ہیں۔ انسانی تاریخ کا ارتقا انسانی خوابوں کی تعبیر کی انتھک تلاش پر مبنی ہے، جس میں کل کا افسانہ آج کی حقیقت بن جاتا ہے اور بڑا لیڈر وہ ہے جو حقیقت حال کے خاکستر میں عظمتِ اقبال کی چنگاریاں ڈھونڈ نکالے۔

آخر سنہ ۴۰ میں پاکستان بھی ایک خواب ہی تھا، ایک مجذوب کی بڑ، لیکن اہلِ عزیمت کے نزدیک نہیں۔ ہمّت بقدرِ حوصلہ جنھیں تھی وہ تو اسے حقیقت ہی سمجھ کر اس کے لیے خون بہاتے رہے، دولت بانٹتے رہے۔ زندگیاں بدر کرتے رہے۔ اگر مسلمانانِ ہند بھی آج کل کے دانش وروں کی طرح عقلمند ہوتے اور حقیقت پسندی کی آڑ میں زندگی سے فرار تلاش کرتے تو پاکستان واقعی غیر حقیقت پسندانہ تصوّر قرار پاتا۔ آج کل تو ہر اس جانور کو شترمرغ سمجھا جاتا ہے جو ریت کے ٹیلے کو بگولہ کہنے پر اصرار نہ کرے اور ہر اہلِ ہمت کو جو نامساعد حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنے کا مشورہ دیتا ہے، شیخ چلی سمجھا جاتا ہے۔ اس طبقۂ فکر کی سراسیمگی، شکست خوردگی اور پست ہمتی خود ہماری روایات سے غفلت کی وجہ سے ہے۔

جس طرح ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی میں مستقبل کی منصوبہ بندی میں ماضی کے تجربات سے مدد لیتے ہیں، اسی طرح مفکرین اپنے مستقبل کی تعمیر میں اپنی ماضی کی روایات سے اکتسابِ فیض کرتے ہیں۔ اور یہ احتساب محض ذہنی ورزش نہیں ہوتا، کیونکہ ہم روایات ہی کی مدد سے اپنی خفیہ صلاحیتوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اُنھیں اُبھاتے ہیں بروئے کار لاتے ہیں محض مثال کے طور پر فرض کر لیں کہ کبھی ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں پانی پت میں صف آرا ہوں اور ہندوستان کی فوجیں تعداد اور وسائل میں ہم سے بہتر بھی ہوں، پھر بھی سوچئے کہ اس لفظ پانی پت کا دو مقابل فوجوں کے حوصلے، شوقِ نبردآزمائی اور جانبازی پر کیا اثر پڑے گا۔ ہم سب اس کا تصوّر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اسپین میں طارق بن زیاد کی فتوحات کا عیسائیوں پر صدیوں رعب رہا اور ایسے وقت میں کہ مسلمان غرناطہ میں گھرے ہوئے تھے، عیسائی پھر بھی اُن پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے کہ مبادا یہ قوم پھر طارق بن زیاد کی روایات پہ چل پڑے۔

آخر نعرۂ تکبیر کی گونج کیوں ہماری رگوں میں خون کی گردش تیز کر دیتی ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ

خالد بن ولید، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر کے نام سے ہی ہمارے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں؟ یہ کیا بات ہے کہ محمود غزنوی سومنات کے سامنے اپنے سے بڑی فوج کو دیکھ کر سجدہ میں گر پڑا ہے اور جب سجدہ سے سر اُٹھاتا ہے تو اُس کی شخصیت عزم و ہمت کا ایک کوہِ گرانبار بن جاتی ہے۔ یہ کیوں ہوتا ہے کہ بابر کی چھوٹی موٹی فوج شراب کے پیالے توڑ کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں سجدہ ریز ہونے کے بعد اٹھتی ہے تو اُس کی ہمت ہندوؤں کی ٹڈی دَل فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ یہ روایت ہی ہے جو ہندوستان میں اچھوت کو اپنی دون ہمتی پر قانع رکھتی ہے اور برہمن کو قلتِ تعداد کا پندارِ غرور بخشتی ہے اور یہ روایت ہی ہے کہ پاکستان کی قلیل فوج کی دھاک اب بھی دشمنوں کے دلوں پر قائم ہے۔ عقل راہ رو نہیں بن سکتی، لگام بن سکتی ہے۔ یہ ہمارے خوابوں کا تعین نہیں کر سکتی لیکن تعبیر کی جستجو میں مدد دے سکتی ہے۔ ورنہ قوموں کی ترقی کے پیچھے جو جذبہ عموماً کارفرما رہا ہے، وہ بڑی بے عقلی کا جذبہ رہا ہے۔ مثلاً عقل کسی فرد یا قوم کو ایثار و قربانی پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ وہ کسی مزدور کو ۶ گھنٹے کے بجائے ۸ گھنٹے کام کرنے پر مستعد نہیں کر سکتی۔ وہ کسی سپاہی کو جان دینے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ وہ کسی سپاہی کو جان دینے کا سلیقہ نہیں سکھا سکتی۔ یہ حقیقت پسندی نہیں بلکہ جنون ہے جو ساربانوں کو جہانبانی سکھا دیتی ہے۔ قلت کو کثرت پر غالب کر دیتی ہے۔ غربت کو امارت اور دولت کو محتاجی عطا کرتی ہے۔

آج ہم جو روایات کے خلاف بغاوت کی صدا سُن رہے ہیں، تو اُس کی اصل صرف یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنی روایات سے سرے سے واقف نہیں۔ یہ لوگ نقلی طالع آزما ہیں جو ہواؤں سے لڑ رہے ہیں۔ یہ وہ فریب خوردہ شاہین ہیں جنھیں کرگسوں سے ہنوز محبت نصیب نہیں ہوئی۔ میری آج کی گفتگو کا اصل مقصد ان محرکات اور عوامل کا جائزہ لینا ہے جو ہماری روایات کو مٹانے پر تلی ہیں، اور اس طبقہ کی نشاندہی کرنا ہے جو اس میں سرگرم و کوشاں ہے۔

ایک تو ہر فاتح قوم چاہتی ہے کہ وہ مفتوح کو اُس کی روایات اور تاریخ سے محروم کر دے۔ دوسرے یہ جو امریکن نوجوان ثقافتی استعمار کی بات کرتے ہیں، اس کا بھی مقصد یہی ہے کہ مفتوح قوم ذہنی طور پر فاتح کی برتری تسلیم کرے۔ مگر ان سب سے اہم ایک انتقامی جذبہ ہے جو ان اقوام و ادیان میں کارفرما ہے جو کبھی مسلمانوں کے محکوم تھے۔ عیسائیوں کی اسلام دشمنی تو ظاہر اور واضح ہے کہ انگریزی تعلیم کی دبیز عینک کے باوجود ہم اُس کو دیکھ لیتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ یہ احساس بھی رفتہ رفتہ زائل ہو رہا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ ادعائے غیر جانبداری کے باوجود عیسائی پادریوں نے ہمارے دین اور تاریخ کو مسخ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اگرچہ عہدِ وسطیٰ کی صلیبی جنگیں ختم ہو گئیں لیکن ہمارے

زمانے میں ہماری آنکھوں کے سامنے افریقہ میں جو حقیقتاً مسلمانوں کا برِاعظم ہے، ہر روز صلیبی جنگ لڑی جارہی ہے، لیکن ہم بے خبر ہیں۔ یہ موضوع خود ایک مقالہ کا محتاج ہے کہ عیسائی کس طرح عرب ممالک میں مسلمانوں کے اتحاد کا شیرازہ منتشر کر رہے ہیں۔ وہ کس طرح افریقہ میں مسلمانوں کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ یا انڈونیشیا کے انقلاب میں اُن کا کردار کیا رہا ہے۔ اس لئے، جب کبھی کسی مسلمان ملک پر آفت آئی ہے تو بالو اُس کے پسِ پشت عیسائی سازشیں کارفرما رہی ہیں یا مخالف طاقتوں کی مدد حاصل رہی ہے۔ اُن کی اسلام دشمنی کی یوں تو ہزاروں داستانیں ہیں لیکن محمد علی کلے کے خلاف امریکہ میں جو کچھ ہوا صرف یہ ایک واقعہ ہماری آنکھیں کھلنے کے لئے کافی تھا۔ اس لئے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یورپ اور امریکہ کی تمام عیسائی طاقتوں میں اسلام دشمنی محسوس و نامحسوس طور پر کارفرما ہے اور ان کی کوشش شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ رہی ہے کہ اسلامی روایات زندہ نہ رہیں۔

یہودیوں کی اسلام دشمنی کی لوگوں کو نسبتاً زیادہ خبر ہے لیکن ہم میں سے کم لوگ ہیں جنھوں نے رسالوں میں یا کتابوں میں پڑھا ہو کہ یہودیوں نے دنیا کی تسخیر کا منصوبہ واضح طور پر بنایا ہے اور اس پر بظاہر سو سال سے عمل ہو رہا ہے۔ یہاں بھی قلتِ وقت کی وجہ سے محض اشاروں پر اکتفا کروں گا۔

ہندوؤں کی اسلام دشمنی بھی نئی بات نہیں ہے، نہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات ہے، لیکن حیرت ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ کے کان پر جوں بھی نہ رینگی جب کہ ہندوؤں کے پروپیگنڈے کا سارا زور مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے پر صرف ہو رہا ہے اور آج بھی ذرا اپنے ٹی۔وی۔ ریڈیو، اخبارات اور لیڈروں کے بیانات پر غور کریں کہ وہ سندھ، بلوچستان اور سرحد میں دشمنوں کی سازش کے جواب میں کیا کر رہے ہیں۔

اب رہے کمیونسٹ تو بعض اصحاب، جن کی واقفیت کم اور خوش فہمی وافر ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ کمیونسٹ خدا کو نہیں مانتے، اس لئے اُن کی نگاہ میں مسلمان اور عیسائی برابر ہیں۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ صدیوں کی دشمنی، جو روس کو مسلمانوں سے تھی، وہ آسانی سے زائل نہیں ہو سکتی۔ اور اس سے بھی اہم حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم دین چھوڑ سکتا ہے لیکن کلچر سے الگ نہیں ہو سکتا۔ ہندو سیکولرزم کی بات تو چھوڑیئے، لیکن اگر یہاں بھی سیکولرزم آئے تو وہ بھی اسلام پسند ہوگا۔ اسی طرح روس کا سیکولرزم عیسائیت پسند تھا۔ یعنی روسی کیمونزم نے عیسائیت کو ترک کر دیا لیکن ٹالسٹائی، پشکن، ذہنیت سے منہ موڑنا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ اسی طرح اہلِ روس میں مسلمانوں کے خلاف جو جذبہ منافرت قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ روس نے ان مسلمان ملکوں کے ساتھ، جو اُس کے زیرِ تسلط ہیں، نہ صرف سوتیلی ماں کا سلوک کیا بلکہ اُن کا رسم الخط تبدیل کر دیا تاکہ روایات سے اُن کا تعلق ختم

ہو جائے۔ پھر انھوں نے یہ کیا کہ بڑے وسیع پیمانے پر انتقال آبادی کر کے روسیوں کو ان مسلمان علاقوں میں لا بسایا اور حکومت، تجارت اور صنعت اُن کے ہاتھ میں دے دی۔ یہ بے سبب نہیں کہ مسلمان علاقے روس کے سب سے پس ماندہ علاقے ہیں۔ اور مشرقی یورپ کے ایک ملک میں جب مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت نے ریلوے اسٹیشن پر نماز ادا کرنا چاہی تو پولیس نے ڈنڈے کے زور سے جماعت کو منتشر کر دیا۔ اور پاکستان کے خلاف روس کی سازش کے پسِ پشت یہ جذبہ بھی کارفرما ہے کہ اگر پاکستان قوی ہوا تو ممکن ہے روس کے زیرِ استبداد جو مسلمان محکوم ریاستیں ہیں کہیں اُن کے حوصلے بلند نہ ہو جائیں۔

مختصراً یہ کہ اس وقت دنیا کی اہم طاقتیں اسلام دشمن ہیں اور اُن کی پاکستان دشمنی کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ پاکستان کی قوت سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن کے زیرِ تسلط مسلمان جاگ نہ اٹھیں۔ ان تمام... طاقتوں کے علاوہ ایک اور طبقہ، جو مسلمانوں کی روایات اور تہذیب کا دشمن ہے خود مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ ہے۔ قبل اس کے کہ پاکستان میں اس طبقے کی کارفرمائیوں پر نظر ڈالی جائے، ماضی کی طرف چند اشارات ضروری ہیں تاکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھیننے کے بعد ثقافتی استعمار کی جو کوششیں کی ہیں، اُن سے واقفیت ہو جائے۔ مسلمانوں کی مرکزیت تباہ کرنے اور اُن کی روایات کی تذلیل کے لئے انگریزوں نے سب سے پہلے تو مغلیہ عہد کے بڑے بڑے اداروں کی تحقیر کی۔ چنانچہ انھوں نے مغل فوج کے کوارٹر ماسٹر جنرل کا خطاب اپنے باورچی کو دیا۔ افسوس ہے کہ آج ہم بھی اپنے باورچی کو "خان ساماں" کہتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اسی طرح پولیس کے آرمی انسپکٹر کو صوبیدار یعنی گورنر کا لقب دیا۔ اپنے بھنگیوں کو جمعدار کا منصب دیا، جو مغلیہ فوج کے لفٹنٹ کا عہدہ تھا۔ اور یہی مذاق لباس کے ساتھ کیا کہ سلطان ٹیپو کا لباس اُس نے اپنے ادنیٰ خادم یعنی چپڑاسی کو دیا کہ لوگ دیکھ لیں کہ انگریز کے در کا ادنیٰ ملازم مسلمانوں کے سلطان کا لباسِ فاخرہ پہنتا ہے۔ باورچیوں کو حکم تھا کہ وہ معتمدوں کا لباس پہنیں اور داڑھی بھی رکھیں۔ کتّوں کو ٹیپو کہہ کر پکارنا عام رواج تھا۔ پیش امام کو دفتر میں ذلیل مزدوروں کے زمرے میں رکھا۔ چنانچہ آج صورت حال یہ ہے کہ وہ افراد، ادارے مناصب، عہدے اور حکمران جو ہمارے لئے کل تک باعثِ افتخار رہے انھیں ہم خود بھی آج ذلیل کہتے ہیں۔

انگریز نے اسلام کو مذہبی جنون کہا تو ہم خود کو مسلمان کہتے ہوئے شرمانے لگے۔ حتیٰ کہ باقر، بیکر ہو گئے، کرامت اللہ، یو کرامت ہو گئے۔ مُلّا کو ہم جہالت کے مترادف سمجھنے لگے اور مکتب کو گہوارۂ ظلمت۔ بخلاف اس کے ہمیں عیسائی ملّا کو فادر کہنے میں عار نہ تھا اور عیسائیوں کے مکتب میں بچّوں کے

داخلے کے لئے توصفیں بننے لگیں۔ ہم خانقاہوں سے بھاگتے رہے اور کانونٹ میں روحانی تسکین طلب کرتے رہے اور عیسائیت کی ہر چیز کو اپنایا، حتیٰ کہ اسلامی صفات کو بھی ترک کر دیا۔

انگریزوں نے ہماری تاریخ ایسی مسخ کی کہ ہم اپنے عہدِ زریں کو عہدِ ظلمت کہنے لگے اور ہمارے ادب میں بھی ازمنۂ وسطیٰ میں عباس صفوی اور سلیمان کا درخشاں زمانہ تھا۔ اُسے اپنا تاریکی دَور کہنے لگے۔

اُس نے ہمیں جغرافیائی قومیت کا سبق سکھایا اور ہماری تاریخ کو ہندوستان کے جغرافیائی حدود میں مقید کر کے عالمِ اسلامی سے ہمارے رشتے کو منقطع کر دیا۔ نوبت بایں جا رسید کہ آج ہمارے طالب علموں کو عیسائیوں کی جتنی قدیم و جدید تاریخ معلوم ہے اس کے مقابلے میں انھیں مسلمانوں کی تاریخ کا علم ہی نہیں۔ نہ انھیں یہ خبر ہے کہ مشرقی یورپ میں اسلام کا کیا دَور دَورہ ہے، نہ انھیں یہ معلوم ہے کہ فلپائن میں اور انڈونیشیا میں ہم نے کب تک اور کیسے حکومت کی۔ نہ ان کو اطلاع ہے کہ عرب تحریک نے کس طرح ہماری خلافت اور تہذیبی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ نہ انھیں پتا ہے کہ اس وقت مسلمان کہاں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

انگریزوں نے جغرافیہ میں بتایا کہ ملک تو صرف وہ ترقی پذیر ہو سکتے ہیں، جہاں سردی بہت ہو، ساحلِ سمندر کٹا پھٹا ہو، لوہے اور کوئلے کی کانیں ہوں، اور قریب قریب ہوں تاکہ ہم برطانیہ کی ترقی کو تقدیر کا حرفِ آخر سمجھ لیں۔ اور آج بھی ہمیں سبق سکھایا جا رہا ہے کہ تم خود کو پسماندہ کہو! اور ترقی یافتہ قومیں وہ ہیں جن کی آمدنی فی کس اتنی ہو اور قومی آمدنی اتنی ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ تاکہ ہم ذہنی طور پر بھی عظمت کا خواب نہ دیکھ سکیں۔ کچھ اور قومیں ہیں جو ہمیں آبادی کے تناسب سے قوموں کی.... سربلندی کا معیار بنانے پر تلی بیٹھی ہیں اور ہمارا مفلوج و محکوم ذہن اس مفروضے کو بھی حقیقت پسندی کی علامت سمجھتا ہے۔

انگریزی نظامِ تعلیم کے بارے میں اُس کے مصنفین نے دو ٹوک لفظوں میں بتا دیا تھا کہ اس کا مقصد ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا ہے جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے درمیان ایجنٹ کا کام کریں، جن پر حکومت کرتے ہیں۔ ایسا طبقہ جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن مذاق، خیال، اخلاق اور ذہن کے اعتبار سے انگریز ہو۔ یہ تو میکالے کے الفاظ تھے۔

اُس نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ مسلمانوں کو رام کرنے میں دشواری تو ہو گی لیکن کام زیادہ مشکل نہیں۔ ہماری تاریخ شاہد ہے کہ یہ نظامِ تعلیم سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل شاید اتنا کامیاب نہ رہا ہو، لیکن اب جبکہ انگریز چلا گیا تو محکومیت کی وہ خُو، جو سیاسی کشمکش کے دوران حُبّ الوطنی کے جذبہ کے تحت دب گئی تھی، تیزی سے اُبھری اور چونکہ ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد اپنی دینی اور قومی شخصیت کو ممتاز

رکھنے کا جذبہ بھی سرد پڑ گیا، اس لئے مغرب کی اندھا دھند تقلید شروع ہو گئی حتیٰ کہ ہم میں سے جو مغرب کے زوال کی تقلید میں لگے، وہ بھی بجائے اس کے کہ مزاروں کے ارد گرد جو ملنگ ہوتے ہیں ان کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرتے امریکن ہی کی تقلید میں بھنگ اور چرس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اب جبکہ امریکہ میں کرشن اور ہندو کلچر کا اثر بڑھ رہا ہے، ڈر ہے کہ کہیں ہمارے نقال نوجوان امریکہ کے راستے ہندو مذہب بھی یہاں درآمد نہ کرنے لگیں۔

ہمارا نظامِ تعلیم ایک ایسی گاڑی ہے جس کے بارے میں سب متفق ہیں کہ اس کا رُخ مغرب کی طرف ہونا چاہیئے اور سب جانتے ہیں کہ یہ جارہی ہے مشرق کی طرف۔ کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ اس گاڑی کو روک لے۔ البتہ مسافروں کو سب مشورہ دیتے ہیں کہ گاڑی پہلے مشرق کی طرف جائے لیکن آپ لوگ اپنی اپنی نشستوں پر قبلہ رُخ ہو جائیں۔ یہ بات آپ کو کسی کمیشن نے نہیں بتائی ہے کہ اس گاڑی کا انجن آکسفورڈ میں ہے، جس کا پہلا ڈبہ کسی دیہات کے پرائمری اسکول میں لگا ہے۔ کوئی اس بات کا اعتراف کرے گا کہ ہمارا نصاب قومی ضرورت کے تحت نہیں بنایا جاتا بلکہ اس لئے کہ ہمارے گریجویٹ لڑکے آکسفورڈ اور ہارورڈ میں قبول کئے جاسکیں۔ اور اب جبکہ وہاں جادو ٹونے، نیز علم نجوم و رمل بھی داخلِ نصاب ہو رہے ہیں، عجب نہیں کہ ہمارے یہاں بھی تحریک ہو کہ ان علوم کو داخلِ نصاب کیا جائے۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے، ہماری تعلیم کا کمال یہ ہے کہ مڈل پاس کرنے کے بعد عام لڑکے اپنے دیہات سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد" باپ کو خبطی سمجھتے ہیں" اور بی۔ اے کرنے کے بعد اپنی تاریخ و روایات اور تہذیب کو ذلیل تصور کرتے ہیں، اور اگر قسمت اور غیر ملکی امداد ساتھ دے اور خیالی کعبہ کو دیکھنے کا موقع مل جائے تو اپنے ملک اور قوم کو بھی ذلیل سمجھنے لگتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمارے زمانے کا مجاہد و غازی وہ ہے جو بی۔ اے پاس کرنے کے باوجود اپنے والدین کا.... فرماں بردار ہو۔ اپنی تاریخ پر فخر کرتا ہو، اپنی روایات کا احترام کرتا ہو، اپنے ملک اور اپنی قوم سے شرمندہ نہ ہو اور جس کے دل کا ہر گوشہ مغرب کی سجدہ ریزی سے پاک ہو، کیونکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ انگریزی عہدِ اقتدار نے ہمارے ذہنوں پر مرعوبیت کا جو نقش مرتسم کر دیا ہے، وہ آج تک نہیں گیا ہے۔

اور ہم اپنی قومی زندگی کی تعمیر میں بھی مغربی رسالے، اخبارات، افراد اور ماہروں کی رائے کو وہ درجہ دیتے ہیں جو عقیدتاً ہم حدیث و قرآن کو دیتے آئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ حقیقت بھی ہمارے ملک کا بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم افراد اور ملک کا سیاسی دستور بنانے کے لئے بھی غیر ملکی ماہر کا مشورہ ضروری تصور کرتے ہیں۔

ان روایات کے پیشِ نظر اس بات پر بھی تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ ہماری نگاہوں میں ہماری اپنی ہی درس گاہیں حقیر نظر آتی ہیں۔ اس نظامِ تعلیم پر تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں لیکن اس پر تبصرہ بعد میں بھی ہوگا۔ البتہ یہ ذہن نشین کر لیں کہ جیسے اقبالؔ اور اکبرؔ نے اپنے طور پر اس تعلیم کے مضر اثرات کی نشاندہی کی تھی، یہاں سے عام طور پر ایسے ہی افراد نکلیں گے جو ذہنی طور پر مغرب کے محکوم یا مغرب سے مرعوب ہوں گے۔

پھر انگریزوں نے ایک نظامِ اقتدار کی طرح ڈالی جس میں صرف اُن کو جگہ مل سکتی تھی جو اس نئی تعلیم سے بہرہ ور ہوں اور ایجنٹ کے فرائض ادا کرنے کے قابل ہوں۔ اس نظام میں ہر آنے والے کو داخلے کی اجازت صرف اس شرط پر ملتی تھی کہ وہ اپنی تاریخ، روایت، تہذیب اور ثقافت سے منہ موڑ لے اور اپنوں میں اجنبی بن کر رہے۔ اپنی تہذیب سے غدّاری کی علامت بن کر رہے۔ ظاہر ہے کہ ان شرطوں پر اقتدار قبول کرنے کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ یہ افراد احساسِ کمتری میں مبتلا رہے اور اس کے نتیجے کے طور پر وہ ایک مربوط غلط کردار کے نمائندہ بن گئے۔ چنانچہ ہمارے اربابِ اقتدار میں جو فرعون بے سامانی پائی جاتی ہے اُس کا بنیادی سبب یہی احساسِ کمتری ہے۔ یہاں پر یہ بحث نہیں کرنا چاہتا کہ ہمارے قومی کردار پر اس تضاد و کشمکش اور دو رنگی کا کیا اثر ہوا کہ یہ بھی ایک مستقل موضوع ہے۔

خواتین و حضرات!

آج کی محفل اور میری گفتگو کا مرکزی کردار یہی مغرب زدہ، یونیورسٹی کا پروردہ، احساسِ کمتری میں مبتلا، بر خود غلط صاحب اقتدار طبقہ ہے قبل اس کے کہ جبینیں شکن آلود ہوں، مجھے یہ اعتراف کرنے دیجئے کہ میں بھی اسی طبقہ کا فرد ہوں۔ اور کل تک اس طبقہ کے اعلیٰ برہمنوں میں میرا شمار ہوتا تھا اور اب بھی جبکہ میں نے گردن سے زنار آثار لی ہے اور پیشانی سے قشقہ پونچھ لیا ہے، اپنی ذات کا سُننا میرے بس کا روگ نہیں، لیکن میں نے جتنا غور کیا ہے، اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاکستان کی ساری خرابیوں، دشواریوں اور نامرادیوں کا اصل سبب یہی طبقہ ہے۔

تعجب ہے کہ اہلِ نظر سے یہ بات اب تک پوشیدہ رہی ہے کہ سنہ ۱۹۴۷ء سے آج تک کہ جولائی کی ۶ تاریخ اور عیسوی تقویم میں ۱۹۷۲ء کا سَن ہے، حکومتیں بدلتی رہیں، حکمراں بدلتے رہے، لیکن اس طبقے کا اقتدار قائم ہے۔ یہ تو محض ذہنی غلامی اور طبقاتی مفاد پرستی کی آویزش تھی کہ اہلِ خرد اس ملک میں معاشرتی ناہمواری کی جستجو میں، انہی عوامل کو مسخر کرتے رہے جس کی مارکس نے نشاندھی کی تھی اور جاگیرداروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کے گڑے مُردے اُکھاڑتے رہے۔ میں اِس کا قطعی مخالف نہیں کہ یہ طبقے ختم کر دیئے جائیں اور مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ پاکستان سے ان طبقوں کا وجود

ہی ختم ہو جائے، لیکن میری عرض یہ ہے کہ جس طبقے نے اس ملک کا دل کھول کر استحصال کیا ہے، وہ نہ مل مالکوں کا طبقہ ہے، نہ جاگیرداروں کا، نہ سرمایہ داروں کا۔ وہ ۲۲ خاندان تو کسی شمار و قطار میں نہیں۔ اگر ان کا مقابلہ اس طبقۂ لوٹ کھسوٹ سے کیا جائے۔ میں دوبارہ یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نفرت ہے اور میں نے اپنی زندگی بھر اس نظام کی مخالفت کی ہے، لیکن میرا یہ خیال ہے کہ مغرب زدہ یونیورسٹی گریجویٹ کا طبقہ استحصال کرنے والے طبقوں کا سرخیل ہے اور یہ بات چند مثالوں سے واضح ہو جائے گی۔

پہلے آپ محض وضع قطع اور اُن علامات پر غور کریں، جو طبقے کو ممیز کرتی ہیں۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ زبان، لباس، انداز، اطوار و گفتار، مذاق، طعام، قیام، مکان غرض ہر لحاظ سے یہ طبقہ عوام سے مختلف ہے۔ اس کے وسائلِ حمل و نقل مختلف ہیں۔ ریل میں اس کے ڈبے دوسرے، اسٹیشن پر اس کا کمرۂ انتظار دوسرا، حتیٰ کہ اندر باہر آنے جانے کے دروازے الگ ہیں۔ اس کی تفریحیں الگ، تہوار الگ، بازار الگ، اسکول الگ، مشاغل الگ، رسالے اور اخبار تک الگ ہیں۔ زندگی سے اس طبقے کی توقعات الگ ہیں، حتیٰ کہ اس کا قبلہ و کعبہ الگ ہے۔ میں ایک لحاظ سے جنوبی افریقہ کے کالے لوگوں کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ انھیں کم سے کم اس بات کا احساس تو ہے کہ اُن کے ساتھ گورے لوگ ناانصافی کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں تو ابھی تک یہ احساس بیدار نہیں ہوا۔

اور جو چیز صاحبِ اقتدار طبقہ کو محکوم طبقے سے الگ کرتی ہے وہ انگریزی زبان کا بحر الکاہل ہے۔ ہر انگریزی داں اس ملک میں حاکم طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ بلاشبہ حاکم طبقے میں بھی ذات پات کی قید ہے اور اس طبقے کے برہمنوں کو گزیٹڈ افسر کہتے ہیں اور اُس کے لئے گریجویٹ ہونا شرط ہے۔ اور ایک دھوپ چھاؤں طبقہ غیر گزیٹڈ کا ہے جس کی نچلی سطحوں پر ملکی اور غیر ملکی زبانیں استعمال ہوتی ہیں۔

آپ دیکھیں تو نظر آئے گا کہ یہ طبقہ حکومت میں، تجارت میں، حتیٰ کہ سیاست میں بھی تمام کلیدی جگہوں پر قابض ہے۔ چنانچہ ہمارا سارا کا سارا معاشرہ دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ ایک وہ جسے حاکم طبقہ کہا جاتا ہے، وہ ماڈرن کہلاتا ہے لیکن جو صرف مغرب زدہ حصّہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ دوسرا طبقہ، جسے حاکم طبقہ رجعت پسند کہتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ ورثا کوئی حصّہ کہے جانے کا مستحق ہے۔

حاکم طبقہ یعنی یونیورسٹی کے مغرب زدہ گریجویٹ کا تناسب پوری آبادی کا مشکل سے ۵ فی صد ہے، لیکن یہ ملک کے جملہ وسائل پر قابض ہے اور اُس نے اقتدار کے سارے دروازے غیر انگریزی دانوں پر بند کر دیئے ہیں جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے، حکومت میں تو داخلہ ہی گریجویٹ ہونے پر مشروط ہے بلکہ اس کی بعض مضحکہ خیز مثالیں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

دیوبند اور ندوہ کے فاضل برطانیہ میں پی ایچ ڈی کے لئے قبول کئے جاسکتے ہیں لیکن ہمارے ہاں کے نظامِ تعلیم میں عربی پڑھانے کے لئے لیکچرار کی جگہ اس شخص کو زیادہ آسانی سے ملے گی جس نے یونیورسٹی سے ایم۔اے عربی میں کیا ہو لیکن اس کو نہیں مل سکتی جس نے ندوہ میں عربی میں لکھنا پڑھنا اور بولنا سیکھا ہو۔ معاش، عزّت، دولت اور ترقی کے سارے دروازے غیر انگریزی دانوں پر بند کرکے اس طبقے نے پوری قوم کو انگریزی کے ذریعے سے اکتسابِ علم کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ اور اس طرح حکومت، تجارت اور سیاست کے تمام اہم عہدوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔

اس طبقے کی چیرہ دستیوں کا یہ عالم ہے کہ پاکستان کے محنت کش عوام اس طبقے پر بے حساب روپے خرچ کرکے اُسے ڈاکٹر یا انجنیر بناتے ہیں اور یہ لوگ اپنی پہلی فرصت میں امریکہ، برطانیہ یا کسی اور غیر ملک میں روپے کمانے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ہمارا غریب کسان برطانیہ، امریکہ اور ایسے ہی دولت مند ممالک کی ترقی میں کوشاں ہوتا ہے۔ گویا ہر ڈاکٹر اپنے ساتھ کوئی ستر ہزار روپے کی مالیت سے غیر ممالک کو دولت مند اور پاکستان کو غریب کرتا ہے۔ اور یہ استحصال یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ ڈاکٹر یا انجنیر بعض حالات میں برطانیہ کے پونڈ کو بلیک مارکٹ سے پاکستان روانہ کرتا ہے اور ہمارے خزانے پر بوجھ بنا رہتا ہے ہمارا خون چوستا رہتا ہے۔ اور اگرچہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہمیں ان ڈاکٹروں اور انجنیروں کی ضرورت ہے کیونکہ ہر علاقے میں اس طبقے کی طرف سے مڈیکل کالج اور انجنیرنگ کالج کھولنے کا مطالبہ ہوتا رہتا ہے مگر پاکستان بیرونی ممالک کی فنّی امداد کرتا رہتا ہے اور وہ بھی بغیر طلب کے۔

اسی طرح ہم سب جانتے ہیں کہ سارے ملک کا معاشرتی اور اقتصادی نظام غیر انگریزی طبقہ چلاتا ہے۔ صرف صنعت و حرفت کو لیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ملک کی مشین فیکٹریاں، فاؤنڈری، ملیں یہی لوگ چلاتے ہیں جنھیں ہم مستری، فٹر، مکینک، مولڈر، فاؤنڈری مین وغیرہ نام سے پکارے جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ کی موٹر خراب ہو جائے تو کون اس کی مرمت کرتا ہے۔ سنہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جب امریکہ نے ہمیں جہازوں کے پُرزے دینے سے انکار کردیا تو کیا ہم نے کسی انجنیرنگ یونیورسٹی سے مدد طلب کی تھی۔ نہیں بلکہ یہی کراچی، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کے مستری تھے جنھوں نے ایسے پُرزے بنا کر دیئے جو امریکن ماہرین کے خیال میں پاکستان میں بنائے نہیں جاسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری اسٹیل مل کے لئے جب کاریگروں کی ضرورت ہوئی تو ہم نے کسی گریجویٹ کو طلب نہیں کیا بلکہ اس غیر انگریزی داں طبقے سے درخواستیں طلب کیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری صنعت اور تجارت کی ریڑھ کی ہڈی یہی لوگ ہیں۔

لیکن استحصال کی اس سے المناک اور ملک دشمن مثال کیا ہوگی کہ کسی بھی پنج سالہ منصوبے میں ان لوگوں

کی تعلیم کا بندوبست نہیں کیا جا سکا۔ ہم نے انجنیئر ضرور پیدا کئے، جن میں سے اکثر کو ہاتھ سے کام کرنے میں عار تھا، جو صرف افسر بن کر حکم چلانا پسند کرتے تھے، لیکن یہ نہ کیا کہ اس طبقے کی تعلیم و ترقی کا بندوبست کرتے جن پر ہماری اقتصادی ترقی کا انحصار ہے۔

اس کے برعکس ہوا یہ کہ ہم انھیں اچھوت سمجھتے رہے۔ دنیا میں جتنی بھی اہم ایجادیں ہوئی ہیں اُن میں ہاتھ سے کام کرنے والے محنت کش طبقے کا ہاتھ رہا لیکن مغرب زدہ طبقے کے نمائندے ہمیں یہ باور کراتے رہے ہیں کہ انگریزی زبان کے بغیر فنی تعلیم ممکن نہیں ہے اور اُن کی تمام کوششوں کا عملی طور پر ہر روز پاکستان کی ہر فیکٹری، ہر ورکشاپ اور ہر انجنیئرنگ کمپنی میں مذاق اُڑایا جاتا رہا ہے۔

اب آپ ذرا ہماری زراعت پر نظر کریں۔ آپ کو علم ہوگا کہ زراعت ساری کی ساری کسان یا غیر انگریزی داں زمیندار کے ہاتھ میں ہے لیکن ہم نے زراعت کی تعلیم بھی انگریزی میں رکھی ہے اور تحقیقی مقالے بھی اسی زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ انصاف سے بتائیں کہ قوم کے ساتھ اس سے زیادہ تکلیف دہ مذاق ممکن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زراعت کی تعلیم کا مقصد اچھے کاشتکار پیدا کرنا نہیں ہے، بلکہ محکمۂ زراعت اور بڑی بڑی تجارتی زموں کے لئے اہلکار پیدا کرنا ہے جو زراعت اور اہل زراعت پر اپنے اقتدار کی گرفت قائم رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ محکوم طبقہ علم حاصل کر کے اُبھرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس طرزِ تعلیم کے پروردہ لوگ بھی کرسی اور عہدہ طلب کرتے ہیں۔ انھیں زراعت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

ایک نظر ہمارے علاج معالجے کے نظام پر بھی ڈال لیں۔ پاکستان میں ہزاروں جڑی بوٹیاں ہیں، جن کے خواص مدوّن ہیں اور ایک طریقۂ علاج مدّتوں سے رائج ہے، لیکن انگریزی داں طبقے نے ان جڑی بوٹیوں کو اس جرم میں کہ وہ ہمارے ملک میں پیدا ہوتی ہیں، دائرۂ تحقیق سے خارج کر رکھا ہے۔ سرکاری ملازم اگر کسی طبیب سے علاج کرائے تو اُس کے اخراجات حکومت برداشت نہیں کرتی۔ غرض یہ کہ مقامی طریقۂ علاج کے ساتھ ایسی معاندانہ روش اختیار کی گئی کہ یہ محض طب کی سخت جانی ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ اب بھی حکومت کی چہیتی نہ ہونے اور کھلی مخالفت کے باوجود اس کے سرپرستوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ کمی نہیں آئی۔ حالانکہ عوام کا بے حساب روپیہ مغربی طریقۂ علاج پر صرف ہو رہا ہے۔

چلتے چلتے ایک لطیفہ آپ کی نذر کرتا ہوں۔ ڈھاکہ میں سنہ ۱۹۶۹ء میں عالمی ادارۂ محنت کی طرف سے ایک سیمینار ہوا۔ مجھے بھی تقریر کی دعوت دی گئی۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ میں تقریر کیا کروں گا کہ میرے پیش رو مقرر نے بیان کیا کہ ویلڈنگ کے لئے غیر ملکی فنی امداد کے لئے ایک ادارہ کھولا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے کہا کہ آپ نے اس ادارے کے لئے اُمیدوار طلب کئے ہوں گے جو کم از کم مڈل پاس ہوں۔

انگریزی کی شُد بُد رکھتے ہوں۔ آپ اُنھیں ۲ سال کی تربیت کے بعد ڈپلوما دیں گے اور پھر وہ آپ سے نوکری طلب کریں گے۔ حالانکہ اگر آپ کی تعلیم ملکی زبان میں ہوتی اور آپ نے اپنی نگاہیں کھلی رکھی ہوتیں تو آپ کو ڈھاکہ ہی میں سیکڑوں دُکانیں نظر آتیں، جہاں لوگ ویلڈنگ کے کام میں مصروف ہیں اور اسی ہنر سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ یقیناً یہ وہ لوگ تھے جن کو اپنے ہُنر میں مہارت حاصل کرنے سے ذاتی دلچسپی ہوتی۔ اور جو آپ کے ادارے میں تعلیم حاصل کرکے اپنی دکانوں کو واپس جاتے اور آپ سے کرسی یا نوکری طلب نہ کرتے۔ میری اس گفتگو کا غیر ملکیوں پر جتنا اثر ہوا اتنا ہم وطنوں پر نہیں ہوا۔ یہ موقع نہیں کہ غیر ملکی فنی اور غیر فنی امداد کا تجزیہ کیا جائے، لیکن ہماری ذہنی غلامی اور مرعوبیت کو استوار رکھنے اور کرسی کو مستحکم کرنے میں غیر ملکی اداروں نے جو کردار ادا کیا ہے، وہ خود ایک الگ کتاب چاہتا ہے۔

اس ملک کی اقتصادی اور فنی ترقی کا واحد راستہ یہ تھا کہ وہ لوگ جو اہلِ حرفت ہیں یا جو فنی کاموں میں لگے ہوئے ہیں، یا جن کا یہ آبائی پیشہ ہے، یا جن کی روزی کا انحصار ہی کسی حرفت پر ہے، ہماری فنی تعلیم کا مرکز اور محور بنتے۔ اس لئے ضروری تھا کہ ہمارا نصابِ تعلیم، طریقِ تعلیم اور ذریعۂ ابلاغ اُن کی ضرورتوں اور صلاحیتوں کے مطابق ہوتا۔ تاکہ اُن کی ہنرمندانہ تعلیم سے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تعلیم حاصل کرتے ہی وہ یا تو درجۂ اوّل کی ملازمت طلب کریں گے یا بیرونِ ملک جانے کے لئے پاسپورٹ بنوالیں گے، بلکہ اُن کی تعلیم سے پیداوار میں اضافہ ہوتا اور ملک کے فنی ڈھانچے کی بنیادیں مضبوط ہوتیں۔ اور جب یہ سب ہولیتا تو بلاشبہ اعلیٰ تر تعلیمات کا انتظام ہوتا، لیکن وہ بھی ملکی زبان میں تاکہ موٹر کا مستری اگر ذہین ہو تو وہ آٹوموبائل انجنیر بن سکے۔ کارخانہ کا مالک اگر ہوشیار ہو تو مکینکل انجنیر بن سکے۔ میں چند باتوں پر اکتفا کر رہا ہوں، ورنہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است"۔ ہماری ملکی معاشرت اور معیشت کی یہ تعریف دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے اور اُس کے اثرات بہت گہرے ہیں۔

خواتین و حضرات!

اب ایک طائرانہ نظر آپ ہماری درآمدی پالیسی پر ڈالیں اور غور فرمائیں کہ عوام بسوں کو ترس گئے ہیں اور اُن میں اس طرح پیک ہوتے ہیں جیسے ڈبوں میں جُوتے، لیکن یہ طبقہ موٹریں درآمد کرتا رہا حالانکہ تھوڑے اضافے سے بسیں آتیں تو اس میں زیادہ تعداد میں لوگ سفر کرتے۔ ہماری دفاعی طاقت پر جو روپے خرچ ہوتے ہیں، وہ اسلام آباد، گلبرگ اور ایسی لاتعداد بستیوں پر صرف ہوتے جہاں کی فلک بوس اور جنت نظیر عمارتیں اس طبقے کے استحصال کا مینار تعمیر کرتی رہیں۔ ایک بار پھر میں یاد دلادوں کہ پاکستان میں جتنی رہائشی عمارتیں بنی ہیں اور فن کی تعمیر و ترقی پہ عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا روپیہ

خرچ ہوا ہے وہ محض ۲۲ خاندانوں کے لئے نہیں بلکہ کُل کی کُل، بہ استثنائے چند، اس مغرب زدہ طبقے کے لئے بنی ہیں۔ ایرکنڈیشنر، ریفریجریٹر اور درآمدات کی طویل فہرست پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ غیر انگریزی داں طبقہ کا استحصال انگریزی دانوں نے کس بے دردی سے کیا ہے۔ اگر آپ ہمارے منصوبہ جات اور ہماری اقتصادی پالیسی کا انصاف پسندانہ جائزہ لیں تو یہاں بھی آپ کو اس طبقے کا مفاد قومی مفادات سے بالاتر نظر آئے گا۔ چنانچہ اسی سوشلزم کے نعرے کو لیں۔ ہمارے ہاں سوشلزم کا مقصد یہ نہیں کہ دولت کی مساوی تقسیم ہو۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مغرب زدہ گریجوئٹ کی پیشانی سے یہ داغ دھو دیا جائے کہ وہ سہگل، داؤد، آدم جی جیسے افراد کے ملازم کہلائیں، کیونکہ یہ ہمارے حکمراں طبقے کی خصوصیت ہے کہ وہ ایسے اداروں اور طبقوں کی ملازمت گوارا نہیں کرتی جن پر غیر انگریزی داں ہونے کا گمان بھی گزرے۔ چنانچہ ہمارے اسکول کے اساتذہ بھی یہ پسند کرتے ہیں کہ لوکل بورڈ یا میونسپلٹی کے بجائے وہ صوبائی حکومت کے تحت ہوں کیونکہ لوکل بورڈ اور میونسپلٹی میں حکمرانوں کے انتخاب میں انگریزی زباندانی کی قید سخت نہیں ہے۔

میں نے ایک اور مضمون میں، جو شائع ہو چکا ہے، ملکی سیاست پر انگریزی زبان کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ یہاں پر مختصراً عرض کر دوں کہ ہماری ۲۰ سالہ سیاسی کشمکش کو دیکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ یہ جنگ انگریزی داں طبقے کے دو گروہ میں رہی ہے۔ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ اقتدار اعلیٰ انگریزی دانوں کو ملے۔ اختلاف صرف اس بات کا ہے کہ آیا حکمرانوں کا انتخاب الیکشن کے ذریعے ہو یا پبلک سروس کمیشن اور سروسز سائنس بورڈ کے ذریعے۔ چنانچہ آج بھی حکمراں طبقے کی محفلوں میں کسی وزیر کی لیاقت اور صلاحیت کا معیار یہ نہیں ہے کہ اس نے ووٹ کتنے لئے، وہ کتنا ہر دلعزیز ہو سکتا ہے، وہ کس حد تک عوام سے ایثار و قربانی طلب کر سکتا ہے، بلکہ معیار یہ ہے کہ وہ انگریزی کے کتنے جملے صحیح لکھ سکتا ہے، کتنے جملے صحیح بول سکتا ہے۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ ہماری خارجہ پالیسی اس درجہ ہماری مغرب زدگی سے متاثر ہے کہ ہم نے اپنی سیاسی نظر اور بصیرت بھی مغربی ملکوں سے حاصل کی اور اپنی سفارت کا دائرۂ کار بھی یورپ اور مغربی ملکوں میں زیادہ وسیع رکھا۔ چنانچہ سفارتوں کی درجہ بندی ایسی ہوئی کہ مسلمان ممالک کی سفارت کو سب سے کم درجہ دیا گیا اور اب بھی یہی ہو رہا ہے کہ بعض نہایت مقدس مسلم ممالک میں تبادلے کو افسر اپنی سزا تصور کرتے رہے ہیں۔ اس مسئلہ کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ تجارتی، ثقافتی اور سیاسی اعتبار سے ہمارا سب سے زیادہ مفاد مسلم ممالک کے ساتھ وابستہ تھا اور ان ملکوں کی ہم خدمت بھی کر سکتے تھے اور وہاں قدم بھی جما سکتے تھے، لیکن ہمارا عیش کوش طبقہ جو مغربی ممالک کے کھلونوں کا فریفتہ تھا، وہ اس

طویل جسمانی اور ذہنی مشقت کا کیونکر خوگر ہو سکتا تھا جو اِن مسلم ممالک یا دوسرے پس ماندہ ممالک میں ہمارے لئے نئی منڈی اور سیاسی تعلقات کی بنا ڈالے بخلاف اس کے امریکہ، روس اور برطانیہ میں ہماری سفارتی کاوشوں کا ماحصل نسبتاً ادنیٰ تھا، کیونکہ ان ملکوں کے ذرائع اطلاع اور مواصلات اتنے ہمہ گیر ہیں کہ انھیں ہمارے ملک کی اکثر ہم سے زیادہ خبر ہوتی ہے۔ وہ اپنی تجارتی، سیاسی یا ثقافتی پالیسی بنانے میں ہمارے سفارت خانے کے نہ محتاج ہیں، نہ ہماری سفارتی کوششوں سے اُن کے رویّے میں کسی خاص تبدیلی کی توقع ہے ہم یورپ اور امریکہ کی تجارتی منڈی میں اس لئے شامل ہیں کہ یہاں بہت بڑا عملہ رکھتے ہیں اور اس کا خرچ خود ہم سے تجارت کرکے، قرضے دے کر، وصول کر لیتے ہیں۔ یہاں امریکہ یا یورپ ہماری تجارتی منڈی نہیں بن سکتا، بلکہ وہ ہمارے خام مال کا خریدار ہی رہے گا۔ اس کے برعکس ہماری مصنوعات کے لئے مسلم اور دیگر ممالک میں بڑی گنجائش ہے۔ فنی تعلیم کا نہایت وسیع میدان کھلا ہوا ہے لیکن ہماری سردبہری کا یہ عالم ہے کہ ان ملکوں میں جہاں عوام میں ہمارے لئے بے پناہ جذبۂ خیرسگالی ہے، ہم یہ بھی تو نہیں کرتے کہ سفیروں کو عربی سیکھنے اور بولنے پر اصرار کریں۔ ہم نے یہ بھی نہیں کیا کہ یہاں ایسے سفیر بھیجتے جو شکل سے نہیں تو اخلاق و اطوار سے ہی مسلمان نظر آتے۔ کچھ دن ہوئے سعودی عرب میں ایک سفیر بھی جو مکۂ معظمہ میں ہو، جمعہ کو ملتا تھا بلکہ اکثر اشراق کے وقت وہاں ہوتا تھا اور ہمارے سفیران دنوں مکۂ معظمہ میں جاتے تھے تو صرف ٹی اے بنانے کے لئے۔ ایسے افراد، جن کو ان ملکوں سے محبت ہے، جن کا وہاں کے لوگ احترام کرتے ہیں، اپنے ملک میں کم نہیں ہیں لیکن ہمارا مغرب زدہ طبقہ تو اُن کو نظامِ اقتدار کے قریب بھی نہیں آنے دیتا چنانچہ آجکل بھی آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا کہ ٹی وی پر اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جو لوگ قرأت، خطابت یا درسِ قرآن کے لئے آیا کریں، اُن کی داڑھی نہ ہو تو بہتر ہے اور اگر ہو تو سرکاری قواعد کے حدود میں رکھی گئی ہو۔

یہ شکایت عام ہے کہ اور تو اور مسلم ممالک میں بھی ہمیں لوگ کم ہی جانتے ہیں اور اس کا سبب یہی رہا ہے کہ ہمارے سفیر جس طرح اپنے ملک اور تہذیب اور روایت کو حقیر سمجھتے ہیں، اسی طرح تمام مسلمان اور تمام کالے ملکوں کو بھی اپنے جیسا سمجھتے ہیں۔ موجودہ حالات نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں اور صدر بھٹو نے ان ملکوں پر توجہ ذاتی سے ہماری تقدیر ان ہی ملکوں سے وابستہ کر دی ہے۔ اس لئے وہاں ہمیں نہایت زیرک سفیر اور بڑا عملہ رکھنے کی ضرورت ہے لیکن ہماری غلامانہ ذہنیت اور یورپ کی زیارت و سیر و سیاحت کے شوق کا بُرا ہو کہ ہم نے یہاں کی سفارت پر نسبتاً زیادہ زر صرف کیا ہے۔ اس خارجہ پالیسی اور اس مغرب زدگی اور محکوم ذہنیت کا اثر ہے کہ ہم نے چین سے دوستی کا ہاتھ اُس

وقت بڑھایا جب امریکہ اور رُوس نے ہم سے سرد مہری کا سلوک کیا۔ حالانکہ ——— ایک ایشیائی ملک کی حیثیت سے ہمیں سب سے پہلے اس ملک کی طرف رجوع کرنا تھا۔ اور آج بھی ہماری ذہنی دریوزہ گری اور ہماری سیاست اور معیشت کے عدم توازن کا اصل سبب مغرب کی محکومی ہے۔ جب مغرب کے ممالک کہتے ہیں کہ تم زراعت پر زور دو، ہم زراعت کے صرف نعرے لگاتے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ دیہاتی ترقی پر توجہ دو تو ہم دیہاتوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور جب وہ کہتے ہیں کہ افزائشِ نسل کو روکو تو ہم اُس کی طرف لپکتے ہیں۔

یاد رکھئے کہ حکمراں طبقہ جب برطانوی انخلا کے بعد یتیم ہوگیا تو اُس نے محکوم طبقے سے مصالحت کی کوشش کی۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا سیّد سلیمان ندوی کو اعلیٰ عہدے دیئے گئے۔ قائدِ اعظم اور قائدِ ملّت نے شیروانی اور پاجامہ پہنا۔ آئین میں اسلامی معاشرے کا مسودہ پاس ہوا۔ اردو کو قومی زبان بنانے پر مستعدی ظاہر کی گئی، لیکن فوراً ہی امریکہ اور بین الاقوامی اداروں نے اس طبقے کی سرپرستی قبول کرلی اور ہماری سیاست خودسر ہوگئی۔ اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ہونے کی شرط ہی یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ کو ذرائع آمدنی پر اختیار ہوتا ہے۔ اگر حکمراں طبقہ اتنی تنخواہوں کے لئے عوام کا محتاج نہ ہو بلکہ وہ خود عوام کو مانگے تانگے کا غلّہ اور روپیہ فراہم کردے تو ظاہر ہے کہ عوام اس طبقے پر موثر اختیار نہیں رکھ سکتے۔ ویسے بیرونی قرضہ جات کی ایک اور خوبی یہ رہی ہے کہ اس ذریعے سے غیر ممالک نے ہمارے سارے راز ہم سے اگلوا لئے اور چند ٹکوں کے عوض انھوں نے ہمیں ننگا کرکے رکھ دیا۔ یہی نہیں، وہ لوگ جو غیور اور محبِّ وطن تھے، وہ بھی امریکہ سیر کرنے کے لالچ میں بعض ایسے راز غیر ملکیوں کو دینے پر آمادہ ہوجاتے جو زیادہ کھلی رشوت ملنے کی صورت میں شاید یہ ہرگز نہ دیتے۔ اس وقت ہمارے ملک کے بارے میں جتنی اطلاعات مغربی ممالک کو حاصل ہیں، اتنی ہمیں نہیں ہیں اور چونکہ وہاں اطلاعات کو جمع کرنے اور اُن کا تجزیہ کرنے کا فن بہت ترقی کرچکا ہے، اس لئے وہ اس علم کے ذریعے ہم کو جس طرح چاہتے ہیں، نچاتے ہیں۔ یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوا کہ ہم مغرب زدہ ہیں اور ہماری دفتری زبان انگریزی ہے اور ساتھ ساتھ اس لئے بھی کہ مغربی ممالک یہ ہرگز پسند نہ کرتے کہ اتنا کارآمد طبقہ، جو اُن کا بے دام کا غلام ہے، اس کو وہ بے یار و مددگار پاکستان کے تاریخی عوامل اور غیور عوام کی مرضی پر چھوڑ دیں۔

حکمراں طبقہ مغرب کی فنّی اور مالی امداد سے اپنے اقتدار کو پھیلانے اور برقرار رکھنے کے لئے مسلسل کوشاں ہے اور اُس کی خود غرضی اور کوتاہ بینی کا یہ عالم ہے کہ یہ قومی اور ملّی مفاد کو قربان کرنے میں کمی اور ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے۔ محکوم طبقے کو کوئی دوسرا ملک تو ایسا ہے نہیں جو پناہ دے، لیکن حاکم

طبقے کی جولانگاہ مغرب کے سارے ممالک ہیں۔ اور اس طبقے کے ترکِ وطن کا رد بار بہت پھیل چکا ہے اس طبقے کو پاکستان کی بقا سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے، بلکہ اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔ جس تعداد میں لوگ غیر ملکوں کی تعریف کر رہے ہیں، اُن کے اعداد و شمار سے اصل حقیقت کا علم ہو سکتا ہے یہی وہ طبقہ ہے جس نے ایک قومی زبان نہیں بننے دی، حالانکہ ایک زبان کا ہونا قومی اتحاد کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ ہندوستان میں ہمارے زمانے کی پیدا شدہ ہندی نے نہ صرف ایک قومی زبان کی حیثیت اختیار کر لی ہے، بلکہ اُس نے ایک پختہ زبان کی گہرائی و گیرائی اور وسعت بھی پیدا کر لی ہے لیکن ہمارے یہاں آج بھی اسی زبان کا جھگڑا چل رہا ہے، جس کو بہانہ بنا کر ہندوستان نے مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑا دیا۔ اور اُسے ایک قومی زبان کے بننے سے بجا طور پر یہ خطرہ لاحق رہا کہ کاروبارِ حکومت پر اس کی اجارہ داری اور عہدوں پر تفوّق اور معاشرے میں برتری جاتی رہی۔ اگر ذریعۂ ابلاغ قومی زبان ہوتی تو ممکن تھا کہ ایک معمولی سیکشن افسر یا کلرک اپنے بڑے افسر سے زیادہ معقول مدلّل اور وزنی رائے پیش کر کے ترقی کے زینے پھلانگنے لگتا۔ اور کانونٹ اسکول میں بڑی بڑی فیسیں خرچ کر کے جن لوگوں نے تعلیم حاصل کی ہے اُن کی برتری دھری کی دھری رہ جاتی۔

اسی طرح وکلا اس بات پر آمادہ نہیں ہو سکتے کہ عدالت کی زبان اُردو ہو کہ اس طرح عوام عدالت کی کارروائیوں کو سمجھنے کے لیے، فیصلہ سمجھنے کے لئے، بلکہ مقدمہ کرنے کے لئے بھی وکیلوں کے دستِ نگر نہیں رہیں گے۔ یہی وکلا اس بات پر راضی نہ ہوں گے کہ اسلامی نظامِ جزا و سزا رائج ہو کیونکہ اس طرح بھی اُن کے روزگار کو بے حد نقصان ہوگا۔

سیلون میں حکومت نے ایک تجربہ یہ کیا کہ درآمد و برآمد کا سارا کاروبار قومی زبان میں کر دیا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کے دروازے غیر انگریزی دانوں پر کھل گئے اور انھوں نے جلد ہی انگریزی دانوں کو اس میدان میں مات دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا حکمراں طبقہ بینک، انشورنس، بحری تجارت، درآمد و برآمد اور سارا کاروبار ہی انگریزی زبان میں چلانے پر مُصر ہے۔ حالانکہ ان تمام کاروبار میں سرمایہ لگانے والوں کی اکثریت اس زبان سے نابلد ہے۔

غرض زندگی کے ہر شعبے میں اس طبقے کا استحصال جاری ہے اور یہ طبقہ اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے ملک و ملّت کو قربان کرنے سے عار نہیں کرتا اور استحصال سے بھی زیادہ اس طبقے کا ظلم یہ ہے کہ اُس نے ہماری نظریاتی سرحدوں پر بے پناہ یلغار کر رکھی ہے۔ اس نے نری نقالی اور اپنی ذہنی غلامی کو بڑے خوش نما نام دیئے ہیں۔ مثلاً ترقی پسندی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اصحابؓ نہایت غریب تھے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان کے کسی گوشے میں اتنے

غریب لوگ اتنی تعداد میں نہیں پائے جاتے ہوں گے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اُن سے یہ نہیں کہا کہ تمہارا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ نہ اس کی ترغیب دی کہ وہ پیٹ بھرنے اور پیداوار میں اضافہ کی کوششوں میں مصروف ہوں۔ کہا تو یہ کہا کہ مجھے تمہاری غربت کا ڈر نہیں ہے۔ بلکہ ڈر اس امارت کا ہے جو تم کو ملنے والی ہے کہ تم دولت مند قوموں کی نقالی میں اپنے کردار کا جوہر نہ ضائع کر دو۔ آج سے نصف صدی قبل تک اگر کوئی شخص کہتا کہ میرا مقصدِ حیات دولت کمانا ہے تو ہم لوگ اس کو مجلس کے قابل نہ سمجھتے، لیکن آج وہ قوم کو ڈھیٹ بن کر کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد تکثیرِ زر ہے۔ اور سونے کے اس بچھڑے کی پرستش تو اب ہمارا سرکاری مذہب بن گیا ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ معاشی مساوات نہ ہو۔ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو دوسرے دن وہ اپنے کاندھوں پر کپڑوں کا تھان لے کر بازار چلے تو حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا کہ بال بچوں کی پرورش کے لئے روزگار تو ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ چلیں ابو عبیدہؓ سے مشورہ لیں کہ آپ خلافت اور اپنی تجارت دونوں کام نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ نے فیصلہ کیا کہ خلیفۃ المسلمین بھی اس وظیفے کے مستحق ہیں جو عام مہاجرین کو بیت المال سے ملتا تھا۔ اس لئے رائج روایت مساوات کی کیا ہو سکتی ہے، لیکن ہماری روایت سے ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ ہم اس سبق کو بغض سے سیکھنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن معاشی مساوات ایک چیز ہے مقصدِ حیات ایک۔

اسلام نے سود کو حرام قرار دیا اور سود وہ ستون ہے جس پر سرمایہ داری کا سارا نظام قائم ہے۔ اسی طرح اسلام نے موجودہ طریقِ تجارت کو بھی حرام قرار دیا، جس میں انسان محض قمار بازی کے طریقوں سے بغیر محنت کے روپے کمائے، لیکن یہ تو ہم سے نہ ہو سکا کہ سود کو ترک کر دیتے۔ موجودہ بنکاری، اسٹاک ایکسچینج، کمیشن ایجنسی، اور اسی طرح کے کاروبار کو بند کرتے۔ البتہ ہم نے یہ کیا کہ ان اداروں کو اپنی تحویل میں لینے کا قصد کر لیا ہے اور سرمایہ داری ہم کو اتنی پیاری ہے کہ سوشلزم کے ادعا کے باوجود آج تک ہم سرمایہ دارانہ نظام سے اپنا تعلق توڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سود کے بغیر ترقی کرنا ناممکن ہے۔ حالانکہ دنیا کی کم از کم چوتھائی آبادی بغیر سود کے ترقی کر رہی ہے۔ بلکہ ترقی کی حد نہ چھو رہی ہے۔

حضرت عمرؓ نے چھ دن کی بحث کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ ممالک محروسہ میں مسلمان زمین کی ملکیت حاصل نہیں کر سکتے، لیکن ہم نے اس روایت سے بھی اس وقت استفادہ نہ کیا، جب بے حساب متروکہ زمینیں ہمارے پاس آئیں۔ اسی طرح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیش و عشرت کے لئے اُمت کو اس درجہ ممانعت کی ہے کہ صحابہؓ اپنے مکان کی تعمیر میں سادگی کو لازم جانتے تھے۔ ایک صاحب نے ایک مکان بنا لیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی دیکھ کر دوسرے دن ہی اُسے توڑ ڈالا۔ حضرت

عمرؓ نے ایک گورنر کو اس لئے معزول کر دیا کہ اُس نے ایک محل نما عمارت تعمیر کرلی تھی اور اس عمارت کو آگ بھی لگوا دی۔ لوگ اس بات کو بھی بُرا جانتے تھے کہ دستر خوان پر لوگ دو سالن کھائیں۔ ہماری تاریخ کا یہ دَور تھا۔ کاش اِس طرح کی سادگی ہر سطح پر نظر آتی تاکہ قوم کی ساری توجہ دولت اور محنت پر صرف ہوتی اور جو سڑک اور اسپتال، اسکول، اسلحہ سازی اور ملّی طاقت کے اضافہ کے لئے صرف ہوتی پر لیکن موجودہ طبقہ ایسی قربانی کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس کے نزدیک ترقی سے مراد صرف اس کے کمرۂ ملاقات و استراحت میں لگا ہوا مغربی وضع کا فرنیچر ہے۔ اگر آج کا مغرب زدہ مغربی اقتدار کا طبقہ اظہارِ تفوّق کے بجائے اپنی زندگی میں اپنے گھر اور دفتر میں سادگی اور کفایت شعاری اور مساوات کے شعار کو اپنائے تو حاکم و محکوم کے درمیان جو وسیع خلیج ہے، یہ کم ہو اور ملک کی دولت کا بہتر مصرف ہو سکے اور مطالبات، گھیراؤ جلاؤ کا سلسلہ ختم ہو اور ایک معاشرے کا وجود ممکن ہو جہاں واقعی مساوات پیدا ہو۔

لیکن یہ طبقہ بھیک پر گزارا کرنے کو تیار رہے گا مگر بدن کی ادنیٰ تکلیف جھیل نہیں سکتا۔ از روئے انصاف آپ ہی بتائیں کہ ایک ایسی قوم، جس کا بال بال غیر ملکی قرضے میں جکڑا ہو، اسلام آباد کی لیز کرے گی۔ گلبرگ میں کوٹھیاں بنائے گی۔ ایر کنڈیشنڈ کمروں میں وقت گزارے گی، لیکن ایک غیر منصفانہ مغرب زدہ طرزِ زندگی اپنا کر اس طبقے نے ملک کو شدید قسم کے معاشی اور معاشرتی بحران سے دوچار کر رکھا ہے۔ اُس نے منصوبہ بندی میں بھی اصول یہ رکھا کہ انسان کو اپنا بنیادی سرمایہ نہایت قیمتی عاملِ پیدا وار تصور نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنے سے ہماری اقتصادی زندگی کا نہج ہی اور ہوتا۔ بلکہ اُس نے اپنے مغربی آقاؤں سے فیکٹری، اسکول، کارخانوں کی مشین اور نقشے طلب کئے۔ تربیتی پروگرام نہ آیا اور اگر انسان اس میں فٹ ہو جائے تو فبہا، ورنہ وہ ان عمارتوں سے دُور رہے۔ حالانکہ اگر ہم انسان کو اپنا سب سے اہم سرمایہ قرار دیتے تو تعلیم و تربیت، صنعت کے انتخاب، فیکٹری کے ڈیزائن، اوقاتِ کار ساری چیزوں کا اس طرح خیال رکھتے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ افراد کی صلاحیت بروئے کار آتی۔

جن ۲۲ خاندانوں کو آج ہم ہدفِ ملامت بنا رہے ہیں، وہ بھی اسی طبقے اور اسی منصوبہ بندی اور ان ہی آقاؤں کی فنّی اور اقتصادی امداد کی پیداوار ہیں جو آج بھی ملک کی تقدیر بنا رہے ہیں۔ آج بھی اس امداد کا کم از کم ۲۰ فیصدی حصّہ ہمارے نوجوانوں کو مغربی ملکوں کا حج کرانے کے لئے اور اُن کی خودی کو سرکرنے اور انھیں مغرب کی عظمت کی تسبیح پڑھنے کے لئے خرچ ہوتا ہے۔ اور پھر یہ لوگ گھبرا کر اپنے ملک سے نالاں رہتے ہیں اور واپس اپنے کعبۂ آرزو میں بس جانا چاہتے ہیں۔

مختصراً ہماری روایات میں ہماری اقتصادی مشکلات کا حل موجود ہے لیکن ذہنی غلامی کی وجہ سے ہم اپنی روایات کی طرف رجوع کرنے کے بجائے امریکہ یا رُوس سے نسخے مستعار لینے پر مُصر ہیں۔ حالانکہ اگر ہم نے اسلامی اقتصادی نظام کو اپنانے کی کوشش کی ہوتی تو ان برکات کے علاوہ جو ہمارے عقیدے کے مطابق آسمان و زمین سے نازل ہوتی ہیں، دنیائے اسلام کی بھی تمام تر ہمدردیاں، توجہ اور محبت ہمارے ساتھ ہوتی۔ اور یہ جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نزاع کی صورت پیدا ہوئی اور جو آج نئے پاکستان کے باقی ماندہ حصّوں میں شروع ہو رہی ہے، ختم ہو چکی ہوتی۔

اسی طرح اگر ہم اپنے سیاسی نظام میں بھی اخلاق اور دینداری کو اقتدار کے حصول کے لئے انگریزی زبان میں مہارت پر ترجیح دیتے، اگر ہم اپنا نظامِ عدل اسلامی اصولوں پر استوار کرتے جس میں انصاف سستا، سہل اور فوری طور پر حاصل ہو سکے اور ملّت کی آتشِ حرص اور دنیا طلبی کو ہوا دینے کے بجائے انھیں اپنی زندگی سے ایثار و قربانی کا سبق دیتے، تو ہماری ملّت کا شیرازہ منتشر نہ ہوتا کیونکہ قومیں ایثار و قربانی سے بنتی ہیں مگر وہ ایثار و قربانی سے چڑتے ہیں۔ اخلاق و کردار کی بلندی بھی ایثار و قربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے دولت کی لوٹ کھسوٹ، لالچ اور خود غرضی سے قومیں تباہ ہوتی ہیں لیکن چونکہ ہمارے مغرب زدہ طبقے کے پاس کوئی بڑا نصب العین نہ تھا اور چونکہ اُس کی نظر نفس پرستی کی حدود سے آگے نہ جا سکتی تھی، اس لئے اُس نے پہلے تو کوٹہ سسٹم شروع کیا اور ملازمت، پرمٹ، لائسنس، الاٹمنٹ کے چکر میں ساری قوم کو لگا کر اُن کے اخلاق کی دھجیاں بکھیر دیں۔ پھر اُس نے علاقائی عصبیت کو ہوا دی۔ اور جب تک یہ طبقہ اقتدار پر قابض ہے اور جب تک مغربی زر پرستی کا سودا اُس کے سر میں ہے، ملّت کا اتحاد ناممکن ہے۔ اس طبقے نے ملّت کو سندھی، پختون اور پنجابی میں تقسیم کیا ہے اور یہی عملاً بھی اس پالیسی میں صوبہ پرستی کو فروغ دے رہا ہے۔ اور جب تک اس طبقے کے اقتدار اور اُس کے فلسفۂ حیات سے ہم نجات نہیں حاصل کرتے، ملّت اور ملک کی نجات میری رائے میں ممکن نہیں ہے۔

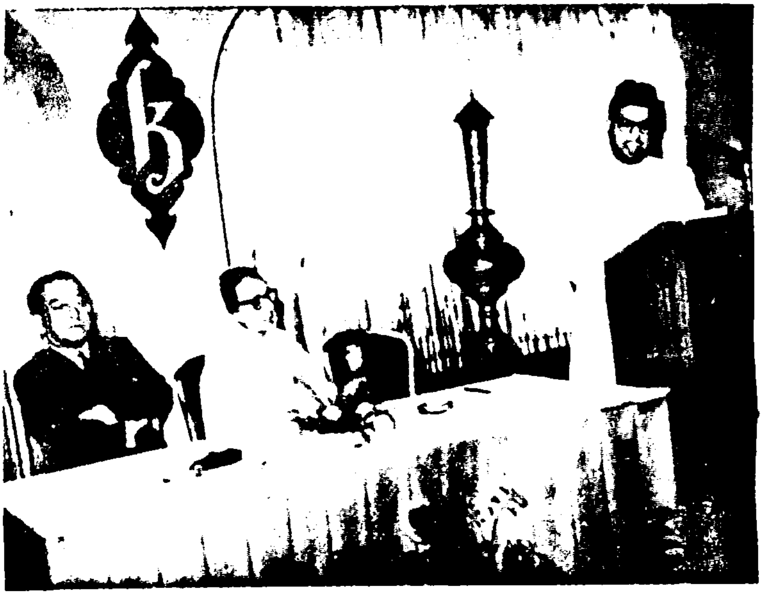
یہاں پر ایک غلط فہمی کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ میں نہ مغرب زدہ طبقے کی مغرب زدگی کا مخالف ہوں اور نہ بحیثیت مجموعی یہ طبقہ میری نظر میں ایسا ہی ہے جیسا کہ فتح مکّہ سے قبل قبیلۂ قریش تھا۔ اگرچہ اس قبیلۂ قریش سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تعلق رکھتے تھے، لیکن یہی طبقہ اسلام کا سب سے بڑا مخالف تھا اور جب تک ابوجہل اور ابولہب کی اس طبقے میں سرداری قائم رہی، یہ اسلام کی ترقی کی راہ کا سب سے بڑا پتھر بنا رہا۔ قریش کو شکست دیئے بغیر اسلام کا فروغ دشوار ہوتا، لیکن فتح سے پہلے اور بعد میں بھی اس قبیلے نے اسلام کو لیڈر بھی عطا کئے۔ تاہم اس طبقے کے ساتھ مصالحت ممکن نہیں

ہے، لیکن ایک بار اس طبقے کو مسندِ اقتدار سے علیحدہ کر دیا تو پھر اس طبقے سے کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اور یہی طبقہ پاکستان اور اسلام کی تقویت کا سبب بھی ہو سکتا ہے۔

اس طبقے کی اسلام دشمنی کی یوں تو بے شمار مثالیں ہیں، لیکن محض اس بات پر غور کریں کہ ۲۷ سال کی مدت میں اس طبقے نے جمعہ کی تعطیل تک نہ ہونے دی، شراب بند کرنے نہیں دی، حالانکہ یہ عوام کا دیرینہ اور متفقہ مطالبہ رہا ہے۔ اور یہی مثال اس بات کی بھی دلیل ہے کہ یہ طبقہ جمہوری قدروں اور عوام کی آرزوؤں کو اپنے تلووں تلے روندتا رہا ہے۔ اور جب تک یہ طبقہ اس جاہ و جلال کے ساتھ قائم ہے، ہم نہ اپنی روایت کا احترام کر سکتے ہیں، نہ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں، نہ اپنی عزت آپ کر سکتے ہیں، نہ اقوامِ عالم میں عزت کا مقام حاصل کر سکتے ہیں، نہ اپنی ملی شخصیت کو متعین کر سکتے ہیں، نہ اُسے اُبھار سکتے ہیں۔ پاکستانی آج بھی دنیا میں وہ مقام حاصل کر سکتے ہیں جو تمام عالمِ اسلام اُس کو دینے پر مُصر ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اسلام کو، اور اُس کی روایات کو اپنے سینوں سے لگائیں اور اپنی زندگی میں برتیں۔ آج بھی اس خزانے سے ہم قوموں پر غالب آ سکتے ہیں اور اپنی پیشانی سے ذلت کا وہ داغ مٹا سکتے ہیں جو صرف اس طبقے کے مغرب زدہ بدکردار اور بد اخلاق مگر اعلیٰ عہدہ داروں نے دیے ہیں۔ آج بھی ہماری روایات، اپنے حیات بخش پیغام سے، ہمارے اندرونی خلفشار کو دور کر سکتی ہیں۔ اگر پاکستان کے حکمراں اور پاکستان کی حکومت اسلامی دستور اور اخلاق کا نمونہ بن جائیں تو نہ افغانستان کو ہمت ہوگی کہ وہ ہمارے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کرے، نہ مشرقی پاکستان کا یہ المیہ ہوا ہوتا اور نہ جی ایم سید جیسے لوگ اس ملک میں گفتگو کرنے کے قابل سمجھے جاتے۔

خواتین و حضرات!

اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ۔ پاکستان پائندہ باد۔



ڈاکٹر حافظ محمد الیاس ، محترمہ بیگم شائستہ اکرام اللہ ، جناب سید ہاشم رضا



جناب سید ہاشم رضا (صدرِ مجلس) ، ڈاکٹر محمد الیاس ، محترمہ بیگم شائستہ اکرام اللہ



ڈاکٹر حافظ محمد الیاس، بیگم شائستہ اکرام اللہ، بیگم سعدیہ راشد، خانم ڈی سلوا



سامعین

احترامِ خواتین

کلماتِ ابتدائیہ : ڈاکٹر محمد الیاس

مقالہ : محترمہ بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ

کلماتِ صدارت : جناب محترم سید ہاشم رضا

شامِ ہمدرد، کراچی

۲۰ جولائی ۱۹۷۲ء

ڈاکٹر محمد الیاس

"احترام خواتین" کے موضوع پر آج یہاں مقرر ہیں محترمہ بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ، اور صدارت فرمارہے ہیں ہماری آپ کی سب کی جانی پہچانی عظیم شخصیت محترم جناب سید ہاشم رضا صاحب۔

بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ ہمارے لیے کوئی نئی ہستی نہیں۔ آپ کا شمار ملک کی ان چند مقتدر ہستیوں میں ہے جن کی تمام زندگی ملک و ملت کی خدمت کرتے گزری۔ مشرقی پاکستان کے اولوالعزم سہروردی خاندان کی چشم و چراغ حسن شہید سہروردی کی یہ بیٹی پاکستان کے سب سے پہلے کامیاب ترین سکریٹری وزارتِ خارجہ جناب اکرام اللہ صاحب کی گھر گرہستی والی مہذب و تعلیم یافتہ اور خواتین کی عظمت کی علم بردار یہ بیگم جن کی تمام زندگی سیاسی سماجی ثقافتی و تعلیمی ترویج و ترقی میں گزری آج ہمارے درمیان تشریف فرما ہیں۔ میں اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن یقیناً بیگم صاحبہ کے شکرگزار ہیں کہ باوجود علالت کے اُنھوں نے ہماری درخواست قبول فرمائی اور ہمیں یہ عزت بخشی۔

اس وقت اس بات کا موقع نہیں کہ میں بیگم صاحبہ کی زندگی کے زرّیں اوراق کھولوں اور ان کی خدمات آپ کے سامنے پیش کروں۔ بس اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ آج شامِ ہمدرد کا موضوع "احترام خواتین" آپ ہی کا مرہونِ منّت ہے۔ خواتین کے مسائل سے آپ کی وابستگی، خواتین کی ترقی کے لیے آپ کی تڑپ اور خواتین کے کردار اور مقام کی بلندی سے آپ کی لگن خصوصاً اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اور ایک مسلم گھرانے میں خواتین کے درجہ و مقام کا تعیّن آپ کی زندگی کا مقصد رہا ہے۔

اصل موضوع "احترام خواتین" پر تو بیگم صاحبہ ہی ہمارے سامنے اپنے زرّیں خیالات پیش فرمائیں گی۔ میں آپ کی خدمت میں چند گزارشات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ اقوامِ عالم کی تاریخ کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ "عورت کا بلند مقام متعین کیے بغیر کسی معاشرے نے ترقی نہیں کی۔ قرآن پاک کی اس آیت نے ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ عورت کو کتنا بلند مقام عطا کیا ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ

"اور عورتوں کا بھی ویسا ہی حق ہے جیسا کہ اُن پر حق ہے دستور کے موافق"

قرآن مبارک میں بار بار اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ عورتوں کے اور مردوں کے مساوی حق ہیں
اللہ تعالیٰ کا سورۂ نساء میں ارشاد ہے

"لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ"

"مردوں کو حصّہ ہے اپنی کمائی سے اور عورتوں کو حصّہ ہے اپنی کمائی سے"

اسی سورۂ نساء میں ایک اور آیت ہے

وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ (۴: ۱۲۴)

عمل صالح کرنے والے خواہ وہ مرد ہو یا عورت جنّت میں داخل کیے جائیں گے اور اُن کے ساتھ کسی قسم کی نا انصافی نہیں ہوگی۔

موضوع تو بہت اہم ہے، میں نے آپ کی خدمت میں یہ دو تین آیتیں قرآن پاک سے صرف اس لیے پیش کی ہیں کہ ہم سب سے پہلے یہ تعین کرلیں کہ ہم "احترام کس کا کر رہے ہیں" "احترام خواتین" ہمارے ذہن میں آتا ہے تو سب سے پہلے ہمیں خواتین کا مقام مقرر کرنا پڑتا ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی آپ کے سامنے پیش کیا ہے یہ مقام خود قرآن پاک نے مقرر کر دیا۔ عورت کا یہ مقام مقرر کرنے کے بعد پھر احترام کا جذبہ ہمارے ذہن میں اُبھرتا ہے۔ اور زندگی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ عورت جس دور میں قدم رکھتی جاتی ہے اُس کے احترام کے درجے بھی بدلتے جاتے ہیں۔ بیٹی کا احترام، بیوی کا احترام، بہو کا احترام، ساس کا احترام وغیرہ۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ احترام ہر حیثیت سے قائم ہے لیکن اس کا اظہار عورت کی بدلتی ہوئی حیثیت سے مختلف شکلوں میں ہوتا ہے اور اس طرح پھر مجموعی طور پر احترام خواتین کا ایک باقاعدہ ہیولا ہمارے اذہان میں تشکیل پاتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ عورت کی عزت ہے جو ایک اچھے معاشرے کی بنیاد ہے۔ کوئی معاشرہ ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتا، کوئی معاشرہ برائیوں سے پاک نہیں ہو سکتا۔ کوئی قوم عزت اور وقار حاصل نہیں کر سکتی کہ جس میں اُس کی عورتوں کا احترام نہ ہو۔

محترمہ بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ

اقوام عالم میں کسی قوم کی تہذیب کے مقام کا اندازہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ اس کے تمدن نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے اور اس کا رویہ اپنی خواتین سے کیا ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان قوم کو مذہبًا اور معاشرتًا ایک ممتاز جگہ حاصل ہے۔ اسلامی احکام کے مطابق عورت کو انفرادی حیثیت اور عزت کا درجہ حاصل ہے۔ قرآن کریم میں عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے یعنی مکمل مساوات کا درجہ عطا کیا گیا ہے۔ کلام پاک میں جگہ جگہ عورتوں کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے عورت کو جداگانہ اقتصادی حیثیت دی ہے۔ عورت شوہر، باپ، بھائی اور بیٹے کی میراث میں نہ صرف حق دار ہوتی ہے بلکہ اس کو اپنے حق پر پورا اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اسے استعمال کرے۔ یہ حق مغربی ممالک کی خواتین کو بڑی جد وجہد کے بعد حال ہی میں حاصل ہوا ہے اور آج بھی ایسے مغربی ممالک موجود ہیں جن میں عورتوں کو یہ حق ہنوز حاصل نہیں۔

مغربی ممالک کی اکثر قوموں میں، جہاں تک مجھے علم ہے ابھی انگلستان بھی شامل ہے، عورتوں کی اپنی ذاتی آمدنی پر ٹیکس بھی شوہر کی آمدنی کے ساتھ ملا کر دینا پڑتا ہے جس کی وجہ سے انھیں بہت کافی زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں عورت اپنی جائداد اور آمدنی کے ٹیکس ادا کرنے کی خود مختار ہے۔ ایسے مذہبی فرائض جن میں مال کا صرفہ ہے۔ مثلاً زکوٰۃ اور حج بطور خود فرض ہیں یعنی شوہر بیوی کی طرف سے زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتا۔

رسول پاکؐ کی احادیث میں جگہ جگہ خواتین کے احترام کی تلقین و ہدایت موجود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے" ایک اور حدیث میں فرمایا "وہ شخص سب سے زیادہ اچھا ہے جس کا سلوک اپنی بیوی سے بہتر ہو۔"

عورتوں کے ساتھ رسول پاکؐ کا سلوک نہایت مہربانی اور شفقت و اعتماد کا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی بار وحی نازل ہوئی اور آپ کے دل میں خوف و ہراس اور یہ شک پیدا ہوا کہ آیا یہ پیغام خدا کی طرف سے ہے یا نہیں تو آپؐ نے اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اپنی قلبی کیفیت کا ذکر کیا۔ یعنی انھوں نے اس اہم ترین معاملے میں ایک عورت ہی کو رائے دینے کا اہل سمجھا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو یقین دلایا کہ یہ وحی حضرت جبرئیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں، جس طرح آپ سے قبل حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے لیے لائے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے

نہ صرف آں حضرت صلعم کی تشفی کی بلکہ سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف بھی انہی کو حاصل ہوا۔ اس واقعے پر غور کیجیے تو عورت کے احترام کا زبردست پہلو نظر آتا ہے۔ رسولِ پاکؐ نے عظیم روحانی تجربے کا ذکر اور اپنی تشویش کا اظہار اپنے کسی مرد رفیق یا دوست کے بدلے اپنی بیوی یعنی ایک خاتون کو ہی اس کا اہل سمجھا۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بیوی حضرت عائشہؓ سے بیشتر احادیث مروی ہیں جن پر اسلامی قوانین کی بنیاد ہے۔ حضرت عائشہ سے مروی احادیث پر صحابہ کرام اُن سے طویل گفتگو اور تبادلِ خیال کیا کرتے تھے۔ گویا اسلام کی دنیائے علم وفضل میں بھی عورت کو اہم مقام حاصل ہے۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ اپنی دختر حضرت فاطمہؓ کے ساتھ نہایت شفقت ومحبت کا تھا۔ حضرت فاطمہؓ کے آنے پر رسول مقبولؐ کھڑے ہو جاتے اور اپنی چادر بچھا کر بیٹی کو بٹھاتے تھے۔ رسول اللہؐ حضرت فاطمہؓ سے کس حد تک محبت فرماتے تھے اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب آں حضرت سفر پر تشریف لے جاتے تھے تو سب سے آخر میں بی بی فاطمہؓ سے ملتے تھے اور جب واپس آتے تھے تو سب سے پہلے اُن سے ملاقات کرتے تھے۔ اس طرح آں حضرتؐ بی بی فاطمہؓ سے جدائی کا وقفہ کم سے کم رکھتے تھے۔ آج دنیا میں رسول اللہؐ کی نسل بی بی فاطمہؓ کی اولاد سے ہی قائم ہے۔ اس میں بھی احترام کا نمایاں پہلو نظر آتا ہے۔

ایک جنگ کے دوران جب حضورؐ کو معلوم ہوا کہ آپ کی دائی حلیمہ کی لڑکی گرفتار ہو کر آئی ہے تو آپ نے خود فدیہ ادا کر کے انہیں رہا کرایا اور بے انتہا محبت والتفات سے اپنے پاس بلا کر گفتگو کی اور دل جوئی فرمائی۔

واقعۂ کربلا کے بعد حضرت زینب کی جرأت آمیز تقریر ہی تھی جس نے یزید کو آلِ رسول کو واپس مدینہ بھیجنے پر آمادہ کیا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ خدا کے احکام اور رسولؐ کے رویے کی معاشرے میں کس حد تک پیروی ہوئی۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ یہاں بھی بیٹی، بیوی، بہن اور ماں کی حیثیت سے عورت ہمارے معاشرے میں واجب الاحترام سمجھی جاتی رہی ہے۔ بیٹی کے ساتھ بیٹے کے مقابلے میں زیادہ نرمی اور محبت کا سلوک روا رکھا جاتا ہے، کیونکہ لڑکی ماں باپ کے گھر چند دن کی مہمان اور ایک مقدس امانت سمجھی جاتی ہے۔ خاص طور پر باپ کا رویہ بیٹے کے مقابلے میں بیٹی سے زیادہ مشفقانہ ہوتا ہے۔ لڑکیاں ساون کی چڑیاں اور پرایا دھن کہلاتی ہیں۔ انھیں دوسرے گھر کی امانت سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کے اکثر شادی کے گیتوں میں بیٹی اور ماں باپ کی ایک دوسرے سے جدائی پر رنج وافسوس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر کی آزادی

اور اُن کی شفقت کو یاد کرتی ہے اور آنسو بہاتی ہوئی گھر سے رخصت ہوتی ہے۔ سسرال میں بھی اسے میکے کی یاد ستاتی ہے تو وہ اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دیتی ہے کہ

نیم کی نبولی پکی ساون بھی کبھی آ دے گا
جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلا وے گا

بیوی کی حیثیت سے مسلمانوں میں عورت اپنے خاوند کے گھر کی ناموس اور زینت کہلاتی ہے۔ وہ گھر کے سارے معاملات کی جزو کل مالک ہوتی ہے۔ ہر اہم اور غیر اہم فیصلہ اس کی مرضی اور خیال کے مطابق ہوتا ہے۔ شادی بیاہ کے معاملات میں ماں کی رائے کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اکثر اوقات ماں کی مرضی باپ کی منشا پر ترجیح پاتی ہے۔ رُپے پیسے کے معاملات میں بھی اُسے مکمّل اختیار ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مرد کا کام کمانا اور عورت کا کام سلیقے سے اُٹھانا۔ یہاں بھی مغربی عورت کے مقابلے میں ہماری عورتوں کو فوقیت حاصل ہے۔ مغرب میں اب بھی جب عورت خود کام نہیں کرتی تو رُپے کے معاملے میں مرد کی دست نگر رہتی ہے۔ مغربی مزاحیہ کہانی اور ڈراموں کا عام موضوع بھی یہی ہے کہ عورت کن کن حیلے بہانوں سے شوہر سے روپیہ حاصل کرتی ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے ہاں عورت کے ہاتھ میں رُپے دینے کے بعد مرد خود اُس سے اپنے ذاتی خرچ تک کے لیے رُپے کے طالب رہتے ہیں۔

ماں کی حیثیت سے تو عورت کے احترام و وقار کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث نے کہ "جنّت ماں کے قدموں کے نیچے ہے" ماں کے درجے کو ہمارے معاشرے میں بے حد بلندی عطا کی ہے۔ جس کی مثال کسی اور قوم میں مشکل سے ملتی ہے۔ اگرچہ بہت سے مذہبی احکام اور احادیث سے ہم نے غفلت برتی ہے، لیکن اس حدیث پر ہر دور میں پورے طور سے عمل کیا گیا ہے۔ پاکستانی گھروں میں ماں کو انتہائی عزّت و عظمت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ میرے ذاتی تجربے میں ایک نہیں متعدد مثالیں ایسی موجود ہیں کہ بیٹوں نے ماں کی مرضی کو ہر بات پر ترجیح دی۔ ماں کا ایک لفظ یا ذرا سی خواہش حکم کا درجہ رکھتی ہے اور ماں کی ناراضی کو نہایت قابلِ افسوس اور بد نصیبی سمجھا جاتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی بکثرت موجود ہیں کہ باپوں نے بچوں کی منگنیاں اپنی ماں کی منشا نہ ہونے کی وجہ سے توڑ دیں۔ بہت سے لڑکے اعلا تعلیم کے لیے بیرون ملک محض اس وجہ سے نہیں بھیجے گئے کہ دادی اماں کی مرضی نہیں تھی۔ لڑکوں کو اسکول سے اٹھا لیا گیا اور ماں کی خوشی کی خاطر ایسی شادیاں توڑ دی گئیں جو دیگر لحاظ سے موزوں تھیں۔

یہ باتیں گئے گزرے زمانے کی نہیں بلکہ آج بھی جبکہ مائیں قدامت پرست ہیں اور لڑکے جدید تعلیم یافتہ اور سارے امور میں مغربی طرز معاشرت کے پیرو تب بھی ماں کی اطاعت

اسی طرح کرتے ہیں جس طرح اب تک ہمارے معاشرے میں ہوتی آئی ہے۔
یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماں کی اس حد تک تعمیل حکم ضرورت سے زیادہ ہے۔ مگر میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ماؤں کی کس حد تک عزت کی جاتی تھی کہ اُن کے ہر مناسب و نامناسب مطالبات کی تعمیل کو فرض خیال کیا جاتا تھا۔ البتہ اب یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ جہاں ایک طرف عورتیں جدید تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور بہت سی باتوں میں زیادہ آزادی حاصل کر چکی ہیں اُن کا اثر اپنے گھر کے مردوں پر کم ہوتا جا رہا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر عورتیں اپنے حقوق حاصل کرنے کی کوشش میں حاصل شدہ مراعات سے محروم ہوتی جا رہی ہیں!
ہر زبان کے ادب میں اُس کے معاشرے کی جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ ہمارا ادب بھی عورت کے احترام کی عکاسی کرتا ہے۔ مراۃ العروس جو اردو کا پہلا ناول ہے اس میں ایک جگہ ماں بیٹے کو پکارتی ہے۔ بیٹا جواب نہیں دیتا۔ ماں کہتی ہے "کیوں بیٹے۔ تیرھویں صدی میں ماؤں کا یہی وقار رہ گیا ہے، میں پکارتی ہوں تم سنتے ہو اور جواب نہیں دیتے؟" اس ایک جملے سے ماں کے وقار کا اور بیٹے کے دل میں کس حد تک اس کی عزت ہونی چاہیے اظہار ہوتا ہے۔
مراۃ العروس دو بہنوں کا قصہ ہے۔ اکبری پھوہڑ، بدسلیقہ اور خود رائے ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی خالہ اُس کے شوہر محمد عاقل اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے نباہ کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔ خالہ کہتی ہیں، "بیٹا چاہے کچھ بھی ہو وہ تمہاری ناموس ہے ایسی بات نہ کرو کہ دنیا ہنسے۔" جب کہ اکبری کی رائے ہے کہ ساس سے الگ گھر بسایا جائے۔ محمد عاقل کو یہ بات سخت ناگوار ہے۔ وہ ماں سے الگ ہونے کے خیال سے ہی انتہائی رنجیدہ و ملول ہے۔ وہ کہتا ہے، "بیوی رہے چاہے جائے میں تو الگ نہیں ہوں گا۔" اس پر ماں خفگی کے ساتھ اسے ڈانتی ہیں اور کہتی ہیں، "بیٹا توبہ کرو! شریفوں میں کبھی کہیں بیویاں چھوٹتی ہیں، تمہیں اپنی زندگی اسی کے ساتھ گزارنی ہے۔ ہمارا کیا آج مرے کل دوسرا دن۔" شرفا میں طلاق کو کتنا معیوب سمجھا جاتا تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔
دوسری بہن اصغری ہے، عقل مند اور سلیقہ شعار۔ وہ گھر میں اسی وجہ سے سیاہ و سفید کی مالک ہے۔ شوہر کی نوکری، تبادلے غرض کہ ہر اہم معاملے میں اس کے مشورے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ سسر اور ساس دونوں کی نظر میں اس کی بڑی وقعت ہے۔
مراۃ العروس سنہ ۱۸۷۱ء میں لکھی گئی تھی۔ اس کا مقصد عورتوں کے حقوق کو ظاہر کرنا نہیں ہے البتہ یہ ہمارے معاشرے کی غیر ارادی تصویر ہے جس سے ہم ماں، بیوی، بیٹی اور بہو کے مقام کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مرثیۂ میر انیس گرچہ واقعۂ کربلا کا بیان ہے لیکن اس کا پس منظر ہماری اٹھارویں صدی کا معاشرہ ہے۔ اِن مرثیوں سے اس کی عکاسی ہوتی ہے کہ اس زمانے میں عورت کا درجہ کیا تھا۔ ماں کی عظمت، بہن کی عزّت، بیوی کا وقار اور بیٹیوں سے شفقت و محبت انیس کے مرثیے ان سب خوبیوں کے آئینہ دار ہیں۔ صرف انیس کے مرثیوں کی روشنی میں ہمارے معاشرے کی عورت کے مقام پر سیر حاصل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ میں یہاں صرف ایک بند نقل کرنے پر اکتفا کروں گی جس میں جناب زینب کے سوار ہونے کا ذکر ہے۔

پہنچیں جو نہی ناقہ کے قریب دخترِ حیدر
خود ہاتھ پکڑانے کو بڑھے سبطِ پیمبر
فضا کھڑی تھامے ہوئے گوشۂ چادر
تھے پردۂ محمل کو تھامے علی اکبر
فرزند کمر بستہ چپ و راست کھڑے تھے
نعلین اٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

کیا آج کسی خاتون کے سوار ہونے میں یہ عزّت و وقار اور احترام پایا جاتا ہے؟ یہ ہمارے اس زمانے کی تہذیب کی جھلک ہے جب مغرب کی ہوا بھی ہمارے معاشرے کو نہیں لگی تھی، لیکن اس کے باوجود کہ ہمارے تمدن میں عورت کا درجہ اتنا بلند ہے عام طور سے مغربی ممالک کے لوگوں اور خود ہماری نئی نسل کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں عورت کا درجہ بہت پست ہے۔ اس کی وجہ پردے کا رواج ہے جس کے سبب غیر اقوام کو ہمارے معاشرے کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور نئی نسل کے زمانے تک پردہ اپنی اصل صورت میں باقی نہیں رہا اور اس میں بہت سی قباحتیں پیدا ہو گئیں۔ پردہ جب مکمل طور پر قائم تھا اُس وقت مرد اور عورت کی دنیا الگ الگ تھی۔ یہ صورت نہیں تھی کہ جو اب غیر اقوام اور نئی نسل کو نظر آتی ہے، یعنی ایک طرف مردوں اور عورتوں کی مکسڈ سوسائٹی ہے اور اس کے برعکس بعض عورتیں علیحدہ محبوس ہیں۔ اب تو خیر پردہ اس حد تک اُٹھ چکا ہے کہ یہ صورت بھی کم نظر آنے لگی ہے، لیکن اب سے تیس چالیس سال آگے جب ہم نے مغربی معاشرہ پہلے پہلے اپنانا شروع کیا تھا تو صورت یہی تھی کہ انگریزی وضع کے بنگلوں کے چند کمروں میں بیگمات قید رہا کرتی تھیں۔ نوکروں کے کوارٹروں میں اُن کی عورتیں محبوس تھیں۔ مغربی قوموں کو پردہ دار زندگی کا یہی نقشہ نظر آیا اور اس کو دیکھ کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمان اپنی خواتین کو قیدی کی صورت رکھتے ہیں، لیکن جب پردہ اپنی اصل صورت میں قائم تھا اس وقت مرد اور عورت کی دنیا الگ تھی۔ بیگمات کے محلات کا زنان خانہ خود ایک وسیع محل ہوا کرتا

تھا جس کے اندر پائیں باغ، نہریں، سیر و تفریح کے سارے سامان موجود ہوتے تھے۔ بیگمات باغ کے اندر چہل قدمی، تیراندازی، کشتی رانی۔ سب کچھ کیا کرتی تھیں۔ پردے کے ساتھ باہر کی سیر و تفریح مثلاً پک نک اور شکار تک کو جاتی تھیں۔ برسات کے موسم میں اپنے محلات کے باغات میں یا شاہی عمارات کے باغات میں ساون منانے جایا کرتی تھیں۔ صرف پردے کا انتظام کرا دیا جاتا تھا۔ شکار کو جائیں تو جنگلات اُن کے اپنے تھے۔ حکم ہو جاتا تھا کہ اس دن وہاں پردہ رہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے پردہ دار بیگمات کو شیر تک کا شکار کرتے دیکھا ہے۔ یہ کہا جائے گا اور کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ یہ دولت مندوں تک محدود تھا، لیکن سیر، شکار، کشتی رانی اور تیراندازی تو بہر حال آج بھی دولت مندوں کے ہی مشاغل ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عورتیں اس سے محروم نہیں تھیں اور بیگمات کے ساتھ اُن کی مغلانیاں، خادمائیں بھی سیر و تفریح میں شامل ہوتی تھیں یہاں تک کہ ماما ئیں اور لونڈیاں تک ایک تنگ کمرے میں بند نہیں رہتی تھیں بلکہ محلات اور زنان خانوں میں چلتی پھرتی، کام کرتی اور لڑتی جھگڑتی نظر آتی تھیں!

ایک اور غلطی جو کہ پردہ دار خواتین کی زندگی سے متعلق غیر اقوام اور نئی نسل میں پائی جاتی ہے وہ یہ کہ وہ خرید و فروخت کی لطیف سرگرمیوں سے محروم ہوتی تھیں جب کہ عورت کے لیے یہ ایک بڑا دلچسپ مشغلہ ہے۔ یہاں بھی یہ لوگ موجودہ حالات دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ پردہ دار خواتین خود خرید و فروخت کے لیے بے شک باہر نہیں جاتی تھیں مگر چیزیں بیچنے والے اور بیچنے والیاں اُن کے گھر آتے تھے۔ بساطی، چوڑی والی سے لے کر بزاز اور جوہری تک گھر پر ہی بیگم صاحبہ کے ملاحظہ کے لیے سامان لے کر حاضر ہوتے تھے اور بیگمات تخت یا مسند پر بیٹھ کر آرام اور سکون سے "شاپنگ" کرتی تھیں۔ میں تو کم سے کم اس طریقے کو اوکسفورڈ اسٹریٹ کے سیلز کے دنوں میں دُکانوں پر دھکے کھانے یا آج کل بوری بازار میں گرمی میں چیزوں کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے ہوئے پھرنے پر ترجیح دوں گی۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے پردے کا حکم صرف اس حد تک ہے کہ عورتیں اور مرد اپنی نظر نیچی رکھیں۔ عورتیں اپنی زینت کا اظہار نہ کریں اور مرد زنان خانے میں بلا دستک اور اجازت کے داخل نہ ہوں، لیکن اس میں شک نہیں کہ رسمی پردہ اس حد سے بہت تجاوز کر گیا ہے اس کے معنی غیر قوموں نے یہ لیے کہ عورت کا درجہ بہت پست ہے اور اسے قیدی کی طرح محبوس رکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے آگے کہا ہے نہ تو انھیں محبوس رکھا جاتا تھا اور نہ پردے کی وجہ ان کو مقید رکھنا مقصود تھا۔ پردے کی وجہ اس کے بالکل برعکس تھی۔ عورتیں پسِ پردہ اس لیے رکھی جاتی تھیں کہ انھیں قوم کا بیش بہا سرمایہ سمجھا جاتا تھا اور جس طرح قیمتی چیز محفوظ رکھی جاتی ہے اسی طرح عورتیں بھی

حفاظت کے لحاظ سے پسِ پردہ رکھی جاتی تھیں۔ پردہ عورت کی ذلت نہیں اس کی حفاظت کا ضامن تھا اور اس کی عظمت کی دلیل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عورتوں کا ذکر بھی اشارۃً کیا جاتا تھا۔ یعنی "گھر میں سے کہا ہے۔ سواری آئی ہے۔" پردہ ہماری نظر میں کیا درجہ رکھتا تھا ان اشعار میں اس کی ترجمانی کی گئی ہے:

سدا پردہ نشیں کا مونس و دم ساز ہے پردہ — بقائے ہستئ عفت کا گویا راز ہے پردہ
حیا کی زندگی کا عیسوی اعجاز ہے پردہ — خواتیں کے لیے صد موجبِ اعزاز ہے پردہ
ہے عزت اس میں پنہاں اور حمیت ہے نہاں اس میں
نہاں ہے عصمت و عفت کا گنجِ شائگاں اس میں

میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ ہر گھر اور ہر خاندان میں پردہ دار عورت کا وہی بلند مقام تھا جیسا کہ میں نے دکھایا ہے، ایسے گھر اور خاندان بھی پائے جاتے تھے جہاں عورت کی عزت و عظمت وہ نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی اور ایسے واقعات بھی دیکھنے اور سننے میں آتے تھے جہاں انھیں سخت دقت و تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن عورتوں کا احترام خاندان کی شرافت کی دلیل تھی۔ جو خاندان یا مرد اس پر کاربند نہ ہوتے تھے انھیں ذلت و تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اعلاے ادنا طبقے تک کے مرد اپنی عورتوں کی عزت پر جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ بیوی سے بدسلوکی، بیٹیوں کی حق تلفی اور بہو سے زیادتی ہوتی تھی لیکن معیار شرافت عورت کے احترام پر ہی مبنی تھا۔ اس قسم کے ناخوش گوار اور ناپسندیدہ واقعات ہماری معاشرت کے مائل بہ تنزل ہونے کے ساتھ ساتھ بہ کثرت ہونے لگے جس سے پردہ اور عورتوں کے مقام کے متعلق غلط فہمی میں اضافہ ہوا۔ ان حالات میں اصلاح کی سخت ضرورت پیدا ہو گئی۔ پردے کے خلاف احتجاج شروع ہوا اور سیاسی جد و جہد اور اقتصادی ضرورت نے مل کر عورت کو مرد کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ لیکن اس آج کے معاشرے میں بھی عورت کے احترام کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ پس پردہ معاشرے میں تھی۔ اس احترام کو پیدا کرنا اور قائم رکھنا بڑی حد تک عورتوں کے اپنے رویتے پر منحصر ہے۔ وہ اگر اپنی آزادی کا صحیح استعمال کریں اور اپنے وقار کو ملحوظ رکھیں تو یقیناً مردوں کے دل میں ان کا احترام قائم رہے گا اور دوسری طرف مردوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ آج جب کہ عورتوں نے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی ضروریات کے سبب پردہ ترک کیا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں کہ وہ احترام کے اس حق سے محروم ہو جائیں جو انھیں خدا نے دیا ہے اور جو ہمارے اسلامی معاشرے کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

جناب محترم سیّد ہاشم رضا

ہر جلسے میں افتتاحی تقریر کرنے والا فائدے میں رہتا ہے، کیونکہ سامعین تازہ دم ہوتے ہیں اور اس لیے ہمہ تن گوش ہوتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ تقاریر کے سلسلے کے ساتھ سننے والوں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جلسہ جس قدر جلد ختم ہو اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ہر ایک کو کہیں نہ کہیں جانا ہوتا ہے یا کسی نہ کسی دوسرے کام میں مشغول ہونا پڑتا ہے، اس معاملے میں صدرِ جلسہ سب سے گھاٹے میں رہتا ہے، کیونکہ اُسے سب سے آخر میں تقریر کرنا پڑتی ہے اور نفسِ مضمون پر سیر حاصل بحث ہونے کے بعد صدر کے لیے کہنے کو بھی بہت کم رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر حافظ محمّد الیاس نے اپنے ابتدائیہ کلمات میں قرآن پاک اور رسول کریمؐ کی حدیثوں کا حوالہ دے کر اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ اسلامی معاشرے میں خواتین کو بہت بلند مقام عطا کیا گیا ہے، میں اپنے نوٹس میں قرآن مجید کی جن آیتوں کو لکھ کر لایا تھا۔ ڈاکٹر حافظ محمّد الیاس نے ان سب کی نشان دہی کر دی اور پھر چونکہ انھیں حافظِ قرآن ہونے کا شرف حاصل ہے اس معاملے میں اُن کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

محترمہ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے جس وضاحت کے ساتھ اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے؛ اُن کی علمی اور سماجی خدمات سے ہم سب واقف ہیں، مرحوم اکرام اللہ صاحب سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے پہلے ہی انھوں نے 'عصمت'، دہلی میں کئی مضامین لکھے جو قابلِ داد تھے؛ گھریلو مشغولیتوں کے ساتھ انھوں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی اور پاکستان کے کارواں کی اتنی اہم رکن بنیں کہ انھیں پاکستان کی پہلی 'کنسٹی ٹوائینٹ' اسمبلی کی ممبری کا شرف حاصل ہوا۔ آج کے موضوع کے لحاظ سے 'شامِ ہمدرد' کو ان سے بہتر مقرر نہیں مل سکتا۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ کی نشوونما کلکتے میں ہوئی اور آپ نے سُنا کہ انھوں نے کتنی سلیس اُردو میں تقریر کی۔ اس معاملے میں جہاں ان کی اُردو دانی کی داد دینا پڑتی ہے وہاں خود زبانِ اُردو کی وسعت اور ہمہ گیری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہ زبان برِصغیر کے ہر حصے میں کشمیر سے راس کماری تک اور خیبر سے چٹاگانگ تک سمجھی اور بولی جاتی ہے، اور اس کا دائرہ صرف برِصغیر ہی تک محدود نہیں بلکہ یہ برما اور ملیشیا، سیلون (سری لنکا) عراق اور جنوبی افریقہ کے کئی ملکوں میں رائج ہے۔ جہاں دینِ اسلام کی روشنی پھیلی ہے وہاں اُردو رائج ہے۔ اس

زبان میں اسلامی تہذیب اور اسلامی ثقافت سمو دی گئی ہے، اور یہی بات اس کی بقا کی ضامن ہے۔ داغ دہلوی نے کہا تھا ؎

احمدِ پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور ورنہ قرآن بھی آتا بہ زبانِ اُردو

برّصغیر میں اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کی میل ملاپ کی زبان بنی اور چونکہ برّصغیر کے ہر حصے میں صوبائی زبانیں مختلف ہیں لہٰذا یہ بین الصوبائی زبان بنی اور اب تو اسے بین الاقوامی زبان کا درجہ حاصل ہے۔

میں نے ستمبر ۱۹۷۱ء میں لندن میں ایک مشاعرے میں شرکت کی جن میں شعرا کے نام اُن کی موجودہ جائے قیام سے منسوب کرکے اس طرح پکارے گئے: یہ صاحب لندنی ہیں، یہ صاحب بریڈفوردی ہیں، یہ صاحب مانچسٹردی ہیں!

امریکا کے ۲۴ فروری ۱۹۶۱ء کے "ٹائم" میگزین میں دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والوں کی تعداد کا اندازہ یوں کیا گیا:

'کرۂ ارض میں تقریباً ۶ ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن جو زبانیں مستند سمجھی جاتی ہیں اُن کی تعداد ۱۳۰ ہے۔ ان ۱۳۰ زبانوں میں سے بارہ زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد یہ تھی'

۴۶ کروڑ چائنیز
۲۵ کروڑ انگریزی زبان
۱۶ کروڑ ہندستانی، جسے ہم اُردو اور ہندستان والے ہندی کہتے ہیں
۱۴ کروڑ ہسپانوی زبان
۱۳ کروڑ روسی زبان
۱۰ کروڑ جرمن
۹½ کروڑ جاپانی
۸ کروڑ عربی
۷½ کروڑ بنگالی
۷½ کروڑ پرتگالی
۶½ کروڑ فرانسیسی
۵½ کروڑ اطالوی

اس لحاظ سے دنیا میں اُردو بولنے والوں کی تعداد عربی بولنے والوں سے دوگنی ہے۔

چوں کہ ہمارے مذہب اور ثقافت کا سرچشمہ مکہ اور مدینہ ہے، ہماری سب سے متبرک کتاب قرآن مجید ہے اور ہم رسول عربیؐ کو دنیا کا عظیم ترین انسان مانتے ہیں، لہٰذا احترام خواتین کے بارے ہمیں قرآن مجید کے ارشادات اور رسولِ کریمؐ کی حدیث سے استفادہ کرنا ہوگا، قرآن مجید کے دو سُورتوں کے نام ہیں سورۂ مریم اور سورۂ النساء۔ سورۂ مریم کی تلاوت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ محترمہ پر وحی خداوندی نازل ہوئی تھی تاکہ وہ اس اتہام کا جواب دے سکیں جو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت پر اُن کے بدخواہوں نے گھڑا تھا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہمارے رسولؐ نے اسلام لانے کی سب سے پہلی دعوت ایک محترم خاتون کو دی۔ حضرت خدیجہؓ، جنھیں آپ کی زوجیت کا شرف حاصل ہوا اور جن کے بطن سے حضرت فاطمہؓ تولد ہوئیں جن کی تعظیم کے لیے رسول اللہؐ اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ حضورؐ اپنی دائی بی بی حلیمہ کی بھی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ تعظیم اصل میں خواتین عالم کی تعظیم تھی۔

مفکرِ اسلام و پاکستان علامہ محمد اقبال نے جنابِ فاطمہؓ کے بارے میں یہ اشعار کہے تھے:

مریم از یک نسبتِ عیسیٰ عزیز — از سہ نسبت حضرتِ زہرا عزیز
نورِ چشمِ رحمۃ للعالمین — آں امامِ اوّلین و آخرین
بانوے آں تاجدار ھل اتیٰ — مرتضیٰ مشکل کشا شیرِ خدا
مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق — مادرِ آں کارواں سالارِ عشق

پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفےٰؐ است

ورنہ گردِ تربتش گردیدمے — سجدہ ہا برخاک او پاشیدمے

سورۂ نساء میں حکم خداوندی ہوا کہ ترکے میں عورتوں کا بھی حصّہ ہے۔ ماں باپ کے ترکے میں اور شوہر کے ترکے میں، اسی سورہ میں ہدایت کی گئی کہ شوہر بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ بیوہ عورتوں کی مدد اور دستگیری کی ہدایت کی گئی۔ سورۂ البقر کی ایک آیت ہے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ، اور اس طرح مرد اور عورت کے ساتھ کو چولی اور دامن کے ساتھ سے تشبیہہ دی گئی۔

بخاری میں رسولِ کریمؐ کی یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ "تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس کا برتاؤ اپنی بیوی سے سب سے بہتر ہے۔"

ہمارے معاشرے میں ماں کا بہت بڑا مقام ہے۔ ع

زیرِ قدمِ والدہ فردوسِ بریں است

امیر خسروؔ نے اپنی مادرِ گرامی کی وفات پر یہ اشعار کہے تھے:

چوں مادرِ من بزیرِ خاک است | گر خاک بر سر کنم چہ باک است
اے مادرِ من کجائی آخر | رو از چہ نمی نمائی آخر
ہر جا کہ ز پائے تو غبارے ست | مارا ز بہشت یادگارے ست
امروز منم بہ مہر پیوند | خاموشیٔ تو ہمی دہد پند

علامہ اقبال نے صحبتِ مادر کے کیمیائی اثر کو اس طرح بیان کیا:

علم کی سنجیدہ گفتاری بڑھاپے کا شعور | دنیوی اعزاز کی شوکت جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اُتر آتے ہیں ہم | صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

انھوں نے اپنی مادرِ گرامی کے مزار پر یہ دُعا کی،

سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے | آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

طرابلس کے میدان کارزار میں اطالوی سپاہیوں نے جن سے سارے یورپ کو ہمدردی تھی نہتے عرب عورتوں اور معصوم بچّوں کو بیدردی سے شہید کیا، فاطمہ بنتِ عبداللہ وہ بہادر لڑکی تھی جو جنگِ طرابلس میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس عظیم کارنامے کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

فاطمہ تو آبروئے ملّتِ مرحوم ہے | ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی | غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر | ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے | نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں | پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا تھا ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ | اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی نظم "چپ کی داد" میں اسلامی معاشرے میں خواتین کے مرتبے کا ذکر یوں کیا،

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو! دنیا کی عزّت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں، قوموں کی عزّت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
تم ہو تو غربت ہے وطن، تم بن ہے ویرانہ چمن

ہو دیس یا پردیس، جینے کی حلاوت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، عفّت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا، طبیعت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا، انساں عبارت تم سے ہے

اُردو میں تذکیر و تانیث کے تعیّن کرنے والوں نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے اور بہت سی محترم اشیا کو تانیث کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ اگرچہ خدا اور پیغمبر مذکر ہیں لیکن اسی کے ساتھ خدائی، اذان اور وحی، رسالت، بعثت، امامت، خلافت، شہادت مونث ہیں۔ جسم جو کہ فنا ہونے والی چیز ہے مذکر ہے اور رُوح جو کہ ابدی ہے مونث ہے۔ اندھیرا مذکر ہے اور روشنی مونث۔ غم مذکر ہے اور شادی مونث، دل مذکر ہے اور جان مونث۔ بڑھاپا مذکر ہے اور جوانی مونث۔ علم مذکر ہے اور عقل مونث۔ جوتا مذکر ہے اور ٹوپی مونث۔ تقدّس کی نشانی ڈاڑھی مونث ہے۔ سپاہی مذکر ہے لیکن سپاہ مونث، عَلَم مذکر ہے لیکن فوج مونث۔ (یہ مثالیں مُشتے از خروارے ہیں۔)

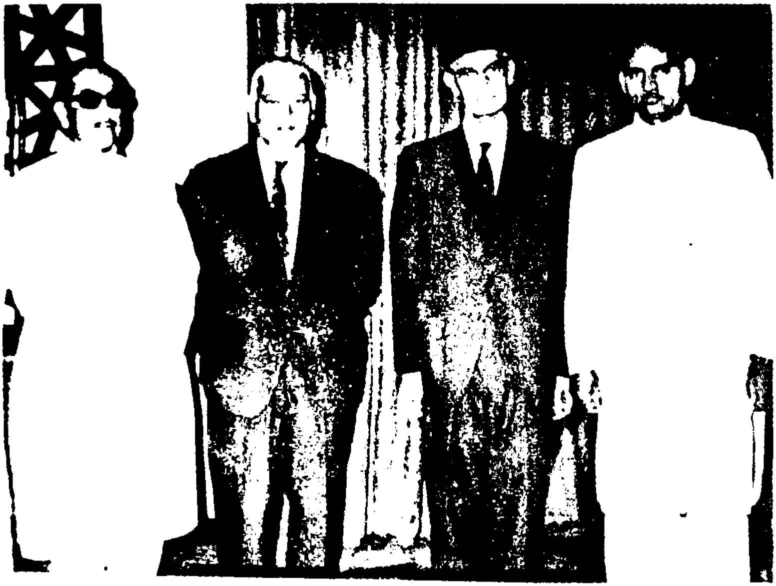
اس محفل میں میری اہلیہ بھی موجود ہیں، انھوں نے مجھے اشارہ کیا ہے کہ میری تقریر طولانی ہو گئی ہے لہذا اُن کے اشارے کا احترام کرتے ہوئے مَیں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔



مقرر:
جسٹس
اے۔آر۔ کارنیلیس



جسٹس اے۔آر۔کارنیلیس ، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (صدر مجلس)



جناب یعقوب ہاشمی ، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، جسٹس اے۔آر۔ کارنیلیس، حکیم محمد سعید



مولانا عبدالجبار غازی، حکیم محمد سعید، مولانا محمد سعید، برگیڈیر گلزار احمد ۔

احترامِ غربت و غربا

کلمات ابتدائیہ : حکیم محمد سعید

مقالہ : جناب محترم جسٹس اے۔ آر کار نیلیئس

شامِ ہمدرد، راولپنڈی

یکم اگست ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

ایکسی لینسیز۔ خواتین و حضرات

تقریباً تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد آج آپ لوگوں کے سامنے حاضر ہوکر اور اپنی تمام سرگرمیوں کو دوبارہ شروع کر کے مجھے بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ امریکا، یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کی سیاحت بڑی مفید ثابت ہوئی۔ میں ہر طرح کے خیالات سے لبریز ہو کر لوٹا ہوں۔ ان انتہائی مصروف سو دنوں کے مشاہدات اور تجربات نے میرے جذبات و احساسات میں تیزی پیدا کر دی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ملک کے حالیہ المناک واقعات کی وجہ سے میں بے حد غمگین بھی ہوں۔ اگر یہی ہمدردی، حُبّ الوطنی اور مفاہمت کا دَور دَورہ جاری رہتا تو یہ تلخی اور بغض و عناد ہرگز پیدا نہ ہوا ہوتا۔ مجھے اُمید ہے کہ انسانی جذبۂ خیر خواہی جو احترام کی بدولت پیدا ہوتا ہے وہ ایک نہ ایک دن ضرور غالب آئے گا۔ آخر کار انسان صرف پیٹ ہی بھر کر تو زندگی نہیں گزارتا، اس کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے حُسن و ہم آہنگی، سچائی اور نیکی، کام اور تفریح، محبت اور دوستی، آرزو اور عبادت، تلاش و تحقیق، تعاون و تخلیق اور خدمت و شرکت کی بھی ضرورت درپیش رہتی ہے۔

یہ تلاش و تحقیق۔ تعاون و تخلیق اور خدمت و شرکت ہی کے جذبات کی برکت ہے جو ادارۂ شامِ ہمدرد قائم ہوا ہے اور اسے اس سال "احترام" کے موضوع کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ احترامِ غربت و غربا بھی اسی کا ایک پہلو ہے، چنانچہ آج ہمارے مہمان مقرر کی تقریر کا موضوع یہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف دو بڑے خاندان ہیں: ایک خاندان تو وہ ہے جس کے پاس سب کچھ ہے، اور دوسرا خاندان وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ان دونوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس کی تصدیق بھی کی جا چکی ہے۔ بالفاظِ دیگر دولت کی فتح مندی اور غربت کی ذلت کے چرچے بہت ہو چکے ہیں۔ غربت ہر فن اور ہر پیشے کی جڑ ہے۔ غربت کوئی عیب نہیں، لیکن جیسا کہ ٹامس فُلر نے کہا ہے غربت کی بنا پر شرمندہ ہونا عیب ہے۔ غربا ایک ایسا طبقۂ شرفا پیدا کرتے ہیں جس کی بنیاد دولت و منصب پر قائم نہیں ہوتی۔ اس طبقے کے لوگ انتہائی حساس، محتاط اور دلیر ہوتے ہیں۔ اُن میں سے ہزاروں گمنامی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ صرف چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا نام باقی رہ جاتا ہے۔ تاریخ کی انتہائی عظیم ہستیاں یعنی پیغمبرانِ دین انتہائی غریب لوگ تھے۔

خود ہمارے رسول پاکؐ نے غایت انبساط سے غریب آدمی کی تعریف کی اور فرمایا کہ میں ایک غریب آدمی کی طرح جینا چاہتا ہوں اور حشر کے دن بھی غریبوں ہی کے ساتھ اُٹھنا چاہتا ہوں۔ معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا، "مومن کے لیے اس دنیا میں غربت ہی بخشش ہے"۔ مشکوٰۃ شریف میں لکھا ہے کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا، اے اللہ۔ میری زندگی ایک غریب آدمی کی طرح بسر ہو اور میری موت بھی ایک غریب آدمی ہی کی طرح ہو اور حشر کے دن جب اٹھوں تب بھی غریبوں ہی کے درمیان ہوں"۔ حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ یہ آخر کیوں؟ تو آں حضرتؐ نے فرمایا کہ "یقیناً یہ لوگ امیروں سے چالیس برس پیشتر جنّت میں داخل ہوں گے۔ اے عائشہ۔ کسی غریب کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جانے دو۔ کچھ بھی دے دو۔ خواہ وہ ایک کھجور ہی کیوں نہ ہو۔ اے عائشہ۔ غریبوں سے محبت کرو اور انھیں اپنے پاس آنے دو، کیونکہ قیامت کے دن اللہ تم کو اپنے قریب بلالے گا۔ اللہ قادر مطلق ان ہی کو غربت دیتا ہے جن سے وہ محبت کرتا ہے۔ دولت مند لوگوں کے فرائض اور ذمّے داریاں بہت زیادہ ہیں مثلاً انھیں زکوٰۃ دینی پڑتی ہے، جبکہ غربا اس سے مستثنیٰ ہیں۔ غربت تمام فنون اور تمام پیشوں کی جڑ ہے۔ ترقی اور پیش قدمی کے لیے یہ رکاوٹ ہرگز نہیں۔ لہٰذا ہم سب کا فرض ہے کہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ان تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھیں جو غربت کے بارے میں بتائی جاچکی ہیں اور اُس کے جو حقوق اور رعایتیں ہیں انھیں بھی پہچانیں، کیونکہ ہمیں یہ بات پہلے ہی بتائی جاچکی ہے کہ" خوش نصیب ہیں غربا کیونکہ خدائی بادشاہت ان ہی کی ہے"۔

آج شام ہمارے مہمان مقرر ہیں جناب جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلیس صاحب جنہیں نہ صرف پاکستان میں بلکہ بین الاقوامی برادری میں بھی ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ موصوف کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے رہ چکا ہے اور انھوں نے ان میں نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ موصوف نے اسلامی قوانین کا نہایت عمیق مطالعہ کیا ہے اور اس کی بنا پر آپ کی شہرت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ آپ کا مستعد اور منوّر دماغ بہت سے دوسرے حلقۂ عمل تک بھی پہنچ جاتا ہے اور ان کا احاطہ کرلیتا ہے۔ موصوف اپنے اسلوب بیان، لطافتِ ادراک اور گہری انسانی ہمدردی کی وجہ سے نہایت ممتاز ہیں۔

جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب جو کہ اس شام ہمدرد کی صدارت فرمارہے ہیں وہ بھی قومی اور بین الاقوامی اعتبار سے اتنے ہی مشہور و معروف ہیں۔ ایک محقق سائنس داں اور ایک معلّم دونوں حیثیتوں سے موصوف نے طلبا کی اس پوری نسل پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے جس نے پشاور،

سندھ اور اسلام آباد کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی ہے۔
میں ان دونوں حضرات کا احسان مند ہوں کہ انھوں نے میری دعوت قبول کی اور آج شام ہمدرد کی محفل کو زینت بخشی۔ مجھے یقین ہے کہ ان دونوں قابل ہستیوں کی موجودگی کی وجہ سے آج کی شام نہایت سبق آموز اور نشاط انگیز ثابت ہوگی۔

جناب محترم جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلیس
سابق چیف جسٹس، پاکستان

میں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ میرے بہت سے سننے والوں کو بڑا مشکل معلوم ہوگا۔ وہ سوال کرسکتے ہیں کہ میلا گندگی، بدنمائی، بے ترتیبی اور بیماری کا احترام کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ احترام تو صرف اسی چیز کا محسوس کیا جاسکتا ہے جو خود اپنی ذات کی بنا پر عزیز ہو یعنی جو عزت و احترام کے جذبات کو اتنا اکساتی ہو کہ وہ بڑھ کر تحسین و تعظیم کی منزل تک پہنچ جاتے ہوں اور جس چیز کی برتری ناقابلِ تردید ہو، لیکن وہ کم از کم پسندیدگی اور خوش خلقی کی بھی مساوی طور پر متقاضی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے دلوں میں انسانی ہمدردی بھی ہوتی ہے۔ جو لوگ غربت کا شکار ہوتے ہیں ہم اُن کا مذاق نہیں اُڑاتے اور نہ اُن سے نفرت کرتے ہیں۔ جہاں کسی کو بہت زیادہ پریشان دیکھتے ہیں تو حتی الامکان اس کی مدد بھی کرتے ہیں، لیکن احترام کرنا بالکل علیحدہ بات ہے۔

آیئے دیکھیں کہ لفظ "احترام" سے ہم کیا سمجھتے ہیں۔ اس دنیا میں جہاں اخلاقی و مادی اقدار کی ناہمواریاں موجود ہیں ہر انسان کے دل میں کسی نہ کسی ایسے شخص یا ایسے ادارے کے لیے احترام کے جذبات پیدا ہونا لازمی ہیں جو ادب و لحاظ کے جذبات کو برانگیختہ کرتا ہو اور توجہ و خوش خلقی کی صفات کو دعوتِ عمل دیتا ہو۔ لہٰذا ایک ایسے معاشرے کے رکن کی حیثیت سے جسے باہمی سماجی تعلقات کو صحت مند اور ترقی پذیر حالت میں برقرار رکھنے کی فکر دامن گیر ہو، یہ بات ہمارے فرائض کا جز ہے۔ جب تک تمام اراکین کافی حد تک ان صفات کا مظاہرہ نہیں کرتے اس وقت تک لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر ارتقا میں ہم آہنگی قائم رکھنا مقصود ہے تو پھر معاشرے میں ایسے اداروں کو قائم کرنا چاہیے جن سے انسانی وجود کی کم از کم بنیادی ضروریات انصاف و مساوات پوری ہوسکیں۔ اصولی اعتبار سے ترقی کے لیے یہ لازمی ہے کہ یہ بنیادی ضروریات بہ تدریج خود بڑھتی رہیں، لیکن تنظیم۔ دولت کی تحریک کی وجہ سے یہ معنی نہ صرف ان بالائی طبقات تک محدود رہ جاتی ہے جو ہر شے پر قبضہ جمائے ہوتے ہیں اور غربا بہ تدریج اپنی ہی تدابیر کے رحم و کرم پر رہ جاتے ہیں اور تنگی ترشی میں بسر کرتے رہتے ہیں۔ تنظیم دولت کی طاقت کتنی زبردست ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کے سب سے زیادہ دولت مند ملک امریکا میں غربا کی ایک انجمن نے حال ہی میں یہ دعوا کیا ہے کہ اس ملک

میں ایک غریب خاندان کی گزر اوقات کے لیے سالانہ کم از کم ساڑھے چار ہزار ڈالر مقرر ہونا چاہیے۔ ہمارے یہاں کے لحاظ سے یہ رقم پچاس ہزار روپے کے برابر ہے جو کہ ایک بڑے سے بڑے سرکاری ملازم کی تنخواہ ہے اور شاید پاکستان کے سب سے زیادہ دولت مند خاندانوں کے نوجوانوں کو بھی اتنی ہی رقم خرچ کے لئے ملتی ہے۔

غربا کو عموماً اس اعتبار سے بڑا خوش نصیب تصور کیا جاتا ہے کہ ان کی عاقبت نہایت اچھی ہوگی۔ اس موضوع پر بڑے رقت انگیز انداز میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جو شخص اس زندگی میں انتہائی تکالیف برداشت کرے گا اس کے لیے آئندہ زندگی میں حضرت ابراہیم کی شفقت حاصل ہونا یقینی ہے۔ بالفرض آسودہ حال لوگ سطحی طور پر یہی عقیدہ رکھتے ہیں تب بھی اس سے ان کے دلوں میں اپنے غریب بھائیوں کے لیے جو عزت ہے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ان کی نظروں میں اس دنیا میں غربت بذات خود ایک نعمت ہے۔

معاشی اعتبار سے چونکہ مشترکہ قومی منافع کا خیال غالب رہتا ہے۔ لہٰذا ایک غریب آدمی کو بد معاش، نااہل، انتہائی کاہل اور فضول خرچ سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر وسائل کو امیروں کے ہاتھوں سے نکال کر غریبوں کے ہاتھوں میں دے دیا جائے گا تو اس سے مشترکہ قومی منافع کو نقصان پہنچے گا تاوقتیکہ اس طرح کی پابندیاں عائد نہ کر دی جائیں کہ ایک آدمی اپنے لیے صرف اتنا ہی فراہم کر سکتا ہے جتنا کہ وہ مشترکہ قومی منافع میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ شرط عملی طور سے ناممکن ہے۔ ماضی میں بہت سے ملکوں میں ان بیواؤں کی امداد کے لیے قوانین بنائے جا چکے ہیں جن کے بچوں کی پرورش کے لیے کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا ہے لیکن اس امداد کے لیے بھی بڑی احتیاط سے حساب لگا کر ایک حد مقرر کر دی گئی ہے یعنی یہ کہ دوسروں کے کپڑے سینے موزہ بننے، برتن دھونے اور اسی طرح کے دوسرے گھریلو کام کرنے کے بعد بھی جو ضروریات زندگی پوری نہ ہوں تو صرف اُن کے لیے مدد دی جاتی ہے۔ اس حساب کتاب میں اس بات کو قطعی مدنظر نہیں رکھا جاتا کہ عورت معاشرے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے بھی خدمت کرتی ہے اور اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت کے ذریعہ سے نمایاں طور پر معاشرے کی امداد کرتی ہے، کیوں کہ یہی بچے بعد میں معاشرے کے ارکان بن جاتے ہیں۔ مشترکہ قومی منافع کو برقرار رکھنے اور اس کی تنظیم کرنے کے سلسلے میں جس احترام کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ اس جذبۂ احترام سے کہیں زیادہ ہوتا ہے کہ جو ان عطیات کے پانے والوں کے لیے محسوس کیا جاتا ہے۔ انسان کو سماج میں زندگی بسر کرنے کا جو حق خالق نے دیا ہے اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

اس طرز خیال کے مطابق سماج کے اس طبقے کے لیے یہ توقع کرنا بے کار ہے کہ اس کے احترام

میں اضافہ ہو سکے گا، لیکن ہر معاشرے میں اس قسم کے طبقے کا ہونا لازمی ہے۔ یہاں پر یہ قول بالکل صادق آتا ہے کہ "غربا ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں گے" اور اب تک تو یہ بات ہر ایک کے دل میں اتر جانی چاہیے تھی کہ ایک معاشرہ خواہ کسی طور سے بھی اپنے مال و دولت کو استعمال کرے یا تقسیم کرے اس کے وجود کے لیے یہ لازمی شرط ہے کہ اس کے درمیان محروم اشخاص کا ایک طبقہ ایسا ہو جو انتہائی غربت میں زندگی گزار رہا ہو۔ بہترین فلاحی نظام میں بھی جسے نہایت جدید طرز پر منظم کیا گیا ہو بعض لوگ اسی حالت میں ملیں گے۔ ان لوگوں کی موجودگی، اُن کا طرزِ زندگی اُن کی رہائش گاہیں قوم کے چہرے پر ایک بدنما داغ سمجھی جاتی ہیں۔ لہٰذا غیر ممالک کے ممتاز لوگ جب آتے ہیں تو اُن سے یہ چھپایا جاتا ہے، لیکن خود اندرونِ ملک ان چیزوں کو چھپانا ناممکن ہے دنیا کے بڑے بڑے شہروں کی گندی بستیاں اور جھونپڑیاں بقول شخصے "انگوٹھے کے پھوڑے" کی طرح نمایاں ہیں۔

یہ تشبیہہ میرے موضوع کے لیے نہایت مناسب ہے جس شخص کے انگوٹھے میں پھوڑا ہو گا وہ اُسے نظر انداز ہرگز نہ کر سکے گا۔ اس کا پُورا اعصابی نظام اور خون اور جسم کی تمام شفا بخش قوتیں متاثر عضو کو نظر انداز کرنے کے بجائے اس کے گرد جمع ہو جائیں گی اور اُسے آرام پہنچانے کے لیے اپنے سارے وسائل استعمال کر ڈالیں گی۔ خالقِ کائنات نے ہر جاندار شے کی شناخت کے لیے اور اس کی بقا کے لیے اس بات کو لازمی قرار دیا ہے۔ جسم کا جو حصّہ صحت مند ہوتا ہے وہ زخمی حصّے کی تکلیف میں برابر کا شریک ہوتا ہے اور اس تکلیف کا ازالہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا خواہ اُس کی وجہ سے خود اس کو کتنی ہی زحمت گوارا کرنی پڑے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں ایک تعلق اور لگاؤ ہے۔ لہٰذا جہاں تعلق اور لگاؤ ہو گا وہاں احترام ہو گا۔

اب یہاں پر میں آپ کی اجازت سے قرآن کریم کی ایک ایسی آیت پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے احترام کی بنیاد کا پتہ چلتا ہے اور جس سے میرے خیال کے مطابق ہر فرقہ اپنے غریب ترین طبقے کا احترام کرنے پر مجبور ہے۔ یہ اکتیسویں سورۃ کی اٹھائیسویں آیت ہے۔ یعنی سورۂ لقمان۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ط

اس آیت کا مختلف طریقوں سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ یوسف علی نے حسب ذیل ترجمہ کیا ہے:

"اور تمہاری تخلیق یا تمہارا حشر ایک منفرد نفس کے سوا اور کچھ نہیں ہے"۔

آربری (ARBERRY) کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"تمہاری تخلیق اور (قیامت کے دن) تمہارا اُٹھنا صرف ایک نفسِ واحد کی طرح ہے"۔

حال ہی میں پیر صلاح الدین نے حسب ذیل الفاظ میں تشریح کی ہے:

"تمہاری تخلیق اور تمہارا ارتقا بالکل ایک نفس واحد کی طرح ہیں۔"

جیسا کہ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے یہ الفاظ مجموعی طور پر انسانیت کو اور مخصوص طور پر مسلم برادری کو مخاطب کر کے کہے گئے ہیں۔ یہاں پر مماثلت بالکل واضح ہے۔ مذہبی تفسیر کی صلاحیت کا ذرا سا بھی دعوا کیے بغیر اس انکساری کے ساتھ جو کہ الہامی صحیفے کو سمجھنے کے لیے مناسب ہے میں آپ کی اجازت سے آخری ترجمے کو ترجیح دیتا ہوں۔ میرے خیال میں "نفس واحد" سے مراد ہے ایک ایسا واحد انسان جس کو روح عطا کی گئی ہو اور جسے اس کا احساس بھی ہو۔ اور "خلق" کا جو حوالہ دیا گیا ہے، اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں انسان کی پوری ساخت شامل ہے اور جس کے بارے میں خود قرآن پاک کہتا ہے کہ اسے بہترین مٹی سے بنایا گیا ہے۔ تمام جان دار چیزوں کی بالخصوص نوع انسانی کی اصلیت جن انتہائی مفصّل و مرتّب اجزا پر مشتمل ہے انھیں اب سائنس کی دنیا خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں اور وجدان کی بدولت سمجھنے لگی ہے۔ لیکن

(لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝)

کے پورے معنی ابھی انسانی فہم و ادراک پر عیاں ہونا باقی ہیں۔ میری ناچیز رائے ہے کہ ہر انسان میں جو یہ مکمّل نظام عمل بیرا ہے اسی سے موازنہ کیا گیا ہے اور یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ ایک فرد اس وقت تک بڑھتا رہے گا اور ترقی پاتا رہے گا جب تک کہ وہ پوری طرح نشو و نما نہیں پاتا۔ اس کی بالکل وہی صورت ہے کہ جس طرح سے ایک بچّہ پیدا ہونے کے بعد بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک مکمل ہستی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

پنی دلیل کی خاطر میں جس چیز پر زور دینا چاہتا ہوں وہ ہے ان پیچیدہ ڈھانچوں کی سالمیت۔ سی اعتبار سے یہ کہا گیا ہے کہ "تم ایک دوسرے کے عضو ہو" اور یہ قول برادری کے ان گروہوں کے لیے بالکل صادق آتا ہے جو اپنے کام اور حالات کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جو لوگ مادّی لحاظ سے خوش حال ہیں ان کے مقابلے میں غربا کا طبقہ "انگوٹھے کے پھوڑے" کی مانند ہے۔ یعنی وہ ایک ایسے عضو کی طرح ہیں جس کی تکلیف سارے جسم پر اثرانداز ہوتی ہے۔ لہٰذا جسم کی ساری توتیں اور صلاحیتیں مثلاً اعصابی نظام، خون کی رسد اور بیماری کا مقابلہ کرنے والے اجسام دفاعی سب اس تکلیف کو دور کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

دراصل یہ محض مصیبت زدہ عضو سے اتحاد یا اتفاق کرنے کی بات نہیں بلکہ دل میں اس فرض کا بس جانا ہے کہ لنظام مکمّل کی دوسری تمام صلاحیتوں اور ذرائع کو اس تکلیف کے ازالے کے لیے استعمال کرنا ہے۔ سی حساس کے تحت میں آپ کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جس برادری کو اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر متحد و مکمّل کیا گیا ہو اس کے دل میں غریب طبقے کی حالت دیکھ کر یہ بات بس جانا چاہیے

کہ اس کی تکلیف کو دُور کرنا ہے۔ اس کی محض یہ صورت نہ ہونی چاہیے کہ ایک نے دوسرے کو کچھ دے دیا۔ بلکہ یہ کہ جیسے ہم نے خود اپنے ہی لیے کچھ کیا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر میں آپ سے نہایت پُرزور الفاظ میں عرض کرتا ہوں کہ غربا کے لیے احترام محسوس کرنا ایک لازمی بات ہے اور یہ سچا تعلق اس عقیدے کی بنا پر ہونا چاہیے کہ یہ لوگ بھی اسی تکمیل شدہ نظام کا ایک لازمی حصّہ ہیں جس میں ہم سب شامل ہیں۔ انھیں ایک مصیبت یا بلائے بے درماں سمجھنا غلط ہے۔

یہ احساس ایسا نہیں جو نفسی ماحول میں شروع ہوتا ہو اور اسی میں ختم ہو جاتا ہو۔ اسے لازمی طور سے اس شعبہ سے منسلک کر دیا گیا ہے جس سے انسانیت مزین ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مختلف سرکاری سلسلوں کے تحت مختلف کام کیے گئے ہیں اور ہر سرکاری نظام نے بنیاد قائم کرنے کے لیے اپنے اپنے اصول بنا رکھے ہیں۔ ایک مسلم ملک میں ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان اصولوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور ان ہی پر عمل کریں جو اسلام کی مقدس کتابوں میں درج ہیں اور ان کی تعمیل کے لیے ان ابتدائی رہنماؤں کی تقلید کریں جنھیں یہ اصول نہایت پاک و صاف روشنی میں نظر آئے تھے۔ انتظامی معاملات کے سلسلے میں مجھے حضرت علیؓ کے ان ولولہ انگیز الفاظ سے بہتر اور کوئی مثال نہیں ملتی جو انھوں نے اسلامی حکومت کے بالکل ابتدائی دور میں مصر کے نئے گورنر ملک اشتر کو مخاطب کرتے ہوئے استعمال کیے تھے۔ غربا کا تذکرہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں کہا گیا ہے:

"خبردار! غربا کے معاملات طے کرتے وقت خدا سے ڈرتے رہنا کیونکہ ان کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ بیکس، نادار اور معذور ہیں اور زمانے کے نشیب و فراز کا شکار ہیں۔ خدا کے واسطے ان کے حقوق کا تحفظ کرنا کیونکہ ان کی ذمّے داری تمہارے اوپر ہے۔ ان کی ترقی کے لیے بیت المال کا ایک حصّہ مخصوص کر دو۔ اپنی کسی بھی مصروفیت کی وجہ سے انھیں بھلا نہ بیٹھنا کیونکہ ان کے حقوق کی طرف سے غفلت برتنے پر خدا کوئی بھی عذر قبول نہ کرے گا۔ ان معاملات کو خود اپنے معاملات سے کم اہم ہرگز نہ سمجھنا۔ ان غریب لوگوں کے لیے ایسا انتظام کر دو کہ قیامت کے دن تم کو خدا کے سامنے کوئی عذر نہ پیش کرنا پڑے ...."

یہ ایک مختصر اقتباس ہے لیکن اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت پر غربا کی جو ذمّے داری ہے وہ دراصل خدا کی خاطر ہے لہٰذا اس سے بچنا ناممکن ہے، چنانچہ حکومت کے کارندوں کو غربا کے مفاد کی خاطر اس طرح سے کام کرنا چاہیے کہ جیسے وہ خود اپنے فائدے کے لیے کچھ کر رہے ہوں۔ ابتدائی دور میں اس مقصد کے لیے حکومت کی آمدنی سے رقم دستیاب ہوتی رہتی تھی، کیونکہ

ہر شخص کے لیے زکوٰۃ دینا لازمی تھا۔ جیسا کہ ہر ایک کو معلوم ہے گذشتہ صدیوں کے دوران ذمّے داری کا یہ احساس کم ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا آج تقریباً ساری زکوٰۃ رضاکارانہ طور پر ادا کی جاتی ہے۔ میں نے کہا ہے "تقریباً" کیونکہ ہمارے ملک میں قانون کے تحت مالی ٹیکس لیا جاتا ہے جو بہر حال غیر مسلم ممالک کی تقلید ہے۔ مالی ٹیکس دولت کی اس سطح سے شروع ہوتا ہے کہ جو عام لوگوں کے معیار سے بہت بلند ہوتی ہے۔ لہٰذا معاشرے کا ایک بہت بڑا طبقہ غربا کی امداد کے سلسلے میں بالکل آزاد رہ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مالی ٹیکس سے جو رقم وصول ہوتی ہے اسے غربا کے لیے متعین نہیں کیا جاتا۔

اس کے برعکس زکوٰۃ ایک ایسا ٹیکس ہے جو خصوصیت کے ساتھ غربا کے لیے وصول کیا جاتا ہے اور جس کی ادائی کے لیے ہر مسلمان کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ اسے باقاعدہ خیرات کی طرح برابر دیتا رہے۔ اس کی ادائی ہر اس شخص پر لازم ہے جس کے پاس اس کی جائز ضرورت سے زائد دولت ہو اور اس کا اطلاق اس مال و دولت پر بھی ہے جو اصل سرمایہ سے زائد ہو۔ نظریاتی اعتبار سے جس شخص کے پاس تجویز کردہ رقم کی قلیل ترین مقدار فالتو بچتی ہو اسے بھی غریبوں کی امداد کے لیے ڈھائی فی صد کے حساب سے دینا چاہیے بشرطیکہ وہ سچا مسلمان ہو۔

۱ اس طرح سے زکوٰۃ نہایت واضح طور پر ایک ایسا معاشی اصول ہے جو دولت کو بالائی سطح کے لوگوں کے پاس جمع ہونے سے روکتا ہے اور نچلے طبقات کے لوگوں کی قوت اور سعی کو برباد ہونے سے بچاتا ہے۔ زکوٰۃ میں مجھے وہی اصول کارفرما نظر آتا ہے جو کہ زمین پر حیات بخش پانی کی تقسیم کے سلسلے میں عمل پیرا ہے۔ ہر مقام پر جہاں پانی ہوتا ہے وہاں سے اور خود زمین پر سے بھی جہاں استعمال کرنے کے بعد پانی بچ جاتا ہے، یہ قیمتی عنصر سورج کی شدید گرمی کے باعث بالائی فضا میں پہنچ جاتا ہے اور بادلوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو ہواؤں سے اس طرح منتشر ہو جاتے ہیں کہ مناسب موسموں میں ان علاقوں پر چھا جاتے ہیں جہاں ہر قسم کی زندگی کی بحالی اور تسلسل کے لیے ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ دولت کے ہر نظم و نسق کے لیے روپیہ اور مال کی حیثیت روحِ رواں کی سی ہے۔ لیکن تجربے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ان چیزوں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ نچلے طبقات تک پہنچ سکیں۔ لہٰذا ہر باضابطہ معاشی نظام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے اصول اور قوانین بنائے جائیں جو اس رجحان کا مقابلہ کر سکیں۔ زکوٰۃ کا قانون غالباً اس قسم کا پہلا قانون ہے۔ میرے خیال میں بڑے افسوس کی بات ہے کہ صدیوں کے معاشی ارتقا کے دوران اسے عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو یہ بذاتِ خود دنیا کی ہر قوم کے لوگوں میں معاشی وسائل کی مساوی تقسیم کا ذریعہ ثابت ہوتا۔ اور اس طرح سے

مادّی دنیا میں تمام طبقات کی صحت مند متحدّہ سعی کا ضامن ہوتا۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ آیا پاکستان میں زکوٰۃ کی وصولیابی کے لیے کوئی عملی صورت اختیار کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصول کو برقرار رکھتے ہوئے نظام کو از سرِ نو مرتب کرنا ہوگا۔

تقریباً چار سال کا عرصہ ہوا میں نے پشاور میں روٹیری کانفرنس کی تقریر میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ذاتی عائد کردہ زکوٰۃ کی رقم میں سے جتنا حصہ انسان خود تقسیم نہ کر سکے وہ کسی سرکاری ادارے میں جمع کرا دیا کرے۔ میں اس بات سے بے حد متاثر ہوا ہوں کہ پاکستان میں خیرات دینے کا رجحان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایک واحد نمایاں مثال یہ ہے کہ داتا گنج بخشؒ کے مزار پر ہر سال پندرہ لاکھ روپے کے عطیات ایسے وصول ہوتے ہیں جس کے دینے والے اپنا نام ظاہر نہیں کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے لوگ مستحق اشخاص میں زکوٰۃ تقسیم کرتے رہتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اس طرح کی انفرادی کوششوں میں منظم اداروں کے ذریعہ سے اضافہ کرنے کی بھی شدید ضرورت ہے تاکہ ان غریب لوگوں کی مدد ہو سکے جو ذریعہ معاش نہ ہونے کی وجہ سے انتہائی تنگی و ترشی میں بسر کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو لاعلاج امراض کی وجہ سے مجبور ہو گئے ہیں یا جو ضعیف و ناتواں ہیں اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے لوگ بھی ہیں جن تک عطیات دینے والوں کے لیے پہنچنا دشوار ہے۔

مَیں نے جو خیال پیش کیا تھا وہ یہ تھا کہ حکومت ہر سال محرّم اور رمضان کے مہینوں میں زکوٰۃ بانڈ جاری کیا کرے جنھیں لوگ اپنی ذاتی عائد کردہ زکوٰۃ کے اس باقی ماندہ حصّے سے خرید لیا کریں جس کو وہ خود مناسب طریقے پر تقسیم کرنے سے قاصر رہ گئے ہیں۔ یہ تمام رقم زکوٰۃ فنڈ میں جمع ہو جائے گی۔ حکومت کی ذمّے داری کو قائم رکھنے کے لیے بانڈ کی شرح منافع مقرر کر دی جائے جو فنڈ میں جمع ہوتی رہے۔ اسی بانڈ سے انکم ٹیکس بھی کاٹا جا سکتا ہے اور چند پابندیوں کے ساتھ اسی میں سے مالی ٹیکس بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔

اس طریقۂ کار کے دو پہلو ہیں: ایک تو یہ کہ لوگ اپنے فالتو مال و دولت سے اپنے غریب بھائیوں کی مدد کر کے اپنا مذہبی فریضہ ادا کر سکتے ہیں اور دوسرے یہ کہ اس میں اشتراکیت بھی اس حد تک شامل ہے کہ سرکاری حکّام اس اجتماعی سعی کی نگرانی بھی کر سکتے ہیں۔ درحقیقت زکوٰۃ کے اصول کا یہ لازمی عنصر ہے اور معاشرے کی روز افزوں پیچیدگی کے پیشِ نظر ناگزیر بھی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس سے ذاتی فیض رسانی کی انفرادی عملی آزادی بھی برقرار رہتی ہے اور یہی زکوٰۃ کے ادارے کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس سے اس آزادی کو تقویت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ آئینی ذرائع حاصل ہو جاتے ہیں اور سرکاری ذمّے داری کا سہارا بھی مل جاتا

ہے۔ اس طرح سے ہر شخص کی رضا کارانہ امداد صحیح منزل تک پہنچ سکتی ہے اور وہ منزل یہی ہے کہ ہر حاجت مند کو زندگی بسر کرنے کے لیے جن ذرائع کی ضرورت ہے وہ اسے حتمی طور پر میسر آسکیں۔ جس وقت تک باقاعدہ ادارے نہ ہوں گے اس وقت تک اس بات کی ضمانت نہیں دی جاسکے گی۔

میں نے جس ادارے کی تجویز پیش کی تھی وہ تھا ایک مرکزی زکوٰۃ بورڈ جس کے سربراہ نائب صدر پاکستان ہوں، اور وہ ملک کے ممتاز اشخاص پر مشتمل ہو۔ ان لوگوں میں پاکستان کے آڈیٹر جنرل بھی ہوں اور دوسرے ممتاز حساب داں بھی ہوں تاکہ ذمہ داری کے بارے میں اطمینان رہے۔ جواب دہی ایک ایسی چیز ہے جسے خیرات کی رقم کے انتظام کے سلسلے میں دنیا کے کسی ملک میں نمایاں مقام نہیں دیا جاتا۔ لیکن زکوٰۃ کی رقم جو کہ ایک مذہبی مقصد کی خاطر دی جاتی ہے اس کے لیے جواب دہی نہایت ضروری ہے۔ میری تجویز کے مطابق صوبائی بورڈ بھی ہونا چاہیئے۔ میں نے یہ بھی تجویز پیش کی تھی کہ انتظامی خرچ کم سے کم رہنا چاہیئے۔ اس کے لیے یہ کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ محکمۂ مال اور مقامی سرکاری حکام کو استعمال کیا جائے کیونکہ یہ لوگ عوام سے براہ راست رابطہ رکھتے ہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ نہایت اعلیٰ درجے کے اسپتال کھولے جائیں یا شاندار عمارتیں تعمیر کی جائیں یا اسی طرح کے دوسرے سازوسامان فراہم کیے جائیں جو عام طور سے سرکاری اداروں کے ساتھ شامل ہوتے ہیں مثلاً بڑی بڑی موٹریں، مفت کے ٹیلے فون وغیرہ۔ اسی طرح فالتو بھتے سے بھی گریز کرنا چاہیئے۔ معاشرے کے ہر طبقے کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کام میں شریک کرنا چاہیئے۔ یہ صرف اس لیے نہیں کہ ان سے رقم وصول کی جائے بلکہ یہ کہ وہ امدادی کاموں میں شریک ہوں اور یہ سارا کام ایک سماجی ذمے داری کی شکل اختیار کرلے۔ چنانچہ رضاکار اداروں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا چاہیئے اور انھیں اس مقصد کے لیے منظم کرنا چاہیے۔ زکوٰۃ بورڈ ہر سال مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے سامنے اپنی اپنی رپورٹ پیش کرتے رہیں گے تاکہ انھیں اپنے کام کی عوامی منظوری حاصل ہوتی رہے۔ ان بورڈوں کے کام کا ثبوت ان کی کارکردگی سے ملے گا۔ جو لوگ امدادی رقم دیں گے اُن میں مزید اعتماد پیدا کرنے کے لیے یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ عطیات دینے والے خود یہ بتائیں کہ اُن کی دی ہوئی رقم کس علاقے میں خرچ کی جائے۔ اس بات پر زور دیا جائے گا کہ ادارہ صرف ان ہی لوگوں کی امداد کر کے مطمئن نہ ہو جائے جو امداد کے طالب ہوں بلکہ خود اُن لوگوں کو تلاش کرے جو حاجت مند اور مجبور ہوں اور ان کی مدد کرے۔ گاؤں میں پٹواریوں سے اور شہروں میں وارڈ کے سرکاری ملازمین سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ حاجت مند اشخاص کے بارے میں تفصیلی طور سے بتاسکیں گے۔ اس کام میں لوگوں کا اعتماد

جتنا جتنا بڑھتا جائے گا اتنا ہی امداد میں اضافہ ہوتا جائے گا، لیکن اگر حالات اس کے برعکس ہوئے تو پھر امداد میں کمی ہوتی جائے گی اور یہ منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔

میں نے جو منصوبہ پیش کیا تھا اُس کی خاص خاص باتیں یہ ہیں۔ اس پر اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے اور واقعی سنگین اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتراض کی بنیاد زیادہ تر اس رواج پر ہو سکتی ہے کہ جو اس سلسلے میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ میں ان اعتراضات کی اہمیت کو بخوبی سمجھتا ہوں کیونکہ اسلامی تصورات میں روایت اور ماضی کے رواج کو بڑا دخل ہے، لیکن میری گذارش ہے کہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تاکہ اصول سے قطع نظر کیے بغیر پاکستان میں زکوٰۃ کو صحیح طور سے رائج کیا جا سکے۔ غربت کا مسئلہ صدیوں سے التوا میں پڑا ہوا ہے اسے اب پس پشت نہ دھکیلنا چاہیئے۔

مسلم ریاستوں میں غربت کے مسئلے کو شروع ہی سے بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے الفاظ آج بھی ہر حکمراں کے لیے ایک تنبیہ ہیں۔

> "۔۔۔ اپنی کسی بھی مصروفیت کی وجہ سے غریبوں کو نہ بھلا بیٹھنا کیونکہ اُن کے حقوق کی طرف سے غفلت برتنے پر خدا کوئی بھی عذر قبول نہ کرے گا۔ ان غریب لوگوں کے لیے ایسا انتظام کرو کہ قیامت کے دن تم کو خدا کے سامنے کوئی عذر نہ پیش کرنا پڑے۔۔۔"

مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد غریبوں کے لئے فکر مند رہتی ہے اور یہ محض برادرانہ ہمدردی اور احترام کی وجہ سے ہے۔ اس میں بڑائی یا سرپرستی کی کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اکثریت زکوٰۃ کی صورت میں غریبوں کی امداد کرنے کے لئے تیار ہے۔ لہذا زکوٰۃ ہی کے ذریعہ سے وسائل کا خاطر خواہ تبادلہ کیا جا سکتا ہے اور یہ صرف اس لیے نہیں کہ غریبوں کی امداد کی جا سکتی ہے بلکہ یہ کہ عام معاشیاتی نظام بھی بہتر ہو سکتا ہے۔ زکوٰۃ کی بنیاد دراصل اس انسانی بھائی چارے کے احترام پر قائم ہے جس کا وجود ہر انسانی برادری کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ زکوٰۃ کے ذریعہ سے ایک نہایت اعلیٰ مذہبی فرض ادا ہوتا ہے۔ لہذا بلا شبہ اس کی بدولت قوم پر اللہ کی رحمتیں نازل ہو سکتی ہیں۔ (انگریزی سے ترجمہ)



جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن ، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، حکیم محمد سعید



صدرِ مجلس:
جسٹس
ایس۔ اے۔ رحمٰن
اور
حکیم محمد سعید



سامعین

احترامِ صحافت

کلماتِ ابتدائیہ	:	حکیم محمد سعید
مقالہ	:	جناب محترم ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
کلماتِ صدارت	:	جناب محترم جسٹس ایس۔ اے رحمان

شامِ ہمدرد، لاہور

۳۰۔اگست ۱۹۷۲ء

حکیم محمدؐ سعید

سلسلۂ تقاریر" احترام" میں احترامِ صحافت کا موضوع اس اعتبار سے اہم ترین ہے کہ اِس دَور میں صحافت ہی وہ وسیع اور موثر ذریعۂ ابلاغ ہے جو احترام کی تعلیم و تبلیغ کا کردار ادا کرتا ہے۔ صحافت موجودہ معاشرے کا ایک ایسا جزو بن گئی ہے جس کا اثر محسوس اور غیر محسوس دونوں طریقوں سے اِنسان کی زندگی پر پڑ رہا ہے۔ عائلی زندگی ہو یا کاروباری، سیاسی نظام ہو یا معاشی، تعلیم ہو یا تجارت، صنعت ہو یا زراعت، صحت ہو یا اخلاق، انتظامی امور ہوں یا امنِ عامہ، ملک کے داخلی معاملات ہوں یا بین الاقوامی تعلقات، معاشرتی مسائل ہوں یا تہذیبی ادارے، لسانی تعبیرات ہوں یا ادبی تنازعے، سائنسی تحقیقات ہوں یا علمی نظریات، زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی گوشہ اور کوئی پہلو دائرۂ صحافت سے باہر نہیں، اور صحافت کے اثر سے خالی نہیں۔ آج کی صحافت انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے کی ترجمان ہے۔ تعلیم و تبلیغ کے دوسرے ذرائع میں اتنی وسعت نہیں ہے جتنی وسعت صحافت کی ہمہ گیری نے اُس کو دی ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں خواندگی کے تناسب میں پہلے کے مقابلے میں اضافہ ہو جانے کے باوجود ابھی تک اخبارات کا مطالعہ آبادی کی اکثریت کے بس سے باہر ہے اور اخبار بینی آبادی کی اقلیت ہی تک محدود ہے، اس کے باوجود اخبارات کا اثر ناخواندہ افراد تک بھی پہنچتا جا رہا ہے اور اس طرح صحافت کے دائرۂ اثر میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اسی لیے صحافت کی اہمیت میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے۔ جمہوری معاشروں میں صحافت کی قدر و وقعت مُسلّم ہے، لیکن یہ بات اُسی وقت صحیح ہے کہ جب صحافت آزاد ہو، آزاد صحافت پر ہی صحیح معنیٰ میں صحافت کی تعریف صادق آتی ہے۔ ورنہ مطبوعہ نیوز پرنٹ میں اور اخبار میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ آزادئ صحافت کی اصطلاح بھی میرے خیال میں بہت وسعت رکھتی ہے۔ آزادئ صحافت کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ حکومتِ وقت کے لیے اکثر و بیشتر یہ آزادی خوش گوار نہیں ہوتی، کیونکہ ایسی خوش گواری کے لیے دیانت اور امانت شرطِ لازمی ہے۔ اسی طرح عوام کے پسندیدہ نظریات سے دیانت دارانہ انحراف بھی اس راہ کا ایک سنگِ گراں ہے۔ آج کل کہ جب صحافت ایک مشن کے علاوہ ایک صنعت بھی بن گئی ہے، اشتہارات بھی صحافت کی آزادی میں مُخِل

ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِن موانع کے علاوہ صحافیوں کے لیے دوچار اور بھی سخت مقام آتے ہیں، جن میں ذاتی دوستی اور دشمنی، جماعتی رجحانات اور سیاسی وابستگی شامل ہیں، لیکن آزاد اور دیانت دار صحافت اِن تمام رکاوٹوں کو عبور کرلیتی ہے اور صرف اسی لیے جمہوریت کا چوتھا ستون کہلاتی ہے۔ جب صحافت آزاد ہو اور ہر شخص اس کو پڑھنے کے قابل ہو تو سمجھ لیجیے کہ سب کچھ محفوظ ہے۔ کوئی حکومت احتساب کے بغیر نہیں رہنی چاہیے۔ اور جہاں صحافت آزاد ہے وہاں حکومت پر احتساب موجود ہے۔

صحافت درحقیقت ایک ایسا آئینہ ہے جو حکومت اور ملت کے ہر فرد کو اُس کا اصلی چہرہ دکھاتا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بعض لوگوں کو خود اپنی شکل پسند نہیں ہوتی اور وہ مصنوعی وجاہت یا میک اپ کو زیادہ مرغوب رکھتے ہیں، اس لیے اپنی اصلی شکل دیکھ کر آئینے سے برہم ہوجاتے ہیں اور اُس کو توڑ دینا چاہتے ہیں۔

صحافی کے لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ قوم کا ترجمان بھی ہے اور نقاد بھی، معلم بھی ہے اور مصلح بھی، رہنما بھی ہے اور محتسب بھی۔ اسی لیے صحافی قابلِ احترام ہے۔ معاشرے میں صحافی کا یہ مقام اور یہ احترام ہی اُس کی ذمے داریوں میں اضافہ کرتا ہے اور ان ذمے داریوں کی نزاکت صحافت کو اور زیادہ محترم بناتی ہے۔

آج کے مہمان مقرر جنابِ محترم ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ہم سب کے جانے پہچانے صحافی اور معلم ہیں۔ صحافت سے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں پر روشنی ڈالنے کے لیے ڈاکٹر صاحب موزوں ترین شخصیت ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے آج شامِ ہمدرد میں احترامِ صحافت جیسے اہم موضوع پر خطاب منظور فرمایا۔

جنابِ محترم جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان صاحب نے از راہِ کرم اس مجلس کی صدارت قبول فرماکر ہم سب کو شکریہ کا موقع عطا فرمایا ہے۔ اور حسبِ معمول ہم پر کرم فرمایا ہے۔ ان کی عنایات ہماری ہمت افزائی کا باعث ہیں۔

جناب جسٹس ایس۔ اے رحمان (سابق چیف جسٹس آف پاکستان) پاکستان کی تعمیری سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ان کے اعلا علمی افکار، قدرتِ کلام و قلم، تعمیرِ ملک و ملت کی شدید لگن اور تڑپ، انتھک محنت نے قومی رجحانات میں صحت راہی پیدا کی ہے۔

جناب محترم ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

احترامِ صحافت کی روایت صحافت کے آغاز سے چلی آتی ہے۔ اُس زمانے سے کہ جب طباعت نے جنم نہیں لیا تھا، اور قلمی اخبارات کا دَور دَورہ تھا، ان اخبارات کے اجرا کا اہتمام حاکموں نے کیا جن کی آرزو تھی کہ سلطنت کے طول و عرض میں آباد عوام کے جذبات اور احساسات سے آگاہ رہیں اور ان کی شکایات معلوم کر کے ازالے کی تدبیر کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے جابجا نامہ نگار مقرر کیے اور اس بات کا محکم بندوبست کیا کہ نامہ نگاروں کے مُرتّبہ خبرنامے کم از کم وقت میں اُن کے پاس پہنچتے رہیں۔ اسلام سے پہلے کے ایران میں ان نامہ نگاروں کو وقائع نگار بھی کہا جاتا تھا اور روزنامہ نویس بھی، اور اخبار کو روزنامہ کہا جاتا تھا۔ یہ اصطلاحات ایران میں اب بھی رائج ہیں۔ دنیائے عرب میں نامہ نگاروں کو صاحب البرید والاخبار کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور خبرنامے کے لیے اخبار کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جو اب بھی رائج ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ اور سلطنت مغلیہ میں وقائع نگار اور اخبار نویس کی اصطلاحات رائج تھیں جو آج بھی موجود ہیں۔

صحافت کو ابتدا سے جو اہمیت دی جاتی رہی ہے اُس کا اندازہ اس بات سے کیجیے گا کہ قبل از اسلام کے ایرانی حکمران اخبار نویسوں کو شہنشاہ کے چشم و گوش قرار دیتے تھے۔ یہی کیفیت برِّعظیم میں تھی، اور سچ پوچھیے تو یہ روایت اب تک چلی آتی ہے، کیونکہ ریڈیو اور ٹیلے وژن کی ایجاد کے باوجود آج بھی دنیا بھر کی حکومتیں اخبارات ہی کو رائے عامہ معلوم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیتی ہیں اور انھی کی دی ہوئی خبروں اور تبصروں کی روشنی میں اپنی پالیسیاں بناتی ہیں۔

آج کی صحافت کو اس بات پر بڑا ناز ہے کہ اسے قصرِ حکومت کا چوتھا ستون مانا جاتا ہے۔ یہ روایت برطانیہ سے چلی تھی جہاں پہلے حکومت کے دو ستون ہوتے تھے: ایک کلیسا، دوسرا دار الامرا۔ پھر دار العوام وجود میں آیا تو تین ستون ہو گئے، اور جب صحافت نے نشو و نما پا کر اپنی قوت ثابت کر دکھائی تو اُسے چوتھا ستون قرار دیا گیا۔ یہ اصطلاح ڈیڑھ سو سال پرانی ہے، لیکن اگر اسلامی تاریخ پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ چوتھے ستون کا تصوّر کم و بیش تیرہ سو سال پرانا ہے۔ چنانچہ مشہور مسلمان مورّخ طبری خلافتِ عباسیہ کے حکمران المنصور سے یہ بیان

منسوب کرتا ہے کہ حکومت کے چار نہایت اہم عناصر ہوتے ہیں۔ اوّل: قاضی جو اپنے فرائض کی کارروائی میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ دوسرا: محتسب، جو کمزور کی پشت پناہی کرتا ہے۔ تیسرا: افسرِ خراج، جو دیانت کو شعار بناتا ہے اور ظلم سے نفرت کرتا ہے اور چوتھا: صاحب البرید، جو واقعات کی غیر جانب دارانہ اور صحیح تصویر پیش کرتا ہے اور حقائق کو مسخ کرنے سے گریزاں رہتا ہے۔

احترامِ صحافت کا ایک اور روایتی پہلو یہ ہے کہ وقائع نگاری پر بہت اعلا کردار کے افراد مامور کیے جاتے تھے۔ قبل از اسلام ایران سے تعلق رکھنے والے ایک قدیم کتابچے "نامۂ تنسر" میں لکھا گیا ہے کہ وقائع نگاری کے نظام سے امرا پریشان تھے اور لوگ خوف زدہ، لیکن حکومت کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ وہی شخص شہنشاہ کے "چشم و گوش" کا مقام حاصل کرسکتا ہے جو دیانت دار ہو، نیک ہو، مذہب کا پابند ہو، باخبر ہو اور صداقت شعار ہو۔ ایسے لوگ بادشاہ کو نہ غلط اطلاعات فراہم کرسکتے ہیں نہ نیم پخت معلومات دے سکتے ہیں۔ اس لیے معصوم لوگوں کے لیے خوف کا کوئی مقام نہیں۔ خلافتِ عباسیہ کے دَور میں اس شعبے کو مکان کے دریچوں سے تشبیہ دی جاتی تھی جن کے ذریعے سے روشنی اندر آتی ہے۔ علم السیاست پر لکھنے والے قدیم مسلمان مصنفین کی رائے یہ تھی کہ برید کے فرائض سنبھالنا اور اُن سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا کارِ ثواب ہے۔ چنانچہ ایسے عہدوں پر مسلّمہ قابلیت اور کردار کے حامل انسان مقرر کیے جاتے تھے۔ اُن سے توقع کی جاتی تھی کہ تمام معلومات کی خوب چھان بین کریں اور صرف صحیح اور مصدقہ باتیں قلم بند کریں۔ اس عہدے کے لیے اچھی تنخواہیں دی جاتی تھیں تاکہ رشوت کی گنجائش پیدا نہ ہو۔

خلافتِ عباسیہ کے نظم و نسق میں صاحب البرید والاخبار کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ مرکزی حکومت کے نو اہم ترین عمّال میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے ماتحت ہر صوبے میں ایک صاحب البرید والاخبار مقرر تھا۔ اُس کی حیثیت اتنی بلند تھی کہ وہ صوبے کے گورنر سے آزاد تھا اور اُسے خلیفہ تک براہِ راست رسائی حاصل تھی اور اُس کی فراہم کردہ معلومات پر فوری کارروائی ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے دو مثالیں موجود ہیں: المنصور کو اطلاع ملی کہ فلاں علاقے کا گورنر امورِ مملکت سے زیادہ شکار پر توجہ دیتا ہے تو اُس نے گورنر کو برطرف کردیا۔ اسی طرح المتوکل کو یہ خبر بھیجی گئی کہ بغداد کا گورنر فرائضِ منصبی سے غافل ہے اور شب و روز حسین و جمیل کنیز کے ساتھ دل بہلاتا ہے۔ اس پر المتوکل نے گورنر کی برطرفی کے احکام صادر کردیے۔

برِعظیم میں سلاطینِ دہلی اور سلاطینِ مغلیہ کے ادوار میں وقائع نگاری کا دائرہ بہت وسیع

ہوگیا۔ خبروں کی صحت کا تیقن کرنے کے لیے اخبار نویسوں کے پہلو بہ پہلو خفیہ نویس بھی مقرر کیے گئے تاکہ دو مختلف ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کا موازنہ کرکے صحیح حالات معلوم کیے جاسکیں۔ غلط قسم کے اخبار نویسوں کا کیا حشر ہوتا تھا؟ اس سلسلے میں دو مثالیں ملاحظہ فرمایئے: بلبن نے بدایوں کے وقائع نگار کو پھانسی دے کر اس کی نعش شہر کے دروازے پر لٹکا دی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس نے مقامی حاکم کی ایک دھاندلی کی پردہ پوشی کی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے پوتے شہزادہ محمد معزالدین نے ایک اخبار نویس کے بارے میں سفارش کی کہ اسے ترقی دے دی جائے۔ اورنگ زیب نے اپنے وزیر اسد خاں کے نام خط لکھا کہ شہزادے کی سفارش قبول کرلی جائے، اخبار نویس کو ترقی دے دی جائے، لیکن اس کے بعد اسے برطرف کردیا جائے تاکہ اسے معلوم ہو کہ سفارش اُس کے منصب سے گری ہوئی بات ہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے شہزادے کے نام ایک مکتوب میں لکھا کہ اچھے بیٹے اخبار نویسوں کی سفارش نہیں کیا کرتے۔ ہم نے تمہاری سفارش قبول کرلی، اُسے ترقی دے دی لیکن اس کے بعد برطرف کردیا۔ آئندہ ایسی حرکت کا ارتکاب نہ کرنا۔ دورِ مغلیہ نے صحافت کو ایک نیا روپ بھی دیا۔ یہ تاریخ نگاری کا روپ تھا۔ دربار میں شاہی وقائع نگاروں کی ایک ٹولی قلمی اخبارات کو نئے سرے سے ترتیب دیتی تھی تاکہ یہ اخبار مورخین کے لیے بنیادی ماخذ کا کام دیں۔ اُس دور میں جتنی تاریخیں لکھی گئیں اُن کی بنیاد انہی اخبارات پر قائم ہے، بلکہ "تزکِ جہانگیری" پر نظر ڈالیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا غالب حصہ اخبار نویسوں کی فراہم کردہ معلومات پر مشتمل ہے۔ اور یہ حقیقت تو شاید کسی سے پوشیدہ نہ ہو کہ اس صدی میں "اورنگ زیب عالمگیر" پر جادو ناتھ سرکار نے جو ضخیم کتاب لکھی اس کا مواد زیادہ تر اُس دَور کے قلمی اخبارات سے اخذ کیا گیا ہے۔

جب حکومت نااہلوں کے ہاتھ آئی تو خبر رسانی کا نظام بھی کمزور ہونے لگا۔ حکومت نے اچھے اخبار نویسوں کی قدر نہ پہچانی اور اس شعبے کو ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جو قابلیت اور دیانت دونوں سے محروم تھے، اور دولت کے لالچ میں مقامی حاکموں کے مظالم اور دھاندلیوں کی پردہ پوشی کرتے تھے۔ گویا وہ دریچے ایک ایک کرکے بند ہونے لگے جن سے روشنی کی کرنیں چھن چھن کر اندر آتی تھیں۔ ایسے میں قصرِ حکومت اور دربارِ معلیٰ پر گھٹا ٹوپ تاریکی مسلط ہوگئی اور جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے، دماغوں میں گھپ اندھیرا ہو، دلوں پر مہریں ثبت ہوچکی ہوں اور آنکھوں پر پردے پڑے ہوں وہاں اقتدار کو ثبات کیسے مل سکتا تھا۔ پس خبر رسانی کے نظام کے ساتھ ساتھ وہ حکومتیں بھی نابود ہوگئیں جو اس کے سہارے زندہ تھیں۔

اِس دوران میں طباعت ایجاد ہوچکی تھی، جو صحافت میں انقلاب کی پیام بر ثابت ہوئی، کیونکہ

جو چیز محلات شاہی، دربارِ معلّیٰ اور انتظامیہ کے دائروں میں محدود تھی وہ کھلی فضاؤں میں سانس لینے لگی۔ وہ پہلے عوام اور حکومت کے درمیان یک طرفہ رابطے کا ذریعہ تھی، اب دو طرفہ رابطے کا ذریعہ بن گئی۔ پہلے صرف خبریں فراہم کرتی تھی اب خبروں کی تاویل اور تشریح بھی کرنے لگی۔ پہلے وہ رائے عامہ کی عکاس تو تھی لیکن صرف حاکموں کی اطلاع کے لیے، اب سرِعام رائے عامہ کی عکاسی کرنے لگی۔ اور نہ صرف یہ بلکہ رائے عامہ کی رہنمائی کے فرائض بھی ادا کرنے لگی۔ صحافت کے اس نئے روپ نے نہ صرف اُس کے کھوئے ہوئے احترام کو بحال کر دیا بلکہ اُس کے وقار کو دوچند کر دیا۔ جب حاکموں نے دیکھا کہ اُن کی خرابیوں کے پردے چاک ہوتے ہیں اور عوام اپنے حقوق مانگنے لگے ہیں تو وہ پریشان ہو گئے۔ انھوں نے صحافت کو پابند کرنا چاہا۔ اور یہاں سے آزادیٔ صحافت کا وہ مسئلہ اٹھا جس نے دنیا کے بہت سے خطوں میں صحافت کو حکومت سے متصادم کر رکھا ہے۔ احترامِ صحافت کو برقرار رکھنے کے لیے آزادیٔ صحافت ایک بنیادی ضرورت ہے اس لیے آزادیٔ صحافت کی جدوجہد حقیقت میں احترامِ صحافت کو برقرار رکھنے کی جدوجہد ہے۔

سوال یہ ہے کہ آزادیٔ صحافت کا مطلب کیا ہے۔ ہمارے ہاں عام تصور یہ ہے کہ حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ہو تو صحافت آزاد ہے، اور اگر اجازت نہیں تو صحافت پابند ہے۔ بہرحال یہ آزادیٔ صحافت کے مختلف اجزا میں صرف ایک جزو ہے اور جزو کو کُل بنا دینا درست نہیں۔ تکنیکی اصطلاحات اور بھاری بھرکم الفاظ سے بالاتر رہتے ہوئے دیکھا جائے تو آزادیٔ صحافت کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو خبریں فراہم کرنے کی آزادی ہو، دوسرے اُنھیں چھاپنے اور نشر کرنے کی آزادی ہو۔ اور اظہارِ رائے کی آزادی میں ہر ایسے قدم پر نکتہ چینی شامل ہے جو کسی ہیئتِ حاکمہ یا معاشرے کے کسی طبقے یا شعبے نے اُٹھایا ہو۔ مثالی آزادیٔ صحافت صرف ایسے مثالی معاشرے میں ممکن ہے جو مساوات کے اصول پر مبنی ہو اور جس میں مخصوص مفادات کے پنپنے کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اس کا تقاضا ہے کہ اخبارات کی ملکیت نہ حکومت کے ہاتھ میں ہو نہ سرمایہ دار افراد کے ہاتھ میں بلکہ ملکیت کے حصص اس انداز سے معاشرے کے مختلف عناصر میں تقسیم ہوں کہ کوئی عنصر غالب نہ آ سکے۔ اور جہاں تک خبر رساں اداروں کا تعلق ہے اُن کی ملکیت اور کنٹرول اخبارات کے ہاتھ میں ہو۔ مثالی آزادیٔ صحافت کا ایک اور بڑا تقاضا یہ ہے کہ صحافت کو کنٹرول کرنے کے لیے کوئی خاص قانون نافذ نہ کیا جائے، کیونکہ عام ملکی قوانین صحافی اور غیر صحافی، سب پر حاوی ہوتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آزادی ہمیشہ ذمّے داریوں سے عبارت ہوتی ہے اور مطلق یا مادر

پدر آزادی کا دنیا میں کہیں بھی وجود نہیں ہے۔ یہی حال آزادیٔ صحافت کا ہے۔ ترقی یافتہ مغربی دنیا میں بھی جنگ یا جنگ کے خطرے یا ہنگامی حالات کی صورت میں آزادیٔ صحافت میں کمی کر دی جاتی ہے اور سنسر شپ کو بھی جائز سمجھا جاتا ہے۔ جب خارجہ پالیسی میں کوئی نازک مرحلہ در پیش ہو تو اخبارات کو خاموشی کے ساتھ "پریس ایڈوائس" دے دی جاتی ہے۔ اسے برطانیہ میں "ڈی۔ نوٹس" کہا جاتا ہے۔ ایک خاص حد کے اندر رہتے ہوئے بعض خبروں کو قومی مفاد کے سانچے میں ڈھالنے کی روایت موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہر ملک میں ایسے قوانین موجود ہیں جن کی رو سے کسی کو اجازت نہیں کہ وہ مملکت کے راز افشا کرے، لوگوں کو تشدد کی انگیخت کرے، انھیں اشتعال دلائے کہ وہ طاقت کے ذریعہ سے نظامِ حکومت کو بدل ڈالیں۔ توہینِ عدالت کا مرتکب ہو۔ یا ہتکِ عزت کے قانون کی خلاف ورزی کرے۔ بہرحال مہذب دنیا میں تادیبی کارروائی کا اختیار صرف عدلیہ کو حاصل ہے، انتظامیہ کو نہیں۔ اس کے ساتھ ہی صحافت سے کچھ اخلاقی ذمّے داریاں مخصوص ہیں۔ اُن کی تکمیل ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو انھیں دنیا بھر میں تسلیم ضرور کیا جاتا ہے۔ مثلاً صحتِ معلومات، صداقت، خلوص، خبروں میں غیر جانب داری، انصاف اور شائستگی۔

آزادیٔ صحافت کا جو تصوّر میں نے پیش کیا ہے یہ جمہوری دنیا کا تصوّر ہے۔ یعنی ایسے معاشروں کا جہاں ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کو زندہ رہنے اور متبادل قیادت پیش کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن ایک تہائی دنیا میں کمیونسٹ نظام قائم ہے اور وہاں آزادیٔ صحافت کا ایک مختلف تصوّر رائج ہے۔ اس تصوّر کا بانی لینن تھا۔ اُس نے اب سے نصف صدی پہلے اپنی کتاب "بورژوا جمہوریت اور پرولتاری آمریت" میں اس رائے کا اظہار کیا کہ جب تک بہترین چھاپے خانے اور کاغذ کے سب سے بڑے ذخائر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں آزادیٔ صحافت محض جھوٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرمایہ دار جسے آزادیٔ صحافت کہتے ہیں وہ حقیقت میں رائے عامہ کو توڑنے مروڑنے کے لیے دولت کے استعمال کی آزادی ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ بات اتنی غلط نہیں، کیونکہ آج برطانیہ، امریکا، فرانس، جرمنی اور دوسرے بہت سے مغربی ممالک میں صحافت صرف سرمایہ داروں کا کھیل ہے۔ ان ملکوں میں پچھلے رُبع صدی سے اخبارات کی تعداد گھٹ رہی ہے، کیونکہ اخراجات کی زیادتی اور منافع کی کمی بلکہ بعض صورتوں میں خسارے کی وجہ سے بڑے اخبار یا تو بند ہو رہے ہیں یا ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے ہیں۔ برطانیہ میں پچھلے چالیس سال کے عرصے میں تین نئے قومی روزنامے جاری ہوئے جن میں صرف ایک باقی ہے، اور وہ بھی کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان، جو اپنے کارکنوں کی قربانی کے طفیل جاری ہے۔

کمیونسٹ ممالک نے اس صورتِ حالات کا یہ توڑ دریافت کیا ہے کہ ذرائع پیداوار کے پہلو بہ پہلو ذرائع

ابلاغ کو قومی ملکیت میں لے لیا ہے۔ چنانچہ وہاں تمام صحافی سرکاری ملازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خطوط بنام مدیر کے کالموں میں کمیونسٹ آئیڈیالوجی کے اندر رہتے ہوئے اختلاف رائے کی اجازت ہے، لیکن یہاں آکر آزادئ صحافت ختم ہوجاتی ہے، اور کمیونسٹ عقیدے میں تخصص رکھنے والوں کے نزدیک صحافت کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ صرف کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں اور اُس کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق مزدوروں کو منظم کرے اور کمیونسٹ معاشرے کے نشو و ارتقا میں مدد دے۔

کمیونسٹ دنیا اور مغربی دنیا کے درمیان ایک تیسری دنیا آباد ہے جسے آپ افریشیائی دنیا کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایسے ممالک کی دنیا ہے جو دوسری عالمی جنگ کے بعد آزاد ہوئے۔ یہ ایک بے چین اور مضطرب دنیا ہے۔ ایک طرف سامراجی اثرات موجود ہیں دوسری طرف سینکڑوں برس کے استحصال کی بدولت معاشی مسائل نہایت پیچیدہ ہیں۔ تیسرے جمہوریت کی جڑیں مضبوط نہیں، عوام کا سیاسی شعور ناپختہ ہے۔ چوتھے، بڑی طاقتوں کا دباؤ موجود ہے۔ اور پانچویں۔ یہ دنیا مضبوط بنیادوں سے عملاً محروم ہے۔ ان میں کہیں صحافت موجود ہی نہیں، کہیں گھٹنوں کے بل چل رہی ہے، کہیں غیر ملکی اثرات کے تابع ہے اور کہیں اچھی خاصی مضبوط بھی ہے۔ اس دنیا میں کہیں صحافت مکمل طور پر غلام ہے اور کہیں مختلف قسم کے جابرانہ قوانین کی شکار ہے۔ پاکستان اسی دنیا میں شامل ہے۔ افریشیائی دنیا ہو یا مغربی دنیا، ہر جگہ حکومتیں اس کوشش میں ہوتی ہیں کہ صحافت پر زیادہ سے زیادہ قدغنیں ڈال دیں، صحافت اس کوشش میں ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ آزاد رہے۔ جہاں دونوں کی ہمت جواب دے دیتی ہے وہاں دونوں کی کوشش میں ایک ٹھہراؤ کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ چونکہ پاکستان میں آمریت کا دور دورہ رہا ہے اس لیے یہاں جابرانہ قوانین کی کثرت ہے۔ جب پاکستان بنا تو پریس ایمرجنسی پاورز ایکٹ نافذ تھا۔ اُس کی رو سے انتظامیہ کسی اخبار سے قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت پر پانسو روپے سے دس ہزار روپے تک کی ضمانت طلب کرسکتی تھی اور دوبارہ ارتکاب جرم کی صورت میں پہلی ضمانت ضبط کرکے نئی ضمانت مانگ سکتی تھی، لیکن اس کا ایک تسلی بخش پہلو یہ تھا کہ اخبار انتظامیہ کے ایسے احکام کو ہائی کورٹ میں چیلنج کرسکتا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان سیکیورٹی ایکٹ نافذ ہوا، جس کی رُو سے انتظامیہ کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ دفاع، خارجہ امور اور ملکی سلامتی کے مفاد میں کسی اخبار کو ایک سال تک کے عرصے کے لیے بند کردے، کسی خاص مواد کی اشاعت ممنوع قرار دے، سنسر شپ عائد کرے، کوئی شمارہ ضبط کرے، ڈیکلریشن دینے سے انکار کردے اور کسی قابل اعتراض خبر کی اشاعت پر ایڈیٹر کو مجبور کرے کہ وہ معلومات کے مآخذ کا افشا کرے۔ اس کے بعد امن عامہ کا آرڈی ننس نافذ ہوا، جس کے ماتحت انتظامیہ کو اختیار دیا گیا کہ وہ امنِ عامہ کو نقصان پہنچانے والے اخباروں کو چھ مہینے کے لیے بند

بند کر دے۔ صدر ایوب کے دورِ حکومت میں جب مارشل لا اٹھا لیا گیا تو پریس اینڈ ایمرجنسی پاورز ایکٹ کا دائرہ وسیع تر کر کے اُسے قانونِ صحافت و مطبوعات کا روپ دیا گیا۔ اُس کے ماتحت انتظامیہ کو اختیار دیا گیا کہ وہ تیس ہزار روپے تک کی ضمانت طلب اور ضبط کر لے۔ کسی اخبار کے بارے میں اگر یہ شبہ ہو کہ وہ مشتبہ وسائل سے سرمایہ حاصل کر رہا ہے تو اُس کا انتظام خود سنبھال کر ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کر دے، اور کمیشن کی سفارش کی صورت میں اخبار کو بند کر دے اور اُس کے پریس پر قبضہ کر لے۔ اس قانون کا خطرناک ترین پہلو یہ ہے کہ اس کے حکم کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اپیل کے لیے ایک ٹربیونل کی گنجائش رکھی گئی ہے لیکن اس کی بناوٹ کا طریق کار غیر جانب دارانہ فیصلے کا ضامن نہیں۔

دورِ ایوبی میں صحافت کو پابند کرنے کے لیے کچھ اور قدم بھی اٹھائے گئے۔ مثلاً ملک کی سب سے بڑی خبر رساں ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کو صرف اس لیے سرکاری کنٹرول میں لے لیا گیا کہ وہ خسارے میں چل رہی تھی۔ ویسے وہ دن اور آج کا دن، اس کا خسارہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اسی دور میں "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" پر حکومت نے قبضہ کر لیا، اور وجہ یہ بتائی کہ ان اخباروں کو چلانے والے ادارے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کو غیر ملکی امداد ملتی ہے۔ بہر حال مطالبے کے باوجود یہ الزام ثابت کرنے کی کوشش نہ کی گئی۔ اس کے بعد حکومت کے کہنے پر صنعت کاروں نے نیشنل پریس ٹرسٹ قائم کیا جس نے "پاکستان ٹائمز"، "امروز"، "مشرق"، "انجام"، "مارننگ نیوز" (کراچی) اور "مارننگ نیوز" (ڈھاکہ) کو خرید لیا، اور ڈھاکے سے ایک نیا بنگالی روزنامہ "دائنک پاکستان" بھی جاری کیا۔ نیشنل پریس ٹرسٹ بظاہر آزاد اور خود مختار ادارہ تھا، بورڈ آف ٹرسٹیز میں اور مختلف اخباری اداروں کے بورڈز آف ڈائرکٹرز میں صنعت کاروں کے علاوہ ماہرینِ تعلیمات وغیرہ بھی شامل تھے، لیکن پسِ پردہ اسے حکومت کنٹرول کرتی تھی۔

صدر ایوب کے دورِ حکومت میں مدیرانِ جرائد کی انجمن اور حکومت کے درمیان ایک شریفانہ معاہدہ ہوا جس کی رُو سے طے پایا، کہ جو اخبار اس انجمن کے ضابطۂ اخلاق پر دستخط کر چکے ہیں اُن کے خلاف قانونِ صحافت و مطبوعات کے ماتحت کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔ اس انجمن کے چُنے ہوئے چیدہ مدیرانِ جرائد پر مشتمل ایک پریس کورٹ آف آنر بنائی گئی۔ تاکہ جو شکایات حکومت یا عوام کو اخبارات سے پیدا ہو جائیں اُن پر اپنی رائے کا اظہار کر سکے۔ اس کی صدارت پر ہائی کورٹ کا ایک ریٹائرڈ جج فائز تھا۔ کچھ دیر یہ انتظام ٹھیک چلا، لیکن ۱۹۶۸ء کی عوامی تحریک کے دوران میں صحافتی عدالت کا وجود ناپید ہو گیا۔ اس کے بعد صدر یحییٰ کے مارشل لا

کا دور دورہ ہوا۔ ایسے میں صحافت کو پابند کرنے کے لیے مارشل لا ریگولیشن بھی نافذ کیے گئے۔ اور حالیہ جنگ سے کچھ دن قبل ڈیفنس آف پاکستان رولز بھی نافذ کر دیے گئے جن کی وجہ سے رہی سہی آزادیٔ صحافت کا بھی صفایا ہو گیا۔ ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو ایک نئے دور کا آغاز ہوا، کیونکہ عنانِ اقتدار پاکستان پیپلز پارٹی کے قائد جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ آ گئی اس سے پہلے کہ اس دور کی داستان قلمبند کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پیپلز پارٹی کے منشور سے وہ اقتباس پیش کر دیا جائے جو آزادیٔ اظہار سے تعلق رکھتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

"فکر کو اظہار سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ضمیر کی آزادی اور فکر کی آزادی کا مطلب ہی یہ ہے کہ کوئی جو کچھ سوچتا ہے اور جن نظریات پر یقین رکھتا ہے اُسے اُن کے عام اظہار کی آزادی حاصل ہو، خواہ وہ جو کچھ کہتا ہے یا لکھتا ہے، وہ دوسروں کے عقائد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کی آزادی کا ذکر بے معنیٰ ہے اگر اس کے ساتھ ہی یہ اصرار بھی کیا جائے کہ صرف قابلِ قبول اور مسلّمہ عقائد ہی کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ رواداری کی بنیاد ہی اپنے سے مختلف آرا کو سننے کی آمادگی پر قائم ہے۔ تعصب، ایمان اور ذہانت، دونوں کی اہانت ہے۔

مسلمان قوموں کی تاریخ شاہد ہے کہ ان کی تہذیب کو اس لیے زوال آیا اور وہ اس لیے ذہنی بے مائگی تک پہنچی کہ اس پر کٹر اور اپنے سے مختلف ہر خیال کو مسترد کر دینے والی جنونی ذہنیت غالب آ گئی۔ پاکستان کے عوام میں اس قسم کی عدم رواداری ان حکومتوں کی جانب سے مسلّط کی گئی جو عوام کی ذہنی بہبود کی دشمن تھیں یا اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھیں۔ ہماری حکومتیں ہمیشہ جاہل اور متعصب لوگوں کی بلیک میل کے سامنے سر جھکانے پر آمادہ رہی ہیں۔ قوم کے ذہن پر اُن طبقاتی مفادات نے پٹیاں باندھ رکھی ہیں جو نہیں چاہتے کہ ہمارے عوام اپنے متعلق خود سوچیں۔ آمرانہ حکومتوں نے قوم کی آنکھوں پر جو پٹیاں باندھ رکھی ہیں انھیں کھول دیا جائے گا۔

"کسی کتاب کو محض اس لیے ضبط نہیں کیا جائے گا کہ اُس کے مندرجات کسی مذہب یا فرقے کے عقائد سے اختلاف رکھتے ہیں کتابوں کی درآمد کے معاملے میں نہایت فراخ دلی کی پالیسی اختیار کی جائے گی۔ صحیح خبروں پر سنسر شپ عائد کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ہمیں اپنے بارے میں خوش گوار چیزوں کے علاوہ ناخوش گوار حقائق سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیے

کہ ہمارے ذہن میں کبھی پختگی نہیں آئے گی اور ہمیں ابدالآباد تک سرپرستوں
کی ضرورت رہے گی۔"

یہی وہ اونچے خیالات تھے جن کی بنا پر صدر مملکت نے ۳ جنوری ۱۹۷۲ء کو کراچی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ "اخبارات پر جتنی پابندیاں اور جتنے کنٹرول عائد تھے وہ اُٹھا لیے گئے ہیں۔ اب صحافت مکمل طور پر آزاد ہے۔ صحافت آزاد ہے کہ جو چاہے کہے۔ صحافت آزاد ہے کہ جو چاہے لکھے" موصوف نے اُس وقت کے وزیر اطلاعات کو ہدایت کی کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ اخبارات جمہوری تصوّرات کے مطابق آزادی سے چلیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اخبارات سے اپیل کی کہ وہ حکومت کی غلطیوں پر درگذر سے کام لیں، کیونکہ یہ ایک نئی حکومت ہے۔

۱۳ جنوری کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے مطالبات کا تذکرہ کرتے ہوئے صدر مملکت نے لاہور میں اعلان کیا کہ صحافت سے تعلق رکھنے والے وہ تمام جابرانہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں گے جو ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے بعد نافذ ہوئے، اور جو قوانین اس سے پہلے موجود تھے اُن پر صحافیوں کے مطالبات کی روشنی میں غور کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ۱۹۶۳ء کے قانونِ صحافت و مطبوعات کو منسوخ کر دیا جائے گا اور پاکستان سیکیورٹی ایکٹ اور امن عامہ کے آرڈی ننس پر نظرِ ثانی ہوگی، اور صحافت کو پابند کرنے کے لیے نہ موجود۔ مارشل لا ریگولیشن استعمال کیے جائیں گے نہ نئے ریگولیشن نافذ کیے جائیں گے، نہ ڈیفنس آف پاکستان رولز اخبارات کے خلاف استعمال کیے جائیں گے۔

صدر بھٹو کی حکومت نے ایک سو کے قریب برطرف شدہ کارکن صحافیوں کی بحالی کا جو کارنامہ سرانجام دیا اُس سے خیرسگالی کا جذبہ پیدا ہوا۔ "پاکستان ٹائمز" کے سینیئر ایڈیٹر مسٹر زیڈ۔ اے سلہری کی برطرفی میں مارشل لا کا سہارا، نیشنل پریس ٹرسٹ پر مکمل اور واضح حکومتی کنٹرول اور ڈان اخباری گروپ کے مدیر اعلا جناب الطاف گوہر کی گرفتاری کے واقعات چنداں خوش آیند نہیں تھے، لیکن اس تصویر کے دوسرے پہلو بھی موجود تھے کہ مسٹر زیڈ۔ اے۔ سلہری اور پیپلز پارٹی کے درمیان اختلافات اُنھیں اخبار میں رکھنے کے مانع تھے۔ نیشنل پریس ٹرسٹ پہلے بھی بہرصورت حکومت ہی کے کنٹرول میں تھا، اور جناب الطاف گوہر کے بارے میں اعلان ہوا کہ ان کی گرفتاری صحافتی پیشے سے تعلق نہیں رکھتی۔ پس ان امور کے باوجود اگر آزادئ صحافت کے بارے میں صدر مملکت کے اعلانات کی روح کے مطابق نئی صحافتی پالیسی بنائی جاتی تو حکومت اور صحافت کے درمیان عدم احترام کی وہ صورت پیدا نہ ہوتی جو آج موجود ہے۔

حکومت کی موجودہ پالیسی کا تجزیہ کرنے سے پہلے چند باتیں واضح کرنی ضروری ہیں:

اوّل۔ اگر کوئی اخبار صدرِ مملکت یا کسی قائد کو گالی دیتا ہے یا اُس پر ناشائستہ انداز میں نکتہ چینی کرتا ہے تو وہ صحافت کے اعلا معیار سے گر جاتا ہے۔

دوم۔ جھوٹی اور گمراہ کن خبروں کی اشاعت سراسر غلط ہے۔

سوم۔ اخبار کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی قانون کو توڑ دے۔ البتہ اُسے یہ حق ضرور حاصل ہے کہ وہ جس قانون کو آزادیٔ صحافت کے منافی سمجھتا ہے اُسے بدلنے کے لیے رائے عامہ ہموار کرے۔

چہارم۔ اخبار نویس عام شہریوں سے ماورا کوئی اونچی ہستی نہیں۔ قانون کی نظر میں اخبار نویس اور عام شہری برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے اگر اخبار نویس کو قانون شکنی پر سزا دی جائے تو اس پر کوئی اعتراض کی گنجائش نہیں ہو سکتی، لیکن شرط یہ ہے کہ سزا عدلیہ دے، انتظامیہ نہ دے۔ اور اگر بعض صورتوں میں انتظامیہ فوری کارروائی پر مجبور ہو تو پہلے اخبار سے جواب طلبی کرے۔ اگر وہ جواب سے مطمئن نہ ہو اور کارروائی کرلے تو اخبار نویس کو یہ قانونی اختیار حاصل ہو کہ وہ اس کارروائی کے جواز کو ہائی کورٹ میں چیلنج کرے۔

پنجم۔ کسی اخبار کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ایک جمہوری معاشرے میں آئین و قانون کے مطابق بنی ہوئی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے لوگوں کو تشدد یا دوسرے غیر آئینی حربوں کے استعمال کی ترغیب دے، لیکن اُسے یہ حق ضرور حاصل ہے کہ مستند اور مصدقہ معلومات کی بنا پر حکومتِ وقت کی خرابیوں کا پردہ چاک کرے اور آئینی ذرائع سے حکومت بدلنے کے لیے رائے عامہ کو مطلوبہ سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔

ششم۔ اگر انتظامیہ کسی اخبار کو سزا دیتی ہے تو اس کا مقصد محض اصلاحِ احوال ہونا چاہیے۔

ان امور کی روشنی میں میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ "اُردو ڈائجسٹ"، "زندگی" اور "پنجاب پنچ" کے خلاف کارروائی میں مارشل لا کا سہارا لینا اور قید، جرمانے، بندش اور کسی اخبار کو ایڈٹ کرنے پر قدغن لگانا مناسب نہیں تھا، کیونکہ اگر اصلاحِ احوال ہی مطلوب تھی تو قانونِ ضمانت و مطبوعات کے ماتحت جواب طلبی کے بعد طلبیٔ ضمانت سے حکومت کا منشا پورا ہو سکتا تھا۔ صوبہ سندھ میں سنسر شپ کے حکم میں خلاف ورزی کی صورت میں قید اور جرمانے کی سزا کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ اس لیے "سن" کے خلاف دوسری کارروائی مناسب نہیں تھی۔ اور ہمہ گیر سزا کے بعد نہیں، پہلے ٹریبونل مقرر کرنا چاہیے تھا

"نوائے وقت" (لاہور)، "امروز" (ملتان) اور "جنگ" (راولپنڈی) کے نام "شو کاز" نوٹسوں کا جواز صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ اول، انھوں نے واقعی غلط خبریں چھاپی ہوں۔ دوسرے، حکومت نے ان کی تردید میں پریس نوٹ جاری کیے ہوں۔ تیسرے، ان اخباروں نے پریس نوٹ نہ چھاپے ہوں۔ "اُردو ڈائجسٹ"، "زندگی" اور "پنجاب پنچ" کے ڈیکلریشن کالعدم قرار دینے کا ٹیکنیکی جواز ہو تو ہو اخلاقی جواز کوئی نہیں، کیونکہ جب وہ مارشل لا کے تحت حکماً بند کر دیے گئے تھے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ یقین دلانے کا کوئی موقع نہیں کہ جرائد کی باقاعدہ اشاعت اُن کے بس میں نہیں تھی۔ "جنگ" (کوئٹہ) نے نیوز پرنٹ کنٹرول آرڈر کی خلاف ورزی کر کے واقعی غلطی کی، لیکن اس کا ازالہ نیوز پرنٹ کوٹے کی تنسیخ کی جگہ ایک وارننگ سے بھی ہو سکتا تھا

میرے نزدیک صحافت اور حکومت کے درمیان موجودہ تصادم کسی صورت میں مفید نہیں۔ اس کیفیت کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا احترام کریں۔ حکومت کا احترام اس لیے ضروری ہے کہ عوام کے چُنے ہوئے نمائندوں کی حکومت ہے، وہ آسمان سے نازل نہیں ہوئی۔ اس دھرتی سے اور ہمارے ووٹوں سے اُبھری ہے۔ اور صحافت کا احترام اس لیے ضروری ہے کہ وہ رائے عامہ کی عکاس اور ترجمان ہے۔ حکومت کے لیے چشم و گوش کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے سے قصرِ حکومت کے دریچوں میں روشنی کی کرنیں داخل ہوتی ہیں۔ صحافت کو محسوس کرنا چاہیے کہ حکومت کو کتنے بڑے مسائل کا سامنا ہے اور اُسے ایک ایسے انتشار سے سابقہ پڑا ہوا ہے جس کی نظیر تاریخ پاکستان میں نہیں ملتی۔ اور حکومت کو جان لینا چاہیے کہ صحافت حکومت کی عکاس ہوتی ہے، اور اگر معاشرہ پریشان حال ہے تو ظاہر ہے اس پریشانی کا عکس اخبارات میں بھی نظر آئے گا۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ مملکتِ پاکستان آمریت کی طویل رات سے گزری ہے۔ مدتوں کے بعد بند ٹوٹے ہیں۔ ایسے میں اگر کبھی کبھی ہلکے پھلکے سیلاب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟ دنیا کی بہت سی حکومتیں چاہتی ہیں کہ نکتہ چینی کے دروازے بند ہوں۔ لیکن اچھی حکومتیں ایسا نہیں چاہتیں، کیونکہ احتساب سے ایک جمہوری حکومت کی کارگردگی بڑھ جاتی ہے اور پھر پاکستان میں تو ابلاغِ عام کے زیادہ تر وسائل حکومت کے کنٹرول میں ہیں۔ سب سے بڑا وسیلہ ریڈیو ہے جس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے کیجیے گا کہ اس وقت ملک میں ریڈیو سیٹوں کی تعداد یقیناً دس لاکھ سے کہیں زیادہ ہے۔ دوسرا وسیلہ ٹیلے وژن ہے جس کے ذریعے سے شہری عوام تک حکومت کا پیغام بلا شرکتِ غیرے پہنچتا ہے اور اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے کیجیے گا کہ

اس وقت ٹیلی وژن سیٹوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے متجاوز ہے۔ تیسرا ذریعہ روزانہ اخبارات ہیں جن کی مجموعی اشاعت نو لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ایک تہائی اشاعت ان اخباروں کی ہے جو نیشنل ٹرسٹ کی ملکیت ہیں یا پیپلز پارٹی کے ترجمان ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اخبارات پر بھی حکومت کا کنٹرول ہوگیا تو احتساب کیسے ہوگا، روشنی کیسے آئے گی؟

دوسری طرف اہلِ صحافت کو معلوم ہونا چاہیئے کہ احترامِ صحافت اس صورت میں ممکن ہے کہ صحافت اعلا اخلاقی قدروں پر چلے، شائستگی کا دامن نہ چھوڑے، ذاتیات سے بالاتر رہے، اشتعال نہ دلائے، امن و قانون کا احترام قائم رکھنے میں مدد دے، خبروں کی تحریر اور پیش کش میں صداقت سے کام لے اور اداراتی تبصروں میں توازن و اعتدال سے کام لے، کیونکہ ایسے تبصروں کا اثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ پھر دشنام طرازی، اسکینڈل بازی اور فحاشی سے گریز کیا جائے تاکہ ایک پاکیزہ معاشرے کی تخلیق میں مدد مل سکے۔

ایک اور بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ آزادیٔ صحافت کو صرف حکومتوں کی طرف سے خطرہ نہیں ہوتا، دوسرے عناصر سے بھی ہوتا ہے مثلاً وہ سرمایہ دار جو اخبارات پر اپنے اشتہاروں کے دروازے بند کرکے اُن کی رائے کو مطلوبہ سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ سیاسی پارٹیاں یا دوسرے عناصر جو اخبارات کے خلاف اختلافِ رائے کی بنا پر مظاہرہ کرتے ہیں ان کا مقاطعہ کرتے ہیں اور اُن کے پرچے جلاتے ہیں اور خطرہ یہ کہ آزادیٔ صحافت کو خود صحافت کی طرف سے بھی خطرہ ہوتا ہے، کیونکہ جب کوئی اخبار یک طرفہ خبریں چھاپتا ہے، انھیں توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے یا اپنے نزدیک ناپسندیدہ زاویۂ نگاہ کے حامل عناصر کی خبروں کو بلیک آؤٹ کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ معلومات کے دروازے بند کرکے آزادیٔ صحافت کی نفی کرتا ہے۔

میرے نزدیک آزادیٔ صحافت کے تین بڑے تقاضے ہیں:

اوّل: صحافت آئین و قانون کے مطابق بنی ہوئی اور عوام کے ووٹوں سے منتخب شدہ حکومت کا احترام کرے۔

دوم: حکومت صحافت کو رائے عامہ کا عکاس اور ترجمان جان کر اُس کے احتسابی کردار کا احترام کرے۔

سوم: صحافت اُن قدروں کا احترام کرے جنھیں دنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ برطانوی پریس کونسل کے نمونے پر ایک ایسی پریس کونسل قائم کی جائے جس کے تین چوتھائی ارکان کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز، آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس منتخب کریں۔ اس کی صدارت

ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے کسی ریٹائرڈ جج کو سونپی جائے اور وہی باقی ایک چوتھائی ارکان معاشرے کے نمائندوں کے طور پر نامزد کرے۔ یہی کونسل صحافتی قوانین پر نظر ثانی کرے تاکہ انتظامیہ کے اختیارات گھٹائے جائیں اور عدلیہ کی سیادت قائم ہو۔ یہی ایک ضابطۂ اخلاق بنائے۔ اسی کے سامنے وہ شکایات پیش ہوں جو حکومت کو صحافت سے ہوں یا صحافت کو حکومت سے ہوں۔ یا معاشرے کو صحافت سے ہوں۔ یہی اخبارات کی ملکیت کا ایسا نظام تجویز کرے جس کے تحت کوئی مخصوص طبقات اس پوزیشن میں نہ رہیں کہ صحافت کی رائے کو اپنے مفادات کے حق میں متاثر کر سکیں۔ اس کونسل میں حکومت کے نمائندے مبصر کی حیثیت سے شریک ہوں تاکہ مختلف امور پر وہ حکومت کے زاویۂ نگاہ کی وضاحت کر سکیں۔ یکم اگست کو یوم آزادی صحافت نے ثابت کر دیا ہے کہ تمام سیاسی پارٹیاں دو معاملات میں متفق ہیں: اوّل: آزادی صحافت برقرار رہنی چاہیے۔ دوم: آزادی صحافت معاشری ذمے داریوں سے عبارت ہے۔ پریس کونسل بن گئی تو ان دونوں امور کی تکمیل کا سامان فراہم ہو جائے گا اور حکومت و صحافت کے درمیان موجودہ افسوسناک محاذ آرائی بھی ختم ہو جائے گی۔

جناب محترم جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن

اس شام کے فاضل مقرر جناب محترم ڈاکٹر عبدالسلام خورشید خود صحافی بھی ہیں اور صحافی گر بھی، کیونکہ وہ پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ صحافت کے رئیس ہیں۔ پھر ابنِ سالک ہونے کی نسبت سے اگر یہ کہا جائے کہ صحافت اُن کی گھٹی میں پڑی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ "احترامِ صحافت" ایسے موضوع کے لیے اُن کا انتخاب ہر پہلو سے موزوں تھا اور آپ نے دیکھا کہ وہ اس موضوع کی ذمّے داریوں سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

اس موضوع کی اہمیت سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ جمہوری مغربی ممالک میں جہاں اہلِ اقتدار کے تین طبقات شمار میں آتے ہیں، وہاں عالمِ صحافت یعنی پریس کو چوتھے طبقۂ اقتدار پر فائز سمجھا جاتا ہے، کیونکہ یہ ابلاغ کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ ان ممالک میں صحافت کو جمہوری اقدار کا محافظ، قانون کی سربلندی کا حصار اور قومی ضمیر کا آئینہ دار گردانا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صحافت کے اس عظیم کردار کی تکمیل کے لیے 'قانونی حدود کے اندر آزادی' پہلی شرط ہے۔ صحیح خبروں اور مختلف نظریوں کی آزادانہ اشاعت ہی معاشرے اور سیاسی تنظیم کی صحت کی ضامن ہو سکتی ہے۔ علمی سطح پر بحث و تمحیص ہی سے ہر معاملے کے مختلف پہلو منظرِ عام پر لائے جا سکتے ہیں، لیکن بعض اوقات کم نظر یا ضرورت سے زیادہ حسّاس انتظامیہ کو اس قسم کی آزادی ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ اسے دبانے کے لیے کئی قسم کے ہتھکنڈے اختیار کرتی ہے۔ ایسے اقدامات کا نتیجہ عموماً انتظامیہ کی توقعات کے برعکس نکلتا ہے، کیونکہ عوامی نظروں میں آزادی کُش کارروائیاں اس بات کی غماز ہوتی ہیں کہ ؏

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اگر کوئی صحافی قانونی حدود سے تجاوز کرتا ہے تو اس سے نپٹنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس کے خلاف عدالتی کارروائی کی جائے تاکہ حق و انصاف کے تقاضے بادی النظر میں پورے ہوتے نظر آئیں اور واقعتاً گنہ گار شخص بھی جائز سزا سے نہ بچ سکے۔ کھلی عدالت کے طریقِ کار کو بالائے طاق رکھ کر، کسی صحافی کی مبینہ بدعنوانی کی بنا پر اس کی نظر بندی یا اس کے پریس کی ضبطی احترامِ صحافت کے اصول کے منافی ہے، لیکن حکمرانوں کی نفسیات کا مطالعہ دلچسپ تضادات سامنے لاتا ہے۔ آزادیٔ صحافت سے متعلق اقتدار سے پہلے اور اس کے بعد اُن کے موقف

میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ تاہم جہاں صحافت کا احترام معاشرے پر واجب ہے وہاں اہلِ صحافت پر بھی کچھ ذمّے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ ذاتی، گروہی یا علاقائی مفادات سے قطعِ نظر، معروضی زاویۂ نگاہ اختیار کرکے متوازن طریقہ سے خبروں کی اشاعت کریں تاکہ صحیح معلومات قوم اور ملک کو صحیح نتائج کی طرف لے جاسکیں۔ محض کاروباری نقطۂ نظر اس بارے میں مضرت رساں ہوسکتا ہے۔ سنسنی خیزی کے لیے رنگ آمیزی یا جنسی بدعنوانی کی چھچھورے دار تفصیلات یا بگڑی اچھال صحافت، مذاقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ ذہنیت اور معلومات کی کمی تخیّل کی مدد سے پُورا کرنے کی کوشش اکثر اوقات مضحکہ خیز اور بعض حالتوں میں قومی سطح پر خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ پھر تردیدی بیانات و مراسلات کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور فکری انتشار کے دروازے کھُل جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ کبھی کبھی سیاسی زعما کبھی کہہ مکرنے کا ڈھونگ رچاتے ہیں، لیکن زیادتی عموماً اہلِ صحافت ہی سے منسوب کی جاتی ہے۔

افسوس سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے ملک میں صحافتی کوتاہیاں اور کبھی کبھی صحافتی بدعنوانیاں فضا کو مکدّر کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں اس حقیر کو بھی ایک صحافتی ادارے کی سربراہی کے دوران میں چند ایک ذاتی تجربات بعض صحافتی کرم فرماؤں کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔ میں نے وہ سربراہی اس زعم میں قبول کی تھی کہ شاید (جیسا کہ بعض اہل الرائے احباب کا خیال تھا) یہ ہیچ مداں کوئی قومی خدمت انجام دے سکے۔ چناں چہ اس خاکسار نے بساط بھر کوشش کی کہ مختلف سیاسی پارٹیوں اور اُن کے لیڈروں کے درمیان غیر جانب داری کا رویّہ اختیار کرکے نیشنل پریس ٹرسٹ کو اسمِ با مسمیٰ بنایا جائے، لیکن اس عاجز کی کوشش کے راستے میں ایک صحافتی ٹولہ آڑے آیا جو صحافت سے زیادہ سیاست کا گرویدہ تھا۔ اس قضیئے کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں تاہم اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ادارہ کی انتظامیہ کے بعض اقدامات پر جو اس ناچیز کی رائے میں عین قانونی تقاضوں کے مطابق تھے، چند نام نہاد صحافیوں نے میرے خلاف ذاتی محاذ قائم کیا اور اس حقیر بے تقصیر سے ایسے افعال اور بیانات منسوب کیے گئے جو کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ دو تین اخباروں نے خصوصاً کیچڑ اچھالنے کا کھیل اس طرح کھل کر کھیلا کہ گویا حق نہ ناحق میں مساوات ہے اور کہ یہ حضرات ان قطبین میں تمیز سے یکسر آزاد ہیں۔ اس زمانے میں میرے تاثرات ایک قطعہ کی صورت میں ڈھل گئے تھے جو میں صحیح قسم کے صحافیوں کی خدمت میں دلی معذرت کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں ؎

کسی نے پوچھا یہ اک کٹ کھنے صحافی سے
نہیں ہے عار تمہیں کوئی حق خلافی سے؟

کہا کہ بھولے نہ بنیے، ہر اک نیا اخبار
جو چل سکا تو چلے گا، دروغ بانی سے

راستی سے تجاہل کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ میرے متعلق یہ خبر شائع کی گئی کہ گزشتہ الیکشن کے دوران میں نے ایک امیدوار کے حق میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن امیدوار نے منہ کی کھائی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے اور میرے خاندان کے کسی فرد حتیٰ کہ کسی ملازم کا نام بھی ووٹروں کی فہرست میں درج نہ ہوا تھا۔ اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب ووٹ کی خواستگار ایک خاتون، میری بیوی کے پاس تشریف لائیں اور انھیں اطلاع دی کہ ہمارے نام الیکشن کمیشن کے کارپردازوں کی توجہ کے نذر ہوگئے ہیں۔ الیکشن کے اختتام تک میں نے ووٹروں کی فہرست کی تصحیح کے لیے کوئی کوشش نہ کی۔ اس کے کافی دنوں بعد میں نے چیف الیکشن کمشنر کی توجہ اس فروگزاشت کی طرف دلائی۔ یہ حقیر تا ایں دم سیاست سے گریزاں ہی رہا ہے۔

لفظ صحافت کا مادہ عربی میں ص ح ف (صَحَفَ) ہے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اگر ح کے اوپر تشدید کا اضافہ ہو جائے تو لفظ صَحَّفَ کے معنی خبر کو بگاڑنے یا اسے غلط رنگ میں پیش کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ کیا عجب متذکرہ صحافی کو کبھی خبر دیتے وقت تشدید کا حادثہ پیش آ گیا ہو!

مشرقی پاکستان کے المیہ سے متعلق صحیح کوائف کا علم بھی عوام کو اخبارات کے ذریعہ سے بروقت نہ ہو سکا۔ معلوم نہیں اس بارے میں اہلِ صحافت پر کیا پابندیاں عائد تھیں، لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ عوام کو اس معاملے میں اندھیرے میں رکھا گیا۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ ان کوتاہیوں کے علی الرغم صحافتی کالی بھیڑوں کا وجود اس اصول پر ہرگز اثر انداز نہ ہونا چاہیے کہ صحافت کا احترام ایک مہذب معاشرے کا لازمہ ہے اور اس کی تہذیبی ترقی کا معیار۔ اخبارات اور جرائد کے ذریعہ سے بے لاگ تنقید کا امکان ہی جمہوریت کی جان ہے۔ اس کے بغیر جمہوریت کی کوکھ سے آمریت جنم لیتی ہے۔



حکیم محمد سعید، جسٹس قدیرالدین احمد ، ریورنڈ جوزف کارڈیرو (مقرر)



جسٹس قدیرالدین احمد (صدر) ، حکیم محمد سعید، ریورنڈ جوزف کارڈیرو



سامعین

احترامِ انصاف

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمد سعید
مقالہ : ہزگریس دی موسٹ ریورنڈ جوزف کارڈ یرد
کلماتِ صدارت : جناب محترم جسٹس قدیرالدین احمد

شامِ ہمدرد، کراچی
۱۷- اگست ۱۹۷۲ء

حکیم محمدّ سعید

تقریباً تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد آج آپ لوگوں کے سامنے حاضر ہوکر اور اپنی تمام سرگرمیوں اور قومی خدمات کو دوبارہ شروع کر کے مجھے بڑی مسرت ہورہی ہے۔ امریکا، یورپ اور شرقِ اوسط کی یہ سیاحت بڑی بامقصد ثابت ہوئی۔ میں طرح طرح کے خیالات سے لبریز ہوکر لوٹا ہوں۔ ان انتہائی مصروف سو دنوں کے مشاہدات اور تجربات نے میرے جذبات واحساسات میں تیزی پیدا کردی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ملک کے حالیہ المناک واقعات کی وجہ سے میں بے حد غمگین بھی ہوں۔ اگر سچی ہمدردی، حُبّ الوطنی اور مفاہمت کا دَور دَورہ جاری رہتا تو یہ تلخی اور بغض وعناد ہرگز پیدا نہ ہوتا۔ مجھے اُمید ہے کہ انسانی جذبۂ خیرخواہی یعنی وہ جذبۂ خیرخواہی جو احترام کی بدولت پیدا ہوتا ہے وہ ایک نہ ایک دن ضرور غالب آئے گا۔ آخرکار انسان صرف پیٹ ہی بھر کر تو زندگی نہیں گزارتا، اُس کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے حُسن اور ہم آہنگی، سچائی ونیکی، کام اور لگن، محبت اور دوستی، آرزو اور عبادت، تخلیق وتعاون، تلاش وتحقیق اور خدمت وشرکت کی بھی ضرورت درپیش رہتی ہے۔

آج ہمارے درمیان دو نہایت ممتاز شخصیتوں کی موجودگی ہمارے واسطے باعثِ صد عزت وافتخار ہے۔ ان میں سے ایک صاحب کلیسا کے نہایت اعلا عہدیدار ہیں۔ یعنی ہز گریس دی موسٹ ریورنڈ ڈاکٹر جوزف کارڈیرو، آرچ بشپ آف کراچی۔ موصوف ہی آج شام ہمارے مہمان مقرر ہیں۔ دوسری شخصیت کا تعلق ہے دُنیاوی سلسلے سے یعنی سندھ وبلوچستان ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس جناب جسٹس قدیر الدّین احمد صاحب۔ موصوف آج شامِ ہمدرد کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جناب جسٹس قدیر الدّین احمد صاحب اس سے قبل بھی شامِ ہمدرد سے خطاب کر چکے ہیں۔ لہٰذا اس اجتماع سے اُن کا تعارف کرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر آپ کو عدالتی کارروائیوں سے دلچسپی رہی ہے تو آپ نے انھیں عدالت میں دیکھا ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ کو سماجی کارروائیوں سے دلچسپی ہے تو آپ نے انہیں محفلوں میں دیکھا ہوگا اور اگر آپ کی دلچسپیاں علمی وادبی ہیں تو پھر آپ نے انھیں ثقافتی تقریبات میں دیکھا ہوگا۔ موصوف نے معروضی صداقت کی جستجو کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے اور اُن کا دائرۂ اثر محض عدالتوں اور قانون دانی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس سے کہیں کہیں دُور تک چلا گیا ہے۔

بزرگ ہیں حالانکہ کراچی کے لیے نئے نہیں پھر بھی شامِ ہمدرد میں پہلی بار شریک ہوئے ہیں۔ ہماری دعوتِ تقریر کو قبول کر لینے پر ہم موصوف کے شکر گزار اور احسان مند ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں موصوف کی سادگی، حلم و مروّت اور علم دوستی کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ اتنے جلیل القدر منصب پر فائز ہونے کے باوجود موصوف پند و نصیحت فرماکر اور ہمہ اوست کے نظریے پر عمل پیرا ہو کر عوام سے رابطہ قائم رکھتے ہیں۔

نہ جانے یہ ہم لوگوں کی بدقسمتی ہے یا خوش قسمتی کہ ہم لوگ تاریخ کے ایک ایسے نازک دَور میں زندگی گزار رہے ہیں کہ جب ہمارے معاشرے کی ساری ساخت اور اُس کی تہذیبی و الہیاتی اقدار بنیادی طور پر تبدیل ہو رہی ہیں۔ مستحکم ارتقائی ادوار میں، عام آدمی ان مفروضات و اصولوں کے بارے میں پریشان ہوئے بغیر اپنی نجی بسر کرتا رہتا ہے جن کے مطابق اس کی زندگی گزر رہی ہے، چنانچہ وہ سیاست کو پیشہ ور حضرات کے ہاتھوں میں چھوڑ دیتا ہے، لیکن ہمارا یہ دور ایسا نہیں۔ دنیا مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ لہٰذا جمہوریت، آزادی، انصاف اور معقولیت کو سنگین خطرہ لاحق ہو گیا ہے، اور دنیا کے بعض حصّوں میں تو انھیں بالکل تباہ و برباد کر ڈالا گیا ہے۔ چنانچہ ہم سب کا فرض ہے کہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی تصادم کے اسباب کا جائزہ لیں۔ معاملات کو اچھی طرح سمجھیں اور جس بات کو ہم صحیح سمجھتے ہیں اس کا تحفّظ کریں خواہ اُس کے لیے ہمیں اپنی اور دوسروں کی جانیں ہی کیوں نہ دینی پڑیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کا یہ حق ہے کہ وہ عزّت و وقار کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ یہ نہیں کہ اُس پر جبر و تشدّد ہو بلکہ محبّت، انصاف اور ہمدردی کے ساتھ اُس کی زندگی گزرے۔

آج ہمارے معزّز مہمان مقرّر احترامِ انصاف کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔ ان الفاظ کے بارے میں اکثر غلط فہمی ہو جاتی ہے اور اُن کا بے جا استعمال کر لیا جاتا ہے۔ انصاف کو اکثر غلطی سے قانون اور اخلاقی حکم تصوّر کر لیا جاتا ہے۔ اِن دونوں میں بال برابر فرق ہے تاہم انصاف کی ہستی اور سالمیت اپنی جگہ پر قائم ہے کیونکہ انصاف خدا کا تصوّر ہے اور انسانوں کا نصب العین۔ یہ حاکم کی اوّلین خوبی ہے اور اسی سے محکوم کی شکایت رفع ہوتی ہے۔ ایک عربی کہاوت ہے کہ "انصاف کرنے میں جو ایک گھنٹہ صرف ہوتا ہے وہ سو دنوں کی عبادت کے برابر ہے"۔ کیا تمام مقدّس کتابوں میں بار بار یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ انصاف خود خدا کی ایک صفت ہے اور حیاتِ لازوال حاصل کرنے کی ایک لازمی شرط؟ میں قرآن پاک کی سولھویں سورۃ کی آیت ۹ کا اقتباس پیش کرتا ہوں:

"خدا انصاف کا حکم دیتا ہے یعنی اپنے اعزّا و اقربا اور خاندان والوں کے ساتھ

نیکی اور فراخ دلی سے پیش آنا، اور وہ ہر شرمناک فعل، ناانصافی اور بغاوت
کو منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں ہدایت دیتا ہے تاکہ تمہیں تنبیہہ ہو۔

افسوس۔ آج انصاف آزمائش میں مبتلا ہے! جی ہاں۔ میں اعادہ کرتا ہوں کہ انصاف آزمائش میں مبتلا ہے اور جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر خود مختاری، جمہوریت اور شخصی آزادی کو سنگین خطرہ لاحق ہے۔ تصادم، بقائے اصلح اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہے۔ جب کبھی اخلاقی اقدار میں تصادم ہوتا ہے اور شخصی اور ماورائے شخصی اقدار میں توازن برقرار نہیں رہتا تو ناانصافی پیدا ہو جاتی ہے۔ متاثرہ ممالک میں اس کا ظہور یوں ہوتا ہے کہ قائدین کا کردار پست ہو جاتا ہے اور انھیں اپنی ذمے داریوں کا احساس نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ جمہوریت تنگ نظری اختیار کر لیتی ہے جس کی وجہ سے بھرپور جوابی کارروائی نہیں ہو پاتی۔ یہ حالیہ واقعات نہایت افسوس ناک ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔ صرف تاریخ کے چند صفحات رہ جائیں گے جن میں مستقبل کا نوجوان اپنے بزرگوں کی حماقتوں کی تصاویر دیکھتا رہ جائے گا۔

ہز گریس دی موسٹ ریورنڈ جوزف کارڈیرو
آرچ بشپ آف کراچی

جو بھی اس مقالے کا عنوان "احترام انصاف" سنے گا اُسے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اب جو کچھ کہا جائے گا وہ انصاف کی توصیف میں ایک نظریاتی تفسیر ہوگی حالانکہ یہ بات میرے ذہن سے کوسوں دُور ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ہے انصاف شکنی۔ انصاف کی پابندی نہیں انصاف کی ذلت ہے، اس کا وقار نہیں۔ اسی لیے ہمارے واسطے یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ انصاف کا مطلب کیا ہے تاکہ معاشرے کو بہتر بنانے کے لیے ہم اپنی عملی زندگی میں انصاف کے تقاضوں کو پورا کریں۔

دنیا میں جتنی بھی مخلوق ہے اُس میں صرف انسان ہی کو اپنے مقدر کا احساس ہے۔ اُسے یہ خیال ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ وہ ایک حیوان سے بہتر ہے۔ حالانکہ وہ اس بات سے کبھی انکار نہیں کر سکتا کہ جو دوسری لاکھوں جان دار چیزیں اُس کے ماحول میں برابر کی شریک ہیں اُن سے اس کی قرابت ہے۔ اس عقیدے کی بنیاد انجیل کی یہ یاد دہانی ہے کہ انسان ان رُوحانی صفات کی وجہ سے جو اسے دوسری مخلوقات سے علیٰحدہ کرتی ہیں خدا کا عکس اُس کی شبیہہ ہے اور ان صفات کی بنیاد ہے انصاف کہ جو اس پیغامِ مقدس کی رُوح ہے۔ بالکل سیدھے سادے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو اس کی ذات کی بنا پر پہچاننا اور اس سے محبت کرنا اور دوسرے انسانوں سے خدا کی خاطر محبت کرنا۔ ان دونوں باتوں کو جُدا نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ ایک ہی محبت کے دو پہلو ہیں۔ پہلے کا دوسرے کے بغیر ہونا ریاکاری ہے جب کہ دوسرے کا پہلے کے بغیر ہونا بے معنی ہے۔

آج دنیا میں انصاف کے مسئلے نے یا یوں کہیئے کہ ناانصافی کی شدت نے بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ ہر جگہ بڑے زور وشور سے انصاف کا اعلان کر دیا جاتا ہے لیکن خوب دل کھول کر اس کی تحقیر کی جاتی ہے۔ ہر شخص کی زبان پر اس کا ذکر رہتا ہے لیکن لوگوں کے دلوں میں اس کا فقدان رہتا ہے۔ جب بندوں کے درمیان انصاف کا وجود ختم ہو جاتا ہے تو پھر خدا کو کوئی نہیں پہچانتا۔ جس جگہ سماجی، سیاسی، معاشی اور تمدنی ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں وہاں خدا کے دیئے ہوئے امن وسکون کی نعمت کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود خدا کو بھی انسانی معاملات میں ثانوی حیثیت دے دی جاتی ہے۔ انسانی تاریخ کی ارتقا پر اگر ہم ایک سرسری نظر بھی ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ احترامِ انصاف اور اس کے سماجی اثرات کو پُوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے انسان کتنی افسوس ناک کیفیت میں مبتلا ہو گیا

ہے۔ انصافِ خداوندی دراصل اس محبّت کے سوا اور کچھ نہیں کہ جس کے ذریعہ سے خدا انسان کو بدی کی بیڑیوں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور اسی کی مطابقت میں انسان سے اس انصاف کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ خدا کا فرماں بردار رہے اور اس اطاعت کے اظہار کا طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں دوسرے انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

لوگوں کو احترامِ انصاف اور ناانصافی کی اہمیت کو سمجھانے کے لیے خدا نے بے حد کوششیں کیں۔ صداقت کی ترسیل کے تحفظ کے لیے خدا کے نیک اور دلیر بندے جو تاریخ میں ظہور پذیر ہوتے رہے ان پیغمبروں نے بار بار اس عام بے وفائی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جو بندوں نے اپنے خدا کے ساتھ کی اور انھوں نے اس ظلم کے خلاف بھی جہاد کیا جو انسان نے غریبوں، بیواؤں اور یتیموں پر کر رکھا تھا۔ بعض اوقات تو انسان نے دوسرے انسان کے ساتھ اتنی ناانصافی کر رکھی تھی کہ امیر آدمی تو حلق تک بھر لیتا تھا اور شاہانہ شان و شوکت سے جام پر جام لنڈھاتا رہتا تھا جب کہ غریب آدمی ایک جوڑا جوتی کی قیمت کے برابر رقم پر غلام کی حیثیت سے بازار میں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اس سماجی و معاشیاتی ناانصافی سے بھی بدتر وہ لطیف و گہری ناانصافی ہے جو آج تک جاری ہے۔ یہ وہ ناانصافی ہے جس کے ذریعہ سے نامنصف لوگوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اپنی حرکتوں کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوششیں کیں۔ اسی دو رُخی ریاکاری کے بارے میں حضرت عیسٰیؑ نے بھرے مجمع میں سرزنش کی تھی اور اپنے مُریدوں کو سختی سے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ: "جس وقت تک تمہارا انصاف یہودی علما اور ظاہر پرستوں سے بہتر نہ ہوگا اُس وقت تک تم قدوسی بادشاہت میں داخل نہ ہو سکو گے۔" اگر مجھے برسرِعام اس ناانصافی کے خلاف بولنے کی اجازت ہو تو میں یہ کہوں گا کہ یہ گناہ بیسویں صدی کے انسان کا گناہ ہے۔

حال ہی میں دنیا بھر کے تمام کیتھلک بشپ جو ۶۵-۱۹۶۲ کے درمیان جمع ہوئے تھے اور جسے دوسری ویٹیکن کونسل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ سب بھی اسی لیے کیا گیا تھا کہ انسان کا ایمان موجودہ دنیا داری کی وجہ سے کم زور ہو گیا ہے، چنانچہ وہ اپنے شکوک و شبہات و مشکلات اور بے اعتقادی کو مذہبی نمائش کا لبادہ اُڑھائے ہوئے ہے۔

دوسری ویٹیکن کونسل کو عالم گیر ناانصافی کے خلاف آواز بلند کیے ہوئے دس برس گزر چکے ہیں، لیکن دنیا کی دولت اور دنیا کی غربت کے درمیان جو غیر منصفانہ عدم توازن اُس وقت تھا وہی آج بھی قائم ہے۔ اعداد و شمار نے اس پریشان کن بات کی تصدیق کر دی ہے کہ دنیا کے تین چوتھائی وسائل دنیا کی چوتھائی آبادی کے قبضے میں ہیں اور وہ اُن سے دل کھول کر فائدہ اُٹھا رہے ہیں جب کہ دنیا کی تین چوتھائی آبادی کے لیے ایک وقت کی روٹی بھی ٹھیک سے میسّر نہیں۔ اور جتنی جتنی ترقی یافتہ

اور نام نہاد ترقی پذیر ملکوں کے درمیان ٹکنالوجیکل خلیج بڑھتی جا رہی ہے اتنی ہی یہ صورت اور بھی بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کھلی ہوئی ناانصافی خدا سے فریاد کر رہی ہے جس نے ہر شخص کو دوسرے کے برابر بنایا ہے اور بھائیوں کی طرح رہنے کی ہدایت کی ہے۔ اس دُنیا کی نعمتوں سے ہر ایک کو فیض یاب ہونا چاہیئے۔

ان حالات کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں اسباب کی طرف توجہ کرنی ہوگی۔ یوں تو اسباب بہت سے ہیں لیکن اختصار کی خاطر صرف ایک ہی سبب کافی ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے دیگر اثرات کے ساتھ ایک اثر یہ بھی ہوا کہ بہت سی قومیں اپنے ضمیر کے جھنجھوڑنے پر اس بات پر آمادہ ہوگئیں کہ وہ شکست خوردہ اور پس ماندہ ممالک کی معاشیات میں مدد دیں گی، لیکن آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دولت مند اقوام کو اب دنیا کی ترقی میں نہ وہ پہلی سی دلچسپی ہے اور نہ وہ اس کام کو اپنی ذمہ داری تصوّر کرتی ہیں۔ صرف گزشتہ تین مہینوں میں UNCTAD (اقوام متحدہ کا کمیشن برائے تجارت و ترقی

(United Nations Commission on Trade and Development)

نے چلی CHILE میں جو اجلاس منعقد کیے ان میں ہم نے دیکھا کہ ترقی یافتہ ممالک کے اقتصادی رہنماؤں نے بین الاقوامی تجارت کے تمام پہلوؤں پر غور کیا لیکن دنیا کی تین چوتھائی آبادی جو کہ ترقی پذیر ملکوں میں ہے اُسے ایک بھی رعایت نہ دی، حالاں کہ ان غریب ملکوں کی معاشیاتی اور ٹکنالوجیکل ترقی کا سارا دارومدار دولت مند اقوام ہی کے رحم و کرم پر ہے۔

اس معاشیاتی ناانصافی کے ساتھ تین مزید اہم مسائل یا ناانصافیاں بھی موجود ہیں جن کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

شہروں کی آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہو جانے کی وجہ سے سن رسیدہ لوگ بڑی مصیبت میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ کمزور ظلم و ستم کا نشانہ بن گئے ہیں اور ٹکنالوجیکل بے روزگاری پیدا ہوگئی ہے جس کی وجہ سے مزدوروں کی ایک بہت بڑی تعداد بے کار ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ نئے نئے طبقات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ جنسی بے راہ روی بڑھ گئی ہے۔ منشّیات کا کاروبار دن دونا ہوگیا ہے لہٰذا اکثر لوگ زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے۔

تقریباً اسّی کروڑ بالغ ناخواندہ ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا میں کُل جتنے بچّے ہیں اُن میں سے تقریباً نصف باقاعدہ تعلیم سے محروم ہیں۔ اور تعلیم پانے والے بچّوں کی تعداد میں اضافہ ہو جانے کے باوجود آبادی کی زیادتی کی وجہ سے فی صد جو تعداد ہے وہ ۱۹۶۰ء سے بھی کم ہے۔ اور ان سب

پر طرہ یہ ہے کہ جنگ یا تو ہوتی رہتی ہے یا اُس کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور اسلحہ جات کا انبار لگتا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا تشدّد کو اب بالکل ہماری چوکھٹ پر لاکھڑا کر دیا گیا ہے۔

اس کٹھن دَور میں کہ جب عالم گیر بحران طاری ہے تصادم جاری ہے اور عوام تشدّد کا شکار ہو رہے ہیں ہم انصاف کی ترقی کی کوشش کرنا بڑا مشکل کام معلوم ہوتا ہے۔ تاہم دنیا کی ظاہری تباہی کو محض مایوسانہ نظروں سے دیکھنا نہ صرف ایک منفی رویّہ ہوگا بلکہ ہم اُس چیلنج کو دیکھنے سے بھی قاصر رہ جائیں گے کہ جو موجودہ نسل کو درپیش ہے۔ ساری دنیا کا معاشرہ اس وقت ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ ایک عامرانہ سوسائٹی ختم ہو رہی ہے اور اُس کی جگہ ایک اشتراکی سوسائٹی پیدا ہو رہی ہے، چنانچہ دنیا کی پختگی کے لیے جس بحران کو ہم دیکھ رہے ہیں وہ صحت مند تو ہے، لیکن یہ مرحلہ تکلیف دہ بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان تمام باتوں کے پسِ پشت انصاف کا مطالبہ بڑی شدّت سے کار فرما ہے۔

میں یہاں تین تجاویز پیش کرتا ہوں جن کے ذریعہ سے ایک عملی حل تلاش کیا جا سکتا ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں تعلیم کا ایک ایسا سلسلہ جاری کر دینا چاہیے جس کے ذریعہ سے عام لوگوں کو عالم گیر انصاف کی صورتِ حال کے بارے میں معلومات حاصل ہوں اور یہ بھی معلوم ہو کہ یہ دنیا ایک دوسرے پر انحصار کیے بغیر نہیں چل سکتی۔ اسکول کی کتابوں سے لے کر سرکاری دستاویزات تک اور پرائمری اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ہر ایک بات کو منظرِ عام پر لانا چاہیے۔ آج محض آمرانہ اعلانات کے ذریعہ سے انصاف کو ترقی نہیں دی جا سکتی۔ انصاف کو صرف اسی حالت میں ترقی دی جا سکتی ہے کہ جب ہمارا عالم گیر عمل غریب، کم زور اور مجبور انسانوں کی شرکت سے منظم ہو۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ ہمیں عدم تشدّد کی مہم چلانی چاہیے۔ عمل انتہائی ضروری ہے، لیکن آدمی جب عمل کرنے چلتا ہے تو وہ ایک گومگو میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک مشکل تو یہ ہوتی ہے کہ جس نظام میں ناانصافی کا وجود ہوتا ہے اُسے اُس وقت تک نہیں بدلا جا سکتا جب تک کہ عوام شریک نہ ہوں۔ دوسری مشکل یہ ہوتی ہے کہ عوام جب مایوسی اور خود غرضی کا شکار ہو کر شرکت کرتے ہیں تو اس سے ایک ایسی خطرناک صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ تشدّد لازمی طور پر شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو قتل و غارت گری، لڑائی جھگڑے، خانہ جنگی، اغوا اور ہوائی جہازوں پر قبضہ کر لینے کی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اِن باتوں کا اتنا اثر ضرور ہوتا ہے کہ معاشرہ ان پر غور کرنے لگتا ہے، لیکن ان کاموں کے کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح کی حرکتوں سے ہنگاموں اور ظلم و زیادتی کا ایک خطرناک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ٹھوس اور تعمیری کوئی کام نہیں ہو پاتا۔ اس میں شک نہیں کہ بے بس لوگ تشدّد کے ذریعہ سے خود اپنے ہی مقصد کو نقصان پہنچاتے

ہیں ۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایسا معاشرہ قائم ہو جس میں سب برابر کے شریک ہوں اور جہاں کوئی کسی پر دباؤ نہ ڈال سکے اور تشدد نہ ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جب وہ تشدد کی راہ اختیار کرتے ہیں تو وہ خود اپنے مسلک کی مخالفت کرتے ہیں۔ حقیقی انصاف کو صرف اسی صورت میں ترقی حاصل ہو سکتی ہے اور اشتراکی سوسائٹی اسی وقت قائم ہو سکتی ہے کہ جب عدم تشدد کی معقول راہ اختیار کی جائے ۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے نظام کو بڑے سے بڑا جابر بھی نہیں دبا سکتا ۔

تیسری تجویز یہ ہے کہ عدم تشدد کا فعل اس مچھلی کی مانند ہے جیسے رہنے کے لیے پانی درکار ہوتا ہے ۔ لہٰذا ماحول میں اعتماد باہمی اس فعل کے لیے پانی کی حیثیت رکھتا ہے اور دوستانہ و برادرانہ مفاہمت اس کا ماحول ہے ۔ اس باہمی اخلاص و اعتماد کی صورت میں کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہیں خواہ وہ کسی بھی مقام پر ہو، چوں کہ ہر شخص معاشرے میں منصفانہ تعلقات قائم رکھنے کا خواہش مند رہتا ہے لہٰذا ہر ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے تیار رہتا ہے ۔ دراصل ہمیں دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات کو درست کرنے اور اپنے خیالات کی صحیح سمت متعین کرنے کی ضرورت ہے ۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ انسان چاروں ہاتھ پیروں پر نہیں چلتا بلکہ وہ سیدھا ہو کر چلتا ہے تاکہ وہ آسمان کو دیکھ سکے اور اس کے بارے میں غور کر سکے ۔ اس کا مقصد بہت بلند ہے ۔ بہرحال اسے سب سے پہلے اتنا کرنا ہے کہ دوسرے انسانوں کی جانب دستِ تعاون و دوستی دراز کرے اور ان کی مدد کرے ۔ اسی عالم گیر برادری میں خدا کا خالق ہونا ظاہر ہوتا ہے ۔ اس تعلق کو وفاداری سے قائم رکھنا ہی احترامِ انصاف ہے ۔

جنابِ محترم جسٹس قدیرالدّین احمد

کراچی کے عالی وقار آرچ بشپ صاحب، نے بے حد فکر انگیز خطبہ عنایت فرمایا ہے۔ آپ کے خیال میں آج جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ہے انصاف کی تحقیر نہ کہ اس کی توقیر۔ آپ نے دنیا کی بُرائیوں کو دُور کرنے کے لیے تین تجاویز پیش کی ہیں۔ اوّل یہ کہ عالمی انصاف و عالمی انحصار باہمی کے حقائق کے بارے میں عالم گیر پیمانے پر تعلیم کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ دوئم یہ کہ عدم تشدّد کی مہم چلائی جائے تاکہ عوام کی شرکت سے تشدّد کا لاوا نہ پھُوٹ پڑے۔ سوئم یہ کہ باہمی اعتماد کا ماحول پیدا کرنا چاہیے تاکہ تعلیمی کارروائی اور عدم تشدّد کے طریقے کو معاشرہ قبول کر سکے۔

ہز گریس نے جن نیک خیالات کا اظہار کیا ہے اُن کے لیے ہمیں ہز گریس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے میں دل و جان سے اِس خیال سے متفق ہوں کہ ہم سب کو حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہیے کہ یہ دنیا انسان کے لیے امن و سکون کا گہوارہ بن جائے۔

میرے خیال میں ہر شخص اپنے بچوّں، پڑوسیوں، ہم وطنوں اور دُنیا کے لیے کم از کم اتنی توقع ضرور کر سکتا ہے کہ انھیں مساوی برتاؤ اور انصاف نصیب ہو سکے گا۔ محترم آرچ بشپ صاحب یہ میری آرزو ہے (واقعی یہ میری دلی آرزو ہے) کہ یہ نامعقول دنیا آپ کی تینوں تجاویز پر عمل کرے۔

مجھے قوی اُمید ہے کہ اس دُنیا میں آخری فتح انصاف ہی کی ہوگی۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت لاکھوں انسان گندگی، غربت اور بیماریوں میں مبتلا ہیں، لیکن لاکھوں انسان ایسے بھی ہیں جو خوش ہیں آسودہ حال ہیں اور صحت مند ہیں۔ لاکھوں مرد عورتیں اور بچے چھوٹے بڑے شہروں میں، قصبات اور دیہاتوں میں باضابطگی سے پُرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جن حالات میں ہم زندگی گزار رہے ہیں وہ بہترین نہیں ہیں اور یقیناً انھیں معیاری تو کسی طرح کہا ہی نہیں جا سکتا، لیکن یوں تو خود انسان کبھی بے عیب نہیں ہے اور نہ کبھی بے عیب ہو سکتا ہے، کیونکہ ترقی اور ارتقا کی دوامی کارروائی کاملیت سے نا آشنا ہے۔ آئیے اس خامی کی وجہ سے مایوس ہونے کے بجائے ہم اپنی ہمّت بلند کریں۔ اس دنیا میں بے حد ناانصافیاں ہو رہی ہیں۔ تاہم یہ حالات اُس زمانے سے کہیں بہتر ہیں کہ جب انسانوں کو بادشاہوں کی ملکیت کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، اور لوگ ہر وقت ہتھیار باندھے رہتے تھے تاکہ حملہ آوروں، ظالموں اور لٹیروں کا مقابلہ کر سکیں۔ دنیا نے اب تک جو ترقی کی ہے وہ ایسی تو نہیں کہ ہم اُس پر فخر کریں۔ معاشی ناہمواری، سیاسی جارحیت

جہالت، بیماری، وسیع آبادیوں کو غلام بنانے کے لیے طاقت ور ریاستوں کی ریشہ دوانیاں اور آدمی کا نوعِ انسان کو نیست و نابود کرنے کے لیے تیاریاں کرنا ایسے خطرناک مسائل ہیں جن پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جب ہم ان باتوں کے بارے میں سوچتے ہیں اور اُن سے جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں اُن پر غور کرتے ہیں تو پھر ہم اپنے آپ کو کائنات کی وسعت میں کھڑا پاتے ہیں اور اس سیارے کی پس ماندگی پر افسوس کرتے نظر آتے ہیں جسے دُنیا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔
میں ایک لمحے کے لیے بھی ان مسائل کی اہمیت کو نہیں گھٹاتا اور نہ اُن پر فوری توجہ دینے کی ضرورت کو نظر انداز کرتا ہوں، لیکن چند منٹ کے لیے آپ کی توجہ آج شام کے موضوع کی تنگ حدود کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

آج کی مجلس کے لیے جس موضوع کو طے کیا گیا ہے وہ ہے "احترامِ انصاف اور قانونِ ملکی"۔ ان الفاظ کے دو معنی نکالے جا سکتے ہیں۔ ایک معنی کے لحاظ سے لفظ "احترام" کو "انصاف" اور "قانونِ ملکی" دونوں کے ساتھ پڑھنا ہوگا اور دوسرے معنی کے لحاظ سے انصاف کے احترام کو ملک کے قانون کے اعتبار سے سمجھنا ہوگا۔ ان دونوں صورتوں میں سے خواہ کوئی بھی صورت ہو مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ انصاف کا احترام قائم رکھا جائے تاکہ انصاف کے غالب آنے کے لیے حالات سازگار ہو جائیں لہٰذا میں اسی نقطۂ نظر سے اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔

انصاف کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ انسان آج تک نہ تو اس کی تعریف کر سکا ہے اور نہ اس کے حدود متعین کر سکا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے انیسویں صدی تک اسے ایک علیحدہ مضمون کی حیثیت نہیں دی گئی۔ بیشتر مصنفین، مفکرین اور مذہبی رہ نماؤں نے یہ سمجھا کہ انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ سمجھتا ہے کہ انصاف کیا چیز ہے۔ بے شک انسان انصاف کو سمجھتا ہے۔ اسی لیے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ آخر پھر اس کی وضاحت میں اتنی دشواری کیوں ہو رہی ہے۔ ایک زمانے میں انصاف کو نیکی کے مترادف تصور کیا جاتا تھا اور یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ انسانی فلاح و بہبود کے لیے جتنی بھی اچھی باتیں ہو سکتی ہیں وہ سب اس کے اندر موجود ہیں۔ بیسویں صدی میں اس خیال کا تجزیہ کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں تاکہ تعریف کے احاطے کے اندر اس کی اصل شکل و صورت دکھائی دے سکے۔
کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انصاف کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو اُس کی ضرورت کے لحاظ سے دے دیا جائے، لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک کو اُس کی قابلیت کے لحاظ سے دیا جائے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ رُتبے کے لحاظ سے دینا ہی انصاف ہے۔ ان نظریات کا تعلق ہے فوائد کی تقسیم سے ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی نظر میں انصاف کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک کو یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔ وکیلوں نے اس کے معنی کو محدود کر دیا ہے۔ انھوں نے اس کے اظہار کے لیے

"انصاف حسب قانون" کا فقرہ گھڑ لیا ہے۔ ان میں سے ایک تعریف بھی صریحی نقائص سے مبرّا نہیں۔ یہ مسئلہ اس بنا پر اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے کہ مفکّرین یہ چاہتے ہیں کہ انصاف کی ایک ایسی جامع تعریف تلاش کی جائے جو زمانۂ قدیم کے لیے اور قرونِ وسطیٰ کے لیے بھی اتنی ہی درست ہو کہ جتنی آج کل کے لیے۔ میرے خیال میں یہی بات غلط ہے، کیونکہ احساسِ انصاف تو ایک دوامی چیز ہے لیکن انصاف کی خصلت عملی اطلاق کے سلسلے میں وقت، حالات اور اشخاص کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب مشتبہ لوگوں کو شدید جسمانی و رُوحانی اذیت پہنچائی جاتی تھی تاکہ وہ جُرم کا اقبال کر لیں، اور اس کو انصاف کہا جاتا تھا۔ آج اس کو مناسب نہیں سمجھا جاتا، لیکن آج ذہنی غسل (Brain Washing) ایک فیشن بنتا جا رہا ہے۔ ہندستان میں ایک زمانے میں بیواؤں کو اُن کے مُردہ شوہروں کے ساتھ چتا میں زندہ جلا دیا جاتا تھا اور اُس کو انصاف سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح یورپ میں بدعتی لوگوں کو زندہ جلا دیا جاتا تھا اور آج شہروں کو بموں سے تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے اور ساری دنیا چشم پوشی اختیار کرتی ہے۔

انصاف کے مقابلے میں ناانصافی کے بارے میں سمجھنا زیادہ آسان ہے، کیونکہ انصاف کا تصوّر تجریدی ہوتا ہے جب کہ انصاف شکنی ہمیشہ ایک حقیقت کی صورت میں نظر آتی ہے۔ جب بھی کسی کو کوئی دُکھ پہنچتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ ناانصافی برتی گئی ہے، کیونکہ ہر شخص یہ تصوّر کرتا ہے کہ انصاف ہر مصیبت اور تکلیف کو روک لے گا۔ لہٰذا انصاف کی ماہیّت کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس کی تردید پر غور کرنا چاہیے۔ انصاف کی تردید ہمیشہ تردید کرنے والے کی شخصیت کے نشو و نما میں خرابی پیدا کرتی ہے۔ اس لیے گناہ بھی خود گناہ گار کے ساتھ ایک ناانصافی ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ قرآن پاک نے ہر قسم کی خطاکاری، بدعہدی اور غلطی کو خود خطاکار، بدعہد اور غلط کار کے ساتھ ناانصافی قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن پاک کہتا ہے کہ:

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ

یعنی جو بھی حکم کے خلاف کرے گا وہ خود اپنے ساتھ ناانصافی کرے گا

اور پھر کہا ہے کہ:

وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

یعنی۔ (سرکشی کر کے) انھوں نے ہم (خدا) کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا لیکن خود اپنی ارواح کو مجروح کر لیا۔

انصاف کے جب یہ معنی ہیں تو پھر اس کا احترام کس طرح ہونا چاہیے؟ لفظ احترام سے بلندی

یا شان وشوکت نہیں ظاہر ہوتی۔ اور غرور کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اس اندرونی خوبی اور عظمت کا تعلق ظاہر کرتا ہے جو کسی شے پر منعکس ہوتا ہے۔ یہ شے ایک عمارت بھی ہو سکتی ہے یا کوئی فعل یا طرزِ عمل۔

ایک عمارت اس وقت محترم ہوتی ہے کہ جب اس کی بناوٹ یا صورت سے کوئی محترم مقصد ظاہر ہوتا ہو۔ یہی بات ایک فعل اور طرزِ عمل پر بھی صادق آتی ہے۔ احترام ایک اندرونی خوبی کا عکس ہے لہٰذا جس طرح اعزاز عطا کیے جاتے ہیں اس طرح اسے عطا نہیں کیا جا سکتا۔ انصاف کا احترام اس وقت ہوتا ہے کہ جب اس کی ظاہری شکل اُس کی اندرونی خوبی کی مطابقت میں ہوتی ہے۔ یعنی اس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ انسانی ترقی میں مدد دے اور گمراہی سے بچائے۔ اس مقصد کی تکمیل میں انصاف کو بالکل بے خوف ہونا چاہیے اور کسی کے ساتھ نہ رعایت کرنی چاہیے اور نہ کسی سے بغض رکھنا چاہیے۔ دلیری اور معقولیت کی یہ خصوصیت اس کی فطرت کا ایک ایسا جزوِ لاینفک ہے کہ اکثر اُسے اُس انسان سے تشبیہ دی جاتی ہے جس کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ انصاف کو اس طرح پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کو اچھی طرح واضح کر دیا جائے کہ جب وہ اپنے مقصد کو پورا کرنے چلتا ہے تو پھر وہ نہ تو کسی انسان کی پرواکرتا ہے اور نہ نتائج کی۔

اس کارروائی میں پہلا قدم یہ ہوتا ہے کہ مسئلے کو سمجھا جاتا ہے۔ اس کام میں قانون اور منطق اس کی رہنمائی کرتے ہیں، لیکن انصاف نہ تو خالص قانون ہے اور نہ خالص منطق، وہ ان دونوں سے فائق ہے۔ اس بات کو مسلم تاریخ کے ایک مشہور مقدمے سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ ایک بار خلیفۂ وقت حضرت علیؓ کی ایک ایسی ڈھال چوری ہو گئی جو اُنھیں بے حد عزیز تھی اور وہ ایک یہودی کے پاس برآمد ہوئی، چونکہ اس یہودی نے ڈھال دینے سے صاف انکار کر دیا لہٰذا حضرت علیؓ نے قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ یہ قاضی خود حضرت علیؓ کا مقرر کردہ تھا۔ جو دو گواہ پیش کیے گئے اُن میں سے ایک حضرت علیؓ کے فرزند تھے اور دوسرا اُن کا غلام۔ قاضی نے اصرار کیا کہ غیر جانب دار گواہ پیش کیے جائیں مگر چونکہ اور کوئی گواہ نہ تھا لہٰذا مقدمہ خارج کر دیا گیا۔ یہ تھا قانون کے مطابق انصاف۔ وہ یہودی مسلمانوں کے انصاف اور غیر جانب داری کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور اُس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد اُس نے قبول دیا کہ ڈھال واقعی حضرت علیؓ کی ملکیت تھی۔ چنانچہ وہ اُس نے حضرت علیؓ کو واپس کر دی۔ یہ تھی احساس انصاف کے اظہار کی ایک شکل۔

ایک اور مشہور مقدمہ ہے جس کی صدارت خود ہمارے رسول پاکؐ نے فرمائی تھی۔ دو عرب حضورؐ کے

پاس کسی جائداد کی وراثت کا جھگڑا لے کر آگئے۔ ان میں سے ایک بڑا چالاک تھا۔ لہٰذا اُس نے خوب چرب زبانی سے کام لیا۔ آں حضرتؐ کچھ دیر تک سنتے رہے پھر بولے کہ میں بھی ایک انسان ہوں لہٰذا جو بیانات میرے سامنے دیے جائیں گے اُن ہی کی بنا پر میں فیصلہ کر سکوں گا۔ اگر فریقین میں سے کوئی بھی غلط بیانی کر کے مجھ سے غلط فیصلہ دلوا دے گا تو جو ناحق جائداد اُس کے قبضے میں جائے گی وہ جائز طور پر اُس کا حصہ نہ ہوگی اور جس کو بھی اس کے حق سے زیادہ مل جائے گا اُسے خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔ آں حضرتؐ کی زبانِ مبارک سے یہ سُن کر دونوں فریقین اتنے خوفزدہ ہو گئے کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ہر ایک یہ کہنے لگا کہ "میں اپنا حصہ اپنے بھائی کو دیتا ہوں"۔ اس پر آں حضرتؐ نے فرمایا "نہیں تم جاؤ اور شریعت کے مطابق اپنی جائداد تقسیم کر لو"۔

اس مثال سے انسانی اداروں کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے اور حضرت علیؑ کے مقدمے سے قانون کے مطابق انصاف کا احترام واضح ہوتا ہے۔ یہودی کا ڈھال واپس کر دینا ایک انصاف پسند نفس کی خوبی ظاہر کرتا ہے۔ انصاف کی پاکیزگی اُس کا حُسن ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو اُس کی فطرت اور اصلیت کی پاکیزگی ہے اور دوسری اُس کی شکل و صورت کی پاکیزگی ہے۔ ایک فعل، حکم یا فیصلہ اگر حالات کی مناسبت سے درست ہے تو وہ پاکیزہ ہے۔ مناسبت نہ صرف قانونی اور منطقی نقطے سے بلکہ انسان کے احساسِ انصاف کے لیے بھی اطمینان بخش ہے۔ حال ہی میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ جنرل یحییٰ خاں ایک غاصب تھے لیکن اسی کے ساتھ قانون احتیاج کا اطلاق بھی کر دیا۔ تاکہ سماجی نظام برقرار و محفوظ رہے۔ یہ اس پاکیزگی کی نہایت نمایاں مثال ہے۔ شکل و صورت کی پاکیزگی کا تعلق ہے قانون کی عملی کارروائی سے۔ اکثر اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ قانون کے مطابق حکم دے دینا ہی صرف کافی نہیں بلکہ دیکھنے والوں کو بھی یہ اطمینان ہو جانا چاہیے کہ اِس واقعی انصاف کیا گیا ہے۔ ظاہری شکل میں کئی باتیں شامل ہوتی ہیں مثلاً انصاف کرنے والے کی شہرت، اُس کی جفاکشی، اس کا غیر جانبدارانہ رویہ اور لالچ سے بچنے کی صلاحیت۔ اُس کا حُسنِ استدلال اور وضاحتِ خیالات۔ اور نتائج کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت۔

جس عمارت میں کسی ملک کی عدالت عالیہ قائم ہوتی ہے وہ عموماً خوب آراستہ ہوتی ہے اور اُس کی شکل و صورت سے شان و شوکت اور رعب ٹپکتا ہے۔

اعلا حاکمِ عدالت عموماً پختہ کار لوگ ہوتے ہیں جو مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اپنے طرزِ عمل میں سنجیدگی کا لحاظ رکھتے ہیں۔ انصاف کرنا کتنا سنگین کام ہے یہ اُن صفات سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ انصاف اُس وقت محترم ہوتا ہے جب وہ خالص ہوتا ہے اور قوانین اُس وقت محترم ہوتے ہیں جب وہ معقول ہوتے ہیں۔

احترامِ امن و انسانیت
اسلام کی نظر میں

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمدؐ سعید

مقالہ : جناب مولانا کوثر نیازی
وزیرِ اطلاعات، اوقاف و حج

شامِ ہمدرد، لاہور

۵ ستمبر ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

خواتین و حضرات!

آج شامِ ہمدرد کے مہمان مقرر ملک و قوم کے مشہور و معروف اور قابلِ احترام ادیب و شاعر اور خطیب مولانا کوثر نیازی یہاں تشریف فرما ہیں جنھوں نے اپنی بے پناہ دینی اور قومی مصروفیات کے باوجود حاضرینِ جلسہ سے خطاب کرنے کے لئے ہماری درخواست کو قبول فرماکر دلی شکریہ کا موقع دیا ہے۔ موصوف اپنے رسائل کی ترتیب و اشاعت، ریڈیو پاکستان سے اپنی نشریات اور اپنی متعدد تصانیف کی وجہ سے روشناسِ خلق ہیں۔ اس وقت اُن کے مزید تعارف کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

مولانا کوثر نیازی نے اپنے علمی ذوق اور دینی لگاؤ کی وجہ سے شامِ ہمدرد کے اس سال کے سلسلۂ موضوعات میں سے "احترامِ امن و انسانیت، اسلام کی نظر میں" کو پسند فرمایا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ یہ رائے قائم کرنے میں میرے ہم خیال ہوں گے کہ وہ اس موضوع کے لئے مناسب و موزوں ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ مجلسِ اقوام نے اپنے منشور کی بنیاد جذبۂ محبت پر رکھی تھی ـــــ اس محبت پر، جس کا نتیجہ کسی تقریبِ نکاح کی صورت میں یا جنسی ارتباطِ باہمی کے انداز میں برآمد نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک عظیم جذبہ ہے جس کا پَرتو انسانیت کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اور یہ قیامِ امن کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

خواتین و حضرات!

فضائے امن اور حصولِ عافیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور دونوں کا اتصال انسانیت کو عروج دیتا ہے۔ فضائے امن ہمارے مصائب و آلام کو دُور کرنے اور اُنھیں مندمل کرنے کے لئے ایک لازمی شے ہے۔ یہ نہ ہو تو انسانیت کا دامن تک ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ جب کسی قوم کو فضائے امن نصیب ہوجائے تو اُسے ذہنی آسودگی خود بخود میسّر آجاتی ہے اور اس طرح اُسے اپنا معیارِ انسانیت بلند کرنے کا موقع ملتا ہے۔

آپ امن و عافیت کی فضا پیدا کرکے اپنے دشمنوں کو خاموش اور بعض صورتوں میں حلقہ بگوش کرسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ ایسا مفید آلۂ کار ہے جو محاذِ جنگ پر استعمال ہونے والے

ہتھیاروں سے زیادہ سریع الاثر ثابت ہو سکتا ہے۔ فضائے امن پیدا کرنے والے انسانیت کو عروج دینے کے علمبردار کہے جا سکتے ہیں۔ امن کو فتح سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ہر فتح کسی کی شکست کا نتیجہ ہوتی ہے اور ایسی فتح نہ قابلِ احترام ہوتی ہے اور نہ دیرپا رہ سکتی ہے کیونکہ شکست کھانے والا لازمی طور پر اپنی ہزیمت کو فتح میں بدلنے کی کوشش کرتا رہے گا اور اس طرح امن و عافیت کی فضا جو اصولِ انسانیت پر مبنی ہو، کبھی قابلِ تعریف نہیں کہی جا سکتی۔ اگر امن کا قیام باعزت طریقے پر ممکن نہ ہو تو اُسے ایک عارضی سمجھوتے سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ انسانیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم رضائے الٰہی کے لئے جملہ بنی نوع انسان کے ساتھ مل جل کر پُرامن زندگی بسر کرنے کا اُصول اپنائیں اور اس پر ہر حال میں کاربند رہیں۔

امن کوئی جنس بازار نہیں ہے جسے ایک خاص رقم ادا کر کے خریدا جا سکتا ہو۔ اس کا حصول.... صرف دلوں کے باہمی افہام وتفہیم پر منحصر ہوتا ہے۔ قیامِ امن کی جدوجہد کرنے والوں کو بعض ناسمجھ لوگ غیر دانشمندانہ طور پر بُزدل کہہ دیتے ہیں، حالانکہ امن کی تمنا ایک پُرسکون آلہ کار ہے جو جنگ کے لئے نہیں، صلح کے لئے استعمال ہوتا ہے، تاکہ اس طرح انسانیت پروان چڑھ سکے۔

ہم مسلمانوں کے لئے امن اور انسانیت کا موضوع اسلامی نقطۂ نظر سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے جس پر محترم مولانا کوثر نیازی کو اپنے عالمانہ انداز میں خلوص وعقیدت کے ساتھ اظہارِ خیال کرنا ہے۔ [لہذا معزز سامعین کی طرف سے مَیں جناب موصُوف سے درخواست کرتا ہُوں کہ وہ اس علمی اور دینی موضوع پر حاضرینِ جلسہ سے خطاب فرما کر اُن کو اچھی طرح فیض پانے کا موقع دیں] —— جناب مولانا کوثر نیازی۔

مولانا کوثر نیازی

خواتین و حضرات!

قرآن حکیم اس دنیا میں امن کے فروغ اور سلامتی کی ترویج کو کس درجہ عزیز رکھتا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ بنی آدم کے لئے ایمان کو، جو امن سے ماخوذ ہے، نعمتِ عظیم ٹھہراتا ہے۔ اُس کی رُو سے خدا پر ایمان لانے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے نوعِ انسانی کو خوف و ہراس سے نجات ملتی ہے اور امن میسّر آتا ہے۔

مثلاً قرآن مومنوں کو بشارت دیتا ہے:

ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا (۲۴ : ۵۵)

(اور اللہ اُن کے خوف کو امن میں تبدیل فرمادے گا)

خوف کے بدلے میں امن کے عطیۂ خداوندی سے متعلق حضور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک ارشاد حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے مجموعۂ احادیث "مسندِ احمد" میں روایت کیا ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"اللہ امن و سلامتی کے قیام میں کچھ اس طرح تمہارا حامی و مددگار ہوگا کہ گھر کی چہار دیواری میں زندگی گزارنے والی پردہ نشین خاتون تن تنہا کسی محافظ و معاون کے بغیر مدینے سے الحیرہ کا یا اس سے بھی لمبا سفر بلا تامّل کر سکے گی اور کوئی چور اور رہزن اُسے خوف زدہ نہ کر سکے گا۔"

قرآن کی رُو سے "امن" خدا کا بنی نوع انسان پر اتنا بڑا احسان ہے کہ وہ آدمی کو اس کا واسطہ دیتا اور اُس کو جتلاتا اور کہتا ہے:

فلیعبدوا رب ھذا البیت الذی اطعمھم من جوع وامنھم من خوف ۝ (۱۰۶ : ۳)

(اُن پر اس گھر کے رب کی عبادت لازم ہے، جس نے انھیں بھوک میں رزق دیا اور خوف سے امان دی)

ایک آیۂ مبارکہ میں تو قرآن نے بڑے واضح الفاظ میں یہ اعلان بھی ضروری سمجھا کہ حضور سرورِ دو عالم فخرِ کائنات حضرت محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت اور کتاب اللہ کے نزول

سے اصل مقصد صرف یہ ہے کہ بنی نوع انسان پر سلامتی کی راہیں کھول دی جائیں۔
ارشاد ہوتا ہے :

"بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے۔ اللہ اس کے ذریعہ ان لوگوں کو، جو اُس کی رضا کے طلب گار ہیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا اور اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے"

قرآن کے نزدیک سلامتی اور امن کے راستے ہی در اصل روشنی کے راستے اور صراط مستقیم ہیں۔ ان کے سوا تمام وہ راستے جو بدامنی، بے چینی، فتنہ و فساد، ظلم و جور، زبردستی و زیادتی، خونریزی و سفاکی اور استحصال و غصب کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اندھیروں اور ظلمتوں کے راستے ہیں۔ اور اللہ کے نزدیک اندھیروں اور ظلمتوں کے راستے بنی نوع انسان کی گزرگاہ بننے کے قابل نہیں ہیں۔ خصوصیت سے اللہ کو یہ بات قطعاً پسند نہیں ہے کہ وہ مسلمان اندھیروں اور ظلمتوں کے راستوں کو پامال کریں اور جنھیں خَیرَ اُمّۃٍ کا اونچا خطاب بارگاہِ قدسی سے عطا ہوا ہے اور جن کا وصف یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ معروف باتوں کو عام کریں اور برائی سے روکیں
قرآن کے الفاظ ہیں :

کنتم خیر اُمّۃ اُخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر ہ (۳ : ۱۱۰)

(تم بہتر اُمّت ہو اور تمہاری ذمّہ داری یہ ہے کہ تم اچھائی اور نیکی کا حکم لوگوں کو دو اور انھیں ہر برائی اور ہر بے انصافی سے روکو)

قرآن ہر اُس شے کو معروف قرار دیتا ہے جس سے فتنہ و فساد رُکتا اور امن و سلامتی اور انصاف و عدل کی ترویج ہوتی ہے۔ قرآن ہر اس بے انصافی، بدامنی اور فتنہ و فساد اور ظلم و زیادتی کو منکر ٹھہراتا ہے، جس سے آدمیت وانسانیت کو نقصان پہنچتا ہے۔
سورۂ المائدہ کی ایک آیتِ کریمہ اس بات میں ایک بڑی ہی وزنی شہادت ہے۔ حکم ہوتا ہے:

یاایھا الذین اٰمنوا کونوا قوّامین للہ شھداء بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علی الّا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون (۵ : ۸)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو مضبوط چٹانوں کا سا دم خم اپنے اندر پیدا کرلو اور اللہ کی خاطر عدل وانصاف کے نگراں بن جاؤ۔ کسی قوم کی دشمنی تمہیں بالکل اس بات پر نہ اکسائے کہ تم عدل وانصاف سے کام نہ لو۔ ہر حال میں عدل کرو کہ عدل

تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ سے ڈرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو وہ اُس سے باخبر ہے)
مسلمان قوم نے قرونِ اولیٰ سے لے کر آخر وقت تک عدل وانصاف کی ترویج اور امن وسلامتی کے قیام میں جد وجہد کی ہے اُس کی مثال کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ امن کو خدا کا سب سے بڑا عطیہ جان کر اُسے پُوری طرح فروغ دیا۔ مسلمانوں نے عدل وانصاف کو ہمیشہ اپنا قومی منصب جانا ہے۔ مگر دشمنانِ اسلام کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ انھوں نے اسلام پر ہمیشہ یہ طعن کیا ہے کہ اسلام امن کا نہیں جنگ کا مذہب ہے۔ انھوں نے "جہاد" کو بالکل غلط معنی پہنائے ہیں اور اُس کو جنگ وجدال کے مترادف قرار دیا ہے۔ حالانکہ اہلِ علم اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جہاد لفظ جُہد سے مشتق ہے۔ اور جُہد کے معنی سخت محنت کرنے اور مشقت اُٹھانے کے ہیں۔
قرآن نے جہاں کہیں جہاد کا لفظ استعمال فرمایا ہے اُس سے یہی مراد لی ہے مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

وَالذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (۲۹: ۶۹)

(جو ہم تک رسائی پانے کے لیے محنت ومشقت سے
کام لیتے ہیں ہم انھیں اپنے تک آنے والے راستوں پر
چلا دیتے ہیں)

ایک دوسری جگہ جہد کا مفہوم اس طرح واضح کیا گیا ہے:

ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ (۲۹: ۶)

(جس نے محنت ومشقت سے کام لیا اس نے
یہ مجاہدہ اپنی ذات کے لئے کیا ہے)

خیال رہے کہ یہ آیات مکّی دَور میں نازل ہوئی تھیں۔ دراصل بات وہ ہے جو تاج العروس میں بیان ہوئی ہے:

وحقیقتہ الجہاد کما قال الراغب المبالغۃ واستفراغ الوسع
والجھد .... وھو ثلثۃ اضرب مجاھدۃ العدو و
والشیطان والنفس ۰

(اور جہاد کی حقیقت یہ ہے جیسے کہ امام راغب نے کہا ہے کہ اپنی پوری
طاقت واستعداد کے مطابق مکمل کوشش وجہد کا نام جہاد ہے۔ اور وہ تین
طرح کا ہے۔ یعنی دشمن کا مقابلہ، شیطانی قوتوں سے نبرد آزمائی اور
نفسانی خواہشات سے جنگ)

اسلام بڑی شاندار تاریخ کا مالک ہے اور یہ روشن و تابناک تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں نے شیطانی قوتوں اور نفسانی خواہشات کا مقابلہ ہر وقت کیا ہے۔ ہمیشہ نفسِ امّارہ اور تعیشِ ذات کے خلاف جنگ کے نادر نمونے پیش کیے ہیں۔ مگر تلوار صرف اس وقت اُٹھائی ہے جب امن و امان کا قیام اس کے بغیر ممکن نہ رہا تھا اور جب قرآن کی رُو سے مسلمان لڑنے کے لئے سخت مجبور کر دیے گئے تھے اور اُن پر دشمنوں کے ظلم کی کوئی انتہا باقی نہ رہی تھی۔ انھیں اُن کے وطن سے زبردستی اس لئے نکال دیا گیا تھا کہ وہ کہتے تھے "اللہ ہمارا رب ہے"۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

اُذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا وان اللہ علیٰ نصرہم
لقدیرہ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا
ان یقولوا ربنا اللہ ۵ (۲۲: ۳۹،۴۰)

(اجازت دی گئی ان لوگوں کو لڑنے کی، جن پر ظلم کیا گیا ہے، جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے، محض اتنی سی بات پر کہ وہ کہتے تھے "اللہ ہمارا رب ہے")

سورۃ النساء میں یہی بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

ومالکم لاتقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین
من الرّجال والنّساء والولدان الذین یقولون ربنا
اخرجنا من ھٰذہ القریۃ الظالم اھلہا ۵ (۴-۷۵)

(کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کے راستے میں ان کمزور لوگوں کے بچاؤ کی خاطر لڑتے نہیں ہو جن میں سے کچھ مرد ہیں، کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچّے ہیں اور جو اللہ کے حضور دست بدعا ہیں کہ ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال دے جس کے باشندے ظالم ہیں)

اور لطف کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو ظلم کے انسداد کی خاطر لڑنے کی اجازت تو ملی، انھیں کمزوروں اور ناچاروں کی حفاظت و دفاع کے لئے قتال کا حکم تو ہوا، مگر اُن پر بڑی سخت پابندی بھی عائد کر دی گئی۔ فرمایا:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا
تعتدوا ان اللہ لایحب المعتدین ۵ (۲: ۱۹۰)

(اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور قطعًا
تعدّی سے کام نہ لو، زیادتی نہیں کرو، کیونکہ اللہ زیادتی کرنے
والوں کو پسند نہیں کرتا)

قرآن کی یہ تصریحات اس امر کی دلیل ہیں کہ اللہ کو جنگ و جدال اور زیادتی بالکل پسند نہیں ہے۔ اور وہ جنگ کی اجازت بھی صرف اُس وقت دیتا ہے، جبکہ جنگ کے بغیر کوئی اور چارۂ کار باقی نہ رہے۔ اور جب اس جبری جنگ کا مقصد پورا ہوجائے یا جب دشمن جنگ سے باز آجائے اور صلح کے لئے ہاتھ پھیلائے تو پروردگار کے نزدیک صلح ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما
جعل اللہ لکم علیھم سبیلا ۝ (۴ : ۹۰)

(اگر وہ لڑائی کرتے کرتے اُس سے گریز کریں، تم سے نہ لڑیں اور تمہیں
صلح کی پیشکش کریں تو پھر اللہ تمہیں ان سے لڑنے کی اجازت نہیں دیتا)

یہی بات سورۂ انفال کی اس آیت میں واضح کی گئی ہے:

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ انہ ھو السمیع العلیم۝
وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ ۔ (۸ : ۶۱)

(اگر دشمن صلح و سلامتی کا ہاتھ پھیلائے تو تم بھی اپنا ہاتھ آگے کردو
اور اللہ پر توکل کرو کہ وہ سمیع و علیم ہے۔ اور اگر وہ تم سے دھوکا کرنا
چاہیں تو جان لو کہ اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔

خواتین و حضرات!

ذرا غور فرمایئے گا ان الفاظ پر اور اس مفہوم پر جو ان الفاظ میں مضمر ہے۔

اسلام کو اس دنیا کے لئے نصیحت اور امن و سلامتی کو خدائی عطیہ قرار دینے والے رب العالمین کے نزدیک صلح و سلامتی جنگ و جدال پر اس درجہ مقدّم اور اس حد تک قابلِ ترجیح ہے کہ وہ حضور سرورِ کائناتؐ اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے ساری مسلمان نسلوں کو حکم دیتا ہے کہ اس خدشے کے باوجود کہ دشمن کا مقصود فریب دہی ہو تو بھی اپنی طرف بڑھتے ہوئے صلح کے ہاتھ کو جھٹکو نہیں۔

یہی اور صرف یہی بات اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے اور انتہائی نتیجہ خیز معاہدۂ حدیبیہ کی محرّک بنی تھی۔ حالانکہ مورّخ ابنِ اسحاق، مورّخ ابنِ ہشام، مورّخ ابنِ سعد، مورّخ ابن خلدون اور مورّخ ابن کثیر کہتے ہیں کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سنہ ۶ ھ میں جب حج بیت اللہ کے ارادے سے

مدینہ سے مکہ کی سمت روانہ ہوئے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب سترہ سو ایسے نفوس قدس تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اشاروں پر ساری کائنات اور اُس کی جملہ قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی سکت اپنے اندر رکھتے تھے۔ اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے مکہ کے سفر کے دوران کہیں کبھی لڑائی کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ قریش کے ان دو سواروں کو بھی کوئی سزا نہ دی جو ابنِ سعد کی روایت کے مطابق بڑی گستاخی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیمہ گاہ تک بڑھ آئے تھے۔ بلاشبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں گستاخی سے باز رکھنے کے لئے اُن کے سامنے صف بندی کی اور ہتھیاروں کی نمائش بھی فرمائی، مگر جوں ہی رات کا اندھیرا پھیلا، جوں ہی نقل وحرکت کو پوشیدہ رکھنے کی گنجائش پیدا ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی صفیں پیچھے ہٹالیں اور رات کے اندھیروں میں چھپتے حدیبیہ کے مقام پر آن پہنچے جو مکہ سے صرف سات میل اس طرف واقع تھا۔

حدیبیہ پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم رُک گئے اور اُن کے سامنے قریش کی جو سفارت بدیل بن ورقہ کی قیادت میں پیش ہوئی اس سے انھوں نے بڑے واضح الفاظ میں کہا:

"ہم تم سے لڑنے نہیں آئے۔ ہم صرف بیت اللہ کی زیارت کرنا چاہتے ہیں، البتہ اگر کسی نے ہمیں بیت اللہ تک پہنچنے سے روکا تو ہم اُس سے ضرور لڑیں گے۔"

ابنِ سعد کے الفاظ ہیں:

فمن صدعنه قاتلناه (ابن سعد جز ۳ ص ۷۰)

اس کے باوجود جب اس سفارت کے بعد کئی اور سفارتیں آتی گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین ہوگیا کہ بدباطن قریش شدید لڑائی کے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبۃ اللہ کی زیارت سے مشرف نہیں ہونے دیں گے اور اس لڑائی سے بڑی خونریزی ہوگی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے اس وعدے پر صلح کرلی کہ وہ اگلے سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کا حج کرنے سے نہیں روکیں گے اور فریقین میں اس مدت تک کوئی لڑائی نہیں ہوگی۔ اور عرب قبائل جس کا ساتھ دونوں میں سے چاہیں گے دیں گے۔

یہ صلح چونکہ حدیبیہ کے مقام پر تحریر میں آئی تھی اس لئے اس نے "صلح حدیبیہ" کا نام پایا ہے۔ مورخ ابن اسحاق راوی ہیں کہ اسلامی لشکر میں جو سترہ سو شجاعوں پر مشتمل تھا کوئی ایک شخص بھی تو اس صلح کا حامی نہ تھا۔ خصوصیت سے اکابر صحابہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت

علی مرتضیٰؓ اور دوسرے بڑے تو اس صلح کے سخت خلاف تھے۔
ابن ہشام نے اس بحث کی تفصیل پیش کی ہے کہ جو حضرت عمر فاروق ؓ نے تمام لشکریوں کا نمائندہ بن کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا تھا کہ آپؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ اور کیا ہمارے مدِمقابل مشرک نہیں ہیں؟
حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "میں اللہ کا رسول ہوں۔ ہم مسلمان ہیں۔ اور وہ مشرک ہیں۔"
جناب عمرؓ نے پوچھا: "پھر ہم دین کے معاملے میں بُزدلی سے کیوں کام لیں اور دشمن کا ڈٹ کر کیوں مقابلہ نہ کریں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا:

انا عبد الله ورسوله لن اخالف امره - (ابن اسحاق - ابن ہشام جلد ۲ - ص - ۲۲۰)

(میں اللہ کا بندہ اور اُس کا رسول ہوں۔ میں اُس کے حکم کی نافرمانی بالکل نہیں کروں گا)

گویا یہ اللہ کا حکم تھا کہ قریش اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان خونریزی نہ ہو، اور امن وسلامتی کا معاہدہ قائم ہو۔
حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ کے اس حکم کی مطابقت میں جناب علیؓ کو حکم دیا کہ معاہدۂ صلح تحریر میں لائیں اور لکھیں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥"
خیال فرمائیے کہ یہ الفاظ معاہدے کے کتنے بے ضرر اور کتنے عام فہم تھے۔ یہ اللہ، رحمٰن ورحیم کے نام سے تحریر کا آغاز تھا۔ مگر قریش کے ضدی سفیر سہیل بن عمرو نے اعتراض کیا: "مجھے ان الفاظ سے واقفیت نہیں ہے ان کی بجائے "باسمك اللّٰهم" لکھا جائے۔" حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جناب علیؓ کو حکم دیا: "سہیل جو کہتا ہے وہ لکھ دو۔" جناب علی رضؓ نے حکم کی تعمیل کی۔
حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اگلی عبارت لکھوائی:

"هٰذا ما صالح علیہ محمد رسول الله وسهیل بن عمرو....

سہیل نے ٹوکا: "اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مان لیتے تو پھر آپ میں اور ہم میں جھگڑا کیوں چلتا، اور لڑائیاں کیوں ہوتیں۔" اُس نے تجویز پیش کی: "آپ ان الفاظ کے بجائے اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں۔"
مؤرخ الطبری کہتے ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جناب علی رضؓ کو حکم دیا: "لفظ رسول اللہ...

کاٹ دو"۔ مگر جناب علیؓ نے یہ بات نہ مانی اور عرض کیا: "حضورؐ میں آپ کے نام سے یہ الفاظ بالکل نہیں کاٹوں گا۔ میں آپ کا نام نہیں مٹاؤں گا۔"

یہ محبت و عقیدت اور وفائے فرض میں عجیب کشمکش شروع ہوگئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کشمکش کو بالکل طول نہ دیا اور اپنے ہاتھ سے رسول اللہ کے الفاظ کاٹ دیئے اور اُن کی بجائے "محمد بن عبداللہ" اپنے قلم مبارک سے لکھا۔

میں اس معاہدے کی ایک ایک بات اور ایک ایک شق کا ذکر نہیں کروں گا۔ البتہ یہ اشارہ لازمی سمجھتا ہوں کہ یہ جو نازک مرحلہ پیش آیا تھا، ایسے کئی مرحلے اور کئی معاہدوں کے دوران پیش آئے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اور سہیل بن عمرو کی ہر ضد مان لی اور معاہدہ مرتب کر کے صحابہ کو حکم دیا: "اپنے بال مونڈ دیں۔ احرام کھول ڈالیں اور قربانیوں کے جو جانور ساتھ لائے ہیں انھیں ذبح کر دیں۔"

ابن اسحاق، ابنِ ہشام، ابنِ سعد، الطبری، ابن کثیر اور ابن اثیر کی ایک جیسی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ حکم دیا تو ساتھی سخت ناراض اور رنجیدہ تھے۔ انھوں نے تعمیلِ ارشاد میں تامل برتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تامل دیکھا تو حضورؐ نے اُمِ سلمہؓ حرم نبوی کے مشورہ پر اپنے بال منڈوائے اور اپنے ساتھ کے جانور قربان کئے۔ بات عمل کے اس مرحلے میں پہنچی تو ساتھیوں نے بھی ایک دوسرے کے بال مونڈے۔ (ابن اسحاق جز ۲۔ ص ۔ ۲۳۔ ابن کثیر جز ۴۔ ص ۱۶۸۔ الطبری جز ۳۔ ص ۷۹۔ ابن خلدون جز ۲ ص ۲۲۔ ابن اثیر جز ۲ ص ۷۷۔ البخاری جز ۲ ص ۱۲۲)

جو کرب و بے چینی اور جو رنج و غم اس وقت پوری جماعت پر مسلط تھا، اس کی کیفیت امام بخاریؒ نے اپنے ایک راوی صادق کی زبان سے اس طرح بیان کی ہے:

وجعل بعضهم يحلق بعضا حتى كاد بعضهم يقتل بعضا غمًا

(البخاری جز ۲ ص ۱۲۲)

(ابن کثیر جز ۴ ص ۱۷۶)

"(ساتھیوں پر اس قدر غم مُسلط تھا کہ قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے کا سر مونڈتے مونڈتے ایک دوسرے کو ذبح کر ڈالیں)"

مگر اسلام کے ہادی اور اُن کو مبعوث کرنے والے رب العالمین ربّ النّاس اور مالک النّاس کے نزدیک اس غم کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس خونریزی اور اس بدامنی کے مقابلے میں جو جنگ کی

صورت میں رُونما ہوتی۔ اس لئے صلح حُدیبیہ کی ایک ایک دفعہ پر عمل ہوا اور نہ صرف اس وقت ہوا دوسرے سال یعنی ۷ھ میں بھی ہوا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور فوج اپنے ساتھ لے کر مکّہ تشریف لائے تھے اور بیت اللہ کے طواف کا شرف پایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ابھی کچھ مدّت پہلے قریش کے ایک بہت بڑے حلیف گروہ یہودانِ خیبر کا دم خم توڑا اور اُن کے گلوں میں اپنی ماتحتی کے طوق ڈالے تھے۔ ابھی چند دن پیشتر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن، بنی فزادہ، بنی مرہ اور غطفان جیسے بڑے بڑے عرب سرکش قبائل کی گردنیں اپنے حضور خم کی تھیں اور قریش کے سوا پُورے وسطی عرب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا کوئی بڑا حریف باقی نہ رہا تھا۔ اس کے باوجود تاریخ بڑے فخر اور انبساط کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ مکّہ میں قیام فرما ہونے کے بعد یہ چوتھے دن کی پہلی گھڑی تھی کہ سہیل بن عمرو نے جو قریش کا سفیر تھا مکّہ کی ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو آواز دی:

"محمدؐ بن عبداللہ ہمارے شہر سے نکل جاؤ۔ معاہدے کے مطابق
تین دن پورے ہو گئے۔"

محمدّ مصطفیٰ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کے بجائے اگر کوئی دوسرا سیاست داں ہوتا یا اگر محمدّ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کو امن وسلامتی کی فضا حد درجہ عزیز نہ ہوتی تو وہ مکّہ پر زبردستی قبضہ کر سکتے تھے کیونکہ اس وقت وہ مکہ کے ایک ایک گھر پر متصرف تھے، اور سارے قریش اپنے گھروں کو خالی کر کے مکّہ سے باہر چلے گئے تھے۔ مگر محمدّ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم نے، جن کے نزدیک امن وسلامتی کے معاہدوں کی پابندی حکمِ خدا کی پابندی کا وزن رکھتی تھی، سہیل بن عمرو کی یہ ہانک سنی تو مکّہ خالی کر دیا اور تلواروں کا کھیل بالکل نہیں کھیلا۔ حالانکہ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ جناب سعد بن عبادہؓ نے جو اسلامی فوج کے نائب سپہ سالار کے طور پر مکّہ میں داخل ہوئے تھے، سہیل بن عمرو کو جواباً للکارا بھی تھا۔

"اے سہیل بن عمرو! تو جھوٹا ہے۔ نہ یہ تیرا شہر ہے، نہ تیری ماؤں
کا اور نہ باپوں کا۔ بخدا محمدؐ اس شہر سے نہیں نکلیں گے۔"

جناب سعد بن عبادہؓ کی یہ للکار محبت ووفا اور دوستی کا اظہار تھی۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس پر بالکل کان نہیں دھرے اور اسلامی سپاہ کا رُخ مدینہ کی سمت پھیر دیا۔ اور اس معاہدے کی کسی بھی شق کو نہیں توڑا جو قریش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں پچھلے سال تحریر میں آیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود قریش نے اپنی حماقت اور جہالت کے سبب اس معاہدے کو عملاً توڑ ڈالا

اور معاہدے کے ایک ذیلی اور مسلمہ فریق قبیلہ خزاعہ پر ایک دوسرے ذیلی فریق بنی بکر کے ساتھ مل کر جارحیت کی۔

مورخ ابن سعد کی رُو سے یہ ۸ ہجری کا مہینہ شعبان تھا از صلح حدیبیہ کو تحریر میں آئے چوبیس مہینے ہوئے تھے کہ قریش کی طرف سے یہ بدعہدی وقوع میں آئی۔

مورخ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بنی بکر اور قریش نے معاہدہ حدیبیہ کی یوں خلاف ورزی کی تو خزاعہ کا ایک وفد چالیس اکابر پر مشتمل مدینہ حاضر ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بدعہدی پر اس قدر رنج ہوا کہ وہ بیٹھے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس حال میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر زمین پر گھسٹ رہی تھی اور وہ فرما رہے تھے کہ:

لا نصرت ان لم انصر بنی کعب (ابن سعد جز ۳ ص ۹۷۔

الطبری جز ۳ ص ۱۱۳۔ ابن اثیر جز ۲ ص ۹۱۔ ابن خلدون جز ۲ ص ۲۳۲)

(اگر میں نے بنی کعب کی مدد نہ کی تو اللہ میری مدد نہیں کرے گا)

خزاعہ کے شاکی بن کر حضور نبوی میں حاضری کی خبر قریش کو ہوئی تو وہ سخت گھبرائے اور ان کا سردار ابوسفیان معاہدے کی تجدید کے لئے مدینہ کی طرف دوڑ پڑا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کو ناکام لوٹا دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک معاہدہ شکنی قطعاً گوارا نہ تھی اور قریش نے معاہدہ شکنی کر کے معاہدوں کا احترام سخت مجروح کیا تھا۔

اس کے باوجود تاریخ کہتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قریش کو اس بدعہدی کی سزا دینے کے لئے جب ایک لشکرِ جرار کے ساتھ مکہ تشریف لائے اور ابوسفیان نے ڈر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی اور اسلام لے آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نقیبوں کو حکم دیا کہ ہر سُو منادی کرا دیں کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا، وہ امن میں ہوگا جو کوئی حکم بن حزام کے گھر میں بیٹھ رہے گا وہ بھی امن میں ہوگا اور جو اپنے گھر کے دروازے بند کر کے اپنے گھر میں مقیم رہے گا، باہر نہیں نکلے گا، اُسے بھی امن نصیب ہوگا (ابن اسحاق ابن ہشام جز ۲ ص ۲۸۶۔ ابن کثیر جز ۴ ص ۲۹۰۔ الطبری جز ۳ ص ۱۱۶۔ ابن خلدون جز ۲ ص ۲۳۴-۲۳۵)

ابن اثیر راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن اپنے امرائے لشکر سے عہد لیا تھا کہ آج کے دن کسی کو قتل نہیں کریں گے، بجز ان کے جو آگے سے ہتھیار اُٹھائیں گے۔

الفاظ یہ ہیں:

قد عھد الی امرائہ ان لا یقتلوا احدا الا من قاتلھم۔

ذرا اس سے آگے بڑھیے اور قدوسی لشکر پر بھی ایک نظر ڈالئے اور تاریخ اسلام کے اس درخشاں دن کا تصور ذہن میں لائیے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم تلے اس دن دس ہزار قدوسی جمع تھے۔ وہ جب وادی مکہ میں داخل ہوئے تھے تو یہ وادی لرز لرز گئی تھی اور ابو سفیان جناب عباس کے پہلو میں کھڑا اسلامی کاروان کو آگے بڑھتے دیکھتا تو گھبرا کر پوچھتا تھا یہ کون گزرا۔

جناب عباس قبائل کا نام لیتے جاتے تھے۔ پہلے بنو سلیم گزرے، پھر مزینہ، اور جہینہ آگے بڑھے۔ پھر مرکز نبوت آگے کو پھیلا جس کے دائیں بائیں انصار و مہاجر روشن ستاروں کی طرح دمک رہے تھے۔ مگر اس شان و شکوہ اور اس جاہ و جلال کے ساتھ مکہ کے اندر سے گزر کر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری جب کعبۃ اللہ کے دروازے پر پہنچی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے خطابِ عام فرمایا تو سب کو عام معافی عطا کی اور بڑی صاف دلی کے ساتھ ان سے کہا:

لا تثریب علیکم الیوم

الیوم یوم برّ و وفاء

(آج کے دن تم سے کوئی باز پرس نہ ہوگی

(آج کا دن بھلائی اور وفا کا دن ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اس دن ہی کو معافی اور بھلائی اور وفا کا دن قرار نہ دیا بلکہ بیت اللہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرمت کا شہر ٹھہرایا اور پوری نوعِ انسانی سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

"اے آدم کے بیٹو! اور سارے جہان کے لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئی ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ اُن کی حرمت ویسی ہی ہے جیسی کہ تمہارے لئے اس دن کی، اس مہینے کی جو اس بیت الحرام میں ہے۔" (ابن اثیر جز ۲ ص ۹۲۔ ابن خلدون جز ۳ ص ۲۳۔ البخاری جز ۳ ص ۶۵)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن انسانی جانوں کی حرمت کا جو اعلان فرمایا تھا، یہی اسلام کی بنیادی حکمت عملی ہے۔ قرآن نے اس سلسلے میں ایک اساسی اصول وضع کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

من قتل نفساً بغیر نفسٍ او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً ○ (۵ : ۳۲)

(جس نے کسی جان کو بلا جواز شرعی یا حق یا زمین پر فساد کرنے کے جرم کے بغیر قتل
کیا تو گویا اُس نے سارے لوگوں کو ایک ساتھ مار ڈالا۔ اور جس نے کسی
ایک جان کو زندگی بخشی تو گویا اُس نے بنی نوع انسان کو زندہ کر دیا ہے)

قیامِ امن کی اصل بنیاد یہ ہے کہ لوگ انسانی جان کا کہاں تک احترام کرتے ہیں اور اس سلسلے میں' میں دعوے سے کہتا ہوں کہ قرآن حکیم نے انسانی جان کو جو تحفظ عطا کیا ہے' یہ تحفظ دنیا کے کسی بھی دستور اور کسی بھی نظامِ حیات نے مہیا نہیں کیا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم' جن پر یہ قرآن اُترا تھا' انسانی جان کو اس درجہ عزیز رکھتے تھے کہ محدّث البخاری کہتے ہیں کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم جن لوگوں کو اسلام میں داخل کرتے اور اطاعت کی بیعت لیتے تھے' اُن سے جہاں کئی اور بنیادی باتوں کا اقرار کراتے' وہاں اُن سے یہ عہد بھی لیتے تھے کہ وہ انسانوں کو قتل نہیں کریں گے۔ امام بخاریؒ کی یہ روایت مشہور صحابی جناب عبادہؓ کی روایت ہے۔ وہ اپنا ذاتی قصّہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جب اُن سے اسلام کی بیعت لی تو اُن سے عہد لیا تھا کہ شرک نہیں کریں گے' زنا نہیں کریں گے' چوری نہیں کریں گے اور نہ اس شخص کو قتل کریں گے جس کا قتل اللہ نے جائز نہیں رکھا۔

امام بخاریؒ ہی نے ایک اور روایت اخراج کی ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مسلمانوں سے فرمایا تھا:

اوّل مایقضی یوم القیامۃ فی الدماء

(قیامت کے دن خدا کے حضور جو مقدمے سب سے پہلے فیصل ہوں گے
وہ قتل کے مقدمے ہوں گے)

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ہر قسم کا قتل' خواہ وہ مسلمانوں کا باہمی قتل تھا یا ریاست کے زیرِ سایہ رہنے والے غیر مسلمانوں کا قتل تھا' سخت ناپسند تھا۔ اسی لئے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ سخت وعید فرمائی تھی:

من قتل معاھد الم یرح رائحۃ الجنۃ

(جس نے اسلامی پناہ میں رہنے والے شخص کو قتل کیا اُسے جنت کی کوئی
خوشبو بالکل میسّر نہ آئے گی)

یہ کتنی بڑی وعید ہے' یہ کتنا بڑا ڈراوا ہے' جو ان لوگوں کو دیا گیا ہے' جو اسلام کے اہلِ ذمہ کے قتل کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اہلِ ذمہ کی آبرو اور جان کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو تحفظ دیا تھا اور جو شدید نگرانی اُن کے حقوق

قرآن حکیم نے دین میں جبر کی ممانعت کی تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ مذہب کے معاملے میں کسی پر سختی روا رکھنا یا عقائد کے باب میں کسی کو بُرا بھلا کہنا اس لئے بھی عبث ہے کہ ہر شخص اپنے ہی مذہب کو اچھا سمجھتا ہے۔ اس لئے محکم دلائل کے ساتھ حق بات واضح کر دینے کے بعد ہر ایک کا معاملہ اُس کے خدا پر چھوڑ دو۔ وہی خود اس سے آخرت میں نمٹ لے گا۔ فرمایا:

کذالک زیّنا لکلّ اُمۃ عملھم ثم الیٰ ربّھم مرجعھم فینبّئھم
بما کانوا یعملون ٥ (۶: ۱۰۸)

(اس طرح ہم نے ہر گروہ کے اعمال اُس کی نگاہ پر خوشنما بنا دیئے، پھر ان سب کو اپنے رب کی طرف واپس جانا ہے۔ تو وہ اس وقت ان کو اُن کے اعمال کی حقیقت سے آگاہ کر دے گا)

یہ بھی وضاحت کر دی کہ دین کے معاملے میں جبر کی اجازت ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسان کو مختار ہی کیوں بناتا خود کیوں نہ اُسے مجبور بنا کر مومن و مسلم کر لیتا۔ فرمایا:

ولو شاء ربك لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ
النّاس حتی یکونوا مومنین ٥ (۱۰: ۹۹)

(اگر آپ کا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے تو پھر کیا تم لوگوں کو اس بات پر مجبور کرو گے کہ وہ ایمان لے آئیں)

فرمایا تمہارا کام یہ ہے کہ تم اسلام کی تبلیغ کرتے رہو۔ ایمان کا لانا یا نہ لانا ہر ایک کا ذاتی معاملہ ہے۔

فذکر انما انت مذکر۔ لست علیھم بمصیطر (۸۸: ۲۱، ۲۲)

(آپ تو بس نصیحت کر دیا کیجئے کیونکہ آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں آپ اُن پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے)

اور یہی حق اُس نے دوسرے مذاہب کا بھی تسلیم کیا ہے کہ اُن کے ماننے والے اپنے اپنے دائرے میں اپنے اپنے عقیدے اور عمل کے مختار اور ذمّہ دار ہیں۔ دلیل اور برہان کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق اُن کو بھی حاصل ہے لیکن دین کے معاملے میں جبر وہ بھی نہیں کر سکتے۔ سورۂ شوریٰ میں فرمایا:

اللہ ربّنا وربّکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم لا حجّۃ
بیننا وبینکم اللہ یجمع بیننا والیہ المصیر ٥ (۴۲: ۱۵)

(اللہ ہمارا بھی مالک ہے، تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہماری تمہاری کچھ بحث نہیں اللہ ہم

سب کو جمع کرے گا۔ اور اُسی کے پاس جانا ہے)

خواتین وحضرات!

پُرامن بقائے باہمی، جس میں ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلنے اور اُس کی تبلیغ کرنے کی اجازت ہو اور انسانی جان کا احترام ہو، یہ دراصل اسلام کی تعلیماتِ اجتماعی کی اساس ہیں اور یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر عالمی امن کے قیام کا انحصار ہے۔ آج جبکہ ہر چہار طرف انسانیت پر بدامنی کے بادل چھائے ہوئے ہیں، اگر اقوام عالم اپنے مصنوعی اور قطعی بے کار ضوابط کی جگہ صرف اُسے اپنا چارٹر بنا لیں تو میں پورے وثوق کے ساتھ آپ کو اور دنیا کو، ہر قوم کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا سے فتنہ وفساد، جدال وقتال اور باہمی چپقلش معدوم ہو جائے گی اور جارحیت کا نام ونشان تک باقی نہ رہے گا۔

احترامِ آدمی

كلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمد سعید

مقالہ : جناب محترم ڈاکٹر برہان الدین احمد فاروقی

شامِ ہمدرد، لاہور

۷۔ ستمبر ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

اسلام کا احسان جہاں یہ ہے کہ اُس نے انسان کو طرح طرح کے معبودوں سے چھٹکارا دلایا اور ہزاروں سجدوں سے نجات دلائی، اور ایک معبودِ حقیقی کے آگے سجدہ ریز کیا وہاں اسلام کا احسانِ عظیم انسان پر یہ بھی ہے کہ انسان کو اُس کی عظمت سے بھی آگاہ کیا اور اشرف المخلوقات بنا کر تمام مخلوقات پر فوقیت دی۔ پھر یہی نہیں، انسان پر انسان کی برتری کے گنجلک سے نکال کر "سب انسان برابر ہیں" کا اعلاترین چارٹر بھی عطا کیا۔ کسی انسان کو کسی انسان پر فوقیت نہیں ہے۔ فوقیت و عظمت کا اگر کوئی معیار ہے تو وہ صرف نیک اعمال ہیں اور اعلا کردار:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

یعنی: "خدا کے نزدیک تم میں سے زیادہ مکرم وہ ہے جو متقی ہے۔"

یہ معیار ایسا ہے جس کا تعلق نہ نسل سے ہے اور نہ قوم سے، نہ رنگ سے ہے اور نہ زبان سے، نہ وطن سے ہے اور نہ پیدائش سے، نہ دولت سے ہے اور نہ حکومت سے اور نہ وزارت سے۔ یہ ایسا معیار ہے جس پر ہر انسان اپنی کوشش سے پورا اُتر سکتا ہے اور عظمت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ سکتا ہے۔ اِسلام نے اہلِ ارض کو بتایا کہ انسان آزاد ہے۔ اللہ تعالیٰ سے انسان کا تعلق براہِ راست ہے، اتنا براہِ راست کہ اسلام نے خدا اور انسان کے درمیان مذہبی پیشواؤں کو بھی نہیں رکھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ انسانی عظمت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی۔ انسان اللہ تعالیٰ کی افضل ترین مخلوق ہے، وہ زمین و آسمان کی اعلاترین ہستی ہے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ انسان کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ

یعنی: "اُس نے اپنے حکم سے رات دن، سورج، چاند اور ستارے
مسخر کر کے تمہاری خدمت کے لیے مقرر کر دیے۔"

انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔ فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا گیا:

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً

"میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔"

پروردگارِ عالم نے انسان میں اپنی رُوح پھونکی ہے۔

وَ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ

"میں نے اس میں (انسان میں) اپنی روح پھونکی"

وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ

"اور ہم نے بنی آدم (انسان) کو لائقِ اکرام بنایا"

اس لائقِ اکرام اور قابلِ احترام آدمی کو اللہ تعالیٰ نے نیک و بد کی تمیز اور خیر و شر کا امتیاز بخشا تاکہ وہ دنیا میں خیر کو عام کرے اور شر کو مغلوب کرے۔ سب سے اچھا معاشرہ وہ ہے جو انسان کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے، اس کے احترام کو قائم کرتا ہے۔ اور انسان و انسانیت کا قدردان ہوتا ہے۔ ایسا معاشرہ وہ ہوتا ہے جس میں ہر انسان کو یکساں مواقع حاصل ہوں جو ہر قسم کے استحصال سے آزاد ہو، جو انسان کو معاشرے کے ایک ذمّے دار رُکن کی حیثیت سے پھلنے پھُولنے اور ترقی کرنے کے پورے پورے مواقع فراہم کرتا ہو۔ ایسے معاشرے کی سب سے اعلا قدر انسانیت ہوتی ہے اور امن اس کی نمایاں خصوصیت۔ جب انسان انسانیت کے اعلا مرتبے سے گر جاتا ہے تو دنیا سے سکون و اطمینان غائب ہوجاتا ہے، رواداری، رفاقت، دوستی، بھائی چارے اور تعاون کی جگہ نفاق، انتشار، خود غرضی، نفسانفسی، بدامنی اور بدنظمی لے لیتی ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں انسان پریشان و خستہ حال ہو، ایسا معاشرہ جس میں شرفا اور اہلِ فکر و نظر پر عرصۂ حیات تنگ ہو، اور ایسا معاشرہ جس میں اسلام کے نام پر غیر اسلامی اعمال و حرکات جاری ہوں، اور ایسا معاشرہ جس میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہو، اور ایسا معاشرہ جس میں انسان اپنے قومی اور دینی تشخص کو برقرار نہ رکھ سکے۔ ایسا معاشرہ جس میں بھائی بھائی کا خون پی رہا ہو۔ ایسے پلید و غلیظ معاشرے میں انسانیت اور آدمیت دم توڑ دیتی ہے اور شیاطین ملک و ملت کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں اور اُن کے مذموم ہتھکنڈے انسانیت کا مذاق اُڑاتے رہتے ہیں۔ آج اسلام حقیقت شناسی کا دوسرا نام ہے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو حقیقت آشنا کر کے انسانی تعلقات کی بنا حقیقت پسندی پر رکھی ہے۔ قوموں، قبیلوں، علاقوں، زبانوں کے اختلافات کو ایک حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور اس طرح اسلامی معاشرے کی بنیاد امن و سلامتی اور رواداری پر رکھی ہے۔ ظلم و زیادتی کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی ہے اور اُس کا منشا بھی امن و آزادی کی حفاظت ہے، جان و مال کی حفاظت ہے۔ دین کی حفاظت ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ

لَقَدِیْرٌ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰه

" ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دے گئی ہے جن سے جنگ کی جاتی ہے ، کیونکہ اُن پر بہت ظلم کیا گیا ہے اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ اُن کو (یعنی مسلمانوں کو) غالب کر دینے کی پُوری قدرت رکھتا ہے جو اپنے گھروں سے بلا وجہ نکالے گئے (اُن کا کوئی جُرم نہ تھا) محض اتنی بات پر کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے ۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا مسلمانوں کو جنگ کی اجازت صرف اسی صورت میں ہے کہ جب اُن کے اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے میں رکاوٹ ڈالی جائے، اُن پر ظلم کیا جائے، اُن کی جان مال محفوظ نہ ہو، مختصراً اُن کی آزادی میں خلل ڈالا جائے اور امن کو تباہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ گویا جنگ بھی امن و سلامتی کے لیے ہو، جنگ کو ختم کرنے اور جنگجویانہ ذہنیت کی اصلاح کے لیے ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے جنگ کا مقصد شر و فساد، ظلم و زیادتی اور حصولِ زر اور جلبِ مُنفعت نہیں ہے بلکہ اصلاح و فلاح ہے۔ فتنے کا انسداد ہے۔ جبر و تشدد کی مدافعت ہے۔ فساد و بدامنی کا خاتمہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امن پسندی، رواداری، محبّت، ہمدردی، عفو و درگزر مسلمانوں کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں، وہ مظلوم کے حامی و ناصر اور ظالم کے مخالف تھے۔ اُن کی حکومت امن و صلح کی عَلَم بَردار ہوتی تھی، اُن کے بڑے کمزوروں کے محافظ ہوتے تھے، خدمت اُن کا شعار تھی، اُن کے حاکم اپنی رعایا کے خادم ہوتے تھے، خاکساری اُن کا طرۂ امتیاز تھی، لیکن اسلامی تعلیمات سے دُوری نے انسان سے انسانیت اور آدمی سے آدمیت چھین لی، انسانی اقدار کا احترام بُھلا دیا، اب شرافت کی جگہ شرارت نے، انسانیت کی جگہ شیطنت نے، انصاف کی جگہ جانب داری اور بے انصافی نے، رواداری کی جگہ تعصب نے، امن کی جگہ فساد نے اور رحم کی جگہ ظلم نے لے لی ہے۔

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

خواتین و حضرات

آج انسان مغلوب ہے اور شیطان غالب - آدمیت شرمسار ہے اور حیوانیت حاوی۔ مولانا رومی کو ایک بزرگ ملے تھے جو چراغ ہاتھ میں لیے گھوم رہے تھے اور رات کی تاریکی میں کسی نایاب شے کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ مولانا رُومی نے دریافت کیا کہ کس چیز کی تلاش ہے ؟

فرمایا کہ مجھے "انسان" کی تلاش ہے۔ میں چوپایوں اور درندوں سے عاجز آچکا ہوں، مجھے ایک ایسے انسان کی تلاش ہے جو مردِ کامل ہو! مولانا رُومی نے کہا کہ اس عنقا کا ملنا آسان نہیں، اس ضعف و پیری میں آپ اس تلاش و جستجو کے متحمل کیسے ہوسکیں گے، میں نے بھی انسان کو بہت تلاش کیا، کامیابی نہیں ہوئی۔ فرمایا کہ مجھے جو چیز نہیں ملتی اس کی جستجو بڑھ جاتی ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

آج شامِ ہمدرد کی صدارت پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب محترم انوارالحق صاحب فرمارہے ہیں۔ ایک جج کی حیثیت سے بھی محترم موصوف کو ہرروز بلکہ ہمہ وقت مسئلہ انسانیت و آدمیت سے واسطہ رہتا ہے، کرسیٔ قانون اور عدل و انصاف پر جب وہ رونق افروز ہوتے ہیں تو جب تک انتہائی احترامِ آدمیت و انسانیت نہ ہو وہ اس منصبِ جلیلہ کا حق ادا نہیں کرسکتے تو جب موضوعِ سخن ہی یہ ہو تو اس شامِ ہمدرد کی صدارت کرنے اور کلماتِ حکم دینے کے لیے اُن سے موزوں شخصیت اور کون ہوسکتی ہے۔ اس کے باوصف جناب جسٹس صاحب مملکتِ پاکستان کی اُن عظیم شخصیتوں میں ہیں کہ جن سے تعمیرِ پاکستان عبارت ہے۔ آج یہاں ان کی موجودگی ہمارے لیے باعثِ مسرت ہے اور اُن کے کلمات ہمارے لیے وجہِ طاقت۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب کا شمار پاکستان کے مفکّرین میں ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وہ مسائل ملک و ملّت کو دیکھتے ہیں اور اُن کا حل بھی اسی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ اُستاذ کی حیثیت سے وہ پاکستان میں بھی درس گاہوں میں اہم خدمت انجام دے چکے ہیں اور انھوں نے نئی نسل کو صحیح راہ دکھانے کی حتی المقدور جدوجہد کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب آج احترامِ آدمی پر آپ سے خطاب فرمائیں گے۔

اگر آج کی شامِ ہمدرد کے نتیجے میں ہمارا سویا ہوا آدمی اور ہماری خفتہ انسانیت بیدار ہوجائے تو حق ادا ہوجائے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

جنابِ محترم ڈاکٹر برہان الدّین احمد فاروقی

ایم اے، پی، ایچ، ڈی (علیگ)

آج کی نشست میں جس موضوع پر مجھ سے اظہارِ خیال کی فرمائش کی گئی ہے وہ ہے "احترامِ آدمی" یہ ایک ایسا ہمہ گیر موضوع ہے جس کا تعلق فرد اور معاشرے کی زندگی کے ہر پہلو سے ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

اور جو خصوصیت انسان کو لائقِ احترام بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں فرمایا ہے لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ

ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی

لہٰذا احترامِ آدمی ایک فرض ہے جو ہر شخص پر عائد ہوتا ہے۔ اور احترام ہر انسان کا حق ہے جو اُسے ادا ہونا چاہیئے۔ چاہے وہ قاتل ہی کیوں نہ ہو۔

"فرض" عبارت ہے کسی قانون کے واجب العمل ہونے کے شعور سے اور "حق" نام ہے کسی مفاد کے واجب التکمیل ہونے کے شعور کا۔ اس طرح معاشرتی زندگی میں فرائض اور حقوق باہمی جوابی اور وجوبی طور پر مربوط ہیں۔ اس ضمن میں احترامِ آدمی ایک ایسا فریضہ ہے جسے افراد اپنے اوپر لازم نہ کریں تو وہ معاشرہ کے بجائے بہائم کا مجموعہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ جنھیں معاشرہ کہنا معاشرے کی توہین ہے۔ فرائض کی بجا آوری پر اصرار ہی افراد کو عمرانی حیثیت عطا کرتا ہے اور حیاتِ عمرانی کی برکات کے مشاہدے سے یہ یقین راسخ ہوتا ہے کہ انسانی شخصیت کے احترام سے حیاتِ عمرانی میں خوش گواری اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ہر انسان کے لیے شخصیت کی تعظیم ہی سب سے زیادہ خوش گوار اور پسندیدہ عمل ہے اور بے تعظیمی سے بڑھ کر کوئی اور طرزِ عمل نہ تو ناپسندیدہ ہوسکتا ہے نہ ناگوار تر۔

مگر جب حیاتِ عمرانی میں محرکِ عمل فرائض کی بجا آوری پر اصرار کے بجائے مطالبۂ حقوق پر اصرار بن جائے تو افراد اور فرد کے درمیان تضاد اُبھرآتا ہے اور تصادم پیدا ہونے لگتا ہے۔ اسی صورتِ حال کا تدارک کرنے کے لیے اللہ پاک فرماتا ہے واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا و لا تفرّقوا۔ اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑ لو اور علیٰحدہ علیٰحدہ نہ ہو جاؤ۔ اور اجتماعی یک جہتی

اللہ تعالیٰ ہی کی عطاکردہ ہدایت کی پیروی میں مضمر ہے۔
یہاں غور طلب یہ امر ہے کہ احترامِ آدمی کے خلاف فضا خود بخود پیدا نہیں ہو جاتی۔ وہ عداوت وعناد کے سبب سے پیدا کرائی جاتی ہے۔ اور اس کے موجبات یہ ہوتے ہیں کہ جب کوئی سیاسی طالع آزما جو نفسیاتی طور پر ہوسِ اقتدار کا مریض ہو جاتا ہے اور نفع بخش فیض رسانی اور نشوونما دینے کی صلاحیت سے محروم ہونے کے باعث اپنی قیادت کو تسلیم نہیں کروا سکتا تو مطالبۂ حقوق پر اصرار کے ذریعے "اختناقِ عمومی" (Mass Hysteria) پیدا کر کے برسرِ اقتدار آتا ہے تو مطالبۂ حقوق پر اصرار سے فرائض کی بجا آوری پیرا نہیں رہتا جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ تمدنی نظام درہم برہم ہونے لگتا ہے اور جرائم پروری کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور انسان نوازی کا ہر امکان ختم ہو جاتا ہے اور احترامِ آدمی باقی نہیں رہ جاتا۔ جسے اس میں شبہ ہو وہ ہمارے معاشرے میں قتل و غارت، استحصال بالجبر، فحاشی، فاحشہ کاری، چوری، ڈکیتی کی بڑھتی ہوئی واردات کا مشاہدہ بھیک مانگتے ہوئے اس کا فرانہ تصور سے ہٹ کر کرے کہ انسان فطرتاً خود غرض، وحشی درندہ ظالم اور کمینہ ہے تو اسے نظر آئے گا کہ یہ سب خرابیاں احترامِ آدمی کے ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں۔ غور طلب یہ ہے کہ احترامِ آدمی کے زائل ہو جانے کا سبب کیا ہے؟ اور احترامِ آدمی پھر سے کیونکر بحال کیا جا سکتا ہے؛ یہ مسئلہ زندگی کے تقاضوں کو سمجھ کر حل کیا جا سکتا ہے۔

زندگی بالفعل (Actually) اور بالقوہ (Potentially) کچھ چیز ہے۔ بالفعل کچھ چیز ہونے کی حیثیت سے اس کی ہستی ہے اور بالقوہ کچھ چیز ہونے کی حیثیت سے یہ مستقبل میں کچھ بن جانے کے امکان کے ساتھ تبدیل ہو رہی ہے اور اس اعتبار سے یہ "عمل" ہے "پیدائش" ہے "تخلیق" ہے اور "ترقی" ہے۔ بحیثیت عمل کے اس مقصد کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے جس کی سمت یہ بڑھ رہی ہے اور عروج و زوال اور فنا کی مصداق ہے۔ بحیثیت پیدائش کے جو نتائج یہ پیدا کرتی ہے اُن کے حوالے سے اس پر حکم لگایا جا سکتا ہے۔ بحیثیت تخلیق کے اس کا جائزہ پیدائش میں جدت اور ابداع کے خصائص کی بنا پر لیا جا سکتا ہے اور بحیثیت ترقی کے اس کی پیمائش اِس پیمانے سے ہو سکتی ہے کہ یہ کس حد تک بہ تدریج اپنے مقصد سے قریب تر ہوتی جاتی ہے۔
لہذا زندگی ایک حرکت ہے اور حرکت اُس وقت ممکن ہے جب جزوًا ماحول کے ساتھ سازگاری اور مسلسل منصوبہ بندی جاری رہے۔
منصوبہ بندی سے یہاں میری مراد ہرگز خاندانی منصوبہ بندی نہیں، کیونکہ افراد ہی سرچشمۂ تخلیق

معیشت ہیں۔ میرے نزدیک کسی عظیم مقصد کی خاطر سرکٹوا کر ہی معیشت اور آبادی میں تناسب پیدا کرنا ہماری عظمت کے شایانِ شان ہے۔

کیونکہ منصوبہ بندی کشمکش اور تصادم سے دوچار ہوتی ہے جس میں کامیابی اور ناکامی مضمر ہے اس لیے اس حقیقت کو سمجھنا ازبس ضروری ہے کہ کامیابی صرف ان ہی اقوام یا افراد کا حصّہ ہے جو اپنے مقاصد کی عظمت کے پیشِ نظر زندگی کو ایک متاعِ حقیر سمجھ کر جان کی بازی لگانے کو حیاتِ دوام کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور جن کا عزم یہ ہو صرف وہی عزّت و احترام کے مستحق ہیں کھوٹے سکّے اپنی قیمت نہیں پا سکتے۔ ؎

قلب پہلومس زند بازر بہ شب
انتظار روز می دارد ذہب

انسان حیاتی سطح پر زندگی کا ایک ایسا مظہر ہے جو اپنی فطرت میں اس حد تک عمرانی ہے کہ بغیر معاشرے کے نہ وجود میں آسکتا ہے نہ ترقی کر سکتا ہے۔ اس لیے زندگی عمرانی، معاشی، اخلاقی، سیاسی، قانونی، انفرادی، ثقافتی پہلو رکھتی ہے۔ اس کے مضمرات میں عوام قوم اور ثقافت داخل ہیں اور جو لوگ اس ملک میں ایسی ثقافت کی تبلیغ پر مُصر ہیں جس میں "احترام آدمی" مفقود ہے وہ اس ملک، اس قوم اس ریاست اس کے عوام اور اس کی تہذیب کے دشمن ہیں۔

انسانی فطرت میں ایک تضاد ہے جو اور کسی مخلوق میں نہیں ہے۔ اس تضاد کے باعث انسان کو ہر ایسی مخلوق پر برتری حاصل ہے جس میں تضاد نہ ہو جیسے حیوان اور فرشتہ، کیونکہ اس تضاد کے باوجود انسان اپنے با اختیار ارادے کی بدولت اپنی فطرت کے سفلی میلانات پر غلبہ حاصل کر کے اپنی زندگی کو منظم اور منضبط کرتا ہے تو وہ "احترام" کا مستحق اس لیے ہوتا ہے کہ غلط روی کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اُس نے اپنے آپ کو صراطِ مستقیم سے ہٹنے نہیں دیا اور اِسی خصوصیت سے متصف افراد عزّت و تعظیم کے مستحق ہیں، کیونکہ وہ اس آزمائش میں پُورے اُترتے ہیں کہ ان کے جبلی داعیات انھیں بے راہ کر سکتے تھے اس کے باوجود انھوں نے اپنے عمل کو غلط نہ ہونے دیا۔

عمرانی اعتبار سے احترام و عزّت کا حق صرف اُس معاشرے کو حاصل ہوتا ہے جس کا نصب العین افراد کو سلامتی مہیا کرنا اور ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رکھنا ہو۔ اور افراد بھی معزز اور مفتخر ہو سکتے ہیں جو سلامتی عطا کرنے والے معاشرے کی بقا اور استحکام کے لیے اپنی تمام استعدادیں وقف کر سکیں مگر یہ تب ہی ممکن ہو گا جب افراد اور جماعتوں کا محرکِ عمل مطالبۂ حقوق کے بجائے فرض کی بجا آوری ہو جس کے تحت تمام حقوق از خود ادا ہو جائیں گے۔ جس معاشرے میں جان

مال اور آبرو کی سلامتی کی ضمانت مہیا نہ ہو اُس کی حفاظت کا ولولہ عوام میں باقی نہیں رہتا۔ اور جب مفاد پرستانہ تخریب کاری پر عامل قومیں اپنے حریفوں کو مٹانا چاہتی ہیں تو انہیں غافل رکھنے کے لیے امن و آشتی کا فریب کارانہ نعرہ لگا کر جنگ کی تیاری کے لیے مہلت حاصل کرتی ہیں اور خود کو ہر ضابطے کی پابندی سے مستثنیٰ سمجھتی ہیں اور جن جماعتوں کو بزعمِ خویش مغلوب سمجھتی ہیں اُن سے ہر ضابطے کی پیروی کی توقع رکھتی ہیں۔ اندریں صورت احترامِ آدمی کی فضا قائم نہیں رہ سکتی ظلم سے سازگاری کرنے والی اپنی بے حمیتی کی بنا پر بین الاقوامی زندگی میں اُس عزت اور وقار سے محروم ہو جاتی ہیں جو اُن کا انسانی حق ہے۔ اور ایسی قوم کا کوئی فرد جو اپنے وقار کو دوبارہ بحال کرنے کا ولولہ نہیں رکھتا اپنے آپ کو احترامِ آدمیت کے حق سے محروم کرتا ہے اِسی ماحول میں انسانی وقار کو از سرِ نو بحال کرنے کے لیے جان کی بازی لگانا ہی پہلا اور آخری فریضہ بن جاتا ہے۔

معاشی تخلیق عمرانی تعاون کا ایک ناگزیر عمل ہے۔ جن فریقوں کے تعاون سے دولت کی تخلیق ہوتی ہے اُن کے درمیان تعاون تخلیقِ دولت کی ناگزیر شرط ہے۔ چاہے تخلیق معیشت کا ذریعہ ملازمت ہو یا زراعت یا تجارت ہو یا صنعت جن کے تعاون سے دولت پیدا ہو گی، اُن کے فرائض کو نافذ کرنے کا ضابطہ برقرار رہے گا تو تعاون برقرار رہ سکے گا۔ اگر ضابطہ کے ذریعہ سے نفع بخشی فیض رسانی اور نشو و نما کو برقرار رکھا جا سکے گا تو معاشی تخلیق کے عمل میں کبھی تعطّل پیدا نہ ہوگا اور تخلیق معیشت کی کارکردگی میں تعطّل پیدا ہو جائے تو ملکی معیشت کو تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تخلیقی جدوجہد میں تعطّل اس عناد و عداوت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو یک طرفہ مطالبۂ حقوق پر اصرار کا نتیجہ ہے اس سے حقوق میں تصادم پیدا ہو جاتا ہے۔ حقوق کا تصادم نہ تو سرمایہ دارانہ معیشت کے حامل معاشرے میں رفع ہوتا ہے نہ اشتمالی معیشت کے حامل معاشرے میں اس لیے یہ دونوں معاشرے مفاد پرستانہ تخریب کاری سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ایک میں انفرادی حقوق اور انفرادی آزادی کے نام پر چند افراد پوری قوم کو حقوق سے محروم کرتے ہیں اور دوسرے میں اجتماعی حقوق کی حفاظت کے نام پر انفرادی حقوق اور انفرادی مفادات کو پامال کیا جاتا ہے۔ ظلم و استبداد کا سایہ دونوں طرز کی معیشتوں میں برقرار رہتا ہے۔ ایک معاشرے میں فریب کاری سے اور دوسرے طاقت کے بل پر تصادم میں حقوق کو نظر انداز کیا جاتا ہے جس کا مشاہدہ ہم آج کر رہے ہیں۔

مطالبۂ حقوق کے نعرے نے وہ تعاون فنا کر دیا ہے جو تخلیقِ معیشت کے لیے ضروری ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مطالبۂ حقوق کے اصرار نے حیاتِ عمرانی میں دشمنی کا دوگونہ محرک پیدا کر دیا ہے، کیونکہ جو

حقوق طلب کرتا ہے اور جس سے حقوق طلب کیے جاتے ہیں دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اس لیے دونوں کے اندر عداوت و عناد کی نفسیات نشو ونما پاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس ہم آہنگی اور سازگاری کا ہر امکان ختم ہوجاتا ہے جو معاشی تخلیق کی جدوجہد کے لیے ضروری ہے اور ان احوال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملکی معیشت تباہ ہوجاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ " احترامِ آدمی" کے فنا ہوجانے کا نتیجہ ہے۔ اس نے ہماری صنعتوں کو معطل کر کے رکھ دیا ہے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے کوئی ریاست صرف اس وقت ریاست کہلانے کی مستحق ہے جب وہ انسانی خصائل کو محفوظ کرنے کے لیے اندرونی اور بیرونی موثراتِ اختلال کا تدارک کرسکتی ہو اور یہ اس وقت ممکن ہوگا جب سیاسی تناقص رفع ہوجائے اور سیاسی تناقص احترامِ آدمی کے مٹ جانے سے پیدا ہوتا ہے اور احترامِ آدمی کے قائم ہونے سے رفع ہوتا ہے۔ ریاست منظم معاشرے کا نام ہے اور تنظیم عبارت ہے حاکم اور محکوم کے وجود میں آنے سے جب تنظیم پیدا ہوجائے اور حاکم و محکوم وجود میں آجائیں تو حاکم کو محکوموں سے بجبر اطاعت کا مطالبہ کرنے کا حق بھی قانوناً مسلّم ہوجاتا ہے۔ سیاسی تناقص کی ابتدا ہوتی ہے۔ سیاسی تناقص یہ ہے کہ اگر محکوموں سے اطاعت کا مطالبہ اُن کی بہی خواہی کے بجائے ہوسِ اقتدار کی تسکین کی غرض سے کیا جائے تو ایک مستبد ریاست قائم ہوتی ہے جس کا ٹیکسیشن لوٹ ہوجاتا ہے پولیس دہشت انگیز بن جاتی ہے فوج قصابی بن جاتی اور اُس کی عدالتیں عدل و انصاف کی قربان گاہیں بن جاتی ہیں اور یہ سب کچھ احترامِ آدمی کے فریضے سے سرتابی کا نتیجہ ہے۔ اگر اطاعت کا مطالبہ ہوسِ اقتدار کی تسکین کے بجائے عوام کی بہی خواہی کی غرض سے کیا جائے تو تناقص رفع ہوجاتا ہے اور ایک فلاحی ریاست وجود میں آتی ہے جس کی سخت گیری بھی رحمت ثابت ہوتی ہے۔ مگر یہ تب ہی ممکن ہے کہ حاکم اور محکوم دونوں ایک انداز سے منزل من اللہ قانون کے تابع ہوں اور محکوموں کے مقابلے میں ایسی کوئی مراعات حاکموں کو حاصل نہ ہوں جو قانون کی نظر میں حاکم کو محکوموں سے ممیز کرتی ہوں۔

قانون کی نظر میں آدمیت کا احترام یہ ہے کہ کسی مجرم کو شہادت کے بغیر سزا نہ دی جاسکے اور مجرم کو سزا دینے کا فرض بھی اس لیے عائد ہوتا ہے کہ ایک مجرم جو اپنے بااختیار ارادے کے تحت اپنے آپ کو قانون سے منحرف کرتا ہے وہ اپنی انسانی شرافت اور شخصی عظمت کو اپنے جرم کی بدولت پامال کرتا ہے اِس لیے انتقاماً سزا کا مستوجب ہے۔ اِس سزا کی بنیاد بھی احترامِ آدمیت ہے۔ جلالتِ قانون یعنی Majesty of Law کا تصور بھی احترام



ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ، جسٹس انوار الحق (صدر مجلس)



جسٹس انوار الحق (صدر) ، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی (مقرر)



حکیم محمد سعید، جناب سید سبط بنی نقوی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری (صدر)



جناب سبط بنی نقوی (مقرر)، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری



ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری تقریر کر رہے ہیں

آدمی سے ماخوذ ہے اُس کی تہہ میں وہی شخصی عظمت ہے جو ایک چور ڈاکو اور قاتل کی ذات میں لائقِ احترام ہے۔ عدالتِ قانون کا سطحی اور سرسری منظر تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص عدالتِ عالیہ کے حدود میں داخل ہونے گئے تو اسے عدالت کی عمارت کے بیرونی دروازے پر ایک پہرے دار نظر آئے جس کی وردی پر سنگین چڑھی ہوئی ہو اگے چل کر وہ ایک عظیم الشان عمارت میں داخل ہو پھر ایک اونچی چھت کی گیلری نظر آئے۔ پھر ایک بڑے کمرے میں داخل ہو جس پر مخمل کا قالین بچھا ہوا اور ایک بہت بلند مقام پر عزت مآب جج صاحب تشریف رکھتے ہوں جن کے وقار کا تقاضا یہ ہو کہ کوئی شخص انھیں "مائی لارڈ" کے بغیر خطاب نہ کر سکے اور اُن کے وقار کے تحفظ کے لیے یہ بھی ضروری ہو کہ اگر کسی شخص نے اپنے گھر کی چہار دیواری کے اندر باورچی خانے میں بیٹھ کر اپنی بیوی سے گفتگو کے دوران کوئی ایسا کلمہ ادا کیا ہو جس سے عدالت کی توہین کا پہلو نکلتا ہو اور اس کی شہادت بہم پہنچ جائے تو اُسے توہین عدالت کے جرم میں سزا دی جا سکے عدالت کو یہ عظمت و شان اس بنیاد پر حاصل ہوتی ہے کہ مجرم کی شخصی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ جب اُسے حقِ زیست سے محروم یا زندہ رہنے کے حق کو بحال کرنے کا فیصلہ درپیش ہو تو کوئی معمولی حیثیت کا شخص اُس کی تقدیر کا فیصلہ نہ کر سکے بلکہ اُس کا فیصلہ ایسے فرد کے ہاتھ سے ہو جسے ہر فرد کے مقابلے میں ایک ایسا خصوصی امتیاز حاصل ہو جو کسی اور کو حاصل نہ ہو یہ سب عظمت و شان احترامِ آدمی کی وجہ سے مسلّم ہوتی ہے۔

مگر آج اپنے نظامِ افکار سے منحرف ہو جانے کے باعث ہم احترامِ آدمی سے محروم ہو گئے ہیں کہ اس فریضے سے غافل ہو گئے ہیں۔

ہم میں سے کوئی فردِ واحد ایسا نہیں جس نے دانستہ یا نادانستہ غلط راہوں سے دولت و اقتدار حاصل کرنے والوں کو گوارا نہ کیا ہو اور اُن کی عزت و توقیر میں اضافہ کر کے آدمیت کی تحقیر و تذلیل میں اضافہ نہ کیا ہو۔

سوال یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرے میں اور اپنی حیاتِ قومی میں احترامِ آدمی کو دوبارہ کیسے قائم کر سکتے ہیں اور اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اپنی قومی زندگی کو مفاد پرستوں کی گرفت سے آزاد کرا کے ہی اس قابل ہو سکیں گے کہ قرآن مجید کے اس حکم پر عمل کر کے لکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالباب پہلے ہم بین الاقوامی سطح پر اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کریں۔ قرآن کا فیصلہ ہے العزت للہ ولرسولہ وللمومنین اور اللہ کی عطا کردہ ہدایت کی روشنی میں رسول اللہ کے اتباع سے ہم احترامِ آدمیت کو سیکھ بھی سکتے ہیں اور بحال بھی کر سکتے ہیں۔

اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ جرائم پیشہ، غدار، دشمن اور مفاد پرست افراد سے قوم کی غلط رہنمائی سے اپنے آپ کو

بچانے کی اور صالح قیادت کے میسّر آنے کی دُعا کریں اور اس کے لیے مقدور بھر سعی کریں تو ہماری زندگی اپنے نظام افکار پر اپنے نمونۂ ثقافت کے مطابق ڈھل سکے گی۔ اس کے لیے ہمیں اللہ تعالیٰ سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق طلب کرنی چاہیے۔

احترامِ علم و حکمت

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمد سعید
مقالہ : جناب محترم سیّد سبطِ نبی نقوی
کلماتِ صدارت : جناب محترم مولانا محمد فضل الرحمٰن الانصاری القادری

شامِ ہمدرد، کراچی
۲۱ ستمبر ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

قرآن حکیم کی جو آیت سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اُس میں علم حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔

(۹۶ - ۱ تا ۵)

پڑھیے اپنے رب کا نام لے کر جس نے (مخلوقات) کو پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ آپ پڑھا کیجیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم دی اور انسان کو اُن اشیا کا علم دیا جن سے وہ ناواقف تھا۔

اس طرح مسلمانوں کا پہلا سبق علم کی اہمیت ہے۔ اور اسلام ہی وہ پہلا دین ہے جس نے علم کو ایک مخصوص طبقے سے نکال کر عام انسانوں تک پہنچایا اور بار بار علم حاصل کرنے کی ترغیب دی اور تاکید کی۔ قرآن حکیم میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اضافۂ علم کی دعا کرنے کی ہدایت دی گئی۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۔(۲۰:۱۱۴)

یعنی۔ "اور آپ دعا کیجیے کہ اے میرے رب میرا علم بڑھا دیجیے۔"

ہمیں بتایا گیا ہے کہ اہلِ علم کا درجہ بے علموں سے بڑا ہے، اور عالم و جاہل برابر نہیں ہو سکتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۔(۳۹:۹)

یعنی: "آپ کہیے کہ کیا علم والے اور جہل والے کہیں برابر ہوتے ہیں۔"

قرآن کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے علم حاصل کرنے کو اوّلین اہمیت دی اور اخلاق کے بعد علم کو اپنے لیے ذریعۂ عزت اور وجہِ فضیلت جانا۔ علم کو حاصل کرنے اور علم کو پھیلانے اور اہلِ علم کی قدر و منزلت کرنے کے واقعات سے مسلمانوں کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

احکامِ الٰہی کے علاوہ تاریخ اسلام کی تعلیمات میں علم کی اہمیت اور علماء کے احترام کی واضح ہدایات موجود ہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ

"علم حاصل کرو اس لیے کہ جو شخص علم حاصل کرتا ہے وہ اللہ کے راستے میں

نیکی کرتا ہے، جو شخص علم کا تذکرہ کرتا ہے وہ خدا کی تسبیح کرتا ہے، جو شخص علم کی جستجو کرتا ہے وہ اللہ کی محبت کا دم بھرتا ہے، جو شخص علم پھیلاتا ہے وہ صدقہ دیتا ہے۔"

ایک اور ارشاد ہے:

"طالب علم کی راہ میں فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں۔"

حضورؐ نے علم کو عبادت سے افضل قرار دیا ہے۔ فرمایا:

"عالموں کی باتیں سننا اور حکمت کے اسباق کو دوستوں کے ذہن نشین کرانا عبادت سے بڑھ کر ہے۔"

اور یہ بھی سرکارِ دو عالمؐ ہی کا ارشاد ہے:

"طالب علم کی روشنائی شہیدوں کے خون سے بھی زیادہ پاک ہوتی ہے۔"

ان چند ارشادات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ احترامِ علم و حکمت سے اُمتِ مسلمہ کا قوام بنا ہے۔ اسلام سے پہلے علم و حکمت کو صرف مذہبی پیشواؤں کی میراث سمجھا جاتا تھا۔ روشن خیال یورپ کی تاریخ، علمی تحقیق کے صلے میں تعزیر کی مثالوں سے خالی نہیں ہے۔ زمین کا گول ہونا یا متحرک ہونا کبھی اہلِ مذہب کو گوارا نہ تھا اور سائنس داں ایسی باتوں پر قید اور قتل کی سزاؤں کے مستوجب قرار پاتے تھے۔ نوعِ انسانی پر مسلمانوں کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے علم کو پجاریوں اور پادریوں کے چنگل سے آزاد کرایا اور ذہنی آزادی عطا کی جو علم و حکمت کی جان ہے۔ اس طرح ہم پوری ذمّے داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جدید سائنس کی بنا مسلمانوں کے ہاتھوں پڑی اور قافلۂ انسانیت جو آج علم و حکمت کی شاہ راہ پر گام زن ہے تو اس سفر کا آغاز مسلمانوں ہی نے کیا ہے۔ قرآن حکیم نے حکمت کو خیرِ کثیر سے تعبیر کیا ہے:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (۲-۲۶۹)

یعنی: "اور جس کو حکمت عطا کی جاتی ہے وہ یقیناً خیرِ کثیر سے سرفراز ہوتا ہے۔"

مسلمان حکمت کو اپنی گم شدہ میراث سمجھتے ہیں اور اس سے مستفید ہونے میں اُن کے لیے یہ بات مانع نہیں ہے کہ یہ کہاں سے ملی ہے اور کس سے ملی ہے؟

ان حقائق کے ساتھ ساتھ اگر ہم اپنی موجودہ حالت کا جائزہ نہ لیں تو یہ بات حقیقت شناسی کے خلاف بھی ہوگی اور اپنی غفلت اور نکبت کا جواز تلاش کرنے کے مترادف بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری کیفیت اس کے بالکل برعکس ہے جو ہمارے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھی۔ آج ہم علم و حکمت کے میدان میں نہ صرف پیچھے ہیں، بلکہ بہت پیچھے ہیں۔ علم و حکمت ہمارے لیے محترم

نہیں رہے۔ آج تخلیق، تحقیق، ایجاد و اختراع سے ہمارا کوئی تعلق نہیں بلکہ ہمیں یہ پوری طرح علم بھی نہیں ہے کہ علم و حکمت کے میدان میں یارانِ تیز گام نے کس منزل کو جا لیا ہے اور وہ کن امکانات کو چھو رہے ہیں۔ منزل یہ آگئی ہے کہ اگر کوئی شخص دوسروں کی تخلیقات و تحقیقات سے واقف ہو تو وہ شخص بھی ہمارے لیے سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ نقل و ترجمہ ہمارا کل اثاثہ ہے۔ اب تو ہمیں یہ بھی دوسرے بتاتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے کیا کیا کام کیے تھے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے اہلِ علم اور اصحابِ فکر اس پر غور کریں اور ان اسباب و عوامل کا کھوج لگائیں جو اس تفاوت کے ذمّے دار ہیں اور ملّت کے سامنے حقائق کو بلا کم و کاست بیان کریں۔

میں دل سے ممنون ہوں آج کے مہمان مقرر جناب محترم پروفیسر سیّد سبط نبی نقوی صاحب کا، جنھوں نے احترامِ علم و حکمت کو اپنا موضوع بنایا۔ پاکستان کے ایک ممتاز سائنس داں کی حیثیت سے جناب سیّد صاحب اس موضوع کے سائنسی اور علمی مطالعے کے لیے ایک موزوں شخصیت ہیں۔ سیّد صاحب کے والد گرامی مولوی سیّد عنایت احمد نقوی جرأت بدایونی ممتاز اہلِ علم میں سے تھے۔ ابن الہیثم کی شہرہ آفاق کتاب "کتاب المناظر" پر کمال الدّین ابن الفارسی کی مشہور شرح "تنقیح المناظر" کے مختلف نسخوں کے مقابلے اور تصحیح کے لیے نواب عماد الملک بلگرامی نے ۱۹۱۸ء میں مولوی صاحب مرحوم کو منتخب کیا تھا اور مولوی صاحب کا تصحیح کردہ نسخہ دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوا تھا۔

جناب سبطِ نبی نقوی صاحب ۶ جنوری ۱۹۰۷ء کو لشکر گوالیار میں پیدا ہوئے اور اعلا تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حاصل کی جہاں سے آپ نے ۱۹۳۰ء میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے کر تحقیقات شروع کر دیں لیکن جلد ہی آپ ہندستان کے محکمۂ (Meteorology) سے وابستہ ہو گئے اور اس کی مرکزی لائبریری میں آپ کو اپنی علمی دل چسپیوں کی تکمیل کا موقع ہاتھ آگیا۔ وہاں آپ نے میکالیات، موسمیات، آبیات، بحریات، شماریات، ہیئتِ ارضی و ہیئت طبیعات میں خصوصی مہارت حاصل کی اور سائنسی موضوعات خصوصاً میکالیات اور موسمیات پر مضامین لکھنے شروع کیے۔ اسی زمانے میں آپ نے موسمیات پر علمی تحقیق شروع کی جو پاکستان بننے کے بعد آبیات، بحریات اور ہیئت تک وسیع ہو گئی۔ سیّد صاحب محترم نے تقریباً چالیس تحقیقی سائنسی مقالات ملک اور بیرونِ ملک کانفرنسوں اور مذاکرات میں پڑھے۔

آزادی ملنے پر سیّد صاحب محکمۂ میکالیات ہند کی تقسیم اور محکمۂ میکالیات پاکستان کی تعمیر میں مصروف رہے۔ ۴۹ء سے ۵۲ء تک لاہور میں محکمۂ میکالیات کے شمال مغربی زون کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ مارچ ۵۳ء میں محکمۂ میکالیات پاکستان کے سربراہ مقرر ہوئے اور ۶۷ء میں

ریٹائر ہوئے، لیکن جنوری ۱۹۶۶ء میں حکومت نے آپ کو اقوام متحدہ کے ٹیکنیکل ماہر کا عہدہ قبول کرنے کی اجازت دی جہاں آپ نے فروری ۱۹۶۹ء تک کام کیا۔

۱۹۴۰ء میں سیّد صاحب رائل میٹرولاجیکل سوسائٹی لندن کے فیلو چُنے گئے۔ ۱۹۵۴ء میں رائل اسٹرانومیکل سوسائٹی لندن کے فیلو بنائے گئے۔ بعد میں امریکا کی جیو فزیکل یونین کے ممبر منتخب کیے گئے۔ اس سال (۱۹۷۲ء) آپ کو امریکن ایسوسی ایشن فار ایڈوانس منٹ آف سائنس کی رکنیت کی دعوت موصول ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ سیّد صاحب بہت سی بین الاقوامی کمیٹیوں اور کانفرنسوں کے رکن اور پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں سیّد صاحب نے پنجاب فلڈ کمیشن میں محکمہ میکالیات کی نمائندگی کی اور طغیانیوں کی پیش بندی کا ایک طریقہ ایجاد کیا جو اب بھی رائج ہے اور جس کی وجہ سے پنجاب کے دریاؤں میں طغیانی کی بروقت اطلاع سے قیمتی جانوں کی حفاظت اور مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ آپ مشرقی اور مغربی پاکستان کے فلڈ کمیشن کے بھی فعال رکن رہے ہیں اور سیٹو اور سینٹو کی میکالیاتی کمیٹیوں میں موثر کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ سیّد صاحب نے پنجاب، کراچی اور بغداد یونیورسٹی میں معلّم اور ممتحن کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی ہیں۔

آج کے صدر مجلس حضرت مولانا ڈاکٹر فضل الرحمان انصاری قادری بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے اپنی دینی و علمی مصروفیات کے باوجود ہماری درخواست قبول فرمائی اور اس مجلس کی صدارت کی زحمت گوارا فرمائی۔ حضرت مولانا کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے فاضل اور قدیم و جدید علوم کے ماہر ہیں۔ دینی علوم کی تحصیل کے علاوہ آپ نے جدید تعلیم بھی حاصل کی اور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ آپ انگریزی زبان میں اشاعتِ اسلام کے لیے بیس سے زائد کتابیں تصنیف فرما چکے ہیں۔ اس کے علاوہ پانچ بار عالمی تبلیغی دورے بھی کیے ہیں۔ آپ نے تبلیغِ اسلام کے لیے "ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشنز" کی بنیاد رکھی جس کے ذریعہ سے آپ گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جناب محترم سیّد سبطِ نبی نقوی

آج سے پہلے شامِ ہمدرد میں انسانی تصوّرات کے مختلف پہلوؤں کے احترام کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اس میں احترام ادب و ادیب، احترام کتاب و قلم اور خود احترام سب ہی شامل تھے۔ آج میں احترامِ علم و حکمت کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج سے نصف صدی پہلے تک احترام ہماری زندگی میں ایک مسلّمہ حقیقت اور ہمارے کردار کا جزو لاینفک ہوا کرتا تھا، لیکن عروجِ سائنس کے موجودہ دور میں احترام کا لفظ زیادہ پسندیدہ اور طرح دار نہیں رہا ہے۔ ایک سائنس داں دعوا کرتا ہے کہ وہ حقائق، حقائق شناسی اور حقائق شناس کے سوا کسی کا احترام نہیں کرتا۔ وہ تجربات، واردات اور واقعات کو زیرِ تحقیق لاتا ہے، کیوں کہ انسانی زندگی میں یہی ٹھوس اور اُنمٹ حقائق ہوتے ہیں، لیکن اپنی تحقیق کے دوران وہ ان حقائق کو کبھی کسی احترام کے جذبے کے ساتھ نہیں چھوتا بلکہ اُس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ پہلے وہ یہ یقین کر لے کہ وہ تجربات اور واردات جن پر وہ تحقیق کرنا چاہتا ہے حقائق کے درجے پر فائز کیے جانے کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد وہ تجزیہ کر کے ان کو ریزہ ریزہ کر ڈالتا ہے۔ پھر وہ ان کے عناصرِ ترکیبی کا دوسرے تجربات کے ایسے ہی عناصرِ ترکیبی سے مقابلہ کر کے اُن کے درمیان وہ رشتے دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے جن کے ذریعے سے وہ کارخانۂ قدرت کی نیرنگیاں پیدا کرتے ہیں۔ اس ساری کوشش میں جو جذبہ برسرِ عمل ہوتا ہے وہ حق کو آشکار کرنے اور اُس کے پرتو دیکھنے کا ہوتا ہے۔ نہ کسی قول کے ساتھ عقیدت ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کا احترام۔ میں نے جوانی کے دور میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا ؎

نقشِ پائے یار کے بس کھوج میں پھرنا یونہی
عاشقِ وارفتہ کا گویا یہی ایمان ہے

سائنس کا طالب علم ہونے کی وجہ سے میں تقریباً نصف صدی اس کھوج میں گزار چکا ہوں، میری کاوشوں کے نتیجے دوسروں کے لیے قابلِ توجہ بھی بنے، اس کا اعتراف بین الاقوامی سطح پر کیا گیا۔ اور میرے منھ سے حق کے سوا کسی اور کے احترام کی باتیں کچھ بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ اس پچاس سالہ جستجو کا ہی نتیجہ ہے۔ اگر کسی نے شعوری طور پر اپنی زندگی کو مقصد بنانے کی کوشش کی ہو تو ہر ذی فہم شخص کی زندگی میں ایک درجہ آتا ہے جب وہ اپنے

شعور کی گہرائیوں میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جس چیز کو آج تک میں ایک مقصد سمجھتا رہا ہوں کیا وہی قابلِ توجہ مقصد تھا یا اس ظاہری مقصد کے پیچھے کوئی اور بنیادی محرک سرگرمِ عمل تھا؟ میری آج کی کوشش اس ہی ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہے اور وہ ختم ہوتی ہے احترامِ علم و حکمت پر۔

اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ علم و حکمت میں ہماری ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم مختلف محسوسات، تجربات، ادراکات اور وارداتِ انسانی میں تعلّقات دریافت کریں۔ اس کے معنی ہوئے کہ تمام مظاہرِ قدرت میں کچھ تعلقات پہلے سے موجود ہوتے ہیں جن کی بنا پر وہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ وہ تعلّقات اس وقت بھی سرگرم رہتے ہیں جس وقت اُن کو محسوس کرنے والا اور تجربے کے حصار میں لانے والا موجود نہ ہو۔ بہ الفاظِ دیگر وہ تعلقات جن کو ایک عالم اور حکیم دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے بذاتِ خود علم و حکمت نہیں ہوتے، بلکہ علم و حکمت نام ہے ان تعلقات کو الفاظ، نمونوں، نشانیوں یا علامتوں سے ظاہر کرنے کا۔ اور یہ الفاظ، نمونے، نشانیاں اور علامتیں پیداوار ہوتی ہیں انسانی دماغ کی اس صلاحیت کی جس کو ہم خیال کہتے ہیں، چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم و حکمت اشیا میں نہیں ہوتے بلکہ وہ انسانی خیال کی پیداوار ہیں اور وہ انسانی ذہن میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ علم و حکمت کی تعریف یہ ہوئی کہ انسانی دماغ میں قدرت کی نشانیوں یا قرآنی اصطلاح میں آیاتِ بیّنات کو ایک دوسرے سے ممیز کر کے تشبیہوں، استعاروں، نشانیوں، علامتوں یا اسمار کے ذریعہ سے اُن کے تصوّرات قائم کرنے اور ان تصوّرات کے درمیان آپس کے تعلّقات قائم کرنے کا نام علم و حکمت ہے۔

جہاں تک آیات کے محسوسات سے دماغ کے متاثر ہونے کا تعلّق ہے یہ صلاحیت تو انسان میں تمام دوسرے ذی حیات اجسام کے ساتھ مشترک ہے۔ نباتات اور حیوانات بھی اپنے ماحول سے اثر قبول کرتے ہیں۔ یہی محسوسات ہیں لیکن ان محسوسات کو علم میں تبدیل کرنا صرف انسان کا ہی ممتاز کن کارنامہ ہے۔ انسانی دماغ کا یہ ایسا پیچیدہ اور پُر عظمت کارنامہ ہے کہ ہر دَور کے عالموں اور فلسفیوں نے اس موضوع پر روشنی ڈالنے کی اور اُس کی اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، لیکن ابھی تک اس مسئلے کی تمام مشکلات حل نہیں ہو سکی ہیں۔ ان کوشش کرنے والوں کی صف میں افلاطون، ارسطو، ابن سینا، رازی اور غزالی، لاک، ہیوم، برکلے، نطشے، برگسان، آئنسٹائن، ہینوں، شروڈنگر، ڈی بروگلی، اقبال اور سینکڑوں علم و حکمت اور فلسفہ کے ماہروں کو کھڑا پاتے ہیں، لیکن ابھی تک علمیات کے تمام متعلقہ مسائل کا نہ مکمّل احاطہ کیا جا سکا ہے اور نہ ان کی مکمّل وضاحت۔ ارسطو کے نظریۂ علم سے چوں کہ اس کی فضیلت اور احترام پر روشنی پڑتی ہے اس لیے

مجھے یقین ہے کہ اس کا خیال آپ کی دل چسپی کا باعث ہوگا۔ ارسطو کے نزدیک "علمی فعلیت ایسی شئے ہے جس کو بلا خوفِ مغالطہ خدا سے منسوب کر سکتے ہیں"۔ اس لیے اس کو وہ انسان کے لیے بہترین فعل قرار دیتا ہے۔ وہ اپنی کتاب 'اخلاقیات' میں کہتا ہے "علم کی مقدس زندگی میں انسان کی شریف ترین قوت پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے جو انسان کو باقی مخلوقاتِ ارضی سے ممتاز کرتی ہے اور جس میں اس کو بہترین سعادت نصیب ہوتی ہے"۔ لیکن ساتھ ہی وہ اضافہ کرتا ہے کہ "چوں کہ انسان میں فطرتِ حیوانی اور عقلِ خالص دونوں ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں اس لیے وہ مسلسل ایسی زندگی نہیں گزار سکتا۔ پس سعادتِ انسانی میں اجتماعی اور شہری فضائل کے حصول کو بھی دخل ہوتا ہے"۔ علم و حکمت اور عالم و حکیم کی فضیلت کے متعلق قرآن کریم اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ارشادات بعد میں بیان کروں گا۔

بہرحال ماحول سے پیدا ہونے والے اثرات تمام جان داروں کے جسموں کے ان حصوں میں تبدیلیاں پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں جن سے وہ بقائے حیات اور ترویج نسل کے لیے اگر فائدہ اٹھا سکتے ہوں تو استفادہ حاصل کریں۔ اگر وہ ضرر رساں ہوں تو اُن سے بچاؤ کریں۔ صبح سویرے جب فضا پر سہانا سماں طاری ہوتا ہے، ٹھنڈی ہوا خوش خرامی میں مشغول ہوتی ہے اور باغ و راغ میں ہر طرف بھینی بھینی خوشبو مہکی ہوئی ہوتی ہے تو مور ناچنا شروع کر دیتا ہے، چڑیاں چہچہانے لگتی ہیں۔ اسی طرح گرمیوں کی دوپہر میں جب ہر طرف لو چل رہی ہوتی ہے تو ایک سہانے سایہ دار کنج میں بیٹھ کر کوئل کوکنا شروع کر دیتی ہے۔ یا جب گھر گھر کر کالی کالی گھٹائیں اٹھتی ہیں تو پپیہا پی کہاں کی رٹ لگا دیتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ویسا ہی خوش وقتی کا مشغلہ ہوتا ہے جیسے انسان کا گانا اور خوش وقتیاں کرنا، لیکن ماہرین حیاتیات ان میں بھی بقائے حیات اور ترویج نسل کے پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ بہرحال یہ ماننا پڑتا ہے کہ حیوانوں میں ماحول سے متاثر ہو کر کارکردگی زیادہ تر نفع بخش افعال پر ختم ہوتی ہے۔ وہ اپنے احساسات کو فوری طور پر لاحاصل تصورات میں تبدیل کر کے اسمار، اشارات اور نشانیوں میں تبدیل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بولیاں چند آوازوں اور چند اقسام کی چیخ و پکار پر مشتمل ہوتی ہیں۔ وہ الفاظ بنا کر اُن کو صرفی اور نحوی ترکیبوں سے علت و معلول کا تصور ظاہر کرنے اور خیالات کو الفاظ کی مسلسل کڑی میں پرو کر بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اُن کی اس خصوصیت کو قدیم فلاسفہ نے بھی اچھی طرح پہچان لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ تمام دوسرے حیوانوں پر اُس کی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے اُسے 'حیوانِ ناطق' کا نام دیا تھا۔ یہ ٹھیک بھی تھا۔ بحرالکاہل کے بعید ترین یکہ و تنہا جزیروں میں بنی نوع انسان سے بالکل الگ تھلگ وحشی ترین انسانی قبیلے بھی کوئی نہ کوئی

زبان استعمال کرتے ہیں جن میں نہ صرف چیزوں اور کیفیتوں کے نام ہوتے ہیں بلکہ افعال کے نام بھی ہوتے ہیں جو فعل کے وقت اور طریقے کے ساتھ بدلتے جاتے ہیں۔ لسانیات کے اکثر ماہرین کا خیال ہے کہ یہ نتیجہ ہوتا ہے انسان کے ایک جبلّی تقاضۂ نطق کی تکمیل کا، لیکن تھوڑا سا غور کرنے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔

یقیناً انسان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے محسوسات کو تصوّرات میں تبدیل کرکے صوتی نشانیوں یعنی الفاظ اور مسلسل جملوں سے ظاہر کر سکتا ہے، لیکن تجربے نے ایک بڑی عجیب و غریب بات ظاہر کی ہے۔ شہنشاہِ اکبر کے زمانے میں ایک انوکھا انسانیاتی (Anthropological) یعنی علم الانسان کا تجربہ کیا گیا۔ کچھ شیر خوار بچوں کو اُن کے والدین اور انسانی ماحول سے علیحدہ کرکے اس طرح پرورش کیا گیا کہ وہ کوئی انسانی بولی نہ سُن سکیں۔ اس تجربے کا مقصد یہ تھا کہ انسان کی فطری بولی معلوم کی جائے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا تنہائی کے پروردہ ان بچوں نے انسانی زبان کی قسم کی کوئی بھی بولی بولنا شروع نہیں کی۔ اس طرح کی تین تاریخی شہادتیں اور بھی موجود ہیں ایک جنگلی لڑکے پیٹر PETER—The Wild Boy کی جس کو ۱۷۲۴ء میں ہینوور کے قریب پکڑا گیا تھا۔ دوسری مثال ایویران کے وحشی وکٹر VICTOR -The Savage of Averan کی ہے جس کو ۱۷۹۹ء میں جنوبی فرانس میں ایویران کے قریب پکڑا گیا تھا۔ تیسری مثال دو چھوٹی لڑکیوں اِملا اور کملا کی ہے جن کو ۱۹۲۰ء میں بنگال میں مدناپور کے قریب جنگل سے پکڑا گیا تھا۔ ان سب بچوں کی پرورش بھیڑیوں نے کی تھی۔ وہ سب یا تو چُپ رہتے تھے یا بھیڑیوں کی سی غرّانے کی یا دوسری آوازیں نکالتے تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ تو انسانی زبان کی قسم کی کوئی بولی بولتا تھا اور نہ انتہائی کوشش کے باوجود چند الفاظ سے زیادہ سیکھ سکا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر بچّہ بالکل اکیلا ہو تو وہ اپنی غوں غاں کا نہ تو ماحول سے کوئی جواب پائے گا نہ اس کو کسی طرح متاثر ہوتے ہوئے دیکھے گا۔ اس ماحول کے پروردہ بچوں کے بے زبان ہونے کی یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ بچّہ تو تنہائی میں بیٹھا ہوا اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ اگر باتیں کرنا جبلّی تقاضۂ نطق کا نتیجہ ہوتا تو یہ جنگلی ماحول کے بچے اکیلے میں بھی کچھ الفاظ ایجاد کرکے اور اُن میں اپنے تخیلات کو گردش میں لاکر کچھ نہ کچھ لسانی پھیلاؤ پیدا کر سکتے تھے۔ پھر املا اور کملا تو کم سے کم دو بچیاں ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے لیے قریب قریب ہی ہوا کرتی تھیں، لیکن وہ بھی اس فن سے نابلد تھیں۔ اگر باتیں کرنا اور زبان ایجاد کرنا کسی جبلّی تقاضے کا نتیجہ ہوتا تو ان دو بچیوں میں اس تقاضے کو کیا ہو گیا تھا؟ اس کے برخلاف بچے اپنے ماں باپ کی گود میں پہلے دن سے زبان سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ تھوڑا بڑا ہونے پر تو زبان کو

استعمال کرنے کا شوق اتنا بڑھ جاتا ہے کہ تنہائی میں بھی باتیں کرتے ہیں اور نئی نئی زبانیں اور تحریریں ایجاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ الفاظ اور صرفی اور نحوی ترکیبوں کی ایجاد انسان کے بچّوں کو پیدائشی حق کی طرح ورثے میں نہیں ملتی بلکہ زبان بولنے والے والدین اور اقربا سے سیکھی جاتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ دماغ کی ساری کارگزاریاں، علم و حکمت کی ساری سرفرازیاں الفاظ، زبان، اور تحریر کی رہینِ منّت ہیں، لیکن الفاظ اور زبان کا پیدا کرنا انسانی دماغ کے بس کی بات نہیں۔ زبان سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت دماغ میں ضرور موجود ہے لیکن زبان پیدا کرنے اور اس کو شروع کرنے کی قابلیت اُس میں یقیناً موجود نہیں تھی۔

چوں کہ علم و حکمت کے معاملے میں زبان کو انتہائی اہمیت حاصل ہے، ان دونوں کا مدار کلیتاً اس پر ہی ہے اِس لیے آئیے دیکھیں کہ زبان اصلیت میں ہے کیا؟ الفاظ ادا کرنے کے لیے ہم اپنے ہونٹوں، زبان، حلق اور ناک کی نلی کے پٹھوں کو اس ترکیب سے کھینچتے ہیں اور ڈھیلا چھوڑتے ہیں کہ جب ان میں سے ہو کر ہوا پھیپھڑوں سے باہر نکلتی ہے یا اندر جاتی ہے تو مختلف قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں جیسے آ، با، جا، نا، وغیرہ وغیرہ۔ الفاظ بنانے کے لیے ہم اپنے حلقوم، زبان اور ہونٹوں وغیرہ کو اس طرح تیزی کے ساتھ بدلتے ہیں کہ اُن سے مختلف مفرد آوازوں کے مجموعوں سے مرکّبات بن جاتے ہیں جیسے کہا، سُنا، دیکھا، ہوا، پانی وغیرہ۔ اِن الفاظ کو ایک نحوی ترکیب کے ساتھ آگے پیچھے ملانے سے جُملہ بن جاتا ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے خیالات کو بیان کرتے ہیں۔

بندر، گوریلا، چیمپینزی، بن مانس وغیرہ بہت سے جانوروں کے حلقوم، زبانوں، ہونٹوں وغیرہ کے پٹھوں کی ساخت گو انسانی حلقوم، زبان اور ہونٹوں کی ساخت سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی اور بعض موقعوں پر وہ ایسی آوازیں بھی نکالتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خیال کا اظہار کر رہے ہیں، خوش ہو رہے ہیں، ڈر رہے ہیں، اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر رہے ہیں یا ایک دوسرے کے غم میں شرکت کر رہے ہیں، لیکن یہ سب مفرد آوازیں یا اُن کے بہت سادہ مجموعے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی آوازوں کو ایسی ترتیب کے ساتھ ردّ و بدل کے بعد نہیں نکالتا جس سے الفاظ یا جُملوں کا شبہ ہو سکے۔

یہ لسانیات کا بہت پُرانا اور پُراسرار مسئلہ ہے کہ انسان نے اپنے محسوسات اور ادراکات کو الفاظ میں تبدیل کرنے کا طریقہ کیسے سیکھا اور شروع کیا۔ اپنے پیش رو حیوانوں سے وہ یقیناً اس معاملے میں کوئی مدد حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

لسانیات میں اِس پر بڑی لمبی بحثیں کی گئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مختلف انسانی گروہوں نے زبانیں بولنا

کیسے شروع کیں۔ یہ فن کس نے شروع کیا جسے اب سیکھنے سکھانے یا تعلیم دینے کے فن سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگر یہ فن تہذیب و تمدن کے ارتقا کا نتیجہ ہیں تو کیوں کسی نہ کسی حد تک ایسے وحشی ترین قبیلوں میں بھی پائے جاتے ہیں جو ابھی تک روایتی معنوں میں تہذیب و تمدن سے بالکل نا آشنا ہیں۔ یہ مسئلہ ایسا پُر اسرار اور چکرا دینے والا ہے کہ ماہرین لسانیات نے اُس کو لاینحل تسلیم کرکے اس میں دل چسپی لینی ہی چھوڑ دی ہے، لیکن علم و حکمت کی عظمت سمجھنے کے لیے اس کا سمجھنا ازبس ضروری ہے۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ زبان کا اصل مقصد خیالات کو دوسرے لوگوں تک منتقل کرنا ہے، لیکن بچّے جو تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں اور اکثر بڑی عمر والے بھی اس شغل میں اپنا کافی وقت گزارتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان کے معاملے میں انتقال خیال کے معاملے کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے۔ اصل حقیقت جس کے ماننے میں کوئی عقلی دقت نہیں ہوتی یہ ہے کہ اصلیت میں زبان حقیقتوں یا تصوّرات کو صوتی جامہ پہنانے کی ایک عملی کوشش ہوتی ہے اور اس کوشش کے معاشرتی لین دین کے استعمال سے اس میں وسعت اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا اظہار مختلف زبانیں بولنے والوں کے تمدن میں ارتقائی منازل سے ہوتا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ تصوّرات کو صوتی نشانیوں کا جامہ کس طرح پہنایا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ احساسات نسوں کے ذریعہ سے برقی رَو یا برقی بار کی شکل میں منتقل ہو کر نسوں کے اُن سروں پر پہنچتے ہیں جو دماغ کے مختلف حصّوں میں واقع ہوتے ہیں۔ وہاں برق کے کیمیائی عمل سے خاص رطوبتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ سب ایسے مادّی تغیّرات ہیں جن کا محسوس یا ادراک کی جانے والی اشیا سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ مثلاً میں یہاں ہال میں آپ سب کو دیکھ رہا ہوں۔ اِس کی صورت یہ ہے کہ آپ کے کپڑوں اور چہروں سے جو شعاعیں منعکس ہو کر آ رہی ہیں وہ میری آنکھ کی پُتلی سے گزر کر میرے آنکھ کے پردے پر ایک شبیہہ بناتی ہیں۔ اِس شبیہہ کا اثر برقی رو کے ذریعہ سے میرے دماغ کے اُس حصّے میں کیمیائی عمل پیدا کرتا ہے جس میں دیکھنے کی صلاحیت ہے۔ تمام جانوروں میں بھی دیکھنے کا عمل ایسا ہی ہوتا ہے۔ ان کیمیائی مرکّبات کا اُن شکلوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جن کو میں متعیّن کر رہا ہوں۔ جانوروں میں یہ کیمیائی اثر دوسری نسوں کے ذریعہ سے ان اعضا کو منتقل ہو جاتا ہے جن کے ذریعہ سے وہ آنکھ کے سامنے والی چیزوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں یا بچاؤ کر سکتے ہیں اور اُن کے متعلقہ اعضا اپنا کام فوراً شروع کر دیتے ہیں۔ انسانوں میں بھی یہ عمل ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ تین حصّوں پر مشتمل ہوتا ہے: (۱) یعنی ایک حِس کو دوسری حِس سے ممیز کرنا (Discrimination) (۲) محسوس کیے ہوئے واقعے

اور دوسرے تجربی واقعات میں یکسانیت کا پہلو دریافت کرنا (Identification) اور (۳) محسوس کیے ہوئے واقعے کو یاد رکھنا (Retention) دماغ میں کیمیائی تبدیلیوں اور اُن کے اثرات کا کسی نہ کسی شکل میں باقی رہ جانا سمجھ میں آتا ہے لیکن ان اثرات کو صوتی نشانیوں کا جامہ پہناکر مجرّد تصوّرات اور پھر اسما میں تبدیل ہوجانا یہ کیونکر ممکن ہوجاتا ہے؟ اس پر فلسفیوں نے بہت بحثیں کی ہیں لیکن نتیجہ وہی ناامیدی ہے جس کا میں نے ابھی تذکرہ کیا۔ اس کی اہمیت آپ پر ایک مثال سے واضح ہوجائے گی۔

عربی زبان میں وہ سب الفاظ اور فصاحت و بلاغت کے وہ تمام صرفی اور نحوی اصول موجود تھے جو قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں۔ جب اس ہی عربی زبان میں قرآن کریم ایک اُمّی نبی صلعم پر وحی ہوا تو اس میں وہ سارے عقیدے اور قاعدے قانون جو انسان کی دنیاوی اور آخرت کی زندگی میں اُس کی خوشی اور خوش حالی اور مکمّل ارتقار کے لیے ضروری اور کافی ہیں بہت سادگی، خوبی اور تکمیل کے ساتھ بیان کر دیے گئے، اور اس خوبی سے بیان کیے گئے کہ چودہ سو سال سے کھُلے ہوئے چیلنج کے باوجود بنی نوع انسان اس جیسی ایک سورۃ تو درکنار ایک آیت بھی پیش نہیں کرسکی ہے۔ اس واقعے کو بیان کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ گو عربی زبان میں ایک مکمّل قانونِ حیات کو سننے کے لیے بنی نوع انسان کو وحی کا انتظار کرنا پڑا۔

بالکل یہی کیفیت زبان کے معاملے میں بھی ہے۔ اس کو قرآن کریم نے بڑی تفصیل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ قرآن کریم سے یہ بات واضح ہے اور موجودہ سائنس بھی اس کی تصدیق کرتی ہے کہ انسان کی تکمیل دو درجوں میں ہوئی۔ اوّل تخلیق۔ پیدا کیا جانا (Creation) اور دوم تکمیل یعنی روحِ خداوندی کا پھونکا جانا (Perfection) قرآن اور سائنس دونوں کی آفرینش کی کہانی کو عام فہم الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے: سب سے پہلے حیاتی خلیے کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ابتدائی بارشوں پر پیدا ہوئے۔ کیچڑ اور پانی میں پروان چڑھے اور مختلف صورتیں اختیار کرتے چلے گئے۔ بعض اُن میں سے اب تک پانی میں رہتے ہیں، بعض خشکی پر، بعض ہوا میں۔ کچھ ان میں پیٹ پر رینگتے ہیں، بعض دو پیروں پر چلتے ہیں، بعض چار پر۔ بعض پروں سے ہوا میں اُڑتے ہیں۔ یہ سب کچھ ربّ العالمین نے کیا ہے یا قدرت کی ارتقائی طاقتوں کے عمل سے ہوا ہے اور خدا کی سب سے بڑی اور حیرت انگیز طاقت یہی ارتقا اور پرورش کرنے کی ہے۔ جب ارتقا کرتا ہوا حیوان اس درجے پر پہنچا کہ صنف کی تھوڑی سی تبدیلی پر علم و حکمت پیدا کرنے والا انسان پیدا ہوسکے تو اب قرآن کریم کے ہی الفاظ میں اس کہانی کو سنیے کہ وہ کس طرح پیدا ہوا اور اس پر علم کے دروازے کس طرح کھُلے۔

تیسری سورت آل عمران میں ارشاد ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ ایک نفس واحد حضرت بی بی مریم سے پیدا ہوئے۔ اُن کے متعلق اس میں سورۃ کی ۵۹ ویں آیت میں ارشاد ہوا "عیسیٰ کا حال خدا کے نزدیک آدم کا سا ہے۔ پھر چوتھی سورۃ 'النسار' کی پہلی آیت میں ارشاد ہوا'' لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفسِ واحد سے پیدا کیا اور اس سے ہی اس کا جوڑا پیدا کیا۔ پھر اُن سے مرد اور عورتیں کثرت کے ساتھ زمین پر پھیلا دیے۔" یہی بات سورۃ 'الانعام' کی ۹۸ ویں آیت میں' سورۃ 'الاعراف' کی ۱۸۹ ویں آیت میں اور سورۃ 'الزمر' کی چھٹی آیت میں دہرائی گئی۔ ان آیات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ 'نفس واحد' کسی بھی صنف کی ہو وہ آدم وحوّا کی خصوصیت نہیں رکھتی تھی' کیونکہ ہماری زمین پر سارے مرد اور عورتیں ان ہی دونوں کی اولاد ہیں۔ حضرت آدمؑ کو خدا نے پیدا کیا تھا خلیفہ فی الارض بنانے کے لیے اور ارض وسموات پر حکومت کرنے کے لیے۔ اس کے لیے علم کی ضرورت تھی۔ آدم وحوّا اِن دونوں میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ علم وحکمت پیدا کر سکیں' لیکن علم وحکمت کی بنیاد یعنی اسمار کا اختراع نہ وہ جانتے تھے اور نہ اُن سے پہلے کوئی مخلوق' جن میں فرشتے' جن اور معلم الملکوت سب ہی شامل تھے۔ چوں کہ حضرت آدم اور اُن کی اولاد سے مادی عالم پر حکومت کروانی تھی' ہر ایک سے اُن کی حکم برداری کروانی تھی اس لیے حضرت آدم کو وحی کے ذریعہ سے خداوند عالم نے خود اسمار کی تعلیم دی۔ اس قصے کو قرآن کریم یوں بیان کرتا ہے: " اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں تو اُنھوں نے کہا،" کیا تو اس میں ایسے شخص کو بنانا چاہتا ہے جو فساد پھیلائے گا، کشت وخون کرتا پھرے گا، اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں" خدا نے فرمایا،" میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔" اور آدم کو سب اشیا کے نام سکھائے۔ پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے کیا اور فرمایا کہ اگر سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ۔ اُنھوں نے کہا تو پاک ہے۔ جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہم کو کچھ نہیں معلوم۔ بے شک تو دانا اور حکیم ہے۔ تب خدا نے آدم کو حکم دیا کہ تم ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب اُنھوں نے اُن کو اُن چیزوں کے نام بتائے تو (خدا نے) فرشتوں سے فرمایا۔" کیوں میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب پوشیدہ باتیں جانتا ہوں۔ اور تم جو پوشیدہ رکھتے ہو یا ظاہر کرتے ہو مجھ کو سب معلوم ہے' اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو وہ سب سجدے میں گر پڑے سوائے ابلیس کے۔ اُس نے غرور کیا اور وہ کافروں میں سے ہوگیا" (سورۃ البقرہ۔ آیات ۳۰ تا ۳۴)

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ حضرت آدم کو چیزوں کے اسمار خدا نے خود تعلیم کیے وحی کے ذریعہ سے۔ اسی طرح جیسے حضرت موسیٰ کو طور پر وحی کے ذریعہ سے قانون وہدایت عطا فرمائی گئی یا حضور

رسولِ مقبول ﷺ کو معراج کے موقع پر جو کچھ وحی کرنا چاہتا تھا وحی کر کے اسلام کی تکمیل فرمائی۔ حضرت آدم انسانوں کے پہلے پیغمبر ہیں۔ اُن کی رسالت کا سب سے بڑا کارنامہ زبان کی ابتدا کر کے علم و حکمت کی بنیاد رکھنا تھا۔ یہ صرف قرآن کا دعوا نہیں ہے بلکہ آریوں کا وید بھی یہی دعوا کرتا ہے کہ سنسکرت زبان کی تعلیم برھما نے بذاتِ خود دی تھی۔ یہ بھی وحی کے ذریعہ سے زبان کی ابتدا کا دوسرے لفظوں میں اقرار ہے۔ زبان بنیاد ہے علم و حکمت کی، فلسفہ و سائنس کی اور خلافت فی الارض والسّموات کی۔ شیطان نے علم کی فضیلت کو نہ سمجھا۔ اُس نے اپنی ساخت پر غرور کیا اور راندۂ درگاہ ہوگیا۔ آج انسانوں میں بھی بعض علمائے مذاہب اس عطیۂ خداوندی کو، انسانوں کی عظمت اور بزرگی کے اُبلتے، بڑھتے اور پھیلتے ہوئے سرچشمے کو، چند تالابوں میں بند دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور باقی وسیع ترین بحرِ ناپیدا کنار کو طاغوتی طاقتوں کا طوفان قرار دے کر احترام کے دائرے سے باہر نکال دینا چاہتے ہیں۔ وہ سائنس کی تعلیم کو کفر و زندقہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بات آپ میں اکثر کو معلوم ہوگی کہ صدیوں کی ضوفشانی کے بعد جامعہ الازہر کی عالم درس گاہ میں ایک ایسا دَور آیا کہ ماضیٔ قریب تک ابنِ خلدون کے مقدمۂ تاریخ کا داخلہ ممنوع تھا۔ یہ درست نہیں۔ علم و حکمت کا تو پورا خزانہ ہی علم و احترام کے قابل ہے، کیونکہ یہ منشائے الٰہی کی تکمیل اور اُس کے اپنے مقصد کی تحصیل کے لیے نہ صرف از بس ضروری ہے بلکہ ارادۂ الٰہی کے عین مطابق ہے۔ اُس نے خود ہی علم و حکمت کا دروازہ انسان کے لیے کھولا ہے۔ اب اس قلعے کے اندر چھپے ہوئے خزانوں کو تلاش کرنا اور اُن سے فائدہ اٹھانا ہمارے لیے فرضِ عین ہے۔

اس مقام پر ہم اس دلچسپ نکتے کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ بنی نوعِ انسان کے پہلے پیغمبر حضرت آدمؑ ہیں۔ اُن کو وحی کے ذریعہ سے اسمار سکھا کر بولنا سکھایا اور اس کے ذریعہ سے علم و حکمت کی ابتدا کی گئی۔ پھر قرآن کریم کے مطابق خداوندِ عالم کا اپنے بندوں پر بڑا بھاری احسان ہے کہ اُس نے خود اُن کو لکھنا اور پڑھنا سکھا کر علم کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کو وحی کے ذریعہ سے ایسے عقیدوں اور طریقوں کی تعلیم دی گئی جن کی مدد سے علم و حکمت اپنی انتہا کو پہنچ سکے۔ اگر مذہب کی تاریخ کا اس بنیادی نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے کہ مختلف زمانوں کے مذاہب کو علم و حکمت کے ارتقا کی کہانی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ مذہب عالمِ کون و مکاں میں نیابتِ الٰہی کے طریقے بتاتا ہے اور علم و حکمت اُس کے وسیلے انسان کے ہاتھ میں دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرات ابراہیم اور اسماعیل علیہما السّلام کعبہ کو تعمیر کر رہے تھے تو اُن کی زبان پر یہ دعا تھی، " اے رب اِن لوگوں میں ان میں ہی سے ایک رسول مبعوث فرمائیے جو ان کو تیری

آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب و حکمت سکھایا کرے اور اُن کے دلوں کو پاک کرے" (بقرہ ۔ ۱۲۹) پھر جب اُن ہی کی نسل سے حضور رسولِ مقبولؐ مبعوث ہوگئے تو اسی سورۃ بقرہ میں آپؐ کے مشن کے متعلق ارشاد ہوتا ہے، "جس طرح منجملہ اور نعمتوں کے ہم نے تم میں تم ہی سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تمہارے سامنے ہماری نشانیاں دہراتے ہیں، تمہیں پاک کرتے ہیں، کتاب و حکمت سکھاتے ہیں اور ایسی باتوں کی تعلیم دیتے ہیں جو پہلے تم نہیں جانتے تھے" (بقرہ ۔ ۱۵۱) تقریباً انھی الفاظ میں اور کبھی کئی جگہ علم و حکمت سکھانا، کائنات اور خالقِ کائنات کی آیتوں اور نشانیوں پر غور و فکر کرنا اور وہ علم سکھانا جو لوگ پہلے نہیں جانتے تھے رسولؐ اللہ کے مشن کا اہم ترین مقصد بتایا گیا ہے۔ بلکہ قرآن کریم نے علم و حکمت اور اُس کے احترام کو انسان کے لیے فرضِ عین قرار دیا ہے۔ سورۃ المجادلہ کی گیارھویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ" اور جو لوگ ایمان لائے اور جن کو علم عطا کیا گیا خدا اُن کے درجے بلند کرے گا" یہی نہیں سورہ طٰہٰ میں حکم دیا گیا کہ اپنا علم بڑھانے کی دعا مانگا کرو۔ حضور رسول مقبولؐ نے فرمایا کہ (۱) خداوند عالم کی تخلیق کے متعلق ایک گھنٹہ غور و فکر میں گزارنا ستّر سال کی عبادت سے بہتر ہوتا ہے۔ ایک عالم کے قلم کی روشنائی کا ایک قطرہ راہِ خدا میں شہید ہونے والے کے خون سے زیادہ پُرعظمت ہوتا ہے۔ ایک گھنٹہ علم و حکمت کی باتیں سیکھنا ایک ہزار راتیں کھڑے ہو کر عبادت میں گزارنے سے زیادہ اچھا ہے۔ اور حالانکہ حضور سرورِ کائناتؐ نے معراج کے موقع پر اپنے عالم و دانا طاقت والے پروردگار کے ساتھ قاب قوسین او ادنیٰ کا درجہ حاصل کیا۔ آپؐ پر وہ سب کچھ وحی کر دیا گیا جو وہ وحی کرنا چاہتا تھا۔ آپ کا علم مکمل ہوگیا، لیکن اس کے بعد بھی آپ کی دُعا ربّ زدنی علما ہوا کرتی تھی۔ اقبالؔ نے پیامِ مشرق میں اس نکتے کو خوب بے نقاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سیدِ کُل صاحبِ اُمّ الکتاب — پردگیہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عینِ ذات را بے پردہ دید — ربِّ زدنی از زبانِ او چکید
علم اشیاء علّم الاسماستی — ہم عصا و ہم ید بیضاستی

آخری شعر میں علامہ اقبال نے علم اشیا کی کیسی مکمل تعریف کر دی ہے۔ علم اشیا بھی تو علم اسما پر ہی ہے لیکن اگر وہ ایک صادق و امین کے ہاتھ میں ہو ید بیضا بن جاتا ہے۔ سہارے کا کام بھی دیتا ہے اور روزی حاصل کرنے کا بھی۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنے عصا کے یہی فائدے بتائے تھے، لیکن جب وہی عصا زمین پر ڈال دیا جاتا تھا تو پھنکاریں مارتا ہوا ڈسنے والا سانپ بن جاتا تھا۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ" جو کوئی خدا کے واسطے علم حاصل کرتا ہے وہ بڑا نیکی کا کام کرتا ہے۔

جو علم کا چرچا کرتا ہے وہ خدا کی تعریف کرتا ہے۔ جو اس کو تلاش کرتا ہے وہ پروردگار کا عاشق ہوتا ہے۔ جو علم سکھاتا ہے وہ خیرات کرتا ہے۔ جو علم کو صحیح طریقے سے دوسروں تک منتقل کرتا ہے وہ خدا کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ علم سے انسان حلال و حرام میں تمیز کرنا سیکھتا ہے۔ وہ جنّت کا راستہ روشن کر دیتا ہے۔ وہ ریگستان میں ہمارا دوست ہوتا ہے۔ وہ تنہائی میں ہمارا ساتھی اور غربت میں غم گسار اور مددگار رہتا ہے۔ دوستوں کی محفل میں ہمارا زیور ہوتا ہے اور دشمنوں کے مقابلے میں زرہ بکتر۔ علم کے ذریعہ سے ایک بندہ خدا کی درگاہ میں اونچے مدارج پر پہنچتا ہے۔ بادشاہوں کے دربار میں عزّت کے مرتبے حاصل کرتا ہے اور آخرت میں مکمّل خوشی۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ علم ایک رئیس کا زیور ہوتا ہے اور ایک غریب کی روزی کا سہارا۔

یہاں تک ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ علم و حکمت خدا کی اپنی صفاتِ اعلا میں شامل ہے۔ بنی نوع انسان کے لیے خود اُس نے وحی کے ذریعہ سے اسما سکھا کر اُس کا حاصل کرنا ممکن بنایا۔ اور یہ انسان کا ایسا پُرعظمت کارنامہ ہے کہ اس کے سامنے ہر سمجھ دار کا سر جُھک جاتا ہے اور اس کا احترام دل و دماغ میں جاگزیں ہو جاتا ہے، لیکن حضرات حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف بعض علمائے دین ہی علم و حکمت کی بعض شاخوں کو ناقابلِ قبول خیال کرتے ہیں بلکہ اکثر شعرا نے بھی علم و فن کے درجے کو گھٹانے کی کوشش کی ہے۔ جب اقبالؔ کی ملاقات جاوید نامہ میں فلکِ قمر پر جہان دوست سے ہوتی ہے تو وہ اُس کے ساتھ اپنی بات چیت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

پیرِ ہندی اندکے دردم کشید	باز در من دید و بے تابانہ دید
گفت مرگِ عقل؟ گفتم ترکِ فکر	گفت مرگِ قلب؟ گفتم ترکِ ذکر
گفت تن؟ گفتم کہ زاد از گردِ رہ	گفت جاں؟ گفتم کہ رمزِ لا الٰہ
گفت آدم؟ گفتم از اسرارِ دوست	گفت عالم؟ گفتم او خود روبروست
گفت ایں علم و ہنر؟ گفتم کہ پوست	گفت حجّت چیست؟ گفتم روئے دوست
گفت دینِ عامیاں؟ گفتم شنید	گفت دینِ عارفاں؟ گفتم کہ دید

اقبالؔ کے نزدیک آدم اسرارِ دوست ہے۔ اُس کی جان رمزِ لا الٰہ ہے۔ اُس کا تن پیدا ہوا گردِ راہ سے اور اُس کا علم و ہنر اُس گردِ راہ کی بیرونی حد یا پوست ہے۔ گو بدن کا ماحول سے علیحدہ وجود قائم رکھنے کے لیے کھال از بس ضروری ہے لیکن بدن میں تو جان ہے جو عزّت، احترام، ادب اور توجّہ کے لائق عنصر ہے۔ ورنہ کھال تو ایک مٹی کے تودے کا روغن ہے۔ جان نکل جائے تو وہ دن

میں نگس وکرِیک کی غذا بن جاتا ہے ۔ اس کی کون عزت کرے گا ؟ آیئے علم و حکمت کے معاملے پر ذرا اس پہلو سے بھی غور کریں ۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے ذرا تفصیل میں جانا پڑے گا ۔

ہم نے شروع میں دیکھا کہ تمام ذی حیات مخلوق کے علم کی ابتدا احساسات اور ادراکات سے ہوتی ہے ۔ ہمارے پاس پانچ قسم کے حواس ہیں : دیکھنا ، سننا ، سونگھنا ، چکھنا اور چھونا ۔ اُن کے اثرات نسوں کے ذریعہ سے برقی رووں یا برقی باروں کی شکل میں منتقل ہو کر دماغ کے مختلف حصوں میں پہنچتے ہیں جہاں دو طرح کے بالکل مختلف نتیجے برآمد ہونے ہیں : ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسان اور حیوان سب میں کم و بیش دوسری نسیں متاثر ہونے لگتی ہیں جن سے ذی حیات جسم بقائے حیات اور ترویج نسل کے کاموں میں لگ جاتا ہے ۔ دوسرا کام مشکل ہے ۔ اس میں عقلِ سلیم کی مدد سے مجرد تصورات قائم کیے جاتے ہیں ۔ اُن کے نام گھڑے جاتے ہیں اور نشانیاں مقرر کی جاتی ہیں ۔ ان ناموں اور نشانیوں کے ذریعہ سے تجربات اور واردات کو ابعادِ ثلاثہ (3—Dimension) اور ابعاد اربعہ (4—Dimension) کی لڑیوں میں پرو دیا جاتا ہے ۔ الفاظ اور صرفی و نحوی ترکیبوں سے خیالات کو گرفت میں لانے اور واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ یہی علم ہے ، لیکن اس سارے عمل کا مدار مشاہدے اور خیال کی اجتماعی کوشش پر ہوتا ہے ۔ جانوروں میں بھی اپنے نفع نقصان کی کچھ عقل اور سمجھ ہوتی ہے ۔ کتا ، گھوڑا ، ہاتھی ، بندر وغیرہ اکثر بڑی سمجھ کی حرکتیں کرتے ہیں ۔ یہی سمجھ انسان میں کچھ زیادہ وسعت اور گہرائی کے ساتھ برسرِ کار آتی ہے ۔ اس کو عقلِ سلیم کہتے ہیں ، چنانچہ ہمارے سارے علم و حکمت کی ابتدا عقلِ سلیم کی کارکردگی سے شروع ہوتی ہے ۔ جانور بھی اکثر غلطی کر جاتے ہیں ۔ انسان بھی عقلِ سلیم کی فراوانی کے باوجود دھوکا کھا جاتا ہے ۔ علم و حکمت میں کھوٹ نکالنے کی ایک وجہ تو یہی غلطیوں کا امکان ہوتا ہے ۔

منطق کا دعوا یہ ہے کہ اگر عقلِ انسانی کا عمل مشاہدوں پر منطق کے اصولوں کے مطابق کیا جائے تو غلطی کا امکان کم ہو جاتا ہے ۔ منطق کے اصولوں کا مدار تین بہت ہی سیدھے سادے بدیہات پر ہوتا ہے : اوّل جو چیز ہے وہ ہے ۔ دوم : یہ ناممکن ہے کہ ایک چیز بہ یک وقت ہو بھی اور نہ بھی ہو اور سوم ایک چیز ایک وقت پر ہوگی یا پھر نہ ہوگی ۔ یہ تین قوانین خیال کہلاتے ہیں ۔ گو یہ تین باتیں ایک ہی حقیقت کو بیان کرنے کے تین انداز ہیں ، لیکن ان تینوں میں ایک بنیادی تصور کو بغیر بیان کیے ہوئے بلکہ بغیر احساس کیے ہوئے حقیقت مان لیا گیا ہے ۔ وہ یہ کہ جس عالم میں مشاہدات پر عقل عمل کر رہی ہے اس میں عالم ، عامل اور معلول سب کی جہات آزادی تین ہیں جو عقلِ سلیم کی گرفت میں آسانی سے آجاتی ہیں ۔ اِن تین قوانینِ خیال کے مطابق اگر سہ ابعادی عالم

ہیں سہ ابعادی انسان یا آلات سہ ابعادی واردات پر عقل کی کارپردازی میں مشغول ہوں تو وہ تمام نتائج جو منطق سے حاصل کیے جائیں گے صحیح ہوں گے۔ لیکن کیا یہ عالم اور انسان سہ ابعادی ہیں؟ یہ مسئلہ ذرا تشریح طلب ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں علم و حکمت کا تمام تر مدار عقل سلیم کی متفقہ دریافتوں پر جن کو بدیہات کہا جاتا تھا ہوا کرتا تھا۔ بدیہات متفق علیہ قوانین اور اصول متعارفہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کو ماننے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ہر خیال اور ہر نئے نظریے کو ان بدیہات پر قوانین خیال کے مطابق استنباطی منطق (Deductive Logic) سے جانچا جاتا تھا۔ نتائج کی صحت کا مدار تمام تر بدیہات کی صحت پر ہوتا تھا۔ اگر بدیہہ صحیح ہے تو اس پر مبنی سارے نتائج بھی صحیح ہوں گے ورنہ غلط۔ مثلاً یونانی علم و حکمت میں یہ سارا عالم چار عناصر سے تعمیر شدہ مانا جاتا تھا۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ ان میں کا ایک عنصر نار تو مادی نہیں ہے اور باقی تین عناصر ۹۲ عناصر کے مرکبات یا آمیزے ہیں تو ان پر مبنی تمام نتائج غلط ثابت ہو گئے۔ ایک اور مثال سے اس طریقے کی تنگ ظرفی اور واضح ہو جائے گی۔ سارے اقلیدسی علم ہندسہ کی بنیاد بارہ بدیہات پر تھی۔ ان میں ایک بدیہہ (Axioms) جو آپ سب کو معلوم ہوگا یہ تھا کہ دو نقطوں کے درمیان سب سے چھوٹا فاصلہ ایک خط مستقیم ہوتا ہے۔ ایک اور بدیہہ یہ تھا کہ اگر ایک خط مستقیم سے باہر ایک نقطہ ہو تو اس نقطہ سے گزرتا ہوا صرف ایک خط پہلے خط مستقیم کے متوازی کھینچا جا سکتا ہے۔ پہلا بدیہہ تین ابعادی فضا اور دوسرا بدیہہ دو ابعادی سطح کے لیے بالکل درست تھے اور اب بھی درست ہیں۔ اور عقل سلیم کے معمولی تجربات کے لیے اب بھی استنباطی منطق میں ان کو کسوٹی کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فضا اگر چار ابعادی یا چار جہات آزادی رکھنے والی ہو تو اس میں دو نقطوں کے درمیان سب سے چھوٹا فاصلہ ایک ہذلولی منحنی یا Hyperbolic Curve سے ہی ناپا جا سکتا ہے۔ اس میں خط مستقیم سے سمتیں اور فاصلے نہیں ناپے جا سکتے۔ اگر سطح کروی ہو تو اس پر کوئی خط کسی دوسرے خط کے متوازی کھینچا ہی نہیں جا سکتا۔

تجرباتی علوم کی ترقی سے ۱۹۱۹ء میں نظریۂ اضافیت کی تصدیق ہو جانے سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارا عالم سہ ابعادی نہیں بلکہ چار ابعادی ہے۔ جوہری طبیعیات کے بعد کی ترقیوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اس مادی عالم میں نور پیدا کرنے کے لیے جوہر کے اندر برقالے یا Electron صرف طیف کی پانچویں جہت آزادی کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ حکیم آئنسٹائن کے عام نظریۂ جذب (Generalized Theory of Gravitation) کی وضاحت پر یہ معلوم ہوا کہ اس عالم کے مسلسلہ Continuum میں جس میں مادہ سرگرم عمل ہے، لمبائی، چوڑائی، اونچائی اور

وقت کی چار ابعاد یا جہات کے علاوہ چھے اور آزادیاں یا ابعاد بھی مضمر ہیں جو دس آزاد عناصر پر مبنی مساواتوں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ بہرحال اب ان تمام ترقیوں کے بعد اُقلیدسی علم ہندسہ کی بدیہات انتہائی دل چسپ، خیال انگیز اور معمولی عقل سلیم کے لیے کارآمد لیکن قصّہ پارینہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ وہ تمام علوم جو ان بدیہات اور اُن کے منطقی نتائج پر مبنی تھے تاریخ علم و حکمت میں ایک بہت مفید، بے حد دل چسپ اور انتہائی کارآمد لیکن حقیقت کا بہت چھوٹے دائرے میں حصار کرنے والے باب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

اس عالم کی اور اس میں موجود ذی حیات اور ذی روح انسان کی جہاتِ آزادی پہلے تین سے چار پھر پانچ اور اب دس تک پہنچ جانے کے بعد علم کے حصول کے بہت سے وہ طریقے جو پہلے ناقابلِ فہم، ناقابلِ قبول اور ناقابلِ یقین سمجھے جاتے تھے انسان کے علم و حکمت کے نزدیک بھی قابلِ قبول اور قابلِ فہم ہو گئے ہیں، لیکن وہ صلاحیتیں جن کو علم و حکمت کی ترقی نے اب قابلِ فہم بنا دیا ہے انسان میں ہمیشہ سے موجود ہیں۔ پہلے جب علم و حکمت کا دائرہ صرف سہ ابعادی آلات، مشاہدات اور منطق سے محدود تھا اعلا جہاتِ آزادی کو استعمال کرنے والی ہستیاں تین جہاتِ آزادی سے اعلا جہات کی آزادیوں سے حاصل کردہ تجربات کو مختلف ناموں سے پکارتی تھیں۔ مثلاً غالب کو کہنا پڑا ہے:

ہر چند کہ ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یا مولانا رومؔ ارشاد فرماتے ہیں:

زادِ دانشمند آثارِ قلم　　زادِ صوفی چیست۔ آثار قدم
ہمچو صیادے سوئے اشکار شد　　گام آہو دید و بر آثار شد
چند گاہش گام آہو درخور ست　　بعد ازاں خود نافِ آہو رہبر است
راہ رفتن یک نفس بر بوئے ناف　　خوشتر از صد منزل گام و طواف

آیئے شاعروں اور صوفیوں کی ان باتوں کو دانشمندوں کی زبان میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

۱۹۱۹ء میں جب سورج گرہن کے مشاہدہ سے نظریۂ اضافیت کی تصدیق ہو گئی تو اس عالم کے مسلسلہ اور مادّہ کو تین ابعادی کے بجائے چار ابعادی مان لیا گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اب اُن کی تعمیر میں لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کے ساتھ چوتھی جہت وقت کی بھی شامل ہو گئی۔ اس نظریہ کے مطابق سر آرتھر ایڈنگٹن نے ایک معیاری کتاب Space, Time and Gravitation لکھی۔ اس کتاب کے مقدمے میں اس عالم کے چار ابعادی ہونے کے مضمرات کو واضح کرنے کے لیے اُنھوں نے فرمایا کہ اگر ایک شخص کو ایک کمرے کے اندر لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کی تینوں ابعاد میں چار دیواروں، فرش اور چھت سے بند کر دیا جائے تو بھی وقت کی چوتھی

بھی کھلی رہے گی۔ اس کے ساتھ اندر بند انسان اگر اپنی وقت کی چوتھی بعد کو استعمال کرنا جانتا ہو تو وہ بند کمرے سے چوتھی بُعد یعنی وقت کے راستے سے باہر بھی آ سکتا ہے اور اندر بھی جا سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر انسان کو وقت کے استعمال کا طریقہ آتا ہو تو اُس کو اپنے تجربی علم کو وسیع کرنے میں مادّی دیواریں، چھت اور فرش حائل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح عام نظریہ جذب میں جن دس جہاتِ آزادی کا ذکر ہوتا ہے اس کے بعد تو علم کے اور بھی زیادہ راستے کھُل گئے ہیں۔

اس مقام پر پہنچ کر تاریخ فلسفہ سے ایک اور بہت دل چسپ بحث سامنے آ جاتی ہے۔ اکثر فلاسفۂ قدیم اور صوفیا کرام کا خیال یہ ہے کہ انسان میں حواسِ خمسہ ظاہری کے ساتھ حواسِ خمسہ باطنی بھی ہوتے ہیں۔ ابن سینا نے اس پر کافی بحث کی ہے اور آخر کار وہ بھی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ حیوانوں اور انسانوں میں اصل فرق یہ ہے کہ حواسِ خمسہ ظاہری ان دونوں میں ایک جیسے ہوتے ہیں، لیکن انسان میں اُن کے متوازی حواس خمسہ باطنی بھی ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس بات کو موجودہ تحقیقوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دماغ کے وہ مرکز جو حواس خمسہ ظاہری سے متاثر ہو کر دماغ میں ایسے برقی تغیّرات پیدا کرتے ہیں جن کو ذہن دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے یا چھونے کے مختلف احساسات سے تعبیر کرتا ہے تو دماغ کے ان ہی پانچ حصّوں میں اعلا جہاتِ آزادی کو استعمال کر کے ویسے ہی کیمیائی تغیّرات امالی (Induced) برق کے ذریعہ سے پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ جیسی طبعی واسطوں سے پیدا ہوتی تھی۔ تصوّف (Mysticism) کا صرف یہ دعویٰ ہے کہ اُن کی خاص مشقوں سے حواس خمسہ باطنی میں اُن سب کو یا کسی ایک باطنی حِسّ کو ایسا حسّاس بنا دیا جاتا ہے کہ پھر مادّی رُکاوٹیں اُس کی ذمّہ دار اعلا جہاتِ آزادی کے استعمال میں حائل نہیں ہوتیں۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ جب بچّہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کی ۵ ظاہری اور ۵ باطنی دسوں حسّیں موجود ہوتی ہیں۔ ظاہری حسّوں کا استعمال آسان ہوتا ہے۔ بچّہ اُن کو ہی استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے اور رفتہ رفتہ اُس کی باطنی حسّیں بالکل شل اور ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ اسلام کا دعوا یہ ہے کہ اگر اُس کے بنائے ہوئے طور، طریق، اعتقادات اور یقین پر پوری طرح عمل کیا جائے تو انسان کے حواس خمسہ ظاہری اور باطنی دونوں پوری طرح ترقی پاتے ہیں۔ تصوّف میں بگڑی ہوئی عادتوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش ہوتی ہے تاکہ انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو پوری طرح استعمال کرنے کے قابل ہو جائے۔

زمانۂ قدیم میں علم کا مدار عقلِ سلیم کی دریافت کی ہوئی متّفقہ بدیہات اور استنباطی منطق پر ہوتا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ یہ طریقِ کار علم کی ترقی میں صرف اس حد تک ممد و معاون ہوا جہاں تک

بدیہات صحیح تھیں یا جہاں تک عقلِ سلیم کی رسائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یونانیوں کے علمی عروج کے بعد ایک ہزار سال تک علوم کی ترقی تقریباً رُکی رہی۔ اس وقت دنیا کی تمام قومیں کارخانۂ قدرت میں متعدد رب خداؤں کے راج کی قائل تھیں۔ یا اُن کے ایمانوں کا مدار معجزات اور مذہبی کہانیوں (Mythology) پر تھا جس میں وہ یہ مانتی تھیں کہ کارخانۂ قدرت میں کوئی اٹل قانون جاری نہیں ہے بلکہ جو کچھ باقاعدگی نظر آتی ہے وہ کبھی بار بار شکست ہوتی رہی ہے۔ خرقِ عادت ایک مسلّمہ اصول تھا۔ اس کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ جو چیز اس وقت اور اس جگہ صحیح ہے وہ ہر وقت اور ہر جگہ صحیح ہو۔ اس لیے باوجود اس کے کہ اسلام کے ظہور سے پہلے منطق میں استقرار یا (Induction) کا اصول دریافت کیا جا چکا تھا لیکن کارخانۂ قدرت میں علم کی ترقی کے لیے نہ وہ جائز تھا اور نہ اس کو استعمال کیا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے شروع ہی سے اس عالم کے پروردگار کی وحدانیت، اس عالم کی وحدانیت، اس عالم میں انسان کی وحدانیت اور انسان کے علم کی وحدانیت پر زور دینا شروع کر دیا۔ اُس نے سورۂ ’الملک‘ میں تیسری اور چوتھی آیات میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا، ”تم آسمان اور زمین میں دیکھو۔ بار بار دیکھو اور غور کرو۔ تمہاری نگاہیں تھک کر اور پس ماندہ ہو کر واپس آئیں گی اور تم کہیں رخنہ یا دراڑ دریافت نہ کر پاؤ گے۔“ اگر علم و حکمت کی ترقی کی تاریخ کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو ظاہری بے قاعدگیوں کی باریک بینی سے جانچ اور پڑتال سے ہی علم و حکمت کی ساری باقاعدگیاں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ گو رسول اکرمؐ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ ہر قسم کے معجزات وابستہ تھے لیکن جب کسی نے معجزہ طلب کیا تو قرآن کریم نے صاف لفظوں میں کہا یہ جاہل اور بے وقوف ہیں۔ معجزہ تو صرف قرآن ہے۔ وہ علم و حکمت کا خزانہ ہے۔ اُس نے نہ صرف قدرت کی یکسانیت اور وحدانیت پر عقیدے کو ایمان کا جزو بنا دیا بلکہ مشاہدات قدرت پر غور و فکر کرنا عقل مندی اور سمجھ داری کی تعلیم کو رسول مقبولؐ کی رسالت کا مشن قرار دے کر علم و حکمت کے میدان میں نئے راستے کھول دیے۔ رسول مقبولؐ نے حکم دیا کہ علم حاصل کرو خواہ اُس کے لیے تمہیں چین ہی جانا پڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین سو سال کے اندر تمام دنیا کے اُس وقت تک کے معلوم شدہ علوم کو عربی میں منتقل کر لیا گیا۔ جابر بن حیان، رازی، موسیٰ برادران، ابن مسکویہ، الکندی، ابن الہیثم، ابن رشد اور دوسرے علماء اور حکماء نے آٹھویں اور بارھویں صدی عیسوی کے درمیان مشاہدہ، تجربہ، استقرار کے طریقوں کو اپنا کر دنیائے علم میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ بیکن نے سولہویں صدی میں یورپ میں مشاہدہ اور تجربہ کے طریقے کو جاری کرنے کی بہت بڑی [illegible] کی۔ مسلمانوں کے فن [illegible] میں استقرار بھی شامل تھا آخر کار

وہاں بھی کام یاب رہا۔ یہاں اس طریقے کو طریقِ سائنس کا نام دیا گیا۔ اور سترھویں اور اٹھارھویں صدی سے اب تک اس کا ہی ڈنکا بج رہا ہے۔

علم و حکمت نے اس قرآنی طریقِ تحقیق کے ماتحت جو ترقی کی اُس نے نہ صرف انسان کا ذہنی اُفق لامحدود حد تک پھیلا دیا بلکہ انسانی زندگی کے لیے وہ سہولتیں اور آسائشیں مہیا کردیں جن کا سترھویں اٹھارھویں صدی تک خیال و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بیسویں صدی اپنے پیراہن میں لامحدود بے کرانیاں چھپائے ہوئے لائی۔ اس کی مناظری اور ریڈیائی دُور بینوں نے اربوں نوری سال پر واقع کھربوں کہکشانی نظاموں سے مانوس کردیا۔ دوسری طرف جوہر کے اندر چھپی ہوئی بے کراں نہین دنیا واشگاف ہوگئی۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس مادّی عالم میں آزادی کی ابعاد کا تعیّن بھی مادّی آلات سے ناممکن ہے۔ اب تک ہم محسوس سے نامحسوس معلوم کرتے تھے لیکن اب جوہری طبیعات، حیاتی کیمیا۔ اور ہیئتی طبیعات وغیرہ میں اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں کے بنیادی تعمیری عناصر کی ہیئت کذائی اور ترتیب کو محسوسات کے احاطے میں لانا تو درکنار ہم اُن کے تخیّلات کو بھی احاطۂ تعقّل میں نہیں لا سکتے۔ ایک ہی حقیقت کبھی ذرّہ معلوم ہوتی ہے کبھی لہروں کا مجموعہ۔ نہ صرف اُن کا نمونہ بنانا ہمارے لیے ناممکن ہے بلکہ اُن کا مکمّل علم حاصل کرنا بھی ہمارے بس کی بات نہیں رہی۔ اب ہم جس قانونِ قدرت کو پورے یقین کے ساتھ جاننے لگے ہیں وہ قانون لایقینی (The Principle of Uncertainty) ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ تجربی طریقِ تحقیق جس کی مدد سے ہم نے مادّی عالم میں یہ ساری کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل کی تھیں اب وہ نفسیات اور دوسری عمرانی حکمتوں میں کام یاب ہوتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ نفسیات میں اب فرائڈ کا علامیاتی (Symbolism) کا نظریہ کام یاب ہو رہا ہے۔ دوسری حکمتوں میں بھی (Symbolic Logic) یا علامیاتی منطق جو روایتی منطق سے مختلف ریاضیات کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے کام یاب ہوتی جا رہی ہے۔

مغربیوں کے ہاتھ میں پہنچ کر مسلمانوں کے تجربی اور استقرائی طریق کار نے اپنی کام یابی کو پوری طرح ثابت کردیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انسان نے وقت اور جذب کی دیواروں کو پھلانگ کر چاند اور خلا میں سفر شروع کردیا۔ مادّے کو توانائی میں تبدیل کر کے توانائی کے اتھاہ ذخیروں کو انسان کی دست رس میں پہنچا دیا، لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ مغرب و مشرق، روس و امریکا، جاپان و انگلستان، جرمنی و فرانس سب ہی ملکوں میں بنی نوعِ انسان کے جمع کیے ہوئے علمی ذخائر کو نوجوانوں کو منتقل کرنے کے دوران میں شک و شبہ (Doubt) کو انتہائی ترقی دی جاتی ہے۔ اور اُن کے ایسے جبلی تقاضوں کو کار آمد سمتوں پر موڑنے کی کوشش کی جاتی ہے جن سے

مادی فوائد حاصل ہو سکیں۔ جیسے بھوک، ڈر، غصہ یا جنسی میلان وغیرہ۔ اُن جبلی تقاضوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے جن سے انسان میں اخلاقی حس، ہمدردی، محبت اور مذہبی انداز خیال پیدا ہو کر پرورش پاتا ہے۔ طریقِ تعلیم کے اِس مخصوص یک طرفہ مادی جھکاؤ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اگر ایک طرف قدرت کی دولت کے اتھاہ ذخیرے انسان کے قبضے میں آ گئے ہیں تو دوسری طرف اخلاقی اور روحانی اقدار کی اہمیت اُس کی نگاہ میں بالکل کم ہو گئی ہے۔ ایک انسان کا دوسرے انسان پر، ایک قوم کا دوسری قوم پر بے یقینی اور شک و شبہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ صرف جوہری توانائی سے عام تباہی اور بربادی کا ڈر اور خوف ہی اُن کو دست و گریبان ہونے سے روکے ہوئے ہے ورنہ عالم گیر جنگیں اور بربادیاں روزمرّہ کا معمول بن جائیں۔ مغرب میں جہاں علم و حکمت اور ٹیکنالوجی کی ترقّی نے مادی انقلاب برپا کر دیا ہے وہیں معاشرے کی بے راہ روی اور جنسی کج روی کو بھی ترقی دی ہے۔ اِس مادی ترقی میں بنی نوع انسان کی تباہی کی بجلیاں بے چین نظر آ رہی ہیں۔ اسی علم و حکمت کو اقبال نے پوست اور محض کھال سے مثال دی ہے۔ اسی کے متعلق وہ فرماتے ہیں ؎

دانشِ مغربیاں، فلسفۂ مشرقیاں　　　همہ بُت خانہ و در طوفِ بتاں چیزے نیست

یا پھر کہتے ہیں ؎

شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ است　　　چشمِ شاں صاحب نظر دل مردہ است

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

شرق حق را دید و عالم را ندید　　　غرب در عالم خزید داز حق رمید

ایسے علم کو اُس کی افادیت کو پوری طرح جانتے ہوئے بھی اُس کے انتہائی نفع بخش نتائج سے آگاہ ہونے کے باوجود اقبال کی طرح کوئی بھی قابلِ احترام نہ سمجھے گا۔ یہ نتیجہ ہے علم و حکمت کے غیر اسلامی طریقے پر حصول کا، نہ کہ علم و حکمت کی اپنی کسی کوتاہی کا۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے اب تک یہ آواز بار بار اٹھتی رہی ہے کہ ہماری تعلیم کو اسلامی فلسفۂ حیات کے مطابق ہونا چاہیے۔ اب تک ہم اس بنیادی سوال کے ظاہری پہلوؤں سے کھیلتے رہے ہیں۔ ہماری تعلیم گاہیں صرف اُس وقت سچے مسلمان عالم و حکیم پیدا کر سکیں گی جب ہمارے طریقِ تعلیم میں ایسی تدابیر شامل کی جائیں گی جن سے بچّوں کے ان جبلی رجحانات کے ساتھ ساتھ جن کو مشرق و مغرب کے طریقوں میں نفع بخش بنانے کی کوشش کی جاتی ہے حرص و ہوس، تعجب و تحیّر اور ذاتی محاسبہ وغیرہ جیسے جبلی رجحانات کو بھی نفع بخش راستوں پر ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

جس علم و حکمت کے احترام کی تعلیم قرآنِ کریم نے ہمیں دی ہے اُس میں علم و حکمت سکھانے کے ساتھ

پاک کرنا بھی شامل اور عالم و حکیم کا باایمان ہونا بھی ضروری ہے۔ جس علم و حکمت کے بڑھنے کی دعا رسول مقبول ؐ فرمایا کرتے تھے، جس علم و حکمت کا احترام نہ صرف ہم پر واجب ہے بلکہ جس کی عظمت و احترام کی خاطر ہر ذی فہم کا سر خود جھک جاتا ہے وہ وہ علم و حکمت ہے جس سے ہمیں علم اشیا پر پورا عبور حاصل ہوا اور جس کی مدد سے ہم نہ صرف چاند، سورج، زمین اور آسمان پر خدا کی نیابت کا حق پوری طرح بلکہ جس کے ذریعہ سے ہم اپنے آپ کو ایسے سانچے میں ڈھال سکیں، جس سے ہمارا ارتقا جنّت الماویٰ کی بلندیوں تک ممکن ہو سکے اور ہم خداوند قدّوس کے دیدار سے سرفراز ہو سکیں اور اُس کے محبوب بن کر اس کا علم حاصل کر سکیں جو سارے علوم کا سرچشمہ ہے۔ اس کے لیے قرآن کریم کے مطابق ہمیں صرف آٹھ خصوصیات اپنی شخصیت میں پیدا کرنی ضروری ہیں۔ وہ یہ ہیں:

(۱) محسنین (بقرہ۔ ۱۹۵) (۲) توابین اور متطہرین (بقرہ - ۲۲۲) (۳) صابرین (آل عمران۔ ۱۴۶) (۴) متوکلین (آل عمران۔ ۱۵۹) (۵) مقسطین (المائدہ - ۴۲) (۶) متقین (توبہ - ۴) (۷) مطہرین (توبہ - ۱۰۸) (۸) اُن کی جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح اُس کی راہ میں لڑتے ہیں (الصّف - ۴) اگر ہمارا نظامِ تعلیم ان خصوصیات کو رکھنے والے عالم و حکیم پیدا کر سکے تو نہ صرف جیتی دنیا اُن کے علم و حکمت کا احترام کرے گی بلکہ رہتی تاریخ میں اُن کے نام سنہری حروف میں لکھے جائیں گے اور اُن کے علم و حکمت کا احترام دوامی ہو جائے گا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام کے علم و حکمت کے تصوّر میں اور مغرب و مشرق کے علم و حکمت کے تصوّرات میں امتیاز ہے۔ مغرب کا علم و حکمت، فلسفہ و آرٹ، بلکہ ذہنی کوشش حواس ظاہری یا طبعی ادراکات میں رشتوں کی دریافت پر مرکوز رہتی ہے اور ان رشتوں سے مادّی فوائد حاصل کرنا ہی ساری کوشش کا مدعا بنا رہتا ہے۔ اس کوشش میں قرآنی طریقِ کار یا مغربی اصطلاح میں موجودہ طریقِ سائنس کے اختیار کرنے سے بڑی کامیابی ہوئی اور تمام ترقیوں اور اُن کے دُوررس نتائج کے حصول نے ان تمام رُوحانی اقدار کو بالکل مفلوج کر دیا ہے جن سے انسان کا متوقع ارتقا جاری رہ سکے۔ آج علم و حکمت کی کیفیت ایسی ہے جیسے ایک قاتل کے ہاتھ میں تلوار، ایک ظالم کے ہاتھ میں بندوق یا ایک پاگل کے ہاتھ میں پتھر ہو۔ ایک فسادی کے ہاتھ میں ایسے مہلک ہتھیار کا کون احترام کر سکتا ہے۔ اس سے خوف زدہ ہو سکتا ہے لیکن اس کی عزّت نہیں کر سکتا۔

اس کے برخلاف قرآن کریم کا یہ دعوا ہے کہ مادّی شکل میں ذی حیات مخلوق کا نقطۂ عروج یقیناً انسان ہے، لیکن اگر وہ اپنے مادّی وجود میں اپنے جسم کے رُوحانی عناصر کو ٹھیک طرح تربیت دے لے تو پھر

ارتقا جاری رہ سکتا ہے۔ اس ارتقا کو جاری رکھنے کے لیے محض حواس خمسہ ظاہری سے حاصل کیا ہوا مادّی اشیا کا علم کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے اُس علم اور اس پر عمل کی ضرورت ہوتی ہے جو حواسِ خمسہ باطنی سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ وحی اس کی ہی ایک خاص صورت ہے جس کا نزول صرف پیغمبروں پر ممکن ہوتا تھا، لیکن بہرحال وہ علم جو انھوں نے وحی کے ذریعہ سے حاصل کرکے ہم تک پہنچایا ہے ایسا ہی نفع بخش اور حقیقی ہے بلکہ اس سے زیادہ جو حواس خمسہ ظاہری کی تگ ودو سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ۵

راہ رفتن یک نفس بر بوئے ناف خوش تر از صد منزلِ گام و طواف

اور اس کے حصول کے بعد ہی نہ صرف علم و حکمت کا بلکہ عالم و حکیم کا بھی احترام واجب ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ ایک مذہبی عقیدہ ہے جس کو مغربی سائنس داں جذباتی عقیدہ (Emotive Belief) کا نام دے کر گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں خود سائنس کا طالب علم ہوں اور میں نے اس منزل میں بہت کام و طواف کیے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے سارے دانش مندی اور Rationalism کے دعووں کے باوجود سائنس میں کبھی تان آکر ایسے ہی عقیدوں پر ٹوٹتی ہے جیسے مذہبی عقیدے مثلاً روحانی اثر یا Ether کیا تھا۔ ایک ناممکن الفہم عقیدے کا نام تھا۔ جوہر (Atom) الیکٹران (Electron) (W. Minus) (Graviton) یہ بھی سب عقیدے ہی ہیں۔ لیکن سائنس داں ان کو عقلی عقیدے (Cognitive Belief) کا نام دے کر عقلی چبوترے پر کھڑا کرکے قابلِ تعظیم بنا دیتے ہیں۔ دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم سائنس کے ان عقلی عقیدوں سے کچھ منطقی نتیجے نکال کر ان کی تجربی جانچ کر سکتے ہیں۔ اور اس جانچ کے نتیجے میں وہ غلط یا صحیح ثابت کیے جا سکتے ہیں لیکن ہر دو صورتوں میں علم بڑھتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے یہ بات مذہب کے جذباتی عقیدوں پر صادق نہیں آتی۔ ممکن ہے یہ اعتراض یہودیت، عیسائیت اور دوسرے مذاہب کے عقیدوں پر ٹھیک ہو، لیکن اسلام کے عقیدوں پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اسلام نے انسانوں کو مذہبی آزادی دے کر حقوق العباد کو ایمان کا جزو لاینفک بنا کر اور خدا کے وجود، زندگی کی نمود، جزا اور سزا اور حیات بعد موت کی مادّی مثالیں بار بار پیش کرکے اور قوموں کی بداعمالیوں کے تاریخی نتائج بیان کرکرکے اپنے تمام عقیدوں کو عقلی عقیدوں (Cognitive Beliefs) میں تبدیل کر دیا ہے اور شخصیت کی وہ خصوصیات جو میں نے خدا کا محبوب بننے کے بارے میں ابھی پیش کی تھیں اُن کو عقل کے نقطۂ نظر سے، منطق کے نقطۂ نظر سے، تاریخ کے نقطۂ نظر سے، نفسیات کے نقطۂ نظر سے، کسی بھی نقطۂ نظر سے جانچ لیجیے افراد اور قوموں کی ترقی کے لیے ازبس ضروری پائیں گے۔

مذہبی قرآنی عقیدوں کا نچوڑ ہے۔
چنانچہ مسلمان علما۔ اور حکما کا یہی عقیدہ رہا ہے کہ علم و حکمت وہی کارآمد اور قابلِ احترام ہے جسے انسان کے حواس خمسہ ظاہری اور حواس خمسہ باطنی دونوں کی مدد سے حاصل کیا گیا ہو۔ اس پر عمل کیا جائے تو علم و حکمت کے سارے فائدے انسان کے لیے منفعت بخش ہو سکتے ہیں۔ اگر صرف حواس خمسہ ظاہری سے حاصل کیے ہوئے علم پر انحصار کیا جائے تو انسانی قافلے کی مثال ویسی ہی ہوگی جیسے پنڈت جی کے قافلے کی ہوئی تھی۔ جو بیچ دریا میں جاکر ڈوب گیا تھا اور وہ بار بار یہی کہہ کر روتے تھے کہ آخر جوں کا توں قافلہ ڈوبا کیوں۔ آج مغرب کی طاقت مادّی علوم پر منحصر ہے، لیکن سوائے عام تباہی کے ڈر اور خوف کے اُس کو لگام دینے والا کوئی نہیں۔ اس علم کو رکھنے والی شخصیتیں مادّی ذرائع کے اتھاہ ذخیروں کے سرور اور غرور میں مدہوش ہیں۔ ان کی حالت بھی اس وقت کچھ ویسی ہی ہے جیسی آفرینش کے وقت معلّم الملکوت کی تھی۔ مغربی دانش وروں کی ایک نسل دو عظیم جنگیں لڑ چکی ہے۔ بنی نوع انسان صلح اور امن کے لیے پُکار رہی ہے لیکن اس کی پہلی کوشش یعنی لیگ آف نیشنز مغرب کے ہی دانش وروں کی ہوا و ہوس کا شکار ہو گئی۔ اب اقوام متحدہ علم و حکمت کے متوالوں کی عظیم طاقتوں کے درمیان خود غرضیوں کا شکار بنی ہوئی ہے۔
آخر اس مشکل کا مداوا کیا ہے؟ اس کشت و خون اور جور و ستم کی روک تھام وہی تحریکِ امن کر سکتی ہے جس کی دعوت اب سے چودہ سو سال پہلے غارِ حرا سے نکل کر ایک اُمّی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دینی شروع کی تھی، جس کی تعلیم نے علم اشیا کی بنیادوں کی نشان دہی کی تھی اور اُس کی تحقیق و ترقی کے نئے نئے راستے کھول دیئے تھے۔ علم کے حصول اور استعمال میں عقل خالص اور اجتماعی اور معاشرتی عنصر دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ آج مغرب میں علم و حکمت کے اسپ تازی کو لگام دینے والی اخلاقی اور مذہبی اقدار بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ ان اقدار کو قابلِ عمل بنانے والے اور سمجھ میں آنے والے عقلی عقیدے صرف اسلام اور قرآن ہی پیش کرتے ہیں۔ علم و حکمت اور اُس کے حاملوں کی اس وقت ہی اصل عزّت و احترام حاصل ہو سکتا ہے جب اُس کو وحی کے ذریعہ سے متعیّن کی ہوئی شخصیت اُبھارنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس کے فوائد کو صرف مادّی حدود کے اندر بند نہ کر دیا جائے بلکہ جب اُس کو ذریعہ بنایا جائے انسان کے بدن اور روح کے ارتقا کا اور مقصدِ خداوندی کی تکمیل کا۔ وما توفیقی الّا باللہ۔

جناب محترم مولانا ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن الانصاری القادری
صدر، ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشنز

"احترام علم و حکمت" کے موضوع کے سلسلے میں ابتدائی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا علم و حکمت کا عدم احترام ممکن ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں ممکن ہے اور یہ کیفیت تاریخ انسانی میں قدیم زمانے سے موجود رہی ہے۔

اس المیے کی داستان یہ ہے کہ ایک جانب انسانوں کے تمام گروہ ہمیشہ سے کسی نہ کسی "نظام معتقدات" کے پابند رہے ہیں، اور دوسری جانب انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہمیشہ موجود رہا ہے کہ علمی تحقیق و تفحص کے راستے سے حقائق کا صحیح تر ادراک کیا جائے۔ اس طرح ایمان (Faith) اور عقل (Reason) کے تصادم کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ "اہل ایمان" نے مجرداً علم کی نفی نہیں کی، مگر اُن کے نزدیک علم کی جائز حدود صرف اُن کے "نظام معتقدات" کے علم کے حصول تک تھیں۔ یہ معتقدات اُن کے لیے "حقائقِ معلومہ" تھے۔ "اہلِ ایمان" کا تصادم دراصل "حقائق غیر معلومہ" کے سلسلے میں ظہور پذیر ہوا۔

اسی تصادم کے نتیجے میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ اسی تصادم کے نتیجے میں مسیحی کلیسا نے علم اور اہلِ علم پر بے پناہ مظالم ڈھائے، لیکن جب اسلام کا انقلابی پیغام آیا تو اُس نے صورتِ حال کو یکسر بدل دیا۔ قرآنِ حکیم نے یہ تعلیم پیش کی کہ "ایمان" اور "عقل" اساسی اور اصولی طور پر ہرگز ہرگز متصادم نہیں ہیں، بلکہ دونوں میں خوش گوار توافق قایم کرنا ہی انسانیت کی کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس طرح "ایمان" اور "علم" جن کی اساس وجدانی شعور اور عقلی شعور ہے، دونوں واجب الاحترام ہیں۔ اس لیے کہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق بن کر انسانی عظمت اور سربلندی کی بنیاد ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (۵۸:۱۱)

یعنی رفع درجات تم میں سے اُن کے لیے ہے جو ایمان اور علم دونوں کے حامل اور دونوں کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ قرآن حکیم نے ابتدائے آفرینش ہی میں انسان کی فضیلت کو علم سے وابستہ کر دیا۔ ابو البشر سیدنا آدم علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم کی عطا اور پھر اس بنیاد پر فرشتوں کو حکم کہ وہ آدم علیہ السّلام کی فضیلت کا اعتراف کریں اس پر دلیل

قاطع ہے۔
علم کی بنیاد پر نوع انسانی تمام انواع مخلوق کے مقابلے میں واجب الاحترام قرار پائی۔ اس طرح قرآن حکیم کی رُو سے علم بدرجۂ امتیاز واجب الاحترام قرار پایا۔ پھر قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں "علم" کے حدودِ اربعہ کا اندازہ لگانا بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا قرآن حکیم کے نزول سے قبل اہلِ ایمان مجرّداً علم کی نفی نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے نظامِ معتقدات سے متعلق علم کو واجب قرار دیتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا قرآن حکیم نے جب "علم" کو واجب الاحترام قرار دیا تو اس سے مراد محض "دینی علم" تھا؟ قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنے والے اس سے پوری طرح واقف ہیں کہ یہ بات حقیقت سے بہت دُور ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کائنات کے رازہائے سربستہ کے علم کے حصول کو ملّتِ اسلامیہ کا مشن قرار دیتا ہے۔ اس پر دلیل وہ کثیر التعداد آیات ہیں جن میں "خلق السمٰوات وَالارض وما بینھما" کا ذکر ہے اور ان پر فکر کی دعوت ہے۔
یہی نہیں بلکہ خشیۃ اللہ کے حصول کی شرط علم کو قرار دیا گیا ہے اور وہ بھی اس علم کو جس کی اساس طبیعی علوم (Physical Sciences) ہیں۔ فرمایا گیا
اِنّمَا یخشَی اللّٰہ مِن عبادہٖ العلماء
خشیۃ اللہ کی صفت واجب الاحترام ہے۔ ایسے ہی وہ صفت یعنی علم جو اس کے لیے اساس ہو بدرجۂ اولیٰ واجب الاحترام ہے۔
انسان کی شخصیت دو صفات سے متّصف ہے: تقلیدی اور تخلیقی۔ تقلیدی اعتبار سے وہ اطاعت و ایمان کا اہل ہے۔ تخلیقی اعتبار سے وہ علم و حکمت کے میدان میں کاوش کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔
قرآن حکیم نے جہاں انسان سے ایمان و اطاعت کا مطالبہ کیا ہے وہاں اس کو خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے تصرّف فی الامور اور "خالقیت" کا مشن بھی دیا ہے: اس طرح اگر وہ اپنی ذات کے تخلیقی جوہر کو بروئے کار نہیں لاتا تو وہ اپنے رب کی ناشکری کا اور اپنی ذات کی توہین کا مجرم بنتا ہے۔ اس تخلیقی جوہر کو بروئے کار لانا ہی علم و حکمت ہے۔
لفظ خالقیت پر دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بدیع بھی ہے اور خالق بھی۔ انسان صرف خالق بننے کا اہل ہے۔ تعدد خالقین قرآن کریم سے ثابت ہے۔
ہم علم و حکمت کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ علم اور حکمت میں فرق یہ ہے کہ علم کثرت معلومات کا نام ہے اور حکمت اسی میدان میں دقّتِ نظر سے متعلق ہے۔ قرآن حکیم نے دونوں کو مقامِ احترام

دیا ہے۔ علم کے سلسلے میں ہم مختصراً دیکھ چکے ہیں ۔ حکمت کے متعلق ارشاد ہوا ہے :

مَنْ یُّوتَ الْحِکْمَۃَ فقد اوتی خیرًا کثیرًا

اسلام میں "حکمت" کے واجب الاحترام ہی نہیں بلکہ عظیم مقام کی حامل ہونے کی واضح دلیل یہ بھی ہے کہ تعلیمِ حکمت کو سید الانبیا صلّی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر منصب میں شامل فرمایا گیا ہے۔

" و یعلمھم الکتٰب وَالْحِکْمَۃَ "

آج سب سے زیادہ قابلِ غور یہ حقیقت ہے کہ علم و حکمت کے میدان سے مُسلم دنیا کنارہ کش ہو گئی اور اہلِ یورپ اس میں داخل ہو کر منزلیں طے کرتے چلے گئے ۔ نتیجہ آج سیاسی تفوق ہی نہیں بلکہ عملی زندگی میں ہر اعتبار سے تفوق اُن کو حاصل ہے اور ہمارا ایمانی تفوق لالہ صحرا ہے ۔ ہماری نو خیز نسلوں کی نظر میں اغیار محترم اور مسلمان ذلیل شمار ہوتے ہیں ۔ کیا علم و حکمت کے واجب الاحترام ہونے کا اس سے زیادہ قطعی ثبوت درکار ہے ؟

احترامِ انسانیت

مقالہ : جناب محترم ڈاکٹر ممتاز حسن

شامِ ہمدرد، راولپنڈی
۳-اکتوبر ۱۹۷۲ء

جناب محترم ڈاکٹر ممتاز حسن

انسانیت احترامِ انسانیت کا نام ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا انسان وہی ہے جس نے انسانیت کا سب سے زیادہ احترام کیا۔ اور ہر انسان کو اس کا مقام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جو پیغام وہ لایا وہ دنیا کے لیے سب سے بڑا اور آخری پیغام تھا۔

انسانیت کا صحیح احترام یہ ہے کہ ہم ہر انسان کی اچھی صلاحیتوں کی حفاظت کریں اور اُن کے نشو و نما کے لیے تمام ممکن سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس میں خاص و عام کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ امتیاز ہمارا قائم کیا ہوا ہے۔ ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ کوئی آدمی عام آدمی نہیں ہے، ہر شخص میں کوئی نہ کوئی صلاحیت، کوئی نہ کوئی خوبی ایسی ضرور موجود ہے جو کسی اَور کے حصّے میں نہیں آئی۔ یہ امتیازی خصوصیت کہیں تو خود بخود اُبھرتی ہے اور کہیں اسے پرورش کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر جہاں تک صلاحیتوں کی حفاظت اور نشو و نما کا تعلق ہے تو انسان توجّہ کا مستحق ہے۔

ہم انسانیت کا احترام کیوں کریں؟ وہ اس لیے کہ انسان کائنات کی ارتقائی کوششوں کا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ ہے۔ محض طبعی اعتبار سے فطرت کے مظاہر کو دیکھیے تو سب سے پہلے جمادات ہیں جو زمین کے اندر اپنی مختصر حدود میں محبوس ہیں۔ اُن کے بعد نباتات ہیں جو زمین سے سر نکال کر اوپر اُٹھتے ہیں، اونچے اونچے درخت بنتے ہیں، اور اگرچہ یہ بھی ایک قطعہ زمین میں مقید رہتے ہیں مگر اپنے پتّوں، پھولوں اور پھلوں سے خلقِ خدا کو مستفید کرتے ہیں۔ اُن کے سایے میں لوگ بیٹھتے ہیں، پھولوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور پھلوں سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ اُن سے آگے حیوانات کا نمبر ہے جو زمین میں گڑے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتے ہیں۔ یہ پانی کے اندر بھی رہتے ہیں اور پانی کے باہر بھی۔ ان میں پرندوں کا مقام بہت بلند ہے کہ وہ زمین پر بھی رہتے ہیں اور آسمان پر بھی۔ بہت دُور بھی جا سکتے ہیں اور بہت اونچا بھی اُڑ سکتے ہیں۔ ان سب کے بعد انسان آتا ہے جو ہر لحاظ سے زندگی کے ان سب مظاہر سے افضل ہے۔ یہ پانی کے اوپر ہو یا نیچے، زمین پر ہو یا ہوا میں، اپنی جسمانی صلاحیتوں کے علاوہ اپنے اختراعات اور ایجادات کے باعث سارے جانوروں سے آگے ہے اور یہ تو ذکر ہے صرف کائنات ظاہر کا

کا۔ کائنات باطنی میں جھانک کر دیکھیے تو اس کے سوا جمادات، نباتات اور حیوانات میں سے کوئی کبھی وہاں نہیں پہنچ پایا ہے۔
کچھ یہی نہیں کہ انسان اس وقت کائنات کا گل سرسبد ہے بلکہ اس کے سامنے ترقی کا ایک ایسا میدان کھلا ہے کہ اس کی آئندہ کامرانیاں اس کی موجودہ اہمیت سے کبھی بالاتر نظر آتی ہیں۔ اپنی ساری کمزوریوں اور ناپختگیوں کے باوجود انسان زمین پر خدا کا نائب ہے۔ خدا اور انسان میں ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ انسان خدا سے ملنا چاہتا ہے مگر مل نہیں نہیں سکتا، کیونکہ خدا ساکن و جامد نہیں ہے۔ وہ ہر آن اپنی تخلیقی ممکنات کو جو بے حد و بے شمار ہیں اپنے آپ پر منکشف کرتا رہتا ہے۔ جب تک انسان اس کے نزدیک پہنچے وہ اور کبھی آگے ہوتا ہے۔ اس ابدی تگ و دو میں انسان نہ خدا سے مل سکتا ہے نہ خود خدا بن سکتا ہے۔ مگر صفاتِ خداوندی کا پرتو اس پر ضرور پڑتا ہے۔ اگر ہمارے دل میں خدا کا احترام ہے تو اس کے نائب اور طالب یعنی انسان کا احترام بھی ہونا چاہیے۔
انسانیت کے احترام کی صورت کیا ہے؟ اسے قائم کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ سب سے پہلے یہ لازم ہے کہ ہر انسان کو تعلیم و تربیت کا یکساں موقع دیا جائے۔ انسانی مساوات کا یہ سب سے اہم پہلو ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر انسان کی ساری صلاحیتیں پورے طور سے پرورش پائیں اور اس کی شخصیت کی امتیازی خصوصیت ابھرے تاکہ اس خصوصیت کے بروئے کار نہ آنے سے معاشرے میں جو خلا واقع ہوتا ہے وہ پیدا نہ ہو۔ علم کے بغیر بھی انسان اور حیوان میں فرق تو رہتا ہے، مگر بہت کم۔ خواندگی کا کام جانور کو آدمی بنانا ہے اور تعلیم کا آدمی کو انسان بنانا۔ طلبِ علم خود علم سے کبھی زیادہ اہم ہے کیونکہ اس طلب میں جویائے علم زندگی اور کائنات کے متعلق جو کچھ سیکھتا ہے اس سے کبھی زیادہ وہ اپنے متعلق دریافت کرتا ہے۔ اور اس دریافت سے اس کی شخصیت کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہیں۔
انسان کی طبیعت میں دو متضاد رجحانات موجود ہیں جو ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ ایک تو اس کی بلندی کی تمنا ہے جو اسے خدا سے قریب تر کرتی ہے۔ دوسرا اس کا وہ رجحان ہے جو اسے پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ بلندی اور پستی کی یہ کشمکش، انسان اور شیطان کا یہ تعاون اور ترکِ تعاون، انسانی شخصیت کا جزو ہے۔ تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں بلندی کی خواہش کو مستحکم کرے اور پستی کے گڑھے میں گرنے سے بچائے۔
تعلیم کے لیے ایسے استادوں کی ضرورت ہے جن کا علم پختہ اور دل بڑا ہو۔ ہر بڑا استاد بڑا آدمی ہوتا ہے اور بڑے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے۔

دوسری چیز جو انسانیت کے احترام کے لیے ضروری ہے وہ معاشرتی توازن ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک شخص کو ہر لحاظ سے ہر دوسرے شخص کے عین برابر سمجھا جائے۔ اس قسم کی مساوات ناممکن ہے۔ کسی میں کوئی قابلیت ہوگی کسی میں کوئی اور قابلیت۔ مگر انسان کا احترام پیشِ نظر ہے تو معاشرہ ایسا ہونا چاہیئے کہ اس میں پنچ ذات، اونچ ذات، زبردست اور زیردست، حاکم اور محکوم کا فرق نہ پایا جائے۔ رنگ اور نسل کی دیواریں انسانوں میں حائل نہ ہوں۔ گورے کو کالے پر فضیلت ہو نہ کالے کو گورے پر۔ نہ کوئی چھوٹا کہلائے نہ بڑا۔ نہ کوئی بشر ہو نہ نفر۔ کوئی کسی کو حقارت سے نہ دیکھ سکے۔ اس قسم کا معاشرہ اس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کے افراد خدا کے پرستار ہوں۔ جہاں خدا کو حاکم مانا جائے گا وہاں کوئی انسان کسی انسان کا محکوم نہیں کہلائے گا۔ ایسے معاشرے میں جو شخص مخلوق کی سب سے زیادہ خدمت کرے گا وہ سب میں محترم ہوگا۔ انسانی تجربہ یہ کہتا ہے کہ اگر ہم ایک اَن دیکھے زندہ اور پائندہ خدا کی پرستش نہیں کریں گے تو اُس کی ناچیز سے ناچیز مخلوق کے سامنے سر جھکاتے پھریں گے۔ اور نہیں تو مرے ہوئے تہرمانوں کو ہی پوجیں گے۔ خدا کی پرستش احترامِ انسانیت کی بنیاد ہے۔

تیسری چیز جو احترامِ انسانیت کے لیے لازم ہے وہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں اقتصادی تعاون موجود ہو اور دولت کا مسئلہ مسئلہ ہی نہ رہے۔ دولت اور جائداد میں مکمّل اور قطعی مساوات تو ممکن نہیں ہے۔ مگر معاشرے میں نہ کوئی امیر ہو نہ غریب۔ ارتکازِ دولت ناممکن ہو۔ روزگار ہر شخص کا حق ہو اور محنت ہر شخص کا فرض۔ آمدنی ایک امانت تصور کی جائے اور اُسے ضروریات پر معتدل انداز سے خرچ کرنے کے بعد جو کچھ بچے وہ معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے دے دیا جائے۔ معاشرے کے اس پہلو کی بنیاد بھی ذاتِ خداوندی سے وابستگی پر ہے۔ یہ وابستگی انسان کے لیے اپنی محدود ذات اور اُس کے محدود مفاد سے باہر نکلنے اور معاشرے میں ایک اخلاقی فضا قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ جلبِ منفعت کی ہوسناکیوں سے مخلصی جبھی ممکن ہے کہ انسان کی توجہ ایک ایسی ذات پر مرکوز ہو جائے جو دنیا اور کاروبارِ دنیا سے ارفع و اعلا ہے۔ جس دل میں خدا کا ڈر ہوگا وہاں انسان کا ڈر نہیں رہ سکتا جس دل کو خدا سے وابستگی ہوگی اُس میں ذاتی منفعت جگہ نہیں پا سکے گی۔ خدا کی محبّت، خدا کے بندوں کی محبّت کا دوسرا نام ہے۔ خدا کا نام لینے کے بعد کوئی انسان اس کی مخلوق سے نفرت نہیں کر سکتا، وہ مخلوق جو خود خدا کا کنبہ ہے۔

چوتھی چیز جو احترامِ انسانیت کے لیے لازم ہے وہ جسمِ انسانی کا احترام ہے۔ جسم روح کا مسکن

ہے۔ اس کا احترام یہ ہے کہ ہم اسے صحت مند رکھنے کی کوشش کریں اور اس سے اچھے کام لیں۔ اگر ہم خود کسی کام کو ذلیل سمجھیں، مگر دوسروں سے وہی کام لینا چاہیں تو یہ اُن کی توہین ہے۔ دوسروں کو گالی دینا بُرا بھلا کہنا اور جسمانی اذیت پہنچانا، انسانی صورتوں کو مسخ کرنا بھی انسانیت کی توہین میں داخل ہے۔ ناحق کسی کی جان لینا ساری نوعِ انسانی کے قتل کے مترادف ہے۔ اور ساری انسانیت کی توہین ہے۔ جب تک معاشرے میں جرائم موجود ہیں اُن کے لیے سزا کا نفاذ ضروری ہے۔ مگر تعزیرات کا مقصد معاشرے کی اصلاح ہونا چاہیے نہ کہ محض مجرم کو ایذا پہنچانا۔ جرم و سزا ایک مدت تک لازم و ملزوم رہیں گے، مگر اس مدت میں بھی یہ لازم نہیں کہ مجرم کی توہین کی جائے۔

ان سب باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ معاشرہ ایسا ہو جہاں کوئی شخص کسی لحاظ سے کسی اور کا محتاج نہ ہو۔ ہر شخص ایک پودے کی مانند اس باغ میں اپنے پورے قد کو پہنچ سکے۔ اور ایک زمانہ وہ بھی آئے کہ جب حکومت اور حکومت کے کارندوں کی بھی ضرورت نہ رہے۔ اور جو حدود اور قیود معاشرے کی حفاظت اور فلاح کی خاطر آج بیرونی طور پر لگانا ضروری ہیں۔ وہ خود فطرتِ انسانی کے اندر سے پیدا ہوں اور اُس کا جزو بن جائیں۔ اس جنّتِ ارضی کو قریب تر لانے کے لیے ہم اپنی مختصر سی زندگی میں کیا کر سکتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہر شخص کو خود ہی دینا ہوگا۔ البتہ جو دل نفرت سے پُر ہوگا اس دل میں اس سوال کی اہمیت کا احساس ہی پیدا نہیں ہو سکے گا۔ نفرت انسانیت کی توہین ہے۔ اس سے دل تنگ سے تنگ تر ہوتا جاتا ہے اور نشو و نما کے امکانات تباہ ہو جاتے ہیں۔ انتقام کا جذبہ لاحاصل ہے، اس میں محض وقت کا زیان ہے۔ جو وقت انتقام لینے میں صرف ہو اُس کے لیے اس سے بہتر مصرف بھی ہو سکتا ہے۔ زندگی ترجیحات کی جنگ ہے۔ اس محدود مدت میں جس کا نام انسان کی عمر ہے ہم کیوں نہ وہ کام کریں جو ہماری رائے میں بہترین ہو۔ اور بہترین کام وہ ہے جس کی بنیاد انسانوں کی محبت پر ہو۔ محبت انسانی شخصیت کے ارتقا کا زینہ ہے۔ زندگی میں ہزاروں دلچسپیاں ہیں، مگر محبت اور دوستی ان سب کا عطر ہے۔ محبت کسی چیز سے بھی ہو سکتی ہے۔ کسی انسان سے بھی اور کسی عالمی مقصد سے بھی۔ ان میں نوعِ بشر کی محبت ساری محبتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اگر ہمیں کسی ایک انسان سے بھی حقیقی محبت ہے تو سارے انسانوں کی محبت سے مفر نہیں۔ محبت نیکی اور خدمتِ خلق کی بنیاد ہے۔ جب نیکی طبیعت میں پختہ ہو جائے تو نفرت اور انتقام اس میں جگہ نہیں پا سکتے۔ ایک نیک آدمی کی مثال ایک گھنے درخت کی سی ہے جو پھل سے لدا

ہوا ہوتا ہے، لوگ اُس کا پھل کھانا چاہتے ہیں، کچھ تو اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب پھل پک کر گرے اور وہ اُٹھائیں، کچھ درخت کے اوپر چڑھ کر شاخوں کو متشدد طور پر ہلاتے ہیں تاکہ ان کی اس حرکت سے پھل نیچے گرے اور وہ اُسے گھر لے جائیں، اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو نیچے کھڑے ہو کر درخت کو پتھر مارتے ہیں اور اس طرح اس کا پھل حاصل کرتے ہیں۔ ان سب طالبانِ ثمر کو درخت ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا کام پھل دینا ہے۔ یہ پھل کھانے والوں کا کام ہے کہ وہ اس سے شائستگی سے پیش آئیں یا سختی کو کام میں لائیں۔ درخت کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ہر حال میں پھل دے گا

ہم فطرت کی طرف غور سے دیکھیں تو ہمیں یقیناً اپنی خود غرضیوں اور جذبۂ استحصال سے شرم آنے لگے۔ دیکھیے دریا کے پاس کتنا پانی ہے۔ کیا وہ خود اس میں سے ایک بوند بھی پیتا ہے؟ درخت کے پاس پھل ہے۔ کیا وہ اپنے پھل کو خود کھاتا ہے؟ چاند کے پاس روشنی ہے، ہوا کے پاس ٹھنڈک ہے، پھول کے پاس خوشبو ہے، کیا یہ چاند اور یہ ہوا اور یہ پھول اپنی زندگی اپنے وجود کی ساری دولت ہماری نذر نہیں کر دیتے، کیا ساری کائنات ایک نظامِ بخشش نہیں ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ انسان اپنی ہوس، اپنی خود غرضی، اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دوسروں کا نقصان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، اور اپنی شخصیت کی نشو و نما میں مدد دینے کے بجائے اس کی جڑیں کاٹتا رہتا ہے؟ کاش انسان فطرت کی طرف دیکھے اور اُس کی داد و دہش سے الہام حاصل کرے۔ یہی احترامِ انسانیت کا راز ہے۔



احترامِ انسانیت ـــــ راولپنڈی ـــــ ۳ر اکتوبر ۱۹۷۲ء ـــــ جناب انصار ناصری (صدر مجلس)، جناب ممتاز حسن (مقرر)



مقرر: جناب چودھری نذیر احمد خاں ، صدر : جناب جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن



دائیں طرف
چودھری نذیر احمد خاں
بائیں طرف
جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن

احترامِ قانون و عدل

کلماتِ ابتدائیہ	:	حکیم محمد سعید
مقالہ	:	جناب محترم چوہدری نذیر احمد خاں
کلماتِ صدارت	:	جناب محترم جسٹس ایس۔اے۔رحمن

شامِ ہمدرد، لاہور

۵۔اکتوبر ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

قانون ایک معاشرتی ضرورت اور حقیقت ہے۔ فرد اور فرد کے باہمی روابط اور افراد کی اجتماعی بھلائی میں قانون ایک مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ افراد کے اختلافات کو حدود میں رکھنے، باہمی نزاعات کو فیصل کرنے اور امن برقرار رکھنے کے لیے قانون ضروری ہے۔ قانون فرد کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور اس طرح معاشرے کے تار و پود کو برقرار رکھ کر انسانی آزادی کو برقرار رکھتا ہے۔ کسی مملکت کے نظام کو برقرار رکھنے کے لیے قانون سازی، قوانین نافذ کرنا اور ان کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ اسی ضرورت سے مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ سے ادارے وجود میں آتے ہیں۔ ان اداروں کا حُسنِ تعاون کسی مملکت کے استحکام اور فلاح و ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔ حُسنِ تعاون سے میری مراد جہاں ان اداروں کا باہمی احترام ہے وہاں ایک دوسرے کے دائرے میں پُر تعاون عدم مداخلت بھی ہے۔ جہاں یہ ہم آہنگی نہ ہوگی وہاں باہمی شکایات پیدا ہوں گی اور معاشرے کے متوازن ارتقا میں خلل پیدا ہوگا جس کے اثرات انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں پڑیں گے اور حقوق و فرائض میں بے اعتدالی ظہور پذیر ہوگی۔ جب صورت یہ ہو جائے تو قانون تارِ عنکبوت کہے جانے کا مستحق ہو جاتا ہے، جس میں چھوٹی مکھیاں تو پھنس جاتی ہیں، مگر بڑی مکھیاں اسے توڑ کر نکل جاتی ہیں۔

سب سے اچھا قانون وہ ہے جو سب کے لیے یکساں ہو اور جو ادنیٰ و اعلیٰ سب پر یکساں قوت کے ساتھ نافذ کیا جا سکے۔ جس میں چھوٹے بڑے، امیر و غریب، حاکم و محکوم کا امتیاز نہ ہو۔ ایسا وہی ہو سکتا ہے جس کی پُشت پر لوگوں کی مرضی اور اُن کے احساسات ہوں اور جس کو قبول کرنے میں بیرونی دباؤ سے زیادہ اندرونی تحریک کارفرما ہو۔ ایسا قانون وہ ہو سکتا ہے جس کی تعزیر سے بچنے کے لیے لوگ چور دروازے تلاش نہیں کرتے۔

قانون کی اس خوبی کے ساتھ قانون بنانے والوں، اس پر عمل کرنے اور کرانے والوں اور اس عمل کو جانچنے والوں کا کردار بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ قانون بنانے والے اگر اپنے فائدے کو ملحوظ رکھ کر قانون بنائیں اور نافذ کرنے والے اگر جانب داری برتیں اور فیصلہ کرنے والے اگر انصاف نہ کریں تو قانون کی قوت و حرمت میں کمی آنی لازمی ہے، اور چاہے کوتاہ اندیش اس کے نقصانات کو محسوس نہ کر سکیں، مگر اس کے بُرے نتائج لابدی ہوں گے۔ لیکن اگر سب کے لیے

ایک قانون ہو اور اُس کا اطلاق سب پر یکساں ہو اور اختلاف کی صورت میں فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جائے تو معاشرہ متوازن اور مستحکم بنیادوں پر ارتقا کرے گا اور ایسے معاشرے میں ہمہ پہلو انسانی ترقی کے غیر محدود امکانات ہوں گے۔

انسانی تاریخ ایک ایسا معاشرہ دیکھ چکی ہے اور وہ تھا اسلامی معاشرہ۔ اس معاشرے کی بنیاد عدل پر تھی۔ درحقیقت اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ عدل قائم کرے۔ عدل اسلام کا مقصد ہے اور اسلام اور عدل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

سورۂ الحدید میں فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید ۲۵)

یعنی: ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ انسان انصاف پر قائم ہو۔

مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ انصاف پر ہر حالت میں قائم رہیں چاہے انصاف کی زد اُن کی اپنی ذات پر پڑتی ہو یا اُن کے کسی عزیز قریب پر حتیٰ کہ وہ اپنے ماں باپ کو بھی انصاف سے بالاتر نہ سمجھیں۔ سورۂ نسا میں ارشادِ باری ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (نساء ۱۳۵)

یعنی: اے ایمان والو! اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو اور انصاف پر خوب قائم رہو چاہے تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور رشتے داروں کے خلاف ہو۔

اسی سورہ کی ایک اور آیت میں ہے:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (۴: ۵۸)

یعنی، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعلان کرنے کی ہدایت فرمائی کہ

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (شوریٰ: ۱۵)

یعنی، اور مجھے تمہارے درمیان عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سرکارِ دو عالم ؐ نے عدل کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے کس بلیغ انداز میں فرمایا ہے کہ لقد شقیت ان لم اعدل۔ یعنی، میرا نصیبہ اچھا نہیں اگر میں عدل نہ کروں۔

آج شام ہمدرد کی صدارت جناب محترم جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن صاحب فرما رہے ہیں جو پاکستان کی سب سے بڑی عدالت (سپریم کورٹ آف پاکستان) کے صدر رہ چکے ہیں اور قانون و عدل میں فہم و فراست اور عمل کی بے نظیر روایات قائم کر چکے ہیں۔ اُن کا نہ صرف یہی کردار (کریڈٹ) ہے کہ اُنھوں نے عدلیہ کے مقام اور وقار کو بلند و بالا رکھا بلکہ ہمیشہ اور ہر موقع پر اُنھوں نے عدلیہ کو انتظامیہ کی ہر آنچ سے بچانے کی جدوجہد کی ہے، اور پوری امانت و دیانت کے ساتھ کی ہے۔ اس مجلس کی صدارت کہ جہاں موضوع فکر "احترام قانون و عدل" ہو پاکستان میں اس سے بہتر صدر نہیں مل سکتا۔ ہم اسے نہ صرف اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں بلکہ اس موضوع پر اُن کے ارشادات کو قول فیصل بھی قرار دیں گے۔

جناب محترم چوہدری نذیر احمد خاں صاحب ہمارے ملک کے عظیم قانون داں ہیں۔ اُن کی ساری زندگی قانون کے ساتھ گزری ہے اگو اس زندگی میں بڑا تنوع بھی ہے۔ وہ پاکستان کی کابینہ میں وزیر صنعت بھی رہے ہیں، مگر ان دنوں اُنھوں نے بزم اکبر کی بنیاد ڈال کر دنیائے ادب میں اپنے بڑوں کا ادب کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ چوہدری صاحب شاید پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے عالمی کانفرنس میں جہاں حقوق انسان (ہیومن رائٹس) کا موضوع زیر بحث تھا رسول مقبولؐ کا ہیومن چارٹر (خطبۂ حجۃ الوداع) پیش کیا۔ چوہدری صاحب اتحاد بین المسلمین کے داعی اور مبلغ ہیں۔ اُن کی جماعت "الاحبا" اس سلسلے میں ایک اہم خدمت انجام دے رہی ہے۔ ایسی ہمہ پہلو شخصیت اور قانون پر ایک حکم کی حیثیت رکھنے والی ذات ہی آج کے موضوع میں کلام کرنے کا حق رکھتی ہے۔

جناب محترم چوہدری نذیر احمد خاں

ایک ایسے وقت میں کہ جب بقولِ شاعر:

بنائے ملّت بگڑ رہی ہے۔ لبوں پہ ہے جان، مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا اُبھر رہے ہیں
ادھر ہے قومِ ضعیف و مسکیں اُدھر ہیں کچھ مرشدانِ خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہی ہے وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں
کٹی رگِ اتحادِ ملّت، رواں ہوئیں خونِ دل کی موجیں
ہم اس کو سمجھے ہیں آبِ صافی، نہا رہے ہیں، نکھر رہے ہیں

(اکبرؔ الٰہ آبادی)

اور ایک ایسے سمے کہ تمام پرانی اخلاقی قدریں بے قدری کے بے پناہ سیلاب کے آگے اس بےبسی سے بہہ رہی ہیں کہ نیک و بد اور اچھے برے کی تمیز ہی باقی نہیں رہی۔

اوران حالات میں کہ جب خود قانون کے محافظ کھُلّم کھُلّا اعلان کرتے پھریں کہ وہ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آگ لگا دیں گے، اور حصولِ حقوق کے لیے بندوق کا استعمال کریں گے اور ہمارے چہیتے۔ "سیّاں بھیے کوتوال۔ اب ڈر کا ہے کا" کا گیت گاتے ہوئے روز روشن میں قانون کی مٹی پلید کرنے میں مشغول ہوں۔

اور جب نوبت بہ ایں جا رسید کہ ہر طرف امن و چین کی صورتیں بگڑتی نظر آ رہی ہوں حتّیٰ کہ صدیوں کے آزمائے ہوئے نسخے بھی تسلّی بخش نہ ثابت ہوں، ہم ایک زمانہ سے سنتے چلے آئے ہیں: "ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را" لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب یہ آسودگی کبھی کسی خوش بخت کو نصیب ہو تو ہو ورنہ جس طرح قانون کی بے حرمتی بڑھ رہی ہے اُس سے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ خدانخواستہ اس وبا سے سب ہی متاثر ہو جائیں گے خواہ وہ کہیں ہوں، یا کسی حالت میں ہوں اور پھر اگر قانون کی بے حرمتی کو "تعمیرِ نو" کا نام دیا جانے تو آپ خود فیصلہ کر لیں کہ اس معاشرے کا انجام کیا ہوگا۔

اور جب حالت یہ ہو کہ لوگ پوچھتے پھرتے ہیں کہ عدل کس چیز کا نام ہے اور بتانے والا کوئی نہیں ملتا اور بتاتے ہیں تو کسی کو یقین نہیں آتا، غرض کہ جب قوم کا کردار عام طور پر اس حد تک گر چکا ہو کہ نہ

قانون کا احترام باقی رہ گیا ہو نہ عدل کا تو ایسے میں انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کی چار دیواری کے اندر اس ذمّے دار اور باوقار مجلسِ شام ہمدرد کے سامنے " احترام قانون و عدل " پر وعظ شاید کچھ زیادہ سود مند ثابت نہ ہو۔

آگ تو باہر لگی ہوئی ہے اور ہم بند کمروں میں مزے سے بیٹھ کر آگ کے مُضر اثرات اور اُس کے خطرناک نتائج کا جائزہ لینے میں مصروف ہوں اور پھر چائے پر خوش گپّی کے بعد گھروں کو واپس سدھاریں تو غالباً آپ میرے ساتھ اتّفاق کریں گے کہ اس سے نہ آگ بُجھ سکے گی نہ آگ لگانے والوں میں خوفِ خدا پیدا ہوگا۔

اگر اس نظریے سے دیکھا جائے تو میری معروضات محض تضیعِ اوقات ہیں اور بڑی حد تک لاحاصل ہوسکتی ہیں، لیکن اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ ہمیں اپنا فرض بجالانا ہے اور اس وقت ہماری ذمّے داری ہے جب تک حالات قابو میں نہیں آجاتے تو ہماری یہ پکار شاید محض بے سود ثابت نہ ہو۔

حضرت شیخ فرید چاچڑاں والوں نے کیا خوب فرمایا ہے:

کوک فریدا۔ کوک توں ۔ راکھی جویں جوار
جاں تک ٹانڈے نہ پکّن ۔ توں کر داز ہو پکار

اے فرید۔ تو پکار کیے جا جیسے جوار کے کھیت کا رکھوالا کرتا ہے۔ جب تک فصل پک کر سمیٹی نہیں جاتی اس کو پرندوں، جانوروں، چوروں وغیرہ سے بچانا تیرا فرض ہے۔

تو فرض منصبی کی بجا آوری کی نیت سے اور اس غرض سے کہ کلمۂ حق کہنا ہر ایک پر لازم ہے، میں آپ کی سمع خراشی کی معذرت چاہتا ہوا عرض کرتا ہوں۔

کہ جہاں ہر معاشرے کو صحت اور کامیابی کے لیے کئی باتوں کی ضرورت ہے اور کئی قدروں کا احترام لازمی ہے (سب سے بڑھ کر آدمیت کا احترام) وہاں قانون اور عدل کا احترام بھی ایک ضروری شرط ہے کہ اس کے بغیر کوئی معاشرہ زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔

بانیٔ پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناح نے اپنی قوم کو تین چیزوں کی نصیحت کی تھی۔ اتحاد، یقین اور تنظیم۔ تنظیم سے اُن کی مراد یہی تھی کہ معاشرے کا ہر فرد بڑا یا چھوٹا، امیر یا غریب، قانون کا احترام کرے، ضابطے کا پابند ہو اور نظم و نسق کا خاص طور پر خیال رکھے کہ ان کے بغیر کوئی معاشرہ سلامتی کے کنارے نہیں پہنچ سکتا۔ قانون سے مراد محض رائج الوقت قوانین ہی نہیں بلکہ وہ تمام مذہبی و اخلاقی اقدار بھی اس میں شامل ہیں جو صدیوں سے انسان کو معزز بنانے کی ذمّے دار

ثابت ہوتی ہیں۔ ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہم قائدِ اعظم کا پاکستان بنا رہے ہیں لیکن کیا یہ حقیقت ہے؟ یا محض دھوکا ہے؟ کیا ہم قائدِ اعظم کے فرمان سے سراسر سرتابی تو نہیں کر رہے؟ جتنی بدنظمی اور انتشار کا مظاہرہ اس وقت ہو رہا ہے شاید گزشتہ ۲۵ برس میں نہ ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ کسی قانون یا ضابطے کا پابند ہی نہیں رہا اور نہ رہنا چاہتا ہے۔ اور رہے بھی کیسے! جب تمام ذرائع ابلاغ سے اس کو یہی تعلیم دی جائے کہ یہاں حقوق ہی حقوق ہیں فرائض کوئی نہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ملت کے افراد میں احساس ذمہ داری مفقود ہوتا جا رہا ہے اور مقررہ حدود سے تجاوز کرنے کا رجحان زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

آپ کسی شاہراہ، کسی بازار، کسی گلی میں چلے جایئے، خلافِ قانون حرکات کا بھرپور نقشہ قدم قدم پر آپ کے پیش نظر ہوگا۔ گزرگاہوں پر چلنا مشکل ہوگیا ہے۔ اس قدر ناجائز تصرفات آپ کو ملیں گے کہ بعض اوقات خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قانون کی اسی طرح بے حرمتی ہوتی رہی تو اس کے نتائج انتہائی تباہ کن ہوں گے۔

ریلوں میں، بسوں میں، دفتروں میں، اسکولوں میں، سینما میں، غرض کسی پبلک جگہ آپ چلے جائیں آپ دیکھیں گے کہ قانون کا احترام اٹھتا جا رہا ہے۔ ہاں ڈنڈے کا احترام ابھی تک کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ خدانخواستہ یہ بھی اٹھ گیا تو بس اللہ ہی حافظ ہے، لیکن ڈنڈے کا ڈر قانون کا احترام نہیں ہے۔ قانون کے احترام سے مراد تو نظم و نسق کے اس خاموش ضابطے کا احترام ہے جو طاقت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ افرادِ ملت کی سرشت میں داخل ہو چکا ہے اور خواہ ظاہری پابندیاں اور گرفتیں ہوں یا نہ ہوں، اس ضابطے کی پیروی عوام کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ صحت مند معاشرے کا یہی خاصا ہے۔

مئی ۱۹۴۸ء میں مجھے ایک سرکاری وفد کی حیثیت سے لندن جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم حکومتِ برطانیہ کے مہمان تھے۔ ایک سرکاری کار میں ہم تین ارکان وفد ایک تقریب سے رات کو بہت دیر سے واپس آ رہے تھے۔ ہماری قیام گاہ ویسٹ اینڈ کے ایک نہایت خاموش علاقے میں تھی جہاں اس وقت ٹریفک قریباً بند ہوتا ہے۔ ایک موڑ پر پہنچے تو سرخ بتی کا سگنل نمودار ہو چکا تھا۔ ہمارے ڈرائیور نے کار روک لی۔ ہم نے کہا اس مقام پر اس وقت تو آمد و رفت نہیں ہوتی۔ ڈرائیور نے کہا سرخ بتی کا احترام اس طرح عادتِ ثانیہ بن چکا ہے کہ وہ اسے نظرانداز نہیں کر سکتا۔

یہ اس انگلستان کی بات ہے جو دوسری جنگ کے بعد اپنی حقیقی عظمت اور اپنا روایتی مقام کھو چکا تھا وہاں بھی پرانی اقدار کو کافی ٹھیس لگ چکی تھی، لیکن پھر بھی چونکہ قوم میں برسوں سے حرمتِ قانون کا جذبہ موجود تھا گرتے گرتے بھی اس قوم کے یہ اخلاق تھے کہ ڈنڈے کے بغیر بھی حرمتِ قانون کا پاس و

لحاظ رہتا تھا۔
برعکس اس کے اپنا حال سُن لیجیے۔ میرے مکان کے سامنے چند ماہ سے ٹریفک سگنل لگے ہیں۔ یہ جگہ لاہور کی مصروف ترین گزرگاہوں میں سے ہے۔ گلبرگ روڈ، فوّارہ والا چوک پر، جہاں سے گلبرگ کی بڑی آبادی میں داخل ہوتے ہیں، کاروں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے اسّی فی صد لوگ سُرخ بتّی کی پروا نہیں کرتے، حتّٰے کہ ان گنہ گار آنکھوں نے پرائیوٹ کاروں کے علاوہ ومنی بس کے ڈرائیوروں کو بھی دیکھا ہے کہ سگنل کی ذرا پروا نہیں کرتے خواہ گاڑیوں کی ٹکّر کا خطرہ ہی کیوں نہ درپیش ہو!
یقین جانیے دوسرے ممالک کے ساتھ اپنے ملک کے حالات کا تقابل کر کے بہت دُکھ ہوتا ہے، بلکہ رونا آتا ہے کہ قوم قانون کی بے حرمتی کر کے تباہی کے راستے پر جا رہی ہے۔ اس قوم کا کیا بنے گا، اللہ ہی حافظ ہے۔
۱۹۴۸ء میں ابھی تک انگلستان میں بعض اشیا کا راشننگ تھا۔ سب کو چینی کی ایک میکہ ملتی تھی۔ انڈا ہفتے میں ایک۔ ہم شاہی مہمان تھے۔ ہمیں روز ایک تازہ انڈا ملتا تھا۔
اسی طرح دنیا کے اکثر ترقی یافتہ ملکوں میں ہر شعبۂ زندگی میں قانون کا احترام دیکھا۔ ڈنڈا ہو یا نہ ہو قانون اور ضابطے کی پابندی لوگوں کی عادت بن چکی ہے۔ سوئٹزرلینڈ اور نیوزی لینڈ کے اکثر شہروں میں سوائے کبھا کبھی کے اوقات کے میں نے ٹریفک پولیس کو بازاروں بلکہ چورستوں میں نہیں دیکھا۔ اور یہاں یہ حالت ہے کہ پولیس والا نظر آتا ہے تو قانون کا احترام بھی یاد رہتا ہے۔ اُس کی نظر اُدھر ہوئی تو کیا قانون اور کیا ضابطہ۔ ہم تو حضرت اکبر الہ آبادیؒ کے شعر کے مصداق بن گئے ہیں:

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اُجالے میں چُوکتا بھی نہیں

شرع کے لفظ کو آپ ڈنڈے میں بدل دیں تو شعر کا مطلب اور واضح ہو جائے گا!

"خلافِ ڈنڈا کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں"

مولانا حالی نے اپنے مخصوص ناصحانہ رنگ میں اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

طاعنوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہِ خطا
وار اُن کا اس لیے اکثر خطا جاتا رہا

نفسِ مضمون سے بے تعلق تو ہے لیکن اُن کا یہ شعر بھی بے ساختہ یاد آ گیا۔ چونکہ میرے حسبِ حال ہے، عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

منہ نہ دیکھیں دوست میرا اگر وہ یہ جانیں کہ میں
اُن کو کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

مدعا میری معروضات کا یہ ہے کہ بلا محتسب بھی اگر قانون کا احترام دلوں میں جاگزیں ہے تو ہمارا مستقبل تابناک ہے۔ اور اگر ہم صرف مارشل لا کے ماتحت ہی رہنا پسند کرتے ہیں تو پھر ہماری حالت مخدوش ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا اسباب و شرائط ہیں جو افراد کو فطری طور پر حرمت قانون پر آمادہ کرتے ہیں۔ میری رائے میں چار بڑی شرائط ایسی ہیں کہ اُن کے بغیر کسی قوم میں حرمتِ قانون کا تصوّر پیدا کرنا ہی مشکل ہے:

اوّل مروجہ قوانین اچھے ہوں، قابلِ عمل ہوں، منصفانہ ہوں۔ ظالمانہ نہ ہوں۔ اور ملت کے ہر فرد پر، خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو، مساوی طور پر حاوی ہوں۔ اچھے قانون کی پہچان یہ ہے کہ وہ قوم کی مسلّمہ اخلاقی اقدار پر پورا اُترے۔ ہر قوم اپنے مزاج، اپنی روایات، اپنی اقدار اور اپنی ضروریات کے مطابق قانون وضع کرتی ہے۔ آج کل کی اس غیر مسلم دنیا میں جسے مہذب و ترقی یافتہ دنیا کہا جاتا ہے، قانون کی حکمرانی یا قانون کی بالادستی کا بہت چرچا ہے (یہ اور بات ہے کہ چوں بہ خلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند) لیکن مغرب کے قانون پرست و قانون ساز اس بات پر متفق ہیں کہ اچھے قانون کی پہچان یہ ہے کہ وہ حقیقی انصاف، قدرتی انصاف اور فطری انصاف Natural Justice کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ یعنی کے اصولوں کے خلاف نہ ہو۔

اس حقیقی انصاف کے لیے بھی چند شرطیں بیان کی جاتی ہیں جن میں زیادہ اہم و قابلِ ذکر پانچ ہو سکتی ہیں:

(۱) ہر شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی بغیر اسے اطلاع دیے نہ کی جائے۔ شو کاز نوٹس بہرحال لازمی ہے۔

(۲) اس کو اپنی مدافعت میں عذرات پیش کرنے کا مناسب موقع دینا چاہیے۔

(۳) تفتیش کی سماعت ایک آزاد اور غیر جانبدار عدالت کرے۔

(۴) کوئی شخص ایسے تفتیے کا تصفیہ نہیں کر سکتا جس سے خود اُس کا ذاتی تعلق ہو۔

(۵) حاکم مناسب طور پر اور نیک نیتی سے واقعات کی شہادت کے مطابق فیصلہ کرے، من مانا فیصلہ نہ دے۔

میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اچھے قانون کا یہ نظریہ جو غیر مسلموں کے ہاں رائج ہے بالکل درست

اور مناسب ہے۔ میں صرف یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے اچھے قانون کی ضمانت یہ ہے کہ وہ قرآن و سنّت کے مطابق ہو۔ ایسے قوانین نہ صرف عین Natural Justice کے مطابق ہوں گے بلکہ وہ ایسے آئینی اصولوں کے ماتحت وضع کیے گئے ہونگے جو خدائی انصاف (کہ اس سے بہتر کوئی انصاف نہیں) اور اعلا اخلاقی قدروں کے مطابق ہوں گے۔

مسلم ممالک کو چاہیے کہ وہ اپنے آئین میں واضح طور پر بیان کر دیں کہ اُن کے تمام قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہوں گے۔ یہ وعدہ مثبت ہو، منفی نہ ہو۔ ابھی تک تو یہ کہا جاتا رہا ہے کہ کوئی قانون (پاکستان میں) قرآن و سنّت کے خلاف نہ ہوگا۔ یہ منفی نظریہ ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ ہر قانون قرآن و سنت کے مطابق ہوگا۔

ہمارا نیا آئین وضع ہو رہا ہے۔ اور واضعین ماشاء اللہ سبھی کلمہ گو ہیں۔ ہمیں اُن سے توقّع رکھنی چاہیے کہ وہ راہ راست اختیار کرتے ہوئے یہ اصول وضع کریں گے کہ پاکستان کا ہر قانون قرآن و سنّت کے مطابق ہوگا۔ "اچھے قانون" کی اس سے بہتر ضمانت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ان اچھے قوانین کی حُرمت اس سے بھی بڑھے گی کہ نئی نسل کو قرآن و سنت کی تعلیم دی جائے تاکہ اُن کے دلوں میں اس عظیم ہدایت کے ماتحت مروّجہ قوانین سے ایک دلی لگاؤ پیدا ہو سکے جو یقیناً انھیں احترام قانون کی طرف قدرتی طور پر راغب کرے گا۔

دوئم، حرمتِ قانون کی دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا حاکم و محکوم دونوں پر یکساں طور پر اطلاق ہو، اس کی زد سے کوئی نہ بچ سکتا ہو، بڑے اور چھوٹے کی تفریق اطلاقِ قانون میں مٹ جانی چاہیے۔

سوئم، تیسری شرط یہ ہے کہ ہنگامی حالات میں خاص قوانین جو نافذ کیے گئے ہوں وہ ان حالات کے اختتام پر فوراً ختم ہو جانے چاہییں۔

چہارم، چوتھی شرط یہ ہے کہ کسی قانون کے ماتحت کوئی تعزیر نہ دی جائے جس کا مدافعہ خود اسی قانون میں موجود ہو۔

ان کے ساتھ ہی اگر بچّوں کے دلوں میں شروع ہی سے احترام قانون کا جذبہ پیدا کیا جائے تو یقیناً حرمتِ قانون کے حق میں رائے ہموار کرنا نسبتاً آسان ہو سکتا ہے۔

جیسا میں عرض کر چکا ہوں یہ قرآن کی تعلیم عام کرنے اور ہمارے قوانین کے قرآن اور سنّت کے مطابق ہونے سے ہو سکتا ہے۔

اب میں کچھ معروضات احترامِ عدل کے بارے میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ عدل کے عام فہم معنے یا اُس کا مترادف "انصاف" ہے۔ چناں چہ آپ نے اکثر "عدل و انصاف" کی اصطلاح کو یک جا استعمال ہوتے دیکھا ہوگا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "عدل" کے صحیح معنیٰ اچھی طرح ذہن نشین کر لیے جائیں تاکہ اس کا مفہوم بالکل واضح ہو جائے۔

عربی لغت کے مطابق اونٹ کے دونوں طرف جو بوجھ لادا جاتا ہے، اور جو ایک دوسرے کے بالکل مطابق ہوتا ہے، ان میں سے ہر ایک "عدل" کہلاتا ہے۔ لہٰذا اس کے بنیادی معنیٰ ہیں برابر ہونا۔ "عدل المیزان" میزان کو برابر کر دیا۔ مثل اور نظیر، ہم وزن اور اعتدال۔ یہ سب عدل کی مختلف شکلیں ہیں۔

سورۂ حجرات میں عدل اور قسط کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں (قسط اور عدل) دونوں کے معنیٰ انصاف کے ہیں۔ لیکن ان میں جو باریک فرق ہے اسے یوں سمجھیے کہ عدل کے معنیٰ ہوں گے دو آدمیوں میں برابر کا سلوک کرنا اور قسط کے معنی ہوں گے کسی کے حقوق اور واجبات کا پورا پورا ادا کرنا۔

قرآن حکیم میں عدل اور احسان کا بار بار ذکر آتا ہے۔ کسی کو پورا پورا معاوضہ دینا عدل ہے اور اس کمی کو پورا کر کے اس کے توازن (حسن) کو قائم کر دینا احسان ہے۔

قرآنی معاشرے کی بنیادیں عدل و احسان پر استوار ہوتی ہیں۔ کسی شخص کو کسی دوسرے پر زیادتی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

والقسط والمیزان کے الفاظ بھی اللہ تبارک تعالےٰ نے ارشاد فرمائے۔ ان کا مفہوم بھی یہی ہے۔ ابنِ فارس نے کہا ہے کہ وزن کے بنیادی معنیٰ استقامت اور تناسب و اعتدال کے ہیں۔ نیز دو چیزوں کے وزن کو برابر کرنے کے۔

قرآن کریم نے وزن کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کو خاص اصولی معنوں میں استعمال کیا ہے۔
نظام کائنات پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ سارا سلسلہ توازن کی رُو سے قائم ہے، چونکہ انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کی دنیا میں بھی یہی توازن (Equilibrium) قائم رہے۔

حکم ہوتا ہے: تم اپنی تمدنی، معاشرتی اور معاشی دنیا میں ہمیشہ اس اصول کو پیشِ نظر رکھو۔ معاشرتی اور معاشی توازن کو عدل و انصاف کے ساتھ برقرار رکھو اور معاشرے کا توازن کبھی نہ بگڑنے دو۔ اس ضمن میں یہ کہنا ضروری ہے کہ معاشرے کا یہ توازن صرف قانون کے الفاظ سے قائم نہیں رہ سکتا، اس کے لیے ایک عملی نظام قائم کیا جائے۔ خدا نے صرف ضابطۂ قوانین ہی نازل نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ المیزان بھی نازل کی ہے۔

سورۂ الحدید (فولاد) کے اشارات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنی نظام کا صحیح نقشہ یہ ہے۔ خدا کی طرف سے ابدی قوانین کا ضابطہ (الکتاب)۔ اس ضابطہ کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لیے نظام (المیزان)

اور اس نظام کے قیام و استحکام کے لیے قوّت (الحدید)
قرآن مجید میں عدل کی ضرورت کی طرف کئی جگہ توجّہ دلائی گئی ہے۔
سورہ النساء میں ارشاد ہوتا ہے (آیت ۵۸) "بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔"
پھر فرمایا باری تعالیٰ نے اسی سورۃ کی ۱۳۵ آیت میں: "اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو۔ اللہ کی طرف گواہی دو۔ اگرچہ اپنی جانوں پر ہو یا ماں باپ اور رشتہ داروں پر۔ اگر کوئی مال دار ہے یا فقیر ہے تو اللہ اُن کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ سو تم انصاف کرنے میں دل کی خواہش کی پیروی نہ کرو۔"
سورہ الاعراف میں ارشاد ہوتا ہے (آیت ۲۹)
"کہہ دو میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔"
سورۂ الحدید میں ارشادِ خداوندی پھر عدل و انصاف کی طرف توجہ دلاتا ہے:
"البتہ ہم نے کتاب اور ترازوئے عدل بھی بھیجی تاکہ لوگ بھی انصاف کو قائم رکھیں"
یہاں یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ پاکستان کی عدالت ہائے عالیہ کا طغرا بھی ارشادِ خداوندی ہے "اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" یعنی۔ عدل کرو کیونکہ عدل تقوے سے قریب تر ہے۔"
یہ چند احکامات میں نے بطور نمونہ پیش کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیم حرمتِ قانون، پابندیٔ ضابطہ، عدل و احسان اور قسط و میزان کی تلقین سے بھرپور ہے۔
صحیح بخاری میں ہے کہ فرمایا رسولِ خدا نے "لوگوں میں عدل کرنا بھی صدقہ ہے۔"
"العادل" بھی اسماء الحسنیٰ میں سے اللہ کا ایک نام ہے۔
کاش کہ مسلمان اس افراتفری کے زمانے میں قرآنی احکام کی طرف اور قرآنی تعلیمات کی طرف رجوع کرتے۔ اُن کی بہت سی مشکلیں حل ہو سکتی تھیں اور اُن کا بیڑا پار ہو سکتا تھا، لیکن افسوس کہ ہم کتاب و سنّت سے اتنے دور ہوگئے ہیں کہ نہ یہ احساس ہے کہ کہاں سے سفر شروع کیا تھا اور نہ اس کا پتہ ہے کہ کہاں جانا ہے۔
قانون کے ایک پُرانے طالب علم کی حیثیت سے میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ احترامِ قانون کا جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے اُس کی مثال دنیا بھر میں کہیں نہیں ملتی۔ اگر ہم مسلمان لفظاً و معناً اس پر عمل شروع کر دیں تو بیڑا پار ہے۔ معاشرہ متمدن ترین معاشروں میں بھی سبقت حاصل کر سکتا ہے۔
۱۹۵۹ء میں میں نے ایک امریکی قانونی رسالے میں لکھا تھا" اور قوموں کے لیے احترامِ قانون محض ایک ضروری قانونی مسئلہ ہے، لیکن مسلمانوں کے نزدیک ایک نظریۂ حیات (آئیڈیالوجی).

اور ایک جزوِ ایمان (Article of Faith) کا درجہ رکھتا ہے۔"

۱۲ سال کے عرصے میں میری رائے اور بھی پختہ تر ہوگئی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں بے یقینی ہے۔ بے یقینی ایک موذی مرض ہے۔

بے یقیں را محشرہا اندر دل است   نقش نو آوردن او را مشکل است

قائدِاعظم علیہ الرحمۃ نے "تنظیم" کے ساتھ یقین پر جو اتنا زور دیا تھا ظاہر ہے وہ اسی نکتے کی وضاحت کر رہے تھے۔ حکیم الاُمّت نے بھی یقین محکم کی تلقین فرمائی تھی۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے سرچشمے سے سیراب ہونے کے بجائے اپنی پیاس بجھانے کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں۔ کبھی واشنگٹن کا رُخ کرتے ہیں، کبھی ماسکو یا پیکنگ کا۔ کیا ہم نے کبھی صدقِ دل سے مکّہ اور مدینہ کا رُخ بھی کیا ہے؟ اگر ایسا کیا ہوتا تو آج مسلمانوں کی وہ حالتِ زار نہ ہوتی جو اکثر مسلم ممالک میں نظر آتی ہے کہ:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم   نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

عدل کا عام فہم تصوّر انصاف کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی واسطے عدلیہ کو عرفِ عام میں عدالت ہائے انصاف کہا جاتا ہے۔ کسی ملک و قوم میں احترامِ عدل کے واسطے ضروری ہے کہ اُس کا عدلیہ منصف ہو اور آزاد ہو۔ یعنی انتظامیہ کے تابع نہ ہو۔

رسول اللہ صلعم نے متعدّد بار منصفوں کی سخت کڑی ذمّے داری کی طرف توجہ دلائی اور اس کی اہمیت واضح فرمائی۔ انسانی تجربہ بھی یہی ہے کہ جس ملک کو ایک عادل عدلیہ نصیب ہوتی ہے اُس میں حقوقِ انسانی کی وہ پامالی نہیں ہوتی جو انتظامیہ کے زیرِ اثر ہونے سے ہوسکتی ہے۔ جب تک عوام کو یقین ہے کہ اُن کے بنیادی حقوق کی عدل و انصاف کے ساتھ اور قانون کی پیروی کرتے ہوئے حفاظت کی جائے گی تو اُن میں ملک کے ساتھ وفاداری اور محبت کا جذبہ قائم رہے گا۔

اگر خدانخواستہ یہ آخری اُمید بھی منقطع ہو جائے تو پھر وہی سماں ہوگا کہ

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

قانون اور عدل کا احترام اسی صورت میں کسی معاشرے کے لیے مفید اور کارآمد ہوسکتا ہے کہ ملّت کے ہر فرد کے دل میں ان دونوں کی حرمت کا خیال بطور ایک جزوِ ایمان کے موجود ہو۔ اس لیے ہم میں سے ہر ایک کو اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے کہ کیا ہم ان بنیادی عقائد پر دل سے یقین رکھتے ہیں اور پھر دوسروں کے لیے ایک عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ خربوزہ سے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اگر ہم خود کسی اچھی روش پر چلیں تو دوسرے

کبھی دیکھا دیکھی ہماری پیروی کریں گے۔ اور رفتہ رفتہ معاشرے میں خوش نظمی اور استواری پیدا ہوجائے گی، لیکن اگر ہم نے کوئی اچھا نمونہ پیش نہ کیا تو دوسروں سے کیا توقع ہوسکتی ہے۔ لیکن کوئی بھی عام انفرادی کوشش کبھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتی جب تک ذمے دار اور با اختیار حلقوں (یا افراد) کی طرف سے اس میں شرکت نہ ہو۔ اس لیے ہم پر جو ذمے داری عائد ہوتی ہے اس سے کہیں بڑھ کر یہ ذمے داری اُن پر وارد ہونی چاہیے جو صاحبِ اختیار ہیں اور جن کا فرضِ منصبی انصاف کرنا ہے (خواہ وہ انتظامیہ سے تعلق رکھتے ہوں یا عدلیہ سے)۔

عام خیال کے مطابق عدل کی توقع عدلیہ سے وابستہ ہے۔ یہ درست ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انتظامیہ قانون کی پابند نہیں۔ یا عدل سے بے پروا رہ سکتی ہے۔ یہ انتظامیہ بھی قانون وعدل کی ایسے ہی پابند ہے جیسے عدلیہ یا معاشرے کا ہر جزو۔

اکثر نامور قوموں کی تاریخ میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں ججوں نے احترامِ قانون وعدل کی شاندار مثالیں پیش کی ہیں۔ اور وہ طاقت سے نہیں دبے یا انتظامیہ کے رعب واثر میں نہیں آئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی داستانوں سے قومیں دنیا میں معزز اور باوقار ہوئیں۔ مسلمانوں کی تاریخ ایسے منصفوں اور قاضیوں کے واقعات سے پُر ہے جنھوں نے بادشاہِ وقت کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے شریعت کے قانون کی پابندی کی اور عدل وانصاف کا دامن نہیں چھوڑا۔

مثنوی "اسرار ورموز" میں ترجمانِ حقیقت سلطان مراد اور ایک معمار کی حکایت بیان فرماتے ہیں۔ بادشاہ کو عمارات کا شوق تھا۔ ایک مشہور اور ماہر معمار سے مسجد بنوائی لیکن پسند نہ آئی۔ طیش میں آکر اس بے چارے کا ہاتھ کاٹ دیا۔

دست آں بے چارہ از خنجر برید

جوئے خوں از ساعدِ معمار رفت — پیشِ قاضی ناتوان و زار رفت

عدالت سے فریاد کی:

گفت اے پیغامِ حق گفتارِ تو — حفظِ آئینِ محمدؐ کارِ تو

میرا فیصلہ قرآن کے مطابق کیجیے

قاضیٔ عادل بدنداں خستہ لب — کرد شہ را درحضورِ خود طلب
رنگِ شہ از ہیبتِ قرآں پرید — پیشِ قاضی چوں خطاکاراں رسید
یک طرف فریادی دعوی گرے — یک طرف شاہنشہ گردوں فرے

قاضی کے سوال پر بادشاہ نے شرمندگی سے اعترافِ جرم کیا۔

اب قاضی کا فیصلہ سنیے:

گفت قاضی فی القصاص آمد حیات　　زندگی گیرد باین قانون ثبات

اور یہ الفاظ تو دائمی طور پر ہمارے لیے خضرِ راہ ہونے چاہییں۔

عبد مسلم کم تر از احرار نیست　　خونِ شہ رنگین تر از معمار نیست

چوں مراد این آیۂ محکم شنید　　دست خویش از آستیں بیروں کشید

مدعی را تاب خاموشی نہ ماند　　آیۂ بالعدل والاحسان خواند

(ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان)

گفت از بہر خدا بخشیدمش　　از برائے مصطفٰیؐ بخشیدمش

حکیم الامت فرماتے ہیں۔

یا فتِ مورے بر سلیمانے ظفر　　سطوتِ آئینِ پیغمبر نگر

اور اُن کے یہ الفاظ تو ہماری ہر عدالت کے سامنے آبِ زر سے لکھے ہوئے نمایاں طور پر آویزاں رہنے چاہییں:

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسند دیبا یکے است

خدا کرے کہ پاکستان کو وہ دن دیکھنا نصیب ہو جب ہماری عدالتیں (ہمارے قاضی) اسلامی قانون پر عمل کریں اور یہ شعر مبارک اُن کے لیے مشعلِ ہدایت ہو۔ آمین۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے رُوحانی، اخلاقی اور تاریخی خزانہ سے مستفید ہونے کے بجائے دوسروں کے خوشہ چیں ہیں، ورنہ داستانِ اسلام میں تو ایسے ایسے واقعات رقم ہیں جن سے ثابت ہے کہ عدل و انصاف نہ صرف عدالتوں کا طرۂ امتیاز تھا بلکہ خود بعض حاکمانِ وقت اور جاہ و جلال والے شہنشاہ بھی حرمتِ قانون و عدل کے اسی طرح پابند تھے جیسا قرآن و حدیث کا حکم ہے۔

ہندوستان کے ایک حکمران شیر شاہ سوری (کہ جس سے بڑھ کر قابل و عادل اور منتظم حاکم کسی ملک کو مشکل سے ملا ہوگا) کا واقعہ تو آپ نے پڑھا یا سنا ہوگا۔ اقبال اور شبلی کی سند تو اسے حاصل نہیں، لیکن جہاں تک میں نے تحقیقات کی ہے قصہ بے بنیاد نہیں۔ بیان ہوتا ہے کہ شیر شاہ کا ولی عہد ہاتھی پر سوار بازار سے گزر رہا تھا۔ کوئی غریب ہندو عورت اپنے گھر میں نہا رہی تھی۔ اتفاق سے شاہزادے کی نظر اُس پر جا پڑی اور اُس نے ایک پھول اُس عورت کی طرف پھینکا۔ دوسرے دن اس عورت کا وارث دربارِ شیر شاہ میں پہنچا اور باصرار تخلیے میں بات کرنے کی اجازت چاہی۔ جب بادشاہ کے حضور پیش ہوا اور کل کا واقعہ بیان کیا تو غصے سے شیر شاہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈالا اور غضب ناک ہو کر ولی عہد کو طلب کیا۔ پوچھا؟ اُس نے اقرار کیا اور کہا، ارادتاً

نہیں۔ نادانستہ فعل سرزد ہوا۔ معافی دیجیے۔ حکم ہوا کل شہزادے کی بیوی اسی ہندو کے مکان میں نہائے گی اور یہ ہندو ہاتھی پر سوار اُدھر سے گزرے گا اور اسی طرح شہزادی کی طرف پھول پھینکے گا۔

درباری اس حکم سے تلملا اُٹھے، لیکن قبل اس کے کہ کوئی بولے، فریادی ہندو بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا اور کہا، جہاں پناہ! حضور کا انصاف رہتی دنیا تک سلامت رہے۔ میں نے شہزادے کو بخوشی معاف کر دیا ہے۔

مولانا شبلی (وہ مولانا شبلی جو ہندوستان میں سب سے بڑے تاریخ داں تھے اور تحقیق کے بغیر کچھ نہیں کہتے تھے) کی نظم "عدلِ جہانگیری" شاید آپ کی نظر سے گزری ہو۔ ایک تاریخی واقعے کو مولانا نے شعر کا لباس پہنایا ہے۔ فرماتے ہیں:

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گذر
ایک دن نورجہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہ گیر اُدھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرتِ حُسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن
ساتھ ہی شاہ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
غیظ سے آ گئے ابروِ عدالت پہ شکن

بیگم سے پوچھا۔ اُس نے کہا:

اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشورِ حُسن میں جاری ہے یہی رسمِ کہن

اس اقبالِ جرم پر شہنشاہ نے مفتیِ دین سے فتویٰ پوچھا:

مفتیِ دین نے بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اُڑا دو گردن
لوگ اس حکم سے دربار میں تھرا اُٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن

ترکنوں کو حکم دیا بیگم کو جکڑ کر باہر لائیں۔ اور پھر جلاد کو حکم دیا "ہاں۔ تیغ بزن"
مولانا فرماتے ہیں:

یہ وہی نورجہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردے میں شہنشاہ زمن

لیکن اب :
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بے کس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر ہے نہ وطن

بیگم نے بادشاہ سے التجا کی :
خدمت شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امر حسن
مفتیٔ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ و زن
وارثوں کو جو دیئے لاکھ درہم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہ زمن
ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رُک جائے تو ہے مستحسن
ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن
اُٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نورجہاں معتکف بیت حزن
دفعتہً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

یہ دونوں واقعات ایک روایتی لیکن مصدقہ دوسرا تاریخی اور مستند قرون اولیٰ کے بزرگوں یا اہل اللہ کے متعلق نہیں ہیں، بلکہ دنیادار حکمرانوں کے ہیں جن میں بادشاہت کی پوری خو بو بھی تھی، جاہ و جلال بھی تھا، لامحدود اختیارات بھی تھے اور پھر پرسش کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ لیکن وہ مسلمان تھے اور مسلمان کے تمدن میں عمل کا احترام ہوتا ہے۔ دوسری مذہبی روایات بھی مسلمانوں کی ایسی ہیں کہ حرمت قانون و عدل ان کے دل میں سموئی ہوئی ہے۔ اس لیے باوجود مطلق العنانی کے دونوں مسلمان حکمرانوں، شیر شاہ سوری، نورجہاں گیر نے عدل کی وہ شاندار روایات قائم کی ہیں کہ آج تک

زباں زد خلائق ہیں۔

افسوس کہ نہ تو ہم اپنے مذہب سے لگاؤ رکھتے ہیں اور نہ ہم اپنی تاریخ سے واقف ہیں اور نہ اپنی شان دار روایات کی ہمیں قدر ہے۔ جیسا کہ حضرت اکبر الہ آبادیؒ کے ان دو شعروں سے ظاہر ہے جو شروع میں میں نے پڑھے۔ حالت یہ ہے کہ ملت کی بنا ہی بگڑ رہی ہے اور ہمیں اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہے اور اس لیے آئندہ کی پروا ہی نہیں رہی۔

إنا لله وإنا إليه راجعون

بنیادی انسانی ضروریات میں سے روٹی کپڑا، مکان نہایت اہم ضروریات ہیں، لیکن یہ تینوں مسائل اور کئی اور اہم بنیادی مسائل اگر اسلامی تعلیمات قانون و عدل کے مطابق حل کیے جائیں گے تو اس میں امن بھی ہے اور سلامتی بھی ہے، لیکن اگر حرمت قانون و عدل کو بالائے طاق رکھا گیا تو گویا شر اور فساد نے جڑ پکڑ لی جس کے نتائج تباہ کن ہو سکتے ہیں۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

جنابِ محترم جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن

محترمی حکیم محمد سعید صاحب نے اپنے تعارفی کلمات میں آج کے موضوع سے متعلق چند بصیرت افروز اشارے کیے ہیں۔ اس کے بعد محترم چوہدری نذیر احمد خاں صاحب نے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کرکے ہمارے لیے سامانِ رہنمائی جہیّا کیا ہے۔

"احترام قانون و عدل" ایک نہایت اہم موضوع ہے۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ قانون اور عدل کے احترام کے بغیر کوئی معاشرہ نہیں قایم رہ سکتا۔ قانون کی بالادستی اور عدلیہ کی آزادی ہی وہ عناصر ہیں جو ایک متوازن معاشرہ اور ریاست کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ اور اس کی ہر سطح پر قانون و عدل کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ فرد کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب اُسے اپنے حقوق کے ساتھ اپنے فرائض کا احساس ہونا لازمی ہے۔ فرد کا پہلا حلقۂ کار اس کا اپنا خاندان ہے۔ اس حلقے میں بھی ملکی قانون کے علاوہ اخلاقی اور دینی صداقتوں اور قدروں کی حرمت کے بغیر خاندان کا شیرازہ بکھرتا ہے۔ "قانون" کی اصطلاح میں اُن صداقتوں اور قدروں کو شامل سمجھنا چاہیے جن کی ہمارے دین نے اچھی زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں تعلیم دی ہے۔ پھر خاندان کے بعد معاشرے کا وسیع تر حلقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشرے کی صحت اور استحکام کے لیے لازمی ہے کہ کوئی ایک شخص دوسرے کے حقوق پر دست درازی نہ کرے اور قانون کی حدود سے تجاوز نہ کرے۔ ورنہ معاشرہ انتشار اور بدامنی کا شکار ہو جائے گا۔ بدقسمتی سے ہمارے حالیہ حالات میں حرمتِ قانون اکثر شعبہ ہائے زندگی میں نظر انداز ہو رہی ہے۔ صنعت و حرفت کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی ہے کیونکہ سرمایہ اور محنت کے تعلقات بگڑ کر اہلِ نظر کے لیے سوہانِ روح بن رہی ہے۔ مزارع اور زمیندار کے درمیان تنازعات بڑھ رہے ہیں۔ تعلیمی دنیا سے قانون اور اُستاد کا ادب و احترام اُٹھتا جا رہا ہے۔ اِن حالات کی ذمّے داری بڑی حد تک موجود اہلِ اقتدار پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے ہی وضع کیے ہوئے قوانین پر عمل درآمد سے گریز کرتے نظر آتے ہیں۔ میں اربابِ بست و کشاد سے دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے وضع کردہ قوانین و قواعد کے نفاذ کے لیے سنجیدہ اقدام کریں تاکہ اس لاقانونیت کی فضا کا جو آج کل ہمارے ہاں روز بروز وسعت پذیر ہے، ازالہ ہو سکے اور ہمارا ملک معاشرتی امن اور اقتصادی استحکام کی منزل کی جانب رواں ہو سکے۔

بین الاقوامی سطح پر بھی قانون کا احترام انسانی معاشرے کی سالمیت وصحت کا ضامن ہے۔ اس کے بغیر ایک طاقت ور ملک ایک کمزور ملک کو پامال کر سکتا ہے۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے اور بھی ضعیف بنا سکتا ہے۔ ہم بھی اس عدمِ احترامِ قانون کے زخم خوردہ ہیں۔ اسی ضمن میں یہ دل خراش حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ بین الاقوامی قاعدوں اور ضابطوں کے علی الرّغم ہمارے کئی فوجی بھائی اور غیر فوجی شہری ہمارے ہمسایہ ملک میں قید وبند کی مصیبتیں جھیل رہے ہیں. حالانکہ یہ مسلّمہ قاعدہ ہے کہ جنگ بندی کے بعد بغیر حیل وحجّت ان قیدیوں کو اُن کے گھروں کو واپس لوٹنا چاہیے۔ لیکن بین الاقوامی ضابطوں اور عہد ناموں کی خلاف ورزی محض اس لیے ہو رہی ہے کہ ان قیدیوں کو روک کر کچھ سیاسی مصلحتیں حاصل کر لی جائیں۔ بین الاقوامی قانون کا احترام ہی اس دھاندلی کا مداوا ہے۔

عدل وانصاف کا تقاضا یہی ہے کہ عدلیہ انتظامیہ کے اثر سے آزاد ہو تاکہ دادخواہوں اور جمہور کے دلوں میں اُس کی انصاف دوستی پر اعتماد قائم ہو سکے۔ احترامِ قانون تب ہی معاشرے میں قائم ہو سکتا ہے کہ جو قوانین وضع کیے جائیں وہ ہمارے اخلاقی اور دینی نصب العین سے مطابقت رکھیں تاکہ اُن کا احترام بطیب خاطر کیا جائے نہ کہ ڈنڈے کے خوف سے۔ اسلامی نظام میں شخصی آمریت کے لیے کوئی گنجائش نہیں کیونکہ خدائی قانون کا اطلاق ہر چھوٹے بڑے پر مساوی حیثیت سے ہوتا ہے۔ خدا کی حاکمیت سے مراد خدائی قانون کی بالادستی ہے۔ مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے اپنے اپنے دائرۂ کار ہیں، جن سے تجاوز انتشار کا موجب بن سکتا ہے۔ دنیائے عدل کا ایک مشہور مقولہ یہ ہے کہ نہ صرف انصاف کیا جائے بلکہ یہ ظاہر و باہر ہونا چاہیے کہ انصاف واقعتہً بروئے کار لایا گیا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ معروف ضابطوں اور قاعدوں کے مطابق کارروائی ہو تاکہ کسی کو وجۂ شکایت نہ پیدا ہو کہ اس کا نقطۂ نظر زیرِ غور نہ آ سکا۔

میں دعا کرتا ہوں کہ ہم سب کو احترامِ قانون کی توفیق ملے اور ہم اپنی کوشش سے اپنے اردگرد کے ماحول میں بھی احترامِ قانون کی روشنی کو پھیلا سکیں۔ آمین۔

احترامِ آثارِ قدیمۂ ملّی

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمد سعید

مقالہ : جناب محمد ولی اللہ خاں

شامِ ہمدرد، لاہور

۷ دسمبر ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

خواتین وحضرات!

جس طرح افراد کی زندگی میں ماضی کی اہمیت ہے، اسی طرح قوموں کی زندگی میں بھی ماضی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایک فرد اپنے ماضی سے واقف ہوئے بغیر یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کون ہے، اور کیا ہے؟ ایک قوم بھی اگر نا آشنائے ماضی ہو تو وہ اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتی اور خود شناسی کے بغیر زندگی بے معنی اور بے کیف و بے مقصد ہوتی ہے۔ آثار قدیمہ بھی اُن عوامل میں سے ہیں جو کسی قوم کو اُس کے ماضی سے وابستہ رکھتے ہیں۔ ماضی کا حسن اس قوم کو اعتماد، عزم، حوصلہ اور آرزوئے حیات بخشتا ہے۔ ماضی کے بغیر نہ حال اطمینان بخش ہوتا ہے اور نہ مستقبل محفوظ و متعیّن۔ ہمارے آثارِ قدیمہ بھی ہمارے ملّی ورثے میں شامل ہیں۔ یہ ہماری روایات، تاریخ اور تہذیب کے خاموش مظاہر ہیں۔ ان کی عظمت ہمیں اپنی عظمت کا احساس دلاتی ہے اور ہمیں بھٹکنے سے بچاتی ہے۔ آثارِ قدیمہ ہماری تاریخ کے وہ سنگ میل ہیں جو ہم میں ترقی کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ اُن کا احترام کرنا ہمیں اپنے اسلاف کا احترام کرنا سکھلاتا ہے۔ یہ ہمارے بزرگوں کے افکار و عزائم کی منہ بولتی تصویریں ہیں، یہ وہ تعمیرات ہیں جو مستقبل کی تعمیر میں ہماری معاون ہیں۔ اُن کے رشتے سے ہم قوموں کی برادری میں اپنا مقام متعیّن کرتے ہیں۔ آثار قدیمہ کا احترام درحقیقت آثارِ سلف کا احترام ہے۔ اُن کے لیے ہمارا احترام پرستش سے عبارت نہیں ہے اور نہ یہ ہماری عبادت کا جزو ہیں بلکہ یہ ہمارے لئے درسِ عبرت ہیں۔

خواتین وحضرات!

میں احترامِ آثارِ قدیمہ پر کسی تفصیلی اظہارِ خیال سے گریز کر رہا ہوں۔ آج کے مہمان مقرر جناب محترم محمد ولی اللہ خاں صاحب اس موضوع پر مفصّل روشنی ڈالیں گے اور حق یہ ہے کہ وہی اس موضوع کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ جناب ولی اللہ خاں صاحب محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ ہم شامِ ہمدرد میں بھی اس سے پہلے اُن کے افکار سے مستفید ہو چکے ہیں۔ آپ ۱۹۴۸ء سے اب تک آثار قدیمہ کے فن سے وابستہ رہے ہیں اور قدیم تاریخی عمارتوں کے حفظ و بقا سے اُن کی دلچسپی اور اُن کا شغف کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ خان صاحب محترم نے بودھی، ہندو اور اسلامی ادوار کی عمارات

کے تحفظ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ میں خاں صاحب کا دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے از راہِ کرم احترامِ آثارِ قدیمہ جیسے دل چسپ موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت قبول فرمائی۔

اس مجلس کے صدر جناب محترم مولانا علم الدین سالک صاحب اُن بزرگوں میں سے ہیں جن کی تمام عمر خدمتِ علم میں گزری ہے اور جنھوں نے تعلیم و تعلّم کو ہر چیز پر فوقیت دی ہے۔ تاریخ و تحقیق سے جنابِ سالک کو خصوصی شغف رہا ہے۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور قومی تحریکوں میں آپ کا کردار نمایاں رہا ہے۔ ایک ماہرِ تعلیم اور نامور محقق کی حیثیت سے آج کی مجلس میں آپ کی شرکت اور صدارت ہمارے لئے باعثِ مسرّت و عزّت ہے۔ مَیں جناب محترم سالک صاحب کا بہ صمیمِ قلب شکرگزار ہوں کہ آپ نے زحمت فرما کر ہماری ہمّت افزائی فرمائی۔

جناب محمد ولی اللہ خاں

خواتین و حضرات!

"آثار" جمع ہے عربی لفظ "اثر" کی اور خصوصی طور پر مُراد ہے اُن باقیاتِ مکانی سے جو زمانۂ سلف میں تعمیر ہوئی تھیں اور ہم تک کسی نہ کسی حالت میں پہنچیں۔ درحقیقت آثار کی یہ اصطلاح پُرانی عمارات یا اُن کی باقیات پر ہی عائد نہیں ہوتی بلکہ اس کے دائرہ مفہوم میں تمام ہی باقیات، جو تہذیب ملّی بلکہ تہذیب انسانی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں، آجاتی ہیں۔ جیسے پرانی عمارات، مکتوبات، دستاویزات، مسکوکات، روایات، رسومات، شخصیات اور اُن کے کارنامے۔ نئی یادگاری عمارات بلکہ کچھ زندہ شخصیات بھی جن کا شمار زمانے نے یادگاروں یا تبرکات میں کرادیا ہو اور ممکن ہے ایسے چند زندہ آثار معزز مہمانوں میں بھی شامل ہوں۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسلمان صرف مُردہ پرست قوم ہے اس لئے زندوں پر توجہ نہیں دیتی۔ بس مُردن صرف اتنا ضرور کہا جاتا ہے کہ اب یہ 'خلا پُر نہ ہوگا یا مشکل سے پُر ہوگا' اور بس۔ زندوں کے احترام کو شاید یہ قوم بُت پرستی میں شمار کرنے لگتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ؎

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ
سُن رکھو فسانہ ہیں یہ لوگ

'آثار' جو عنوان کا دوسرا لفظ ہے جمع الجمع ہے اور ترکیب میں ہے آمیزش بغدادی و شیرازی جو صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ لفظ "ملّی" کی جگہ لفظ "انسانی" ہونا چاہیے تھا، چونکہ آثار جہاں بھی ہوں اور جس کے بھی ہوں، بہرحال مجموعی طور پر ارتقائے انسانی اور اُس کی تہذیب کے مظہر ہیں۔ اور اس لئے واجب احترام اور اب تو اقوام متحدہ کا تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارہ جس کو مختصراً "یونیسکو" کہا جاتا ہے، مختلف ممالک میں بلاتخصیص مذہب و ملت، جغرافیہ اور تہذیب، آثار کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ جیسے اسوان بند کے سلسلے میں مصر کے مشہور مندر ابو سمبل (۱۳۰۱ ق.م) اور اسی سلسلہ کے دیگر منادر کی مرمت اور حفاظت پر اربوں روپیہ صرف ہوا ہے۔ یہ مندر فرعون ثانی (ریمز) نے بنوایا تھا۔ اس مندر میں اُس کے چار بُت بھی ہیں جو ۶۵ فٹ سے زیادہ اونچے ہیں۔ حال ہی میں اس ادارہ نے موئنجو دڑو کی حفاظت اور اُس کے آثار کو محفوظ کرنے کے لئے تقریباً نو کروڑ روپیہ کا

ایک جامع منصوبہ محکمۂ آثارِ قدیمہ، واپڈا اور محکمۂ انہار سندھ کی معاونت سے تیار کیا ہے۔ آثار کا احترام کرنا درحقیقت انسانیت اور انسانی تہذیب و ثقافت اور اُس کے ارتقا اور بقا کا احترام کرنا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی شخص فریضۂ انسانی اور لگاؤ کی حیثیت سے ماں باپ کا احترام کرتا ہے۔ یا شیریں پھل کھانے کے لئے اُس کے پودے کی حفاظت اور احترام کرنا پڑتا ہے، مگر مشرق میں یہ جذبہ کچھ عرصے سے ماند پڑا ہوا ہے۔ لگ بھگ ۱۹۳۱ء کی بات ہے کہ محکمۂ آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر جے۔ ایف بلیکسٹن ایک نوجوان انگریز لڑکی کو ہمراہ لئے ٹیکسلا کی بُدھ خانقاہ واقع جولیاں (یعنی جائے ولیاں۔ بھکشو اور راہبوں کی طرف اشارہ ہے) بغرض معائنہ تشریف لے گئے۔ میں بحیثیت ایک ادنا ماتحت کے صاحب کی پیشی میں تھا۔ مسٹر موصوف اگرچہ سپرنٹنڈنٹ آثار قدیمہ تھے، مگر اس فن یا اس کے احترام سے بالکل ایسے کورے تھے جیسے دھوبی کا گھاٹ، اپنی صفائی سے خانقاہ کے ایک حجرے کے سامنے کھدائی کے وقت سے ایک بُت کا ٹوٹا ہوا چھوٹا سا ٹکڑا پڑا تھا۔ وہ کسی قدر راستے میں روڑے کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ مسٹر بلیکسٹن نے، جو تھے تو سفید فام مگر عرف عام میں بلیکی کہلاتے تھے، بڑے غصے میں اس حقیر ٹکڑے بُت کو ایک ٹھوکر لگائی۔ ٹھوکر لگا: اُس عہد کے فرنگی افسران کا خاصہ تھا اور میری طرف بڑی رعونت سے دیکھا۔ ابھی میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ وہ خوبصورت نوجوان لڑکی بپھر گئی اور دو قدم ایک طرف ہو کر بلیکی صاحب کے گلے پڑ گئی اور کہنے لگی، "کیا تمہیں اس پرانی تہذیب کا احترام نہیں ہے۔ تم نے اس محکمے میں ہوتے ہوئے بھی آثار کا احترام کرنا نہیں سیکھا" وہ بہت دیر تک برہم رہی۔ بلیکی صاحب نے معذرت چاہی اور جب میں نے یہ بتایا کہ بُت کا یہ ٹکڑا کھدائی میں اسی جگہ ملا تھا جہاں وہ اب پڑا ہے اور اس لیے اس کو یہاں سے نہیں ہٹایا گیا ہے، وہ تو بہت خوش ہوئی اور طنزاً بلیکی صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ تو تھی پرایوں کی بات۔ اب کچھ اپنوں کی بھی سن لیجئے ملا رموزی مرحوم موجد "گلابی اردو" کے حالات پڑھتے ہوئے میں نے یہ واقعہ اُن کے متعلق ایک مضمون میں پڑھا تھا۔ ملا صاحب غالباً جناب مولانا عبد المجید سالک مرحوم کے ہمراہ پنجاب میں کسی پرانے قلعہ کے پاس سے گزر رہے تھے۔ اچانک ملا صاحب نے سواری رکوائی اور دوڑتے ہوئے قلعہ کی دیوار تک گئے اور وہاں خاصی زور آزمائی کے بعد ایک اینٹ نکال لی اور اُسے لے کر سواری میں آ بیٹھے۔ استفسار پر ملا صاحب نے فرمایا کہ اس اینٹ کو وہ بطور یادگار رکھیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص احترام کا یہ رویہ اختیار کرے تو آثار کچھ دنوں کے مہمان رہ جائیں گے۔ نہایت خوبصورت نقاشی، خشت نگاری اور مرمریں تختیوں پر بارہا آپ نے بقلم خود کے ساتھ نام پتہ اور ڈگری درج کی ہوئی دیکھی ہوگی۔ نہ دیکھا ہو تو شالامار کے درودیوار اور شاہی مسجد چنیوٹ کی دیدہ زیب گل کاری

کی سطح پر ملاحظہ فرمائیے ۔ زندہ جاوید ہونے کی یہ ایک کوشش ہے، مگر کس قدر بھونڈی اور سنگدلانہ جس کا انجام آثار اور انسانی ثقافت کی بربادی ہے ۔ معلوم ہوا کہ آثار کا احترام اتنا علمیت سے نہیں جتنا گھر کی تربیت سے تعلق رکھتا ہے اور جس کو اپنانا اور بچّوں کو بتانا ضروری ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ تعمیرات اور اُس کا فن تہذیب انسانی کی کوکھ ہے اور اُس کا ملجا و ماوا ہے ۔ درحقیقت یہ ترجمہ ہے انگریزی کی ایک عالمانہ ضرب المثل کا جو یوں ہے :

"Architecture is the matrix of human civilization"

خواتین و حضرات !

بات صحیح ہے ہر عہد کی عمارت میں اُس عہد کے بہترین اثرات اور موادات موجود ہوتے ہیں ۔ اینٹ، چونا، گارا، پتّھر، نقاشی، منبّت کاری، آئینہ کاری، خشت کاری، مرمر پر چین کاری، خطاطی، بہترین چوبکاری وغیرہ ۔ غرضکہ انسانی بہبود اور آرام سے متعلق اس عہد کی تمام ہی ایجادات ۔ سبھی کچھ وہاں ہوتا ہے ۔ انسان تو ہمیشہ سے محل یا لحد کے لیے ہی سب کچھ کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا ۔ اس لئے اگر کسی تہذیب کا مطالعہ کرنا ہو تو اس عہد کی عمارات کا مطالعہ کرو اور یہ عمارات آپ کے مطالعہ کے لئے جب ہی موجود اور محفوظ ہو سکتی ہیں جب اُن کا احترام کیا جائے ۔ اگر مغل شہنشاہوں کی نفاستِ طبع اور معیارِ تہذیب کا اندازہ کرنا ہو تو دہلی کا قلعہ دیکھو ۔ لاہور کا شیش محل اور نولکھا دیکھو ۔ اُن کی تہذیب آئینہ بن کر آپ کے سامنے آجاتی ہے ۔ آپ ایک ضخیم کتاب پڑھ کر وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتے جو اس عہد کی چند عمارات دیکھ کر حاصل کر سکتے ہیں ۔ ٹیکسلا، ہڑپّہ اور موئنجو ڈرو کا نام تو آپ نے سُنا ہی ہوگا ۔ ان آثار کی برآمد سے قبل ہندستان کی قدیم تاریخ تین ناموں پر ختم ہو جاتی تھی یعنی رامائن، مہابھارت اور مہاتما بُدھ ۔ ان کو کھینچ تان کر آٹھویں صدی قبل مسیح تک لے جایا جا سکتا تھا مگر ان آثار کے برآمد ہونے کے بعد ایک حد تک بڑی تفصیل سے تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح تک کے حالات ہی نہیں بلکہ انسانی تہذیب کے مذہب اور اس کی تمدّنی، زرعی، اقتصادی اور حربی ترقی کا بھی پتہ چل گیا ہے ۔ آپ نے سُنا ہوگا اور موٹی موٹی تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ ٹیکسلا میں موریہ خاندان، یونانی، سیتھیانی، پارتھائی، کُشان اور ہُن اقوام نے حکومت کی ہے اگر آپ ٹیکسلا کی گہری کھدائی اور اُس کے مختلف طبقات سے برآمد کی ہوئی اشیا کو ملاحظہ فرمائیں تو یہ داستان ضخیم کتاب کے مطالعہ کے مقابلے میں زیادہ تفصیل سے آپ کے سامنے آجاتی ہے ۔ آپ نے یہ بھی سُنا ہوگا کہ ہُن حملہ آوروں نے بدھ خانقاہوں کو نذرِ آتش کر دیا تھا ۔ اگر یہ دیکھنا ہو تو جولیاں کی خانقاہ کے، جس کا

اوپر ذکر ہو چکا ہے، در و دیوار کو دیکھئے، جہاں آگ کی تپش سے پتھر سُرخ ہو گئے ہیں اور مٹی کا پلستر جل کر پختہ ہو گیا ہے۔ اگر میری یہ گزارش صحیح ہے تو اُس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ہم آثار قدیمہ کا احترام کریں اور اُن سے کچھ علم و عبرت حاصل کریں۔

اسلامی ممالک میں ملک کی تعمیرِ نو میں یہ احترام ایران میں بڑے اہتمام، خلوص اور جوش سے شروع کیا گیا ہے۔ وہاں قابلِ فخر ایرانیوں کی یادگاریں اور اُن سے متعلق آثار کی حفاظت ہی نہیں کی جا رہی بلکہ جہاں تک ہو سکتا ہے انھیں اُجاگر بھی کیا جا رہا ہے۔ وہاں اب زرتشت، سائرس (کورش)، دارا، اردشیر بابکان، شاہپور، خسرو، بوعلی سینا، خیّام، فردوسی، امام غزالی، فریدالدین عطار، اولجیتو خدابندہ، شیخ سعدی، حافظ شیرازی، ملکہ گوہرشاد، بہزاد، پرسی پولیس (اصطخر) پساد گراد، طوس، نیشاپور وغیرہ کتابی کہانیاں ہی نہیں بلکہ زندہ اور قابلِ احترام شخصیات، آثار اور یادگاریں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایرانی بچوں میں سائرس اور دارا کی روح پروان چڑھ رہی ہے۔ پچھلے دنوں سائرس کی ڈھائی ہزار سالہ برسی کے موقع پر اُس کے مقبرہ واقع پساد گراد پر تمام عالم کے حکمرانوں اور دانشوروں کو جمع کر کے ایک مثالِ زمانہ شاندار تقریب جو منعقد کی گئی تھی، وہ اس مہم کی ایک کڑی تھی۔ وہ ایران کے شاندار ماضی کو ایک سلامی تھی، خراجِ تحسین تھا۔ اگر ہم بھی اپنے آثارِ ملی کی حفاظت کریں اور اُن کا احترام کریں تو ہم بھی حالیہ مایوس کُن فضا کے بھنور سے باہر آ سکتے ہیں اور ہماری سرزمین میں بھی حقیقی معنوں میں دین، قوم اور ملک پرست رہنما پیدا ہو سکتے ہیں۔ آجکل جیسے نہیں، جن کی بھانت بھانت کی بولیوں نے ہمیں ہمارا سبق بُھلا دیا ہے اور ایسے سخت انتشار میں مبتلا کر دیا ہے کہ کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ سچی بات کیا ہے۔ یہ لوگ دانستہ یا نادانستہ طور پر ملک کے مفاد کے مقابلے میں دشمن کے مفاد کا باعث بن رہے ہیں۔ اگر ہم بھی اپنے ماضی اور آثار کا احترام کریں تو جس قحط الرجال کا ہم آج شکار ہیں، اس سے نجات مل سکتی ہے اور ہماری سرزمین بھی پھر سے مردم خیز بن سکتی ہے۔ ایسے ہی حالات میں شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے کہا تھا

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

لاہور کو ایشیا کا روم کہا جا سکتا ہے۔ یہ بزرگ اور جان سے عزیز شہر حضرت شاہ اسماعیلؒ، حضرت زنجانیؒ، حضرت علی ہجویریؒ، حضرت میاں میرؒ اور درجنوں دیگر بزرگانِ دین کی نگری ہے اور اس میں تقریباً ایک سو پندرہ قدیم عمارات تو ایسی ہیں کہ اُن کا کوئی پُرسانِ حال ہی نہیں ہے۔ وہ مٹ رہی ہیں یا تقریباً مٹ چکی ہیں۔ تقریباً ۲۳ محکمۂ اوقاف کی اور ۴۶ محکمۂ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہیں۔ ان

میں سے اکثر کی حالت خراب ہے ۔ معدودے چند آثار کی دیکھ بھال ہو رہی ہے ۔ باقی سب کسمپرسی کی حالت میں ہیں ۔ کوئی بھی حکومت اتنی بڑی تعداد میں قدیم عمارات کی خاطر خواہ دیکھ بھال نہیں کر سکتی اگر وہاں کے باسی اپنا فرض یعنی احترام آثار کا پاس نہ کریں ۔ شاید ہی کسی شہر کے باسیوں نے اپنے شہر اور اُس کے آثار کی اتنی مٹی پلید کی ہو جتنی زندہ دلانِ لاہور نے اپنے شہر کی کی ہے ۔ سارے شہر کو جو کبھی خوبصورت اور صاف شہر تھا، ایک بڑے اصطبل میں بدل دیا ہے ۔ آثار کو جدید مکانوں کے گھیرے میں اس طرح لے لیا ہے کہ وہاں تک پہنچ ہی مشکل ہے ۔ کوئی کیا دیکھے اور ان سے کیا حاصل کرے ۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرماویں ۔

نواں کوٹ کے مغل باغ کا خوبصورت دروازہ، باغ کے گوشائی برج، سب جدید مکانوں کے حصار میں آ گئے ہیں ۔ مقبرہ جانی خاں واقع باغبانپورہ اصطبل کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور شاید اب بھی یہی صورت ہے ۔ یہ وہ شیر دل جانی خاں تھا جس نے لاہور کو ابدالی حملوں سے بچاتے ہوئے اپنی جان قربان کی تھی اور جس کی بہادری کی احمد شاہ ابدالی نے بھی تعریف کی تھی ۔ شیخ محترم کا مقبرہ، جو پُرانے ریلوے اسٹور کی حدود میں ہے، بیکری کے طور پر استعمال ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ بیکری کا تنور مقبرہ کی عمارت کے اندر رہتے ۔ نواب عبدالصمد اور نواب ذکریا خاں لاہور کے محسن حکمرانوں میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ اُن کی قبور کا چبوترہ ایک کوٹھی کے بیرون صحن کی جگہ استعمال ہوتا ہے ۔ نواب عبدالصمد خاں، وزیرِ جنگ، نے سکھوں سے لاہور اور پنجاب کے مسلمانوں کو بچایا تھا اور اُن کے فرزند نواب ذکریا خاں نے نادر شاہ کے حملے کے وقت اپنی دانائی اور دلیری سے لاہور کو بربادی سے بچا لیا تھا ۔ اب حال یہ ہے کہ مہمانوں کی کرسیاں قبروں پر پڑی رہتی ہیں ۔ ان لوگوں کو نہ خدا کا خوف، نہ بندوں کی شرم اور نہ حکومت کا ڈر ۔ کچھ عرصہ ہوا محکمۂ اوقاف نے جنگلہ بنوا دیا تھا ۔ وہ بھی جگہ جگہ سے توڑ دیا گیا ہے ۔ مہابت خاں کے مقبرہ واقع باغبانپورہ کے باغ کا نصف حصّہ وہاں کے معزز زمینداروں نے فروخت کر دیا ۔ اور اُس پر اب جدید عمارات کھڑی ہیں ۔ شرف النسا بیگم کا خوبصورت منقّش میناری مقبرہ جو سرو والا مقبرہ کہلاتا ہے، اب جدید عمارات سے گھر گیا ہے ۔ کبھی سڑک سے نظر آتا تھا ۔

خواتین و حضرات !

یہ داستان لمبی اور رنجیدہ ہے اور ہماری قومی، ملّی اور حکومتی پستی اور بے حسی کا بیّن ثبوت بھی ہے ۔ شالامار کی یکتائی اور خوبصورتی چند سال کی مہمان ہے ۔ عنایت باغ، جو بالکل اُس کے سامنے جانبِ جنوب ہے، بالکل اُجڑ گیا ہے اور وہاں جدید عمارات بنائی جا رہی ہیں ۔ مشرق اور مغرب میں پہلے ہی باغ کے بالکل نزدیک عمارات بن چکی ہیں اور شمال میں اب " مدینہ " نام کی ایک کالونی بن رہی

ہے ۔ اب یہ باغ اونچی عمارات سے ہر چہار جانب سے گھر جائے گا اور اُس کی خلوت ختم ہو جائے گی۔ نقار خانہ، جو دراصل شاہی جھروکہ اور دربار گاہ تھا' اب مویشیوں کی آماجگاہ ہے ۔ احاطہ کی دیوار جگہ جگہ سے شق ہو گئی ہے اور عمارات رفع حاجت کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ہائے بربادی۔ وائے بربادی ۔ دوہائی ہے ' دوہائی ہے ۔ مگر کس سے اور کس کی۔ یہاں تو راجا اور پرجہ دونوں ہی نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں ۔ ۱۹۶۵ء تک یہ نقار خانہ آباد تھا ۔اس میں باغ تھا ، گلاب ویران اور برباد ہے ۔ یہ ہی کچھ شاہدرہ کی عمارات کے چاروں طرف ہو رہا ہے ۔غرضیکہ لاہور جیسے ثقافتی اور تاریخی شہر میں آثارِ قدیمہ کو روندا جا رہا ہے اور وہ بھی دونوں پیروں سے

"City decorates the monuments and
monuments decorate the city"

ترجمہ : (شہر کی زینت کا باعث یادگاری عمارات ہوتی ہیں اور شہر یادگاری عمارات کو زینت بخشتا ہے)

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ جنیوا میں سولہویں اور سترھویں صدی کی چند عمارات کو حکومت چھ کروڑ ڈالر خرچ کر کے دوسرے مقام پر کھڑا کر رہی ہے ۔ یہ ہے وہ حرمت جو زندہ قومیں اپنے آثارِ ملی کو دیتی ہیں ، مگر اس ملک کے شہروں اور خصوصًا لاہور کا عجیب حال ہے ۔یہاں کی بلدیہ نے آج تک کبھی ایک پائی بھی ان پرانی عمارات پر صرف نہیں کی جو اس شہر کے باسیوں کی تفریح اور صحت کا باعث ہیں ۔مثلاً شالامار باغ ،جہانگیر کا مقبرہ، قلعۂ لاہور وغیرہ ۔یہی نہیں بلکہ بلدیہ چند مخصوص آثار کی بربادی کا باعث بن رہا ہے ۔ شالامار باغ کے اندر چراغاں کا میلہ سالہا سال تک ہوتا رہا اور روشوں، خیابانوں' دیواروں اور درختوں کی بربادی کا باعث بنا رہا ۔اس میلے کی تمام آمدنی کارپوریشن حاصل کرتی اور مرمت مرکزی حکومت ۔ توڑ پھوڑ اور مرمت میں تناسب نہیں تھا۔ تخریب زیادہ مرمت کم۔ بس ہوا یہ کہ اس ارضی جنت کا برا حال ہو گیا۔ جہانگیر کے مقبرے کے وسیع سبزہ زاروں میں جوڑ کا میلہ ہوتا رہا۔ دوکاندار خیابان یعنی پڑویں کی اینٹیں توڑ کر چولہے بناتے رہے ۔نتیجہ یہ نکلا کہ باغ کے مغربی نصف حصے میں اب کوئی پختہ سڑک باقی نہیں رہی ۔ یہاں بھی آمدنی کارپوریشن کی تحویل میں جاتی اور مرمت مرکزی حکومت کراتی ہے ۔

لاہور سے ہٹ کر اب مغربی پاکستان کے آثار کا جائزہ لیجئے ۔ پنجاب میں ۱۲۱، صوبہ سرحد میں ۵۳، سندھ میں ۸۳ اور بلوچستان میں ۱۵ آثار محکمۂ آثارِ قدیمہ کے تحفظ میں ہیں جن میں ہڑپہ ۔ موئنجوڈرو ٹیکسلا اور مکلی کی پہاڑی کا وسیع اور عریض قبرستان بھی شامل ہیں ۔اس اکیلے قبرستان میں ہی

لاتعداد مقابر ہیں۔ یہ کل تعداد ۲ ، ۲ بنتی ہے۔ اس میں پرانے شہر، محل، قلعے، مساجد، منادر، خانقاہیں، یادگاریں، باغات، سرائیں، کنویں، باؤلیاں وغیرہ شامل ہیں۔ مگر اس کے علاوہ بھی ملک میں بلامبالغہ تقریباً ایک ہزار ایسے آثار ڈھیروں کی شکل میں موجود ہیں جن کا اب تک جائزہ تو چھوڑ و نشان دہی تک بھی نہیں ہوئی ہے۔ ان تمام آثار کی دیکھ بھال اطمینان بخش طریقہ پر نہیں ہو رہی ہے۔

احترام آثارِ قدیمہ کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ اُن کو جھک کر سلام کیا جائے۔ اگرچہ یونان کے دارالسلطنت میں دیوی اتھینا کے مندر کو جو پانچویں صدی قبل مسیح کا ہے اسکول کے بچے آکر باقاعدہ سلامی دیتے ہیں۔ یونانی اپنی گزشتہ شان وسطوت اور تہذیب کی یوں یاد تازہ کرتے اور اپنے بچوں میں قومی اُمنگ اور تعمیرِ نو کا جذبہ یوں بیدار کر رہے ہیں۔ تاہم اصل احترام تو یہ ہے کہ ان آثار کو تخریب سے بچایا جائے اور اُن پر تحقیقات کر کے تاریخی مواد قوم، ملک اور انسانیت کی بہبود کے لئے فراہم کیا جائے۔ مگر افسوس ہے یہ کام پاکستان میں اس درجہ پر نہیں ہو رہا جتنا کہ اس ملک کے آثارِ قدیمہ کے پیشِ نظر ہونا چاہیے۔

تقریباً یہی حال تمام اسلامی ممالک میں ہے خصوصاً اسلامی عہد کی عمارات پر تحقیقی کام نہیں ہو رہا ہے۔ اور جو کچھ ہوا بھی ہے وہ مغرب کے دانشوروں نے کیا ہے جیسا کہ کریسویل اور پوپ نے مصر اور ایران میں کیا ہے۔

ہمارا حال تو یہ ہے کہ قرآن پاک میں جن آثار اور اقوام کا ذکر ہے اور جن کی تعداد تقریباً تیس ہوگی، ہم نے اُن کے متعلق کوئی معلومات نہیں کی۔ اگرچہ لاکھوں صفحات تفاسیر پر لکھے گئے ہیں تاہم یہ کام بھی مغرب کے محققین نے ہمارے لئے سرانجام دیا اور اس سے قرآن کی صداقت اور معترضین کے لیے مثبت جوابات کے سلسلے میں بڑے انکشافات ہوئے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک فرماتا ہے۔

(فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً ۚ (سورۂ یونس آیت ۹۲)

ترجمہ: (آج کے دن ہم تیرا جسم بچالیں گے تاکہ وہ نشانی ہو تیرے بعد آنے والوں کے لیے)

خواتین وحضرات!

گزشتہ ایک ہزار سال سے یہ اعتراض چلا آتا تھا کہ فرعون کا وہ بدن کہاں ہے۔ یہ اعتراض مخالفِ دین نے درحقیقت قرآن پاک کی حقانیت کے خلاف استعمال کیا تھا مگر ہوا یوں کہ اس صدی میں جب آثار کی کھدائی ہوئی تو فراعنہ کے ممی شدہ بدن بھی برآمد ہو گئے جن میں فرعون ریمز یز ثانی بھی شامل ہے اور اب وہ سب قاہرہ کے عجائب گھر کی زینت ہیں۔ راقم الحروف نے بھی انھیں بغور دیکھا

ہے۔ پاکستان کے اخباروں میں اُن کے فوٹو بھی چھپ چکے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ فرعونِ موسیٰؑ ریمزیز ثانی تھا۔ اگرچہ یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے تاہم یہ فرعون مصر کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اُس کے بُت کبھی برآمد ہوئے ہیں۔ اس بُت کے مشاہدے سے معلوم ہوگا کہ فرعون کے سر کا لباس ایک خود ہے، جس پر گول گول منقّش نشان ہیں۔ اس خود پر ایک سیاہ ناگ پھن اُٹھائے ڈسنے کے لئے تیار ہے۔ یہ ناگ دیوتا کا مظہر ہے جو فراعنہ کا ذاتی محافظ ہے۔ دائیں ہاتھ میں کاندھے کا سہارا لئے ہوئے ایک ڈنڈے نما چیز ہے جس کا اوپر کا سرا حلقہ نما مڑا ہوا ہے یعنی کنڈی کی شکل میں ہے۔ یہ درحقیقت عصائے شاہی ہے جو حاکم کی طاقت، سطوت اور جبر و قہر کا مظہر ہے۔ خود پر جو گول گول نشانات منقّش ہیں، وہ سورج دیوتا کی طرف اشارہ کرتے ہیں یعنی سورج دیوتا کی حفاظت کی طرف نئی شہنشاہیت کے حکمراں جن کا دورِ حکومت ۱۵۸۰ تا ۳۳۲ ق۔م تھا، مصر کے اصل باشندے تھے۔ اور انھوں نے (Shepherd Kings of Hyksos) یعنی ہائیک سوس کے چرواہے بادشاہوں کو مصر سے نکال دیا تھا۔ یہ چرواہے درحقیقت شام اور اُس کے نواحی علاقوں سے مصر پر حملہ آور ہوئے تھے اور اس لیے نئی شہنشاہیت کے حکمراں شام کے لوگوں کو نفرت اور انتقام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فرعون (Tuthmosis I) تتھ ماسیس اوّل (۱۵۳۰ - ۱۵۲۰ ق۔م) نے انتقاماً شام اور فلسطین کو فتح کر کے مصر کا جزو بنا لیا تھا۔ ایسا ہی ایک فرعون ریمزیز ثانی تھا (۱۳۰۱ - ۱۲۲۵ ق۔م) یہ فرعون، فراعنہ مصر میں بہت ہی طاقتور حکمراں تھا۔ اس کے عہد میں مصر نے بہت ہی ترقی کی۔ اس کے مرنے کے بعد اُس کو اور اُس کی بیوی کو دیوتاؤں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا تھا۔ فراعنہ اوسی ریز (Osiris) کے پجاری تھے، جو اُن کا سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ یہ مر کر زندہ ہوا تھا اور مر کر زندہ ہونے کی جملہ روایات کا درحقیقت یہی سرچشمہ ہے۔ اس لئے یہ موت کا اور موت کے بعد زندگی یعنی بعث بعد الموت کا بھی دیوتا تھا، مگر درحقیقت یہ سورج کا دیوتا یا مظہر تھا یا اسے سورج ہی سمجھا جاتا تھا، جو جملہ زندگی کا سرچشمہ ہے۔

اب اس پس منظر میں حضرت موسیٰؑ کا جو شامی یعنی فلسطینی تھے اور چرواہے بھی اور ممکن ہے چرواہے خاندان سے بھی ہوں اور فرعون مصر کی نبرد آزمائی کا مطالعہ فرمائیے۔ جو معجزے حضرت موسیٰؑ کو دیے گئے تھے وہ درحقیقت فراعنہ کی روایتی طاقت کے ردِّ عمل اور مقابل تھے۔ عصائے فرعونی کے مقابل چرواہے کی لاٹھی جو سانپ بن کر نیل کے سانپ اور فراعنہ کے محافظ ناگوں کو کھا گیا۔ خود پر جو گول گول نشان سورج دیوتا کی ترجمانی کر رہے ہیں، اس کے خلاف یدِ بیضا ہے۔ جیب

کی تاریکی سے جب باہر ہوتا تو بغیر کسی دھبے کے صاف اور روشن نظر آتا۔ قرآن میں اس بات پر تاکید ہے کہ اس ہاتھ کی سفیدی میں کوئی نقص نہ تھا۔

وَاَدۡخِلۡ یَدَکَ فِیۡ جَیۡبِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ (النمل: ۱۲)

ترجمہ: (اور اپنا ہاتھ اپنی جیب یا اپنے سینے میں رکھو۔ وہ باہر سفید آئے گا اور اس میں کوئی نقص نہ ہوگا، یعنی سورج میں تو دھبے ہیں مگر تیرا روشن ہاتھ بغیر دھبے یا نقص کے ہے)

یعنی موسیٰؑ فراعنہ کے تمام دیوتاؤں پر فوقیت رکھتے تھے۔ اسی طرح سورہ المومنین کی آیت ۳۶ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ یٰهَامٰنُ ابۡنِ لِیۡ صَرۡحًا لَّعَلِّیۡۤ اَبۡلُغُ الۡاَسۡبَابَ (المومن: ۳۶)

ترجمہ: (اور فرعون نے کہا کہ اے ہامان تعمیر کر ایک مینار تاکہ میں آسمانوں تک پہنچ سکوں اور موسیٰؑ کے خدا سے رابطہ قائم کرسکوں)

ایک عرصہ دراز تک معترضین ہم سے دریافت کرتے رہے کہ ہامان کون تھا۔ اب غزہ میں اس کا مقبرہ دریافت ہوچکا ہے اور اس کا بت بھی مل گیا ہے۔ بت پر جو کتبہ کندہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہامان ایک معمار تھا اور وزیر تعمیرات بھی۔ غالباً ہامان فرعون کی طرح ایک منصب یعنی عہدہ کا نام تھا۔ اور بہت سے حقائق جو بھی قرآن پاک کی صداقت کی دلیل ہیں آثار قدیمہ کے مطالعہ سے دریافت ہوئے ہیں، مگر یہ سب کچھ مغربی دانشوروں اور ماہرین آثار قدیمہ کی کاوش کا نتیجہ ہے افسوس یہ ہے کہ اس ضمن میں مسلمانوں نے کہیں بھی اور کچھ بھی نہیں کیا۔ انجیل اور توریت میں جن شخصیتوں یا جگہوں کا ذکر ہے ان پر ضخیم کتب جیسے

1) Encyclopaedia of Bible
2) Land of Bible
3) A Survey of the Ancient Peoples and Cultures of the Holy Land, by Dr. W. F. Albright.
4) The Archaeology of Palestine.
5) The Archaeology of World Religions.
6) Light from the Ancient Past.
7) The Archaeological Background of Hebrew - Christian Religion.

وغیرہ بہترین تحقیقات کے بعد مرتب کی جاچکی ہیں۔

ان میں بڑی عرق ریزی سے کام لے کر بہت مفید معلومات مہیا کی گئی ہیں مگر قرآن کریم کے اس پہلو کو مسلمانوں نے اُجاگر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ صرف ایک کتاب 'ارض القرآن' کے نام سے دو جلدوں میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے اپریل ۱۹۱۵ء میں شائع کی تھی، اور ۱۹۵۵ء میں اس کا طبع چہارم شائع ہوا ہے۔

خواتین و حضرات!

۱۹۱۵ء تک جو معلومات آثارِ قدیمہ کی مختلف کھدائیوں اور کتبوں سے فراہم ہوئیں، اُن کا اس پُراز معلومات تصنیف میں ذکر کیا گیا ہے، مگر گزشتہ سال کی معلومات یعنی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۷۲ء تک سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا گیا ہے۔ غالبًا علامہ مودودی صاحب کی تفسیر میں کچھ ہو۔۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ علما اور فضلا کی ایک ایسی جماعت ہو جو قرآن، حدیث، قدیم جغرافیہ، قدیم تاریخ، مذہبیات، علم آثار قدیمہ اور قدیم فلسفہ، قدیم زبانوں جیسے اشکالی، آرامی، سریانی، حمیری، صبائی، نباتی اور قدیم مصری تحریروں کو پڑھ اور سمجھ سکتی ہو۔ یہ جماعت ارض قرآن کے موضوع پر ایک جامع کتاب تحریر کرے اور اس طرح قرآن اور اسلام کی حقّانیت کو دنیا پر واضح کرے۔ اس سلسلے میں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن کتب کا مطالعہ بھی جو اسلام اور پیغمبر اسلام پر مغربی مفکرین نے تحریر کی ہیں، از حد ضروری ہے۔ یہ تو ہوا قرآن مجید اور آثار قدیمہ کے رابطے کے متعلق جو احترام آثارِ قدیمہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اب اس سلسلے میں پاکستان کے آثار قدیمہ، جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، قوم اور ملک کی توجہ کے محتاج ہیں۔ اُن کی سلامتی اور حفاظت کے لیے اگرچہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کے نام سے ایک مرکزی محکمہ موجود ہے، مگر عوام کی لاپرواہی اور تخریبی رجحان سے اس میں سے اکثر کی حالت ابتر ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ملک کے دانشور ایک ایسی جماعت کی بنیاد ڈالیں جو اس محکمے کے لئے اخلاقی اور مالی مدد کا ذریعہ ہو۔ ایسی جماعت لاہور کے لئے تو از حد ضروری ہے، جہاں سینکڑوں کی تعداد میں قدیم عمارتیں اپنی بربادی کے آخری مرحلوں پر ہیں۔ روم میں ہر وہ مسافر جو کسی ہوٹل میں ٹھہرتا ہے، یادگاری ٹیکس دیتا ہے۔ اس سے اتنی بڑی آمدنی ہو جاتی ہے جو روم کے آثارِ قدیمہ کی خاطر خواہ دیکھ بھال کے لئے کافی ہے۔ آجکل روم میں ۲۶ لاکھ ڈالر تقریبًا دو کروڑ ۶۰ لاکھ روپیہ سے صرف ایک عمارت کولیسیم کی مرمت ہو رہی ہے۔ یہ عمارت ایک قسم کا اسٹیڈیم ہے اور پہلی صدی عیسوی کی ہے۔ صرف اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مہذب اور ترقی یافتہ ملک اپنے آثار ملی کا کتنا احترام کرتے ہیں اور اُن کی دیکھ بھال پر کتنا خرچ کرتے ہیں۔ مجھے ایک گفتگو کے دوران پروفیسر ٹوچی نے بتایا تھا کہ یہ آمدنی لاکھوں انگریزی پاؤنڈ تک پہنچتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ لاہور کی کارپوریشن ایسی کوئی صورت اختیار کرے۔ پچھلے ماہ ایک مجلس مشاورت میں لاہور کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر صاحب نے مجھ سے ایسی قدیم عمارات کی ایک فہرست طلب کی تھی جن کا کوئی اور محکمہ نگراں نہیں ہے، چنانچہ ۱۱۵ ایسی عمارات کی فہرست مہیا کر دی گئی ہے۔ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ شاید تجھ میں جونک لگ جائے۔ اے مساجد، مقابر اور میناروں کے شہر! اللہ تجھے اپنی حفاظت میں رکھے اور تیرے باسیوں کو توفیق عطا فرمائے کہ تیرے ساتھ کم از کم دشمنی تو نہ کریں اور تیرے قدیم آثار کا احترام کریں۔

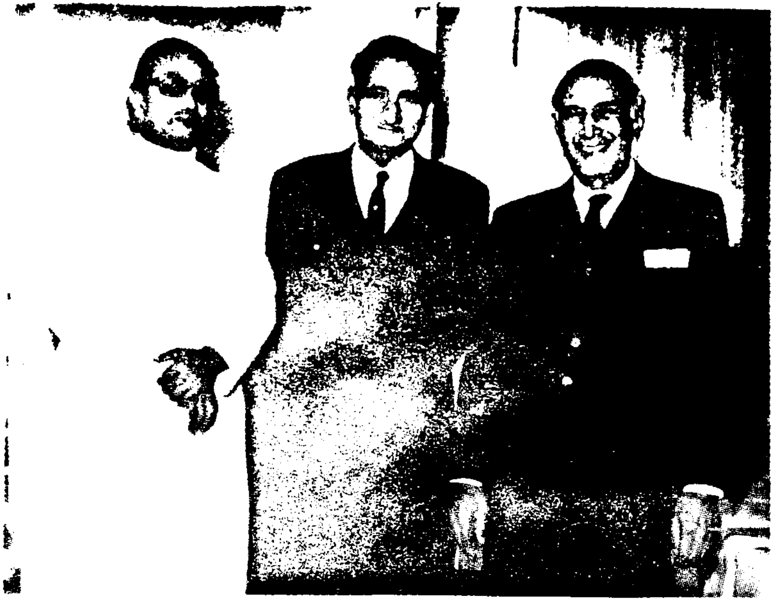
میں نے اس مختصر سے مضمون میں چند جگہ اور چند زاویوں سے احترامِ آثارِ قدیمہ کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ دنیا اب پچھلے پہیوں چل رہی ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم اپنے ماضی کے شاندار حصے سے سبق حاصل کر کے تعمیرِ نو کر رہی ہے، بجز مسلمانوں کے جو اب تو اپنے شاندار ماضی کی کئی صورتوں میں تکذیب ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس پر شرمائے ہوئے نظر آرہے ہیں اور اپنے اس ناقابلِ فہم فلسفے پر فخر بھی کرتے نظر آرہے ہیں۔ جغرافیہ، زبان، قوم اور قبیلے کے نام پر ہر حقیقت، احترام، اصول اور ملت کو ٹھکرایا جا رہا ہے۔ یا اللہ! تو ہم گنا ہگاروں کو نیک سمجھ اور نیک عمل کی توفیق عطا فرما، اور ہمیں انسانیت اور انسانی تہذیب کے احترام کے فوائد سے آگاہ فرما دے اور اُن پر عمل کی توفیق بھی عطا فرما دے۔ آمین ثم آمین۔

اس مقالہ میں دو تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ علما وفضلا پر مشتمل ایک ایسی جماعت کی تشکیل کی جائے جو قرآن پاک میں بیان کیے ہوئے جغرافیائی اور تاریخی جگہوں، قوموں، اشخاص اور واقعات پر تحقیقات کر کے ایک کتاب تصنیف کرے؛ دوسری یہ کہ پاکستان میں آثار قدیمہ کی حفاظت، اُن کی خاطر خواہ مرمت اور دیکھ بھال پر دانشوروں کی ایک جماعت بنائی جائے جو قلمی، درسی اور اخلاقی مدد سے محکمۂ آثار قدیمہ کی موجودہ مشکلات میں معاون ثابت ہو۔

تحفظِ آثارِ قدیمہ کا موجودہ قانون ناقص ہے اور اس میں ترمیم کی اشد ضرورت ہے۔ اس قانون کو دست اندازیٔ پولیس کے تحت لانا چاہیے اور سپرنٹنڈنٹ آثار قدیمہ کو عدالتی کارروائی کے اختیارات دینے چاہئیں۔ کسی یادگاری عمارت کے نزدیک ایک مقررہ فاصلے تک کسی تعمیر کی ممانعت ہونی چاہیے۔ یہ قانون دیوانی نہیں بلکہ فوجداری نوعیت کا ہونا چاہیے۔



بائیں طرف سے: جناب علم الدین سالک (صدر مجلس)، حکیم محمد سعید
جناب محمد ولی اللہ خان (مہمان مقرر) ڈاکٹر حافظ محمد الیاس۔



احترامِ علم و عمل
کراچی
۲۱ر دسمبر ۷۲ ۱۹ء

ڈاکٹر نذیر احمد
جناب حسن علی عبدالرحمٰن
حکیم محمد سعید

احترامِ علم و عمل

کلماتِ ابتدائیہ : حکیم محمد سعید

مقالہ : ڈاکٹر نذیر احمد

شامِ ہمدرد، کراچی

۲۱ دسمبر ۱۹۷۲ء

حکیم محمد سعید

محترم خواتین و حضرات!

بہت عرصہ ہوا مولانا حالی کا ایک مضمون پڑھا تھا کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟ اس پیچیدہ اور نازک بحث میں جیت علم کی ہو یا عمل کی، لیکن اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اہمیت دونوں ہی چیزوں کی ہے۔ علم بھی ضروری ہے اور عمل بھی لازمی۔ ان دونوں کی اہمیت تسلیم کرنے کے بعد دونوں کا احترام لازم ہو جاتا ہے۔ اس احترام کی تفصیل آج کے مہمان مقرر جناب محترم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ہی فرمائیں گے، اس لیے کہ وہ ان دونوں کا مجموعہ ہیں۔ وہ ہمارے ملک کے ممتاز سائنس دانوں میں سے ہیں اور سائنس کا تعلق علم و عمل دونوں سے ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کے متعلق چند کلمات کہنے پر اکتفا کروں گا۔ جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے ریڈیم سے نکلنے والی گاما شعاعوں پر لارڈ ردرفورڈ (Lord Rutherford) کی رہنمائی میں ریسرچ کر کے ایم۔ ایس۔ سی اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل فرمائیں۔ وطن واپس ہونے پر ڈاکٹر صاحب صدر شعبۂ سائنس کی حیثیت سے اسلامیہ کالج لاہور میں مقرر کیے گئے۔ پانچ سال تک یہ تعلیمی خدمت انجام دینے کے بعد ڈاکٹر صاحب سنٹرل کاٹن ٹیکنولوجیکل لیبوریٹریز بمبئی کے ڈائرکٹر مقرر کیے گئے اور ۱۹۴۵ء تک اس عہدے پر مامور رہنے کے بعد انڈین ٹیرف بورڈ کے ممبر بنائے گئے۔

قیامِ پاکستان پر آپ کو سکریٹری، ڈیولپمنٹ بورڈ اور پھر وزارتِ اقتصادی اُمور کا انچارج جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں ٹیرف کمیشن کے چیرمین بنائے گئے۔ ۱۹۵۶ء میں ایٹمی توانائی کمیشن کے چیرمین بنائے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ کو ایڈیشنل سکریٹری کا مرتبہ دے کر حکومتِ پاکستان کا ٹیکسٹائل ایڈوائزر بنایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو وزارتِ اقتصادی اُمور، ٹیرف کمیشن اور اٹومک انرجی کمیشن کے قیام کی ذمّے داریاں سونپی گئی تھیں، جن کو ڈاکٹر صاحب نے بحسن و خوبی پورا کیا۔

جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز، انڈیا، انڈین اکیڈمی آف سائنسز، پنجاب یونیورسٹی، بمبئی یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کے فیلو بھی رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۴۱ء میں او۔ بی۔ ای کا اعزاز بھی مل چکا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب حکومتِ ہند اور حکومتِ پاکستان کی مقرر کردہ کئی اہم کمیٹیوں اور کمیشنوں کے چیرمین بھی رہے

ہیں ۔ آپ متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں وفود کے قائد اور رکن کی حیثیت سے بھی وطنِ عزیز کی نمائندگی فرما چکے ہیں۔

تعلیم سے دلچسپی اور تدریسی تجربے کی بنا پر داؤد انجینئرنگ کالج، اُردو کالج، اور کراچی کالج برائے خواتین جیسی درس گاہوں کے بورڈ آف گورنرس میں بھی شامل رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اب تک اپنے پچاس سے زیادہ سائنسی، فنی اور ادبی مقالات شائع فرما چکے ہیں۔

آج کل آپ پاکستان سنٹرل کاٹن کمیٹی کی ٹیکنولوجیکل سب کمیٹی کے چیرمین اور اقبال اکیڈمی کے خازن ہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی خدمات کے اس مختصر تذکرے سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو علم اور سائنس سے دلی شغف رہا ہے اور اپنے علم سے کام لے کر پاکستان کی عملی خدمت بڑی لگن کے ساتھ فرماتے رہے ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب احترام علم وعمل پر جو کچھ فرمائیں گے وہ یقیناً بصیرت افروز ہوگا اور ہم اُن کے افکار سے روشنی حاصل کر سکیں گے۔ میں ڈاکٹر صاحب کا دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے ازراہِ کرم ہماری درخواست کو منظور فرماتے ہوئے اپنے افکار سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع عطا فرمایا۔

خواتین وحضرات !

آج کے صدرِ مجلس جناب محترم حسن علی عبدالرحمٰن صاحب بیرسٹر ایٹ لا کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ایک ممتاز ماہرِ تعلیم اور معزز قانون داں کی حیثیت سے ہم سب آپ سے واقف ہیں۔ آپ کراچی ہی میں پیدا ہوئے اور سندھ مدرسہ ہائی اسکول، سینٹ پیٹرک ہائی اسکول، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور اِن آف کورٹ لندن میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۹ء تک مشرقی افریقہ کی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں وکالت فرمائی۔ پھر ۱۹۶۲ء تک ویسٹ پاکستان ہائی کورٹ اور پاکستان سپریم کورٹ میں وکالت کی۔ آپ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۴ء تک ایس۔ ایم کالج کراچی کے پرنسپل بھی رہے۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۷ء تک سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصے بعد دوبارہ آپ کو اس اہم خدمت پر مامور کیا گیا، جہاں سے آپ حال ہی میں سبکدوش ہوئے ہیں۔

محترم حسن علی عبدالرحمٰن صاحب کراچی بار ایسوسی ایشن اور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔ اس کے علاوہ آپ نے بیرونِ ملک کئی اہم تعلیمی اور قانونی کانفرنسوں میں شرکت فرمائی اور اپنی قابلیت سے ملک کا نام روشن کیا۔

محترم حسن علی عبدالرحمٰن صاحب کا میں دل سے تشکر گزار ہوں کہ آپ نے ازراہِ کرم میری درخواست کو شرفِ قبول بخشا اور اِس شامِ ہمدرد کی صدارت کے لئے وقت نکالا۔ آپ جیسا صاحبِ علم اور باعمل انسان ہی احترام علم و عمل کی اس مجلس کی صدارت کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔

خواتین و حضرات!

اب میں جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے افکار و خیالات سے ہمیں مستفید فرمائیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد

خواتین وحضرات!

جس قوم کی الہامی کتاب کا سلسلہ اِن آیاتِ شریفہ سے شروع ہو کہ "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝" (سورہ علق آیات ۱-۵) جن کا ترجمہ یہ ہے کہ "پڑھو اس خدا کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا، پڑھو کہ تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو ان باتوں کی تعلیم دی جن کا اس کو علم نہ تھا۔"

جس قوم کے ہادیٔ برحق جن کے علم وفضل کی نسبت ارشادِ خداوندی ہے یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ یعنی وہ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور جن کو حکیم الأمت اقبال نے "دانائے سبل ختم الرسل مولائے کُل" کے نہایت موزوں القاب دیے۔ ان جیسی عظیم ہستی کو خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ دُعا مانگنے کا حکم ہو کہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۝ یعنی اے میرے خدا میرا علم زیادہ کر۔

جس قوم کی الہامی کتاب میں بارہا اَفَلَا تَتَدَبَّرُوْنَ، اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ یعنی تم کیوں نہیں سوچتے، تم کیوں نہیں سمجھتے، تم کیوں عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ فرمایا گیا ہو۔

جس قوم کی الہامی کتاب میں بارہا یہ ارشاد ہو کہ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ۔ یعنی دنیا میں گھوم کر دیکھو کہ خدا تعالےٰ کے احکام، جن میں تحصیلِ علم بھی شامل ہے، جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

جس قوم کی الہامی کتاب میں یہ تمثیل بیان کی گئی ہو کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل وکرم سے انسان کو علم الاشیا دے کر فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اسے سجدہ کریں اور جس ہستی نے صاحبِ علم انسان کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا، اُسے ملعون کا خطاب دیا گیا۔

جس قوم کے ہادیٔ برحق نے یہ فرما کر طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ تحصیل علم پر فرض کی مہر لگا دی ہو۔

اُس قوم کے کسی مجمع کے سامنے، خاص کر جب کہ وہ مجمع تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہو، علم کی اہمیت یا ضرورت پر تقریر یا مضمون کو طوالت دینا میرے خیال میں تحصیل حاصل ہے۔

اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ علم کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جا ملتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ علق کی پیش کردہ آیات سے ظاہر ہے، اور اس تمثیل سے بھی واضح ہے کہ (اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم الاشیا دے کر مسجودِ ملائک بنا دیا) اور علم حاصل کرنے اور غور و فکر اور عقل سے کام لینے کا حکم قرآن مجید میں بارہا دیا گیا اور قرآن حکیم کے معلمِ اوّل نے تحصیلِ علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دے دیا، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا علم کا احترام کیے بغیر اس کا حاصل کرنا ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، کیونکہ جس چیز کے لئے ہمارے دلوں میں قدر اور وقعت نہیں، اس کے حصول کے لئے مستحکم جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ ہم صرف اسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور اسی کے لیے اپنا وقت، اپنی محنت، اپنا زر و مال خرچ کرنے پر آمادہ اور تیار ہوں گے، جس کی عزت، قدر اور احترام ہمارے دلوں میں ہو گی۔ تو اگر ہم تحصیلِ علم کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کر لیں، تو علم کا احترام ہم پر واجب ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے علوم ہیں جن کا احترام واجب ہے۔ اس سوال پر غور کرنا اس لیے ضروری ہے کہ بد قسمتی سے ہمارے بعض حلقوں میں علم کا مفہوم نہایت تنگ معنوں میں لیا جاتا ہے، اور عام طور پر ان حلقوں میں اس سے علوم دینیہ یا علوم نقلیہ مراد لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ درس گاہیں جہاں صرف علوم دینیہ یا علومِ نقلیہ پڑھائے جاتے ہیں اُن کو دارالعلوم کا معزز خطاب دیا جاتا ہے اور یہ خطاب صرف انھی درسگاہوں کے لیے مختص ہے۔ اس کے برعکس اسکولوں، کالجوں یا یونیورسٹیوں کو کبھی دارالعلوم کا معزز خطاب نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح دارالعلوم کے سند یافتوں کو تو عالم کہا اور سمجھا جاتا ہے لیکن کالجوں یا یونیورسٹیوں کے سند یافتوں کو عالم کے معزز خطاب سے نہیں نوازا جاتا۔ اس ذہنی افتراق کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو علوم دینیہ کا احترام ہمارے دلوں میں موجود ہے اور ہم ان علوم کے حاصل کنندگان کی عزت کرتے ہیں لیکن دوسری طرف علوم عقلیہ کو ہم دنیاوی ضرورت سمجھ کر حاصل کرنے پر مجبور تو ہوتے ہیں لیکن اُن کے لیے ہمارے دلوں میں حقیقی احترام کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی ہم ان علوم کے حاصل کنندگان کی دلی عزت کرتے ہیں، اور نہ اُن کو احترام کے لائق سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں اس تنگ نظری سے ملتِ اسلامیہ کو سخت نقصان پہنچا ہے اور یہ تنگ نظری ہماری موجودہ غربت اور پسماندگی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ اس اذیت سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہم تمام علوم کا خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی، عقلی ہوں یا روایتی، یکساں احترام کریں اور ان علوم کے حاصل کرنے والوں کو دل میں برابر کی عزت کی جگہ دیں۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں نہ صرف موجودہ علوم کے دائرے دن بدن وسیع سے وسیع تر ہو رہے ہیں، بلکہ آئے دن نئے علوم کے لیے نئی اصطلاحات وضع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ ان نئے علوم کے

مضامین پُرانے علوم میں صحیح طور پر کھپ نہیں سکتے تو یہ سب علوم خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید یا جدید تر سب ہماری توجہ اور احترام کے مستحق ہیں۔ اور قرآن شریف کی اس آیت کے مطابق کہ یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۝ (سورہ مجادلہ آیت ۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے علم حاصل کیا، مدارج بلند کرتا ہے۔ اس وعدے میں سب اہلِ علم برابر کے شریک ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ یہ کبھی کہنا پڑتا ہے کہ قرآن مجید کی اس صریح نشاندھی کے خلاف اسلامی ممالک میں بجائے اس کے کہ اہلِ علم کے درجے بلند ہوں، بسا اوقات یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کم علموں کے مدارج بلند ہیں بشرطیکہ اُن کے ہاتھوں میں طاقت یا دولت ہو۔

اس ضمن میں ایک ضروری بات توجہ کے لائق یہ ہے کہ جن دارالعلوم کا میں نے ذکر کیا ہے، اُن کے نظامِ درسی میں کئی کتابیں ایسی شامل ہیں، جن کی بنا ان یونانی، عبرانی یا ایرانی تفکرات، روایات اور تحقیقات پر ہے جن کو عربوں اور نومسلموں نے اپنایا اور ترقی دی اور اُن میں سے بہت سے نظریے ہماری مذہبی کتابوں مثلاً تفاسیر کے اجزا بن گئے ہیں۔ اس کے بعد جب ملّتِ اسلامیہ میں جمود کا سلسلہ شروع ہوا تو اس درسی نظام میں مدّتوں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس عرصے میں علم کی دنیا اس عہد سے صدیوں آگے بڑھ گئی۔ اور ہزاروں نئے انکشافات نے نئی حقیقتوں کو ہم پر واضح کر دیا، جن کا اس پُرانے درسی نظام کی کتابوں میں کہیں ذکر نہیں۔ مثلاً ان کتابوں میں اب تک عناصرِ اربعہ کا ذکر ہے۔ حالانکہ جدید تحقیقات کی بنا پر کیمیاوی عناصر کی تعداد سَو [۱۰۵] سے اوپر ہے۔ اور پھر ان میں طبیعیاتی اجزا یعنی الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون مشترک ہیں جن کی بنا پر مادّے کی ماہیت کے متعلق ہمارے خیالات میں زبردست تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور تحقیق کا یہ سلسلہ بڑے شدّ و مد سے جاری ہے، جس کی بنا پر نئے انکشافات ہوتے رہیں گے۔ تو اگر ہمارے علما کی یہ خواہش ہے کہ لوگوں کے اور خصوصاً نئی تعلیم یافتہ نسل کے دلوں میں ان کے احترام کا سلسلہ جاری رہے تو پھر ان پر یہ بھی لازم ہے کہ رائے زنی کرنے سے پہلے جدید علوم سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر لیں۔ ان علوم سے بے اعتنائی کرنے سے ان علوم کی ترقی تو رک نہیں سکتی۔ اور دوسری قومیں جو ان علوم کو ترقی دے رہی ہیں، وہ اُن سے بھرپور فائدہ اٹھاتی رہیں گی، لیکن نقصان ان لوگوں اور قوموں کا ہوگا، جو اس ترقی کے مدارج اور نتائج سے آگاہ نہ ہوں اور فائدہ نہ اُٹھائیں۔ علامہ اقبالؒ نے زمانے کی زبان سے کیا خوب فرمایا ہے کہ

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

اب میں آج کے موضوع کے دوسرے حصّے یعنی احترامِ عمل پر اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت

چاہتا ہوں۔ اس ضمن میں میرے خیال میں اس کھُلی حقیقت پر زیادہ زور اور طوالت دینے کی ضرورت نہیں کہ عمل کے بغیر علم نہ صرف نامکمل اور خام رہ جاتا ہے، بلکہ اس میں ریا کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عمل ہی وہ کسوٹی ہے جس پر عمل پرکھا جا سکتا ہے اور کھرے اور کھوٹے میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ عمل ہی وہ ترازو ہے جس پر علم تولا جا سکتا ہے، اور اُس کی ماہیّت اور حقیقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عمل کی لگام کے بغیر علم بعض اوقات محض قیاس کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے اور حقیقت سے دُور جا کر اپنے متّبعین کو گمراہ بھی کر سکتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ہم کو متعدد مثالیں ایسی ملیں گی کہ جن میں ایک غلط خیال نے لوگوں کے دل و دماغ پر مدّتوں تسلّط جمائے رکھا جب تک کہ تجربے کے عمل نے اس کی غلطی کو فاش نہ کر دیا۔ مثلاً ارسطو نے اپنی کتاب میں لکھ دیا کہ اگر کسی بلند مقام سے ایک وزنی اور ایک ہلکی چیز بیک وقت گرائی جائے، تو وزنی چیز زیادہ تیزی کے ساتھ گرے گی۔ تقریباً دو ہزار سال تک لوگ اس عقیدے پر قائم رہے، حتیٰ کہ گلیلیو نے "پیسا" کے جھکے ہوئے مینار سے ایک ہلکا اور ایک بھاری پتّھر گرا کر ثابت کر دیا کہ دونوں ایک ہی وقت زمین پر گرے اور اُس کے اس عمل سے اس غلط خیال کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی طرح صدیوں تک لوگ اس غلط خیال میں گمراہ رہے کہ زمین ساکن اور چپٹی ہے۔ حتیٰ کہ تجربہ اور عمل نے ان غلط خیالات کا خاتمہ کیا۔ یعنی عمل، جس میں تجربہ کا زبردست عنصر شامل ہے وہ بھٹّی ہے جس میں غلط خیالات اور قیاسات جل بھُن کر ختم ہو جاتے ہیں، اور اُن کے نیچے دبی ہوئی حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں جن میں تجربے نے غلط نظریوں کو نظر انداز کرنے میں فیصلہ کن کام کیا۔

جیساکہ میں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اگر ہم تحصیلِ علم کے لیے علم کا احترام ضروری سمجھتے ہیں تو ہمیں عمل کا احترام بھی کرنا پڑے گا۔ کیونکہ خصوصاً آج کل کے دَور میں تجربے اور عمل کے بغیر علم کی صحت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ زمانۂ قدیم میں بہت سا علم قیاس آرائیوں پر مبنی تھا جس میں تجربے اور عمل کو زیادہ اہمیّت نہ تھی، لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے اور اب تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی کے بغیر علم ترقی نہیں کر سکتا۔ اس لئے تجربوں کے سچے نتائج خاص طور پر ہمارے احترام کے لائق ہیں جس طرح درسگاہوں کو دارالعلوم کہا جاتا ہے، اسی طرح تجربہ گاہوں کو دارالعمل کا خطاب دینا چاہیے۔ اور ہمارے ذہنوں میں ان کی بھی وہی عزّت اور احترام ہونا چاہیے جو دارالعلوم کا ہے۔

قرآن مجید میں بار بار اعمالِ صالح کی تاکید کی گئی ہے اور اعمالِ صالح کرنے والوں کے لیے اجراً غیر ممنون یعنی بے انتہا اجر کا وعدہ ہے۔ ہمارے یہاں عام طور پر اعمالِ صالح کا مطلب عبادات سمجھا جاتا ہے۔ اور جو شخص یہ عبادات بجالائے اُس کا شمار صالحین میں ہوتا ہے خواہ وہ اُس کے دنیاوی

معاملات، لین دین اور قول وفعل پر زیادہ اثرانداز نہ ہوں۔ یعنی ان اعمال سے اُس کی ذات کو ثواب کی شکل میں اجر ملتا ہے، لیکن سوسائٹی کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس میں کلام نہیں کہ مذہبی عبادات کی بجاآوری کا شمار اعمالِ صالح میں ہونا چاہیے، لیکن جیسا کہ میں نے علم کے سلسلے میں عرض کیا تھا، موجودہ دَور میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ جس طرح علم کی تعریف کا دائرہ وسیع کرکے اس میں علوم جدید کو بھی شامل کیا جائے، اسی طرح اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ ہم اعمالِ صالح کی تعریف کا دائرہ بھی وسیع کریں۔ اس توسیع تعریف کے لیے خوش قسمتی سے ہمیں ارشادِ نبویؐ سے نشاندہی ملتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ خَیرَ النّاس مَن یَنفَعُ النّاس۔ یعنی لوگوں میں وہ آدمی اچھا ہے جس سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ اس نظریے کو ذرا وسعت دیتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اعمال اچھے اور صالح ہیں، جن سے عوام النّاس کو فائدہ پہنچے۔ مثال کے طور پر مسجد کی تعمیر کرنا عملِ صالح اور کارِ ثواب سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے مقابلے میں ڈسپنسری یا اسکول یا دارالتجربہ تعمیر کرنے کا شمار اعمالِ صالح میں نہیں ہوتا۔ حالانکہ قوم کو ایسی عمارتوں اور اداروں کی سخت ضرورت ہے اور ان سے عوام النّاس کو بہت سے فائدے پہنچتے ہیں۔ اگر ہم عملِ صالح کی تعریف میں میری پیش کردہ وسعت معنی تسلیم کرلیں، تو ہر وہ کام جو خلوص اور نیک نیتی سے کیا جائے اور جس سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو، اُس کا شمار اعمالِ صالح میں ہوگا۔ مثلاً وہ کسان جو محنت سے اپنی فصل اُگاتا ہے تاکہ لوگوں کو اس سے خوراک حاصل ہو، وہ عملِ صالح کرتا ہے اور اُس کا یہ عمل ہمارے احترام کے لائق ہے۔
اسی طرح وہ مزدور جو فیکٹری میں تن دہی سے کام کرتا ہے تاکہ ملک کی صنعت میں ترقی ہو اور لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے، وہ بھی عملِ صالح کرتا ہے اور اُس کا یہ عمل ہمارے احترام کا حق دار ہے۔ اسی طرح وہ ڈاکٹر یا طبیب، جو خلوص سے مریضوں کا علاج کرتے ہیں تاکہ لوگ توانا اور تندرست رہیں، وہ بھی اعمالِ صالح کرتے ہیں اور اُن کے یہ اعمال ہمارے احترام کے سزاوار ہیں۔ اسی طرح وہ استاد، جو محنت اور محبت سے اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتا ہے تاکہ اُن کو فائدہ پہنچے اور علم کی روشنی پھیلے، اُس کا عملِ صالح بھی ہمارے احترام کے قابل ہے۔ اسی طرح وہ سائنس داں یا ٹکنالوجسٹ جو تجربوں سے حقیقت آشکار کرتا ہے یا ایسی مشینیں بناتا ہے جن سے ملک کو فائدہ پہنچے، وہ سب ہمارے احترام کے حق دار ہیں۔ اگر ہم اعمالِ صالح کو ان وسیع معنوں میں لیں جو میں نے پیش کیے ہیں تو ہم کو تاریخ اور مشاہدے کی روشنی میں اس آیت شریفہ کے سمجھنے میں آسانی ہوگی جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین کا وارث اپنے صالح بندوں کو بناتا ہے، کیونکہ ہم نے دنیا کی تاریخ میں بارہا دیکھا ہے کہ زمین کے وارث صرف وہی لوگ نہیں ہوتے جو محض عبادات بجالانے پر اکتفا کرتے ہیں، بلکہ وہ لوگ بھی ہوتے

ہیں جو وسیع معنوں میں اعمالِ صالح بجالانے پر جہاں گیری اور جہاں بانی کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔

خواتین و حضرات!

آخر میں میں اس مقالے کو اقبالؔ کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مطبوعاتِ ہمدرد اکیڈمی — ایک نظر میں

ماہ و روز	حکیم محمد سعید	۳۵ — ۰۰
قرآن روشنی ہے (۲۴ کتابچے)	حکیم محمد سعید	۱۲ — ۰۰
شب و روز مع تاثراتِ سفرِ دمشق، حلب اور جدّہ	حکیم محمد سعید	۱۰ — ۰۰
تعلیمِ صحت	حکیم محمد سعید	۵ — ۰۰
ذیابیطس نامہ	حکیم محمد سعید	۵ — ۰۰
مقالاتِ ابن الہیثم	حکیم محمد سعید	۸ — ۰۰
داستانِ سرطان		۲ — ۵۰
مسدسِ بے حالی	سیّد ضمیر جعفری	۱ — ۰۰
دیہاتی معالج حصّہ اوّل		۱۲ — ۰۰
دیہاتی معالج حصّہ دوم		۱۲ — ۰۰
اطبّائے عہدِ مغلیہ	کوثر چاند پوری	۳ — ۲۵
انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت	آغا محمد اشرف	۲ — ۵۰
گاما، رستمِ زماں گاما پہلوان کی کہانی	خواجہ محمد شفیع	۲ — ۵۰
شعلۂ سنگ (افسانے)	کوثر چاند پوری	۲ — ۵۰

بچّوں کے لیے

قصّہ اژدہا پکڑنے کا	محمود علی اسد و دیگر	۲ — ۵۰
پُراسرار غار	میرزا ادیب و دیگر	۲ — ۵۰
ننھا سُراغ رساں	مسعود احمد برکاتی و دیگر	۳ — ۵۰
ابو علی کا جوتا	عبدالحمید نظامی و دیگر	۳ — ۵۰
کھلونا نگر	غازی کمال رشدی	۴ — ۵۰
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	علی اسد	۴ — ۰۰
ننھا سیاح	محمد زکریا مائل	۴ — ۵۰
چالاک خرگوش کے کارنامے	معراج	۴ — ۵۰
سنہرے اصول	حکیم محمد سعید	۳ — ۰۰
جاگو جگاؤ	حکیم محمد سعید	۲ — ۰۰

جوہرِ قابل (مولانا محمد علی جوہر کے سوانح) دوسرا ایڈیشن	مسعود احمد برکاتی	زیرِ تیاری
صحت کی الف بے	مسعود احمد برکاتی	۳ — ۰۰
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	حکیم محمد سعید و دیگر	۵ — ۰۰
غذائیں دوائیں	ادارہ	۴ — ۰۰

انگریزی کتب

البیرونی کی کتاب الصیدنہ فی الطب حصّہ اول (عربی و انگریزی)	حکیم محمد سعید	۲۵۰ — ۰۰
البیرونی کی کتاب الصیدنہ فی الطب حصّہ دوم (انگریزی)	پروفیسر سامی حمارنہ	۵۰ — ۰۰
فارماکوگرافیا انڈیکا	ولیم ڈائی ماک	۲۲۰ — ۰۰
البیرونی کومیموریٹیو والیوم	حکیم محمد سعید	۲۰۰ — ۰۰
ہیلتھ اوف دی نیشن کانفرنس پروسیڈنگس	حکیم محمد سعید	۱۲۵ — ۰۰
ابن الہیثم (رُوداد جشن ہزار سالہ)	حکیم محمد سعید	۵۰ — ۰۰
اقبال اینڈ سوشلزم	ڈاکٹر ایس۔ اے۔ رحمٰن	۵ — ۰۰
مِسٹیریئس میوزک اوف مسٹی سزم	جی۔ الانہ	۵ — ۰۰
اے کوڈ اوف مسلم پرسنل لا جلد اوّل	ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن	۲۰۰ — ۰۰
دی ایمپلائر اینڈ دی ایمپلائی۔ اسلامک کانسپٹ	حکیم محمد سعید	۱۵ — ۰۰
اسلامائی زیشن اوف پاکستان لا	ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن	۲۵ — ۰۰
اسلامک کانسپٹ اوف سٹیٹ	جسٹس حمود الرحمٰن	۵ — ۰۰

رسائل

		سالانہ
ہمدرد صحت	مدیر حکیم محمد سعید	۴۵ — ۰۰
یونیسکو پیامی	مدیر حکیم محمد سعید	۴۵ — ۰۰
ہمدرد نونہال	مدیر مسعود احمد برکاتی	۲۵ — ۰۰
اخبار الطب	مدیر حکیم محمد سعید	۱۲ — ۰۰
ہمدرد اسلامیکس	مدیر حکیم محمد سعید	۷۵ — ۰۰
ہمدرد مڈیکس	مدیر حکیم محمد سعید	۱۰۰ — ۰۰

ہمدرد اکیڈمی، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد، کراچی ۱۸

SHAM -I- HAMDARD PAPERS

1972

RESPECT

SHAM-I-HAMDARD — AN
EDUCATIONAL, SCIENTIFIC
AND CULTURAL FORUM,
providing a window on our
traditions, religious thought and
socio-economic philosophy

ہمدرد اکیڈمی ، کراچی